خطبات

حکیم الامت

Vol - 02

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان فون: 4540513-4519240

بسم الله الرحمن الرحيم

اردو کتب خانہ
URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT

علم وعمل

بسلسلہ خطبات حکیم الامت جلد-۳

علم و عمل

جدید ایڈیشن

حکیم الامت مجدد الملت

حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ

عنوانات

مفتی عبد الرحمن خان رحمہ اللہ

تصحیح و تزئین
صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہ

تخریج احادیث
مولانا زاہد محمود قاسمی

ادارہ تالیفات اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان
(061-4540513-4519240

علم و عمل

تاریخ اشاعت.............رمضان المبارک ۱۴۲۷ھ
ناشر...........................ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان
طباعت.......................سلامت اقبال پریس ملتان

جملہ حقوق محفوظ ہیں

قارئین سے گذارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تا کہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاک اللہ

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ.....چوک فوارہ.....ملتان
ادارہ اسلامیات.........انارکلی.........لاہور
مکتبہ سید احمد شہید.........اردو بازار.........لاہور
مکتبہ رحمانیہ.........اردو بازار.........لاہور
مکتبہ رشیدیہ.........راجہ بازار.........راولپنڈی
یونیورسٹی بک ایجنسی.........خیبر بازار.........پشاور
ادارۃ الانور.........نیو ٹاؤن.........کراچی نمبر 5
مکتبہ المنظور الاسلامیہ.........جامعہ حسینیہ.........علی پور
مکتبہ المنظور الاسلامیہ.........بلاک زیڈ.........مدینہ ٹاؤن.........بنک موڑ.........فیصل آباد

ادارہ اشاعت الخیر - حضوری باغ روڈ - ملتان

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K
(ISLAMIC BOOKS CENTERE
119-121- HALLIWELL ROAD
BOLTON BL1 3NE. (U.K.)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

عرض ناشر

خطبات حکیم الامت جلد نمبر ۲ ’’علم وعمل‘‘

جدید اشاعت سے مزین آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اللہ کے فضل وکرم اور اپنے اکابرین کی دعاؤں کے طفیل کافی عرصہ سے خطبات کی اشاعت کا ادارہ کو شرف حاصل ہو رہا ہے۔ بہت سے بزرگوں کی تمنا تھی کہ ان کی احادیث مبارکہ کی تخریج ہو جائے۔ ادارہ کی درخواست پر محترم جناب مولانا زاہد محمود صاحب نے یہ کام سرانجام دیا اور اس کے ساتھ ہی ہم حضرت صوفی محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہ کے مشکور ہیں کہ اُنہوں نے فارسی اشعار اور عربی عبارات کا ترجمہ اور اس کے ساتھ ساتھ تصحیح بھی فرما دی۔

اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے آمین

احقر: محمد اسحٰق عفی عنہ

رمضان المبارک ۱۴۲۷ھ بمطابق ستمبر 2006ء

اجمالی فہرست

وعظ کا نام ——— صفحہ نمبر

الفاظ القرآن ۱۴

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ (الحجر)

طٰسٓ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۝ (النمل)

تعمیم التعلیم ۹۲

وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۭ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ

مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (البقرہ)

کوثر العلوم ۱۹۹

الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ

بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ (البقرہ)

العلم والخشیة ۲۴۰

إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا الخ (فاطر)

تعلیم البیان ۲۸۴

الرَّحْمٰنُ ۝۱ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝۲ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝۳ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝۴ (الرحمٰن)

فضل العلم والعمل ۳۰۳

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ (المجادلہ)

اکبر الاعمال ۳۴۰

وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ۝۴۵ (العنکبوت)

آخر الاعمال ۳۸۱

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ (البقرہ)

* * *

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحات	نمبر شمار	مضمون	صفحات
	گذارش		۱۹	خلافت کا تقاضا	۴۳
	الفاظ قرآن	۱۴	۲۰	خطرے کا الارم	۴۴
۱	تلاوت فرض کفایہ ہے	۱۶	۲۱	حفظ کی حقیقت	۴۵
۲	حروف مقطعات	۱۷	۲۲	علم وکمال پر ناز	۴۶
۳	مسلمانوں کی قسمیں	۱۸	۲۳	آخرت کے سکے	۴۸
۴	ترقی اور تعلیم جدید	۱۹	۲۴	عقلی اور طبعی محبت	۴۹
۵	اسرار احکام الٰہی	۲۰	۲۵	حق تعالیٰ سے ہم کلامی	۵۲
۶	صحبت علماء کی ضرورت	۲۱	۲۶	الفاظ سے عشق	۵۴
۷	حصول تعلیم جدید کا طریق	۲۳	۲۷	توجہ علی الالفاظ کی ضرورت	۵۵
۸	دینی اور دنیوی منافع کا تفاوت	۲۴	۲۸	لذت الفاظ و معانی	۵۶
۹	غرض پرستی و نفس پرستی	۲۵	۲۹	الفاظ کی اہمیت	۵۷
۱۰	قرآن خوانی سے گریز کا حیلہ	۲۶	۳۰	بلا متن قرآن کا اردو ترجمہ	۵۸
۱۱	معانی کا محل	۲۸	۳۱	اردو میں نماز	۵۸
۱۲	لفظ کے معنی	۲۹	۳۲	صحت قرأت کا اہتمام	۵۹
۱۳	الفاظ قرآن کی حفاظت	۳۰	۳۳	دینی دنیوی ناکامی کا اثر	۶۱
۱۴	انوار نہیں مٹ سکتے	۳۲	۳۴	تفویض وطلب کی ضرورت	۶۲
۱۵	مرضی حق کی رعایت	۳۴	۳۵	راحت طلبی کا نتیجہ	۶۵
۱۶	خداتعالیٰ سے بےتعلقی	۳۶	۳۶	اہل اللہ کی راحت کا راز	۶۶
۱۷	حضورؐ کا حافظہ وقوت	۳۹	۳۷	عزت حکام واہل اللہ کا فرق	۶۷
۱۸	حفاظت الفاظ کا اہتمام	۴۲	۳۸	تعظیم اولیاء کی صورت	۶۹

۳۹	اخلاص کی قدر و قیمت	۷۰	۷	عجب و کبر	۱۰۶
۴۰	زیارت قبور کی غرض	۷۱	۸	عقلی علت	۱۰۸
۴۱	سماع کی شرائط	۷۲	۹	حکمت احکام	۱۱۱
۴۲	پختہ قبروں کی ممانعت	۷۳	۱۰	نسبت مع اللہ	۱۱۴
۴۳	فیوض قبور کی نوعیت	۷۴	۱۱	حرمت کا مدار	۱۱۵
۴۴	طاعت کی برکت	۷۵	۱۲	بے وضو نماز	۱۱۷
۴۵	نو تعلیم یافتہ طبقہ کی کوتاہی	۷۶	۱۳	لیڈر کی نماز	۱۱۸
۴۶	جاہل درویشوں کی غلطی	۷۷	۱۴	مولوی کی تعریف	۱۱۹
۴۷	حقیقت قلندری	۷۸	۱۵	بسم اللہ پڑھنا	۱۲۱
۴۸	جماعت علماء کی غلطی	۸۰	۱۶	نفع کی چیز	۱۲۲
۴۹	علماء کو انتباہ	۸۳	۱۷	سفلی و علوی عمل	۱۲۳
۵۰	قابل عمل مثال	۸۴	۱۸	علوی عمل کی حدود	۱۲۷
۵۱	دین و دنیا کی راحت کا راز	۸۴	۱۹	سحر کی تاثیر	۱۲۹
۵۲	اصلاح عوام کی صورت	۸۶	۲۰	کشف کے خطرات	۱۳۱
۵۳	چند علمی نکتے	۸۷	۲۱	تعلیم نسواں کی صورت	۱۳۲
۵۴	نکات متعلق حروف مقطعات	۸۹	۲۲	عجائب پرستی	۱۳۵
	۲۔ تعیم التعلیم	۹۲	۲۳	غلو فی الدین	۱۳۶
۱	تمہید	۹۳	۲۴	عوام کا اعتقاد	۱۳۸
۲	علم سحر	۹۴	۲۵	واعظین کا مذاق	۱۳۹
۳	نیت کا اثر	۹۵	۲۶	ہاروت و ماروت	۱۴۰
۴	مقام عشاق	۹۷	۲۷	سحر و معجزہ میں فرق	۱۴۳
۵	علت اور شریعت	۱۰۱	۲۸	مجذوب و سالک کا فرق	۱۴۵
۶	اسوہ شریعت	۱۰۳	۲۹	کاملین کے کمالات	۱۴۶

۳۰	سحر کے اثرات	۱۵۰	۶	خالصیت و عالمیت	۲۰۷
۳۱	علم محمود	۱۵۱	۷	خشیت کی حد	۲۱۰
۳۲	مناظرے کی خرابیاں	۱۵۳	۸	لذت محویت	۲۱۲
۳۳	مضر و نافع علوم	۱۵۹	۹	فرق اجرت و نفقہ	۲۱۵
۳۴	علماء کی غلطی	۱۶۱	۱۰	حقیقت علم	۲۱۶
۳۵	عوام کی غلطی	۱۶۳	۱۱	فہم قرآن	۲۲۱
۳۶	علماء کی کوتاہی	۱۶۶	۱۲	امور ذوقیہ	۲۲۵
۳۷	علم کی کیمیا	۱۷۵	۱۳	وہبی علوم	۲۲۶
۳۸	علم کی فضیلت	۱۷۷	۱۴	حقیقت تقویٰ	۲۲۸
۳۹	صحبت کا اثر	۱۷۹	۱۵	تقویٰ کی مثال	۲۳۱
۴۰	امراء کی کوتاہی	۱۸۰	۱۶	طلباء کی کوتاہیاں	۲۳۲
۴۱	علم کی قدر	۱۸۱	۱۷	علماء کا ادب	۲۳۳
۴۲	انتخاب طلباء	۱۸۴	۱۸	انوار و اسرار	۲۳۴
۴۳	علم دین کی برکت	۱۸۵	۱۹	توضیحات	۲۳۸
۴۴	رفع اشکالات	۱۸۷		۴۔ العلم والخشیت	۲۴۰
۴۵	مفید علم	۱۹۳	۱	ضرورت بیان	۲۴۱
۴۶	کام کی باتیں	۱۹۶	۲	طریق اصلاح	۲۴۳
	۳۔ کوثر العلوم	۱۹۹	۳	تعلق علم و خشیت	۲۴۴
۱	ضروریات کا علم	۲۰۰	۴	مفسدہ اہل علم	۲۴۵
۲	زیادت فی العلم	۲۰۲	۵	فرق آمد و آورد	۲۴۸
۳	حظ نفس کے اقسام	۲۰۳	۶	کلام کا اثر	۲۴۹
۴	لذات کا فرق	۲۰۴	۷	مطالعہ میں احتیاط	۲۵۱
۵	خشوع کی حقیقت	۲۰۵	۸	تقسیم موئے مبارک	۲۵۱

۹	قبر پرستی	۲۵۳	۷	آمیزش و تشابہ	۲۹۲
۱۰	تصور شیخ	۲۵۵	۸	عجائبات قدرت	۲۹۵
۱۱	خشیت کا اثر	۲۵۹	۹	قوت حافظہ	۲۹۵
۱۲	خشیت کی علامت	۲۶۱	۱۰	قوت بیانیہ	۲۹۶
۱۳	علم اور عشق	۲۶۳	۱۱	طریق بیان	۲۹۷
۱۴	علم مطلوب	۲۶۵	۱۲	نیا خبط	۳۰۰
۱۵	فخر و فضیلت	۲۶۶		۶۔ فضل العلم والعمل	۳۰۳
۱۶	خشیت مطلوبہ	۲۶۷	۱	ایک خاص حکم	۳۰۴
۱۷	عوام کی تعلیم	۲۶۹	۲	علت و حکمت	۳۰۵
۱۸	دولت علم	۲۷۱	۳	حصول نفع کی صورت	۳۰۷
۱۹	تبلیغ کی صورت	۲۷۲	۴	تعلیم جدید کی خرابیاں	۳۱۰
۲۰	چندہ اور علماء	۲۷۴	۵	ترقی مال و جاہ	۳۱۱
۲۱	تبلیغ کا قاعدہ	۲۷۵	۶	عزت و ذلت کی علت	۳۱۲
۲۲	ایک علمی اشکال	۲۷۸	۷	راحت و طاعت کا تعلق	۳۱۳
۲۳	علم کی قسمیں	۲۸۱	۸	عزت و اطاعت کا تعلق	۳۱۵
۲۴	خشیت کی ضرورت	۲۸۳	۹	موازنہ دنیا و آخرت	۳۱۵
	۵۔ تعلیم البیان	۲۸۴	۱۰	حالت دنیا کی مثال	۳۱۸
۱	تمہید و ضرورت	۲۸۵	۱۱	صورت و حقیقت کا فرق	۳۲۰
۲	رحمت عظیمہ	۲۸۶	۱۲	محبت کی خاصیت اور تقاضا	۳۲۲
۳	حسن بیان	۲۸۸	۱۳	اصلاح اخلاق و معاشرت	۳۲۳
۴	اثر بیان	۲۸۹	۱۴	طریق اصلاح	۳۲۴
۵	طرز بیان	۲۹۰	۱۵	آداب تعظیم و تکریم	۳۲۵
۶	خصوصیات زبان	۲۹۱	۱۶	آداب راحت رسانی	۳۲۶

۱۷	ایک علمی نکتہ	۳۳۰	۱۲	ذکر ترک تعلق کا نام نہیں	۳۶۱
۱۸	اصلاح معاشرت کے ثمرات	۳۳۱	۱۳	صورت ذکر	۳۶۲
۱۹	قبول اعمال کی شرط	۳۳۳	۱۴	مراتب ذکر	۳۶۴
۲۰	سالک ومجذوب کا طریق	۳۳۴	۱۵	ذکر لسانی کے درجات	۳۶۷
۲۱	مراتب اہل علم وایمان	۳۳۴	۱۶	حقیقت ذکر	۳۷۰
۲۲	عاصی ومومن سے سلوک	۳۳۵	۱۷	روح اعمال	۳۷۱
۲۳	کبر وعجب	۳۳۶	۱۸	ذکر کی کوئی حد نہیں	۳۷۲
۲۴	قبول اعمال کا معیار	۳۳۶	۱۹	توضیحات	۳۷۴
۲۵	ایک سہل مراقبہ	۳۳۸	۲۰	تشریحات	۳۷۹
۲۶	شرط اعمال	۳۳۸		۸۔ آخر الاعمال	۳۸۱
۲۷	شیخ کامل کی شناخت	۳۳۹	۱	تمہید	۳۸۲
	۷۔ اکبر الاعمال	۳۴۰	۲	توبہ کی اہمیت	۳۸۳
۱	ضرورت بیان	۳۴۱	۳	توبہ کی ضرورت	۳۸۳
۲	شعائر دین اور ان کی حقیقت	۳۴۲	۴	ایمان وعمل کا تعلق	۳۸۴
۳	ذکر اللہ کے معنی	۳۴۴	۵	فکر دین کا فقدان	۳۸۵
۴	توسل کی حقیقت	۳۴۵	۶	فکر دین کی صورت	۳۸۷
۵	اللہ کے ساتھ بے ادبی	۳۴۶	۷	دھن اور دھیان کی ضرورت	۳۸۸
۶	ادب کی تعلیم	۳۵۱	۸	نزع کی تکلیف کا راز	۳۹۰
۷	صورت اور حقیقت کا فرق	۳۵۲	۹	خدمت خلق کی اہمیت	۳۹۰
۸	ذکر اللہ کے درجات	۳۵۶	۱۰	شوق کا اثر	۳۹۱
۹	فرمائش میں احتیاط	۳۵۹	۱۱	دیندار کی تعریف	۳۹۲
۱۰	ترقی دین ودنیا	۳۵۹	۱۲	دینداروں کی کوتاہیاں	۳۹۳
۱۱	نفس کی پہچان کا معیار	۳۶۰	۱۳	وقار اور وضع کا خیال	۳۹۵

۱۴	دین میں قناعت کیوں؟	۳۹۶	۲۹	آج کل کا تصوف	۴۱۷
۱۵	تکمیل دین کی صورت	۳۹۷	۳۰	عشق کی خاصیت	۴۱۸
۱۶	ایک اہم غلطی	۳۹۸	۳۱	تصوف اور شریعت	۴۱۹
۱۷	مجاہدہ کا لطف	۳۹۹	۳۲	مقام کی حقیقت	۴۲۰
۱۸	دین کی برکات	۴۰۰	۳۳	سلوک کے معنی	۴۲۱
۱۹	عاشق کی طلب	۴۰۱	۳۴	رضا کے معنی	۴۲۲
۲۰	واصل الی اللہ	۴۰۲	۳۵	رضا کا مقام	۴۲۴
۲۱	قرب الٰہی کی حد	۴۰۴	۳۶	جوش اور ہوش	۴۲۶
۲۲	سیر الی اللہ و سیر فی اللہ	۴۰۵	۳۷	جنت سے بڑی نعمت	۴۲۷
۲۳	دوستی کی شرط	۴۰۷	۳۸	ادب مجالست کا جرم	۴۲۹
۲۴	خدا سے بخل	۴۱۰	۳۹	فنا کے معنی	۴۳۱
۲۵	عاشق کا مذہب	۴۱۱	۴۰	ہمہ اوست کے معنی	۴۳۳
۲۶	جنت کا سودا	۴۱۳	۴۱	مقام عبدیت	۴۳۵
۲۷	تصوف کی صورت	۴۱۴	۴۲	مقام محبوبیت	۴۳۶
۲۸	تصوف کی کنجی	۴۱۶	۴۳	مقصود بیان	۴۳۷

الفاظ قرآن

ضرورت تعلیم قرآن کے متعلق خطبہ جامع مسجد کیرانہ ضلع مظفر نگر میں بوقت صبح بروز اتوار ۲۳ شعبان المعظم ۱۳۳۴ھ منبر پر بیٹھ کر ۱۵۰۰ کے مجمع میں ارشاد فرمایا جو سوا پانچ گھنٹوں میں ختم ہوا۔ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے اسے قلمبند فرمایا۔

اس وقت میں ایک خوفناک منظر دیکھ رہا ہوں کہ مسلمانوں کی تحریریں تو کفر آمیز شائع ہوتی ہیں اور اہل یورپ کی تحریریں اسلام کی مدح میں شائع ہو رہی ہیں۔ گویا بعضے مسلمان تو کفر کی طرف بڑھ رہے ہیں اور بعض کفار اسلام کی طرف۔ اس حالت کو دیکھ کر سخت اندیشہ ہے کہ جب یہ دونوں جماعتیں سرحد پر پہنچ چکیں گی، تو ایسا نہ ہو کہ وہ تو کفر سے نکل کر مسلمان ہو جائیں اور یہ اسلام سے نکل کر کافر ہو جائیں۔

خطبۂ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد لله نحمده ٗ ونستعينهٗ ونستغفرهٗ ونومن به ونتوكل عليه ونعوذبالله من شرور انفسنا و من سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل لهٗ ومن يضلله فلاهادى له ونشهد ان لااله الاالله وحدهٗ لاشريک له ونشهد ان سيدنا ومولانا محمدًا عبدهٗ ورسوله صلى الله تعالىٰ عليه وعلىٰ اٰله واصحابه وازواجه وذريته وبارک وسلم تسليما كثيراً اما بعد فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم. بسم الله الرحمن الرحيم.

الٓرٰ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ وَ قُرۡاٰنٍ مُّبِیۡنٍ ۝ (الحجر:۱)

طٰسٓ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡقُرۡاٰنِ وَ کِتَابٍ مُّبِیۡنٍ ۝ (النمل:۱)

(ترجمہ: الرا (حروف مقطعات) یہ آیتیں ہیں کامل کتاب اور قرآن واضح کی۔ طس (حروف مقطعات) یہ آیتیں جو آپ پر نازل کی جاتی ہیں قرآن کی ہیں اور ایک واضح کتاب کی)

ذکر قرآن

یہ دو آیتیں ہیں۔ ایک سورۂ حجر کی دوسری سورۃ النمل کی۔ ان آیتوں کی تلاوت ہی سے سامعین کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ اس وقت مجھے قرآن کے متعلق بیان کرنا مقصود ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کو قرآن سے خاص مناسبت ہے۔ عوام بھی آیت کو سن کر فی الجملہ اجمالی معنیٰ کو سمجھ لیتے ہیں۔ پھر ان آیتوں میں قرآن کا لفظ صراحۃً مذکور ہے۔ اس لئے اس طرف انتقال ذہن کچھ دشوار نہیں۔ اس مضمون کے اختیار کی یہ وجہ ہوئی کہ آج کل مسلمانوں کو قرآن کے حقوق سے غفلت ہے۔ اور جو اہتمام رمضان میں اس کا ہونا چاہئے اس میں کوتاہی ہے۔ اور رمضان اب نزدیک آ رہا ہے کہ سات دن یا چھ دن باقی ہیں اس لئے اس مضمون کو اختیار کیا گیا۔ شاید

سی کو خیال ہوا ہوگا کہ رمضان کی مناسبت سے روزہ کا بیان بھی ہونا چاہیے مگر میں اس وقت روزہ کے متعلق بیان نہیں کروں گا کیونکہ ظاہر ہے کہ ایک جلسہ میں سب مضامین کا بیان دشوار ہے گو ضروری سب ہیں۔ بس یہی ہوسکتا ہے کہ ان میں سے اہم کو مقدم کیا جائے۔ چنانچہ رمضان کے متعلق روزہ اور قرآن وغیرہ کا بیان ضروری ہے۔

تلاوت فرض کفایہ ہے

سو میں نے اس وقت ذکر قرآن کو مقدم کیا ہے۔ گو روزہ بھی بڑی چیز ہے کہ نماز کی طرح فرض عین ہے اور تلاوت قرآن اس درجہ میں ضروری نہیں کیونکہ وہ فرض عین نہیں یعنی اول سے آخر تک قرآن کا پڑھنا فرض عین نہیں گو فرض کفایہ ضرور ہے اور ایک آیت کا یاد کرنا فرض عین اور سورۂ فاتحہ اور ایک سورۂ کا سیکھنا گو چھوٹی سی ہی سورۃ ہو واجب علی العین ہے۔ مگر میں نے قرآن کا بیان اسی لئے اختیار کیا ہے کہ اس کا جو درجہ ضرورت کا ہے مسلمان اس سے بھی غافل ہیں اور جس درجہ اس کا اہتمام ہونا چاہیے اس میں بھی آج کل کوتاہی ہے اور اس کوتاہی کو بہت لوگ کوتاہی نہیں سمجھتے۔ اور روزہ میں جو لوگ درجہ فرض میں کوتاہی کرتے ہیں۔ یعنی روزہ نہیں رکھتے ان کی کوتاہی کو ہر شخص جانتا اور روزہ نہ رکھنے والوں کو ہر مسلمان برا سمجھتا ہے۔ خود وہ روزہ خور بھی رمضان میں چوروں کی طرح چھپ چھپ کر کاروائی کرتا ہے یعنی وہ خود بھی اس حرکت کی شناخت سے واقف ہے۔ اور روزہ میں جن کوتاہیوں کو کوتاہی نہیں سمجھا جاتا وہ درجہ فرض میں کوتاہی نہیں یعنی ایسا فرض جس کی قوت سے روزہ روزہ ہی نہ رہے اور قرآن کے جس درجہ میں کوتاہی ہے، وہ ایک تو فرض کفایہ کا درجہ ہے اور یک فرض عین کا درجہ ہے یعنی لوگ پورا قرآن نہیں پڑھتے اور بعض لوگ صحت وتجوید حاصل نہیں کرتے اور ان دونوں درجوں میں قرآن ہی کا تحقق نہیں رہتا۔ اول میں تو ظاہر ہے کہ جزو کا فوت کل کے فوت کو مستلزم ہے اور دوسرے اس لئے کہ قرآن عربی ہے۔ عربیت کے فوت ہونے سے بھی قرآن کا تحقق نہ رہے گا۔ سو قرآن کے متعلق اتنی بڑی کوتاہی کی جارہی ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ غضب ہے کہ اس کو کوتاہی بھی نہیں سمجھتے۔ اس لئے قرآن کا بیان اہم ہوا۔ اس لئے میں نے اس کو اختیار کیا ہے۔ گو بیان مختصر (مگر باوجود اختصار کے ۵ گھنٹہ بیان ہوا۔ فلیف لو ارید الاطناب من اول الامر) ہی ہوگا چند وجوہ سے۔

ایک طبیعت کا کسل مند ہونا۔ دوسرے مشاغل عامہ کا خیال ہے کہ لوگ اپنے کاروبار چھوڑ کر آئے ہیں ان کا زیادہ حرج نہ ہو (اس پر مجمع میں سے بعض حضرات نے پکار کر کہا کہ حضرت آزادی سے جب تک چاہیں بیان فرمائیں۔ سب لوگ مشتاق ہیں اور کسی کا حرج نہیں۔ فرمایا کہ آپ کو سب کی ضرورتوں کا علم کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس پر دوسری طرف سے آواز آئی کہ حضرت کسی کا حرج نہیں فرمایا، بہت اچھا لیکن اس پر بھی اگر کسی کو درمان میں جانے کی ضرورت ہو تو وہ آزاد ہے مقید نہیں ۱۲) تیسرے ایک وجہ اختصار کی یہ بھی ہے کہ اس وقت مجھے قرآن کے متعلق صرف ایک مضمون بیان کرنا ہے جو اب تک کانوں میں نہیں پڑا۔ باقی مضامین چونکہ سب کے کانوں میں پڑے ہوئے ہیں مثلاً فضائل قرآن وثواب وغیرہ وہ اس وقت بیان نہ کروں گا۔ اور ظاہر ہے کہ ایک مضمون کا بیان عموماً مختصر ہی ہوتا ہے اور وہ نیا مضمون جس کے بیان کا قصد ہے ایسا اہم ہے کہ اس کے بیان نہ کرنے سے یہ مرض بڑھ جائے گا اس لئے اس کا اہتمام ضروری ہے۔ رہے فضائل وثواب سو وہ اگر میں نے بیان نہ کئے تو دوسروں سے آپ کو معلوم ہو سکتے ہیں نیز کتابوں سے بھی معلوم ہو سکتے ہیں کیونکہ آج کل اردو میں بھی دینی رسائل بکثرت ہیں۔ لیکن یہ مضمون غالباً نہ کسی دوسرے سے آپ نے سنا ہوگا نہ سننے کی امید اور نہ کتابوں میں نظر آئے گا۔ اب میں مقصود کو شروع کرتا ہوں۔

حروف مقطعات

یہ دو آیتیں جو میں نے تلاوت کی ہیں حروف مقطعات سے شروع ہوئی ہیں جو کٹے کٹے پڑھے جاتے ہیں ملا کر نہیں پڑھے جاتے اور ان کا مقطعات ہونا نقل ہی سے معلوم ہوتا ہے لکھا ہوا دیکھ کر معلوم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ کتابت میں سب متصل ہیں۔ اس سے ان کا مقطع سمجھنا دشوار ہے۔

اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا۔ میرے چھوٹے بھائی ایک دفعہ ریل میں سفر کر رہے تھے۔ اس درجہ میں ایک انگریز بھی سوار تھا۔ بھائی کے ہاتھ میں ایک حمائل شریف تھی جو ٹائپ کی چھپی ہوئی تھی۔ صاحب بہادر بولے کہ میں اس کو دیکھ سکتا ہوں؟ بھائی نے کہا کہ ادب و تعظیم کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں کیونکہ یہ ہماری آسمانی کتاب ہے۔ انگریز نے رومال ہاتھ پر رکھ کر کہا کہ میں اس کو ہاتھ نہ لگاؤں گا رومال سے پکڑوں گا۔ بھائی نے حمائل اس کے ہاتھ میں دے دی۔ اس نے رومال سے اس کو کھولا تو اول ہی آلر نکلا۔ ٹائپ میں ر کا سرا ذرا مڑا ہوا تھا جس پر و کا شبہ

www.arifhaq.org

ہوسکتا تھا۔ اس لئے صاحب کہتے ہیں کہ یہ کیا ہے آلو؟ بھائی نے حمائل لے لی اور کہا، آپ اس کتاب کو بدون ہم سے سیکھے ہوئے پڑھ نہیں سکتے۔ (یہ بھی قرآن کی خصوصیت ہے کہ اس کو بدون مسلمانوں سے سیکھے ہوئے کوئی قوم از خود صحیح طور پر پڑھ بھی نہیں سکتی سمجھنا تو در کنار ۱۲)۔

غرض ان دونوں آیتوں میں ایک مابہ الاشتراک تو یہ تھا کہ دونوں حروف مقطعات سے شروع ہوئی ہیں۔ دوسرا مابہ الاشتراک یہ بھی ہے کہ ان دونوں میں مذکور ہے۔ صرف اتنا تفاوت ہے کہ ایک جگہ کتاب کا لفظ مقدم ہے قرآن موخر اور دوسری جگہ لفظ قرآن مقدم ہے کتاب موخر ہے نیز ایک جگہ قرآن منکّر ہے دوسری جگہ معرّف اور کتاب بھی ایسی ہی ہے۔ اور مجھے مضمون میں دونوں سے امداد لینا تھا اس لئے دونوں کو ساتھ ساتھ تلاوت کیا گیا۔

مسلمانوں کی قسمیں

اجمالاً اس مضمون کا پتہ یہ ہے کہ ان آیتوں میں قرآن کے دو لقب مذکور ہیں ایک کتاب (بمعنی قابل کتاب) دوسرے قرآن (بمعنی قابل قرأت) اور دونوں جگہ مبین کی صفت و قید مذکور ہے اور اس کی تفصیل اور اس تقدیم و تاخیر کا فائدہ اور قیود کا مطلب آگے معلوم ہو جائے گا۔ دراصل مجھے اس وقت ایک شبہ کا رفع کرنا مدنظر ہے۔

اور اسی کے لئے میں نے ان آیات کو اختیار کیا ہے اور حقیقت میں وہ شبہ نہیں بلکہ غلطی ہے۔ کیونکہ شبہ تو وہ ہے جس کے لئے کوئی منشاء صحیح ہو اور اس کے لئے کوئی منشا صحیح موجود نہیں، اس لئے وہ غلطی ہے منشا نہیں۔ اور اس غلطی میں کم و بیش سب مبتلا ہیں۔ کیونکہ مسلمان دو قسم کے ہیں۔ ایک دنیادار دوسرے دیندار۔ اور دنیادار سے میری مراد وہ ہیں جو عقائد کے اعتبار سے دنیادار ہیں اور دیندار سے مراد بھی وہ ہیں جو عقائد کے اعتبار سے دیندار ہیں۔ گو عمل سے دنیادار پہلے زمانہ میں جب تک نیچریت کا ظہور نہ ہوا تھا ہندوستان میں عقائد کے اعتبار سے مسلمانوں کی یہ دو قسمیں نہ تھیں بلکہ اس وقت عقائد کے اعتبار سے سب دیندار تھے۔ صرف اعمال کے اعتبار سے دینداری اور دنیاداری کا فرق ہوتا تھا۔ افسوس ہماری قسمت کہ ہم ایسے زمانہ میں ہیں جس میں عقائد کے اعتبار سے مسلمانوں کی دو جماعتیں ہو گئیں۔ ایک وہ جن کو عقائد اسلامیہ میں شبہ ہے۔ ایک وہ جن کو عقائد میں کچھ کلام نہیں۔ اس لئے آج بعضے وہ فاسق غنیمت معلوم ہوتے ہیں جن کو عقائد میں کلام نہ ہو بلکہ

عقائد اسلامیہ پر مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں۔ اور بحمد اللہ! ابھی تک کثرت سے اسی جماعت کی ہے جس کے عقائد درست ہیں اور ان میں کچھ شبہ نہیں کرتے۔ کیونکہ تعلیم جدید سے ابھی تک بہت لوگ محروم ہیں۔ اور یہ لفظ نو تعلیم یافتہ جماعت کے محاورہ پر کہہ دیا ورنہ ہم تو ان کو محروم نہیں کہتے بلکہ مرحوم کہتے ہیں کیونکہ ”بھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان“۔

ترقی اور تعلیم جدید

اس ترقی اور تعلیم کو لے کر کیا کریں جس سے دین ہی برباد ہونے لگے۔ وہ تو چولہے میں جھونکنے کے قابل ہے۔ اگر معاش کی وجہ سے کسی کو اس تعلیم کی ضرورت ہی ہو، اگرچہ ہم کو ضرورت میں کلام ہے کیونکہ ترقی دنیا جدید تعلیم پر موقوف نہیں، تجارت وغیرہ سے اس سے زیادہ ترقی حاصل ہو سکتی ہے مگر اس نئے طبقہ کو اس کی ضرورت ایسی مسلم ہے کہ اس میں کلام کرنے کو حماقت بتلاتے ہیں۔ تو ہم ان کی خاطر سے ضرورت کو تسلیم کر کے کہتے ہیں کہ بہت اچھا! ہم نے مانا کہ ضروری ہے مگر تم اس تعلیم جدید کو اس طریقے سے حاصل کرو کہ اس سے پہلے عقائد و احکام کا علم حاصل کر لو لیکن یہ یاد رہے کہ ان دینیات کے حاصل کرنے کے لئے وہ مختصر کورس کافی نہیں جس میں راہ نجات وغیرہ دو چار مختصر کتابیں ہیں بلکہ اس کے لئے ایسا کورس تجویز کرنا چاہئے جس سے عقائد و احکام بصیرت کے ساتھ معلوم ہوں اور کچھ اسرار و حکم بھی بتلائے جائیں تا کہ بالاجمال پڑھنے والے کو معلوم ہو جائے کہ ہمارے گھر میں اسرار و حکم بھی ہیں، مصالح عقلیہ کی بھی رعایت ہے اور تمدن و سیاست بھی کامل ہے۔ اجمالاً اتنا معلوم ہو جانا ضروری ہے تا کہ تعلیم جدید سے شبہات پیدا نہ ہوں۔

عظمت خداوندی کا فقدان

باقی تفصیل علم کی ضرورت نہیں کیونکہ رعیت کو علم اسرار کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ اس کی نظیر مشاہد ہے کہ رعایا حکام وقت کے احکام مانتے ہیں علم اسرار کی محتاج نہیں اور اگر کوئی ایسا کرے کہ ہر قانون کی وجہ دریافت کرنے لگے اور یہ کہے کہ بدون وجہ معلوم کئے میں قانون کو نہ مانوں گا تو بھی عقلاً اس کو کلام سے منع کرتے اور بیوقوف بتلاتے ہیں کہ رعیت کا ہر فرد اسرار احکام سلطنت کو معلوم نہیں کر سکتا نہ اس کو اس کے مطالبہ کا حق ہے مگر افسوس!

یہی عقلاء خدا کے سامنے بہادر بنتے اور اسرار کا مطالبہ کرتے ہیں اور بدون ان کے معلوم کئے احکام شرعیہ کو نہیں مانتے اور اگر کوئی ان سے کہے کہ غلام کو احکام میں دریافت اسرار کا حق نہیں تو کہتے ہیں لو صاحب! ہم سے جبراً منوایا جاتا ہے

بہ بیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

(اس راہ میں فرق تو دیکھو کہ کہاں سے کہاں تک ہے)

اصل یہ ہے کہ عظمت کے ہوتے ہوئے قوانین میں شبہ اور کلام نہیں ہوا کرتا۔ حکام وقت کی ان کے دل میں عظمت ہے۔ اس لئے ان کے قوانین میں کلام نہیں کرتے۔ چنانچہ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وکلاء نے یہ قوانین گھڑ لئے ہیں۔ اور خدا کی عظمت دل میں ہے نہیں، اس لئے حکام الٰہیہ میں ان کو شبہ رہتا ہے۔ اور اسی لئے علماء پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے یہ مسائل گھڑ لئے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر اس وقت کے علماء نے اپنے مطلب کے مسائل گھڑ لئے ہیں تو کیا شرح وقایہ و ہدایہ وغیرہ میں بھی یہ مسائل یہی لوگ لکھ کر آئے ہیں۔

www.qlehaq.org

صاحبو! یہ کتابیں تو ہم سے صدیوں پہلے کی ہیں اور اگر کہو کہ صاحب ہدایہ اور شارح وقایہ نے یہ مسائل گھڑے ہیں تو بتلاؤ حدیث میں کون لکھ آیا اور اگر حدیث بھی راویوں نے گھڑی ہے تو قرآن میں کون لکھ آیا کیونکہ مسائل و عقائد تو قرآن سے بھی صاف صاف ثابت ہوتے ہیں۔

اسرار احکام الٰہی

غرض جس طرح رعایا کے ہر فرد کو احکام سلطنت کے اسرار کا علم ضروری نہیں، اسی طرح ہر شخص کو احکام الٰہیہ کے اسرار کا جاننا ضروری نہیں اور جس طرح بدون علم اسزار کے احکام سلطنت کا ماننا جبر نہیں اسی طرح یہاں بھی جبر نہیں۔ اور اگر یہاں جبر ہے تو احکام سلطنت کا بدون اسرار بتلائے منوانا یقیناً جبر ہوگا۔ اور اگر جبراً احکام کو کسی حکم کا منوانا جائز ہے تو احکام الٰہیہ تو ضرور ماننے کے قابل ہیں کیونکہ وہ ایسی ذات کے احکام ہیں جس کے سامنے احکام تکوینیہ میں سلاطین عالم بھی مجبور ہیں دوسروں کے احکام چاہے ماننے کے قابل ہوں یا نہ ہوں۔ مگر افسوس آج کل احکام الٰہیہ کی وقعت نہیں۔ ہاں احکام سلطنت کی بڑی وقعت ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ دینیات کا کورس علماء سے پوچھ کر مقرر کیا جائے تاکہ وہ ایسا کورس مقرر

کریں جس سے شریعت کی عظمت قلب میں جم جائے اور عقائد اسلامیہ ایسے راسخ ہو جائیں کہ پہاڑ کے ہلائے بھی نہ ہلیں۔ اور اجمالاً اس کے پڑھنے والے کو اسرار کا علم بھی حاصل ہو جائے تاکہ اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ علماء کے پاس احکام کے اسرار و مصالح عقلیہ بھی ہیں تو اس نصاب کے بعد یہ ان سے رجوع کریں۔ اور اب تو غضب یہ ہے کہ نو تعلیم یافتہ جماعت نے یہ سمجھ لیا ہے کہ علماء کے پاس سوائے نقل کے کچھ نہیں اس لئے اسرار میں یہ ان سے رجوع نہیں کرتے۔ پس ایک کام تو یہ ضروری ہے جو تعلیم جدید سے پہلے ہونا چاہیے۔

صحبت علماء کی ضرورت

دوسرے اس کی ضرورت ہے کہ تعلیم جدید حاصل کرنے والے بچوں کو علماء کی صحبت میں بٹھلاؤ۔ تعطیل کے زمانے میں کچھ دنوں کیلئے ان کو بزرگان دین کے پاس بھیجا کرو۔ نیز فرصت کے اوقات میں ان کو علماء شریعت کی کتابیں دیکھنے کی تاکید کرو اور غیر علماء کی کتابیں دیکھنے سے منع کرو کیونکہ غیر علماء کی کتابیں ان کی نظر سے گزارنا بھی جرم ہے جیسا کہ کوئی شخص باغیانہ کتابیں اپنے گھر میں رکھے۔ ظاہر ہے کہ قانون سلطنت کی رو سے یہ بڑا جرم ہے اور حکومت ایسے شخص کو سخت سزا دے گی۔ مگر حیرت ہے کہ جس بات کو یہ عقلا دنیوی قوانین میں جرم مانتے ہیں شریعت کے قوانین میں اس سے روکنے کو تعصب بتلاتے ہیں۔

اگر غیر علماء کی کتاب دیکھنے سے روکنا تعصب ہے تو اہل سلطنت کے اس قانون کو بھی تعصب کہنا چاہیے کہ باغیانہ کتابوں کا رکھنا جرم ہے مگر اس کو سب عقلاء ضروری اور صحیح قانون سمجھتے ہیں۔ اس لئے کوئی سلطنت ایسی نہیں جس نے باغیانہ کتابوں کے مطالعہ کو اور گھر میں رکھنے کو جرم قرار نہ دیا ہو۔ پھر تم جو علماء پر تعصب کا الزام لگاتے ہو تو یہ بھی تو سوچو کہ علماء کی اس قانون میں ذاتی کیا غرض ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کی اس میں کچھ غرض نہیں بلکہ غرض تو عوام کی موافقت میں ہے اور جن مسائل سے عوام متوحش ہوں اور علماء پر الزام لگائیں، اس میں کیا غرض ہو سکتی ہے۔ اور یہیں سے سمجھ لو کہ عالم حقانی وہی ہے جو تمہاری مرضی کے موافق فتویٰ نہ دے کیونکہ جو مرضی کے موافق فتویٰ دیا کرے، اس میں غرض کا قوی شبہ ہے کہ وہ عوام کو اپنے سے مانوس کرنا چاہتا ہے۔ اور جو شخص کسی کی مرضی کی رعایت نہ کرے سمجھ لو کہ وہ صحیح احکام بیان کرتا ہے۔ طبیب اگر تلخ دوا دے تو بتلاؤ اس میں اس کی

کیا مصلحت ہے، یقیناً کچھ نہیں بلکہ سراسر مریض کی مصلحت ہے۔ پس جو علماء ایسی باتوں سے منع کرتے ہیں۔ جن میں لوگوں کو مزہ آتا ہے سمجھ لو کہ وہ محض خیر خواہی سے منع کرتے ہیں کیونکہ وہ ان باتوں میں زہریلا اثر مشاہدہ کرتے ہیں۔

واللہ! اہل باطل کی کتابوں کا بعض علماء پر بھی برا اثر ہو جاتا ہے تو عوام کی تو ان کے مطالعہ سے کیا حالت ہوگی۔ لہٰذا عوام کو کوئی کتاب بدون مشورہ علماء کے ہرگز نہ دیکھنا چاہیے۔ اور اگر کوئی یہ کہے کہ میں رد کے لئے دیکھتا ہوں تو یہ بھی مناسب نہیں۔ کیونکہ یہ کام علماء کا ہے تمہارا کام نہیں۔ اور اس میں آپ کی توہین نہیں۔ اگر یہ کہہ دیا جائے کہ یہ کام آپ کا نہیں کیونکہ اگر ایک شخص قانون میں ایل، ایل، بی ہو تو وہ فن انجینئری سے جاہل ہوگا۔ اور ایک انجینئر کو یہ حق ہے کہ اس کو کہہ دے کہ آپ قانون دان ہیں مگر انجینئری سے جاہل ہیں۔ اس لئے اس میں آپ کو دخل دینے کا حق نہیں۔ ایسے ہی میں کہتا ہوں کہ آپ لوگ ان علوم سے جاہل ہیں جن کے رد کرنے میں ضرورت ہے۔ اس لئے آپ کو اس قصد بھی اہل باطل کی کتابوں کا مطالعہ نہیں، اور اگر کسی کو لفظ جاہل ناگوار ہو تو ناواقف کہہ لو۔

ایک نو تعلیم یافتہ نے مجھ سے ایک بار ایک مسئلہ پوچھا تھا۔ میں نے کہا کہ آپ اس مسئلہ کو نہیں سمجھ سکتے ان کو میرا یہ جواب بہت ناگوار ہوا۔ کہنے لگے اس کی کیا وجہ کہ میں اس کو نہیں سمجھ سکتا۔ میں نے کہا وجہ یہ ہے کہ اس کے سمجھنے کے لئے جن مقدمات و مبادی کے جاننے کی ضرورت ہے۔ آپ نے ان کو نہیں جانا اور جس بات کا علم مقدمات و مبادی پر موقوف ہو۔ اس کو بدون ان کے جانے ہوئے سمجھنا دشوار ہے اور اگر آپ اس کا دعویٰ کریں کہ بدون مقدمات و مبادی کے بھی میں سمجھ سکتا ہوں تو پہلے آپ میرے سامنے ایک گھس کھدے کو جس نے اقلیدس کے مقدمات و اصول موضوعہ معلوم نہیں کئے اقلیدس کی کوئی شکل سمجھائیں اور میرے سامنے اس سے تقریر بھی کروائیں تو میں بھی اس مسئلہ کا جواب بدون مقدمات و مبادی کے آپ سمجھا دوں گا۔ اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا خاموش ہو گئے۔

ایک شخص سے میں نے ایسے ہی موقع میں یہ بھی کہا تھا کہ شاید آپ کے دل میں وسوسہ آیا ہو کہ علماء کے پاس میرے سوال کا جواب نہیں اس لئے بہانہ کر کے ٹال دیا۔ تو اب آپ یہ کیجئے کہ سامنے درس گاہ میں جو مدرس پڑھا رہے ہیں ان سے اپنا سوال بیان کر دیجئے اور کہئے

کہ وہ اس کا جواب مجھ سے دریافت کریں۔ میں ان کے سامنے جواب بیان کر دوں گا کیونکہ وہ اس کے مقدمات ومبادی سے واقف ہیں۔ اس سے آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ علماء کے پاس آپ کے سوال کا جواب ہے اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ آپ اس کا جواب کو نہیں سمجھ سکتے کیونکہ آپ اس کے مقدمات سے جاہل ہیں اور جس کو مقدمات کا علم ہے وہ سمجھ جائے گا۔ چنانچہ میں آپ کے سامنے اس مدرس سے بھی جواب کی تقریر کرادوں گا۔ اور اگر وہ ایسا کرتے تو بہت جلدی اقرار کر لیتے کہ واقعی میں اس سوال کا اہل نہ تھا۔

تو صاحبو! ہر شخص ہر بات کے سمجھنے کا اہل نہیں ہوتا۔ اس لئے آپ تقلیداً مان لیجئے کہ مخالفین کا رد کرنا آپ کا کام نہیں۔ اس لئے آپ کو غیر مذہب والوں کی کتابیں اور ان مسلمانوں کی بھی کتابیں جن کو دین سے مس نہیں ہرگز نہ دیکھنا چاہیے۔

یہ محض آپ کی خیر خواہی کے لئے میں کہہ رہا ہوں تاکہ آپ کا دین سلامت رہے جو ہر مسلمان کو جان سے زیادہ عزیز ہے۔ آگے آپ جانیں آپ کا کام۔

حصول تعلیم جدید کا طریق

پس تعلیم جدید حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اول اپنے مذہب کی تعلیم حاصل کرو۔ کسی عالم کے مشورہ سے کورس مقرر کرو۔

دوسرے علماء کی صحبت میں آمدورفت رکھو۔

تیسرے غیر جنس کی کتابوں سے احتراز رکھو اور علماء حقانی کی کتابیں مطالعہ میں رکھو۔ اس کے بعد تعلیم جدید حاصل کرنے کا مضائقہ نہیں۔ اور یہ جب ہے کہ تعلیم جدید کی ضرورت مان لی جائے۔ اور میں نے آپ کی خاطر سے اس کو مان کر یہ طریقہ بتلا دیا ہے۔ ورنہ علماء کا مذاق اس سے مختلف ہے آپ کو ایسے علماء بھی ملیں گے جو اس کی ضرورت ہی کو نہیں مانتے اور دلائل سے آپ کو ساکت کر سکتے ہیں مگر میرا یہ مذاق ہے کہ میں منازعت ومناظرہ سے نہیں کیا کرتا۔ اس لئے میں نے اس تعلیم کی ضرورت کو آپ کی خاطر سے تسلیم کر کے اس کی اصلاح کر دی ہے جیسا کہ طبیب مریض کو بیگن سے منع کرے اور مریض نہ مانے تو بعض طبیب تو اس حالت میں مریض سے جھگڑنے لگتے ہیں اور غصہ ظاہر کرنے لگتے

ہیں اور بعض شفیق طبیب ایسے بھی ہیں جو بیگن کی اصلاح کر کے اجازت دے دیتے ہیں کہ اچھا اس کے اندر دہی اور پالک ڈال دینا اور کھالینا۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ بحمد اللہ! زیادہ مسلمان تو ایسے ہی ہیں جو عقائد میں شبہات سے پاک ہیں کیونکہ وہ تعلیم جدید کے اثر سے محفوظ ہیں اور تھوڑے سے ایسے ہیں جو تعلیم جدید سے متاثر ہو کر شبہات میں مبتلا ہیں اور ان کی صحبت میں بیٹھنے سے عوام پر بھی کچھ اثر ہونے لگا ہے۔ اس لئے اس کی روک تھام ضروری ہے اور اگر اس کی اصلاح نہ کی گئی، تو مفسدہ عظیمہ کا اندیشہ ہے۔

دینی اور دنیوی منافع کا تفاوت

تو میں اس وقت اس دوسری جماعت کے ایک شبہ کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ وہ شبہ یہ ہے جو دلوں میں تو بہت لوگوں کے پہلے سے ہے مگر اب بعض کی زبان پر بھی آنے لگا ہے کہ اس حالت میں قرآن کے پڑھنے سے کیا نفع جب ہم اس کو سمجھتے ہی نہیں اور بعضے اس عنوان سے اس کو بیان کرتے ہیں کہ بچوں کو طوطے کی طرح قرآن کو رٹانے سے کیا فائدہ وہ سمجھتے ہی نہیں؟ بات یہ ہے کہ قرآن کے پڑھنے میں جو فائدہ ہے اس سے یہ لوگ واقف نہیں۔ اگر فائدہ سے واقف ہو جاتے تو اس کے لئے کوشش کرتے۔ جیسا کہ تجارت کرنے والے آج کل کاندھلہ جا کر آم لاتے ہیں اور اس میں بڑی بڑی مشقتیں برداشت کرتے ہیں کیونکہ اس کے نفع سے واقف ہیں کہ ایک روپیہ کے دو ہو جائیں گے۔ دنیا کے کاموں میں تو لوگوں کی یہ حالت ہے کہ جب کسی تجربہ کار سے یہ معلوم کر لیا کہ فلاں چیز کی تجارت سے بہت نفع ہے تو اس کے قول پر اعتماد کر کے وہ تجارت شروع کر دیتے ہیں اور اگر ایک دو بار نقصان بھی ہو جائے تو ہمت نہیں ہارتے بلکہ پھر وہی کام کرتے ہیں۔ چنانچہ آم والوں کو بعض دفعہ خسارہ بھی ہوتا ہے مگر خسارہ والا پھر وہی کام کرتا ہے اور اگر خسارہ بھی نہ ہو بلکہ برابر معاملہ رہتا ہو کہ نہ نفع ہے نہ نقصان، جب تو اس تجارت کو چھوڑ ہی نہیں سکتے اور یوں کہتے ہیں کہ تجارت میں یہ بھی ایک قسم کی کامیابی ہے کہ نقصان نہ ہو۔ دوسرے اب نفع نہیں ہوا تو آئندہ تو امید ہے بلکہ خسارہ بھی ہو تب بھی اس امید نفع کو نفع سمجھا جاتا ہے۔

مگر افسوس! دین میں معلوم نہیں یہ اصول کہاں گئے۔ صاحبو! کیا یہ حیرت نہیں کہ دنیا کے

کاروبار میں تو نقصان نہ ہونے کو بھی کامیابی سمجھا جاتا ہے اور دین کے کام میں نفع کی تاخیر کو بھی کامیابی نہیں سمجھا جاتا۔ زراعت، تجارت، ملازمت، سب میں کبھی نفع ہوتا ہے کبھی نہیں اور بعض دفعہ نقصان بھی ہو جاتا ہے مگر ان کو کیوں کر چھوڑ دیں۔ وہاں تو تجربہ کاروں کا قول ہے کہ ان کاموں میں فائدہ ہے۔ گو ہمیشہ نہیں اکثر ہی ہو اور گو عاجل نہ ہو، موخر ہی ہو۔ مگر افسوس! کیا خدا اور رسول کا قول ان تجربہ کاروں کے قول سے بھی کم ہو گیا، جو صاف صاف قرآن کے منافع بیان کر چکے ہیں۔ پھر وہ بھی ہر حالت میں خواہ سمجھ کر پڑھو یا بدون سمجھے پڑھو۔

غرض پرستی و نفس پرستی

اور میں واللہ بقسم کہتا ہوں کہ جو لوگ یہ شبہ کرتے ہیں کہ جب ہم سمجھتے نہیں تو قرآن کے پڑھنے سے کیا فائدہ، یہ محض حظ نفس کے بندے ہیں۔ ان کو عقل سے ذرا مس نہیں گو دعوی بہت کرتے ہیں اگر یہ عقل کے بندے ہوتے تو ایسی بے عقلی کی بات نہ کہتے۔ کیونکہ عقلی قواعد میں یہ نہیں ہوا کرتا کہ ایک دلیل سے ضد شی اور عین شی دونوں پر استدلال ہو سکے۔ اگر یہ شبہ عقلی ہوتا کہ جب معانی نہ سمجھے تو الفاظ سے کیا فائدہ، تو بتلایئے اس قاعدہ عقلیہ سے کیا ثابت ہوتا۔ آیا یہ کہ الفاظ کو چھوڑ دو یا یہ کہ محض الفاظ پر اکتفا نہ کرو بلکہ معانی بھی حاصل کرو۔ ظاہر ہے کہ اس سے الفاظ کے چھوڑنے پر دلالت نہیں کیونکہ جب معانی کی ضرورت اس قاعدہ میں مسلم ہے اور معانی الفاظ کے تابع ہیں اور ضروری کا موقوف علیہ ضروری ہوتا ہے تو اس سے تو خود علم الفاظ کی ضرورت پر دلالت ہو رہی ہے۔ اگر وہ یہ کہیں کہ ہاں ہم الفاظ کی ضرورت تسلیم کرتے ہیں مگر ان کو اس وقت حاصل کرنا چاہیے۔ جب کہ معانی کی فہم بھی ساتھ ساتھ حاصل ہو سکے تو ہم کہتے ہیں کہ آپ کی یہ تاویل اس وقت چل سکتی تھی جب کہ ہم دیکھتے کہ تم اپنے بچوں کو بچپن میں تو قرآن نہ پڑھاتے کیونکہ اس وقت سمجھیں گے نہیں بلکہ بڑے ہو کر پڑھاتے کہ اس وقت سمجھیں گے، مگر تمہاری حالت تو یہ ہے کہ تم نہ بچپن میں پڑھاتے ہو نہ بڑے ہو کر۔ تو معلوم ہوا کہ تم اس قاعدہ سے علی الاطلاق خود عدم ضرورت الفاظ پر بھی استدلال کرنا چاہتے ہو اور یہ وہی بات ہے کہ دلیل سے ضد شی پر استدلال کیا گیا ہے۔ حالانکہ وہ عین شی کو بھی مثبت ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ قاعدہ عقلیہ نہیں۔

اس لئے میں کہتا ہوں کہ اس کا منشا محض نفس پرستی ہے۔ ان لوگوں نے اس قضیہ کو غرض پرستی کا ایک بہانہ بنالیا ہے۔ اور دل میں ان کے یہ ہے کہ نہ قرآن کے الفاظ کی ضرورت ہے نہ معانی کی۔ گو زبان سے معانی کی ضرورت ظاہر کرتے ہیں۔ مگر ان کا عمل بتلاتا ہے کہ وہ کسی کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ورنہ کسی وقت تو قرآن کو معانی ہی کے ساتھ حاصل کرتے اور اپنے بچوں کو اس کی تعلیم دلاتے۔ جب عمل یہ ہے تو اب زبان سے معانی کی اہمیت ظاہر کرنا مخلوق کو دھوکا دینا ہے۔ مگر خدا کو کس طرح دھوکا دے لوگے جو علیم بذات الصدور ہے وہ تو تمہاری دل کی حالت کو خوب جانتا ہے کہ تم خود قرآن کی تعلیم ہی کو مطلقاً بے فائدہ سمجھتے ہو۔ خواہ محض الفاظ ہوں یا معانی کے ساتھ ہوں ؎

خلق راگیر کہ بفریبی تمام　　در غلط اندازی ناہر خاص و عام
کارہا باخلق آری جملہ راست　　باخدا تزویر وحیلہ کے رواست
کارہا اوراست باید داشتن　　رایت اخلاص وصدق افراشتن

(میں نے مان ہی لیا، اگر تو نے ساری مخلوق کو دھوکہ دے ہی دیا مگر خدا تعالیٰ کو کہاں دھوکہ دے سکتا ہے، مخلوق کے ساتھ تیرے سب کام درست ہیں، خدا تعالیٰ کے ساتھ مکر وحیلہ کب جائز ہے، حق تعالیٰ کے ساتھ تو سب کام درست رکھنے چاہئیں۔ اخلاص اور سچائی کا علم بلند کرنا چاہیے)

خدا کے ساتھ دھوکہ نہیں چل سکتا۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

ترسم کہ صرفہ نبر د روز بازخواست　　نان حلال شیخ زآب حرام ما

یعنی مجھے اندیشہ ہے کہیں ہمارا آب حرام شیخ کے نان حلال سے قیامت میں بڑھ نہ جائے کیونکہ وہ مخلوق کو دھوکا دینے کے لئے تقوی اور بزرگی کی صورت بناتا ہے اور ہم اپنے کو قصوروار سمجھ کر گناہ میں مبتلا ہیں اور خدا کے یہاں دھوکا چل نہیں سکتا۔ اس لئے اندیشہ ہے کہیں ریاکار مشائخ کا ریا ہماری رندی سے گھٹ نہ جائے۔ اسی طرح میں کہتا ہوں کہ فاسق مسلمان جو اپنے کو گنہگار سمجھتے ہیں ان مہذب لوگوں سے اچھے پڑ رہیں گے جو عقائدہ اسلام میں شبہات نکالتے ہیں اور عقل سے شریعت کا مقابلہ کرتے ہیں۔

قرآن خوانی سے گریز کا حیلہ

چونکہ یہ لوگ ظاہر میں مسلمان ہیں، اس لئے زبان سے یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ قرآن

پڑھنے کو مطلقاً ہمارا جی نہیں چاہتا اور نہ کفر کا فتوی لگ جائے گا۔ اس لئے یہ قاعدہ غرض نفس کے موافق گھڑ لیا کہ جب معانی نہیں سمجھتے تو الفاظ سے کیا نفع! اس کا جواب بس یہی ہے کہ بہت اچھا! آپ اپنے بچوں کو معانی ہی کے ساتھ قرآن پڑھایئے اور ان کو ابتداء ہی سے عربی کی تعلیم صرف ونحو کی دیجئے۔ مگر اس سے تو اور بھی خون خشک ہو جائے گا۔ کیونکہ وہ تو الفاظ کو ٹال کر معانی سے بھی سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔ یہ کیسی الٹی پڑی۔ صرف ونحو بھی گلے پڑ گئی۔ مگر جو شخص الفاظ کو بدون معانی کے بے فائدہ کہے اور صرف معانی ہی کی ضرورت کا قائل ہو اس کو یقیناً ضروری کی تحصیل پر مجبور کیا جائے گا۔

صاحبو! ظاہر میں یہ قضیہ کہ بدون سمجھے الفاظ سے کیا فائدہ، پر مغز معلوم ہوتا ہے۔ مگر دراصل ان لوگوں نے مغز اسلام کا نکال دیا ہے ان میں سے بعضوں نے تحصیل معانی کی بھی کوشش کی، مگر وہ اس کا مصداق تھی۔

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی	تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

انہوں نے معانی حاصل کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ ترجمہ قرآن کا مطالعہ کر لیا۔ مگر یہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص خوان نعت سے گلگلے پکانا سیکھے۔ کیونکہ اس میں سب کھانوں کی ترکیب لکھ دی ہے۔ مگر اس سے آٹا گوندھنے کا طریقہ اور پانی کھپانے کی ترکیب اور آنچ کا اندازہ کیسے معلوم ہو گا۔ نیز اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک صاحب نے ''ض'' کے بارہ میں مجھ سے تحریراً سوال کیا تھا کہ ''ض'' کا مخرج کہاں سے ہے۔ اور اس میں اور ''ظا'' میں فرق کیونکر ہوتا ہے۔ میں نے لکھ دیا کہ یہ بات خط سے نہیں معلوم ہو سکتی کیونکہ

گر مصور صورت آں دلستاں خواہد کشید ☆ لیک حیرانم کہ نازش را چساں خواہد کشید

(اگر مصور اس محبوب کی تصویر بنائے لیکن میں حیران ہوں کہ اسکی ناز و ادا کو کیسے چسپاں کرے گا)

اس کو کسی ماہر تجوید سے زبانی سن کر سمجھ سکتے ہو۔

تو حضرت بعض باتیں ایسی ہیں جو مطالعہ سے حاصل نہیں ہو سکتیں بلکہ ان کے لئے استاد کی ضرورت ہے۔ کیونکہ بعض باتیں سینہ بسینہ ہوتی ہیں۔ اس میں کچھ تصوف اور سلوک ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ ہر علم میں ایک بات ایسی ہوتی ہے جو سینہ بسینہ ہے کہ صرف استاد سے حاصل ہوتی ہے۔

خوبی ہمیں کرشمہ ناز وخرام نیست ☆ بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

(خوبی ناز وخرام کے کرشمہ کا نام نہیں ہے محبوبوں میں بہت ادائیں ہیں کہ ان کا نام نہیں ہے کیونکہ وہ ذاتی ہیں جن کا نام نہیں بتایا جا سکتا)

پھر قرآن ہی اتنا سستا کیوں ہو گیا کہ اس کا مطلب بدون استاد کے سمجھ میں آ جائے گا۔ آج کل تعزیرات ہند کا ترجمہ اردو میں ہو گیا ہے۔ ذرا کوئی اس ترجمہ کو دیکھ کر مطلب صحیح تو بیان کر دے۔ یقیناً بہت جگہ غلطی کرے گا۔ اسی طرح کیمیا کی کتابیں اردو میں ہو گئی ہیں۔ کوئی ان کو دیکھ کر کیمیا تو بنا لے۔ کبھی نہیں بنا سکتا۔ پس معانی قرآن حاصل کرنے کا یہ طریقہ نہیں کہ ترجمہ دیکھ لیا جائے۔ ترجمہ قرآن اگر دیکھو تو صرف ونحو اور قدرے فقہ کے بعد دیکھو۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم اردو ترجمہ کسی عالم سے تو سبقاً سبقاً پڑھ لو۔

معانی کا محل

سو ایک جماعت تو یہ تھی جس کے عقائد تعلیم جدید کی وجہ سے خراب ہو گئے ہیں اور ایک جماعت عوام کی ہے۔ ان کا عقیدہ یہ تو نہیں کہ بدون معانی کے قرآن پڑھنے سے کیا فائدہ مگر اس کے اثر لئے ہوئے ہیں۔ کہ قرآن کے پڑھنے میں کوشش نہیں کرتے۔ سو یہ لوگ دوسرے رنگ میں اس غلطی میں مبتلا ہیں۔ اس لیے اس وقت میں اس غلطی کو رفع کرنا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اول الٓرٰ فرمایا ہے۔ یہ تو حروف مقطعات ہیں جن کے معنی ہم کو معلوم نہیں۔ گو بقول بعض محققین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھے۔ لیکن امت کو نہیں بتلائے گئے۔ مگر میں ان سے بھی اپنے مقصود میں کام لوں گا۔ گو سامعین کو تعجب ہو گا کہ جب معنی ہی معلوم نہیں تو اس سے مضمون کو کس طرح ثابت کیا جائیگا لیکن یہ تعجب میری تقریر کے بعد مرتفع ہو جائے گا۔ ابھی میں آیتوں کا ترجمہ بیان کر دوں اس کے بعد ان حروف سے مدعا ثابت کروں گا تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ①

یہ آیات کتاب اور قرآن مبین کی ہیں

یہی ترجمہ دوسری آیت کا ہے۔ صرف کتاب وقرآن میں تقدیم وتاخیر کا فرق ہے تو اس جگہ آیات کے دو لقب بیان کئے گئے ہیں۔ ایک قرآن۔ دوسرے کتاب۔ قرآن کے

معنی ہیں ما یقرا یعنی پڑھنے کی چیز اور کتاب کے معنی ہیں ما یکتب یعنی لکھنے کی چیز۔ اور ظاہر ہے کہ پڑھنے اور لکھنے کی چیز کیا ہے۔ الفاظ ہی تو ہیں معانی کو کون پڑھ سکتا ہے یا کون لکھ سکتا ہے اور ایک مضمون ابھی ذہن میں آیا ہے جو شروع میں نہ آیا تھا۔ اب تک تو ذہن میں یہ بات تھی کہ الفاظ ہی پڑھنے لکھنے کی چیز ہیں۔ معانی کو پڑھ لکھ نہیں سکتے۔

اس پر ایک لطیفہ یاد آیا کہ نحوییین نے کہا ہے کہ ضرب میں ضمیر ہو مستتر ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ظاہر میں ضمیر مذکور نہیں لیکن سمجھنے میں آتی ہے مگر ایک طالب علم یہ سمجھے کہ ضرب کے اندر ضمیر ہو چھپی ہوئی بیٹھی ہے۔ تو آپ نے ضرب کو چھیلنا شروع کیا، یہاں تک کہ کاغذ پھٹ گیا اور اتفاق سے دوسرے ورق میں اسی جگہ ہو لکھا ہوا تھا۔ یہ بڑے خوش ہوئے کہ واقعی استاد نے ٹھیک کہا تھا کہ اس کے اندر ہو پوشیدہ ہے۔ دیکھو چھیلنے سے نکل آیا۔ پھر دوڑے ہوئے استاد کے پاس آئے کہ دیکھئے میں نے ضرب کو چھیلا تھا یہ ہُو نکل آیا جو اس میں چھپا ہوا تھا۔ استاد بہت ہنسے اور ان کو مطلب دوبارہ سمجھایا۔

غرض یہ طالب علم یوں سمجھا تھا کہ معانی بھی کتابت میں آسکتے تھے مگر یہ اس کی غلطی ہے۔ معانی قرأت وکتابت میں نہیں آسکتے۔ ان کا محل صرف ذہن ہے۔ لوگ بے تار کی خبر پر تعجب کرتے ہیں مگر خدا تعالیٰ نے اس کو پہلے سے پیدا کر رکھا ہے کیونکہ الفاظ سے معانی کا سمجھنا یہ بے تار کے ہی تو خبر ہے کیونکہ معنی کا مرکز قلب ہے اور جہاں الفاظ کسی کی زبان سے نکلے معاً وہاں معانی سمجھے گئے۔

غرض ان آیتوں میں اشارہ کیا بلکہ صراحت ہے کہ قرآن کے ساتھ پڑھنے میں تعلق رکھو۔ کیونکہ لفظ قرآن کے معنی یہی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ قرأت الفاظ ہی کی ہوتی ہے نہ کہ معانی کی۔ دوسری صفت اس جگہ کتاب ہے جس کے معنی لکھنے کی چیز ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ الفاظ قرآن کے ساتھ قرأت کے علاوہ ضبط وکتابت کا بھی تعلق رکھنا چاہیے۔

سو اب تک تو صرف یہی بات ذہن میں تھی اور دوسری جو بات اسی وقت ذہن میں آئی یہ ہے کہ کتاب کا مصداق حقیقۃً نہ الفاظ ہیں نہ معانی کیونکہ الفاظ تو زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ ان کا محل زبان ہے لفظ کے معنی لغت میں پھینکنے کے ہیں۔ چونکہ الفاظ زبان سے پھینکے جاتے یعنی نکالے جاتے ہیں اس لئے ان کو الفاظ کہا جاتا ہے۔ اور معانی کا محل صرف ذہن ہے۔ وہ

تو کتاب کا مصداق کسی طرح ہے ہی نہیں بلکہ اس کا مصداق دوسری چیز ہے یعنی نقوش جن کو عوام کرم کانٹے کہتے ہیں۔ کیونکہ ان پڑھ آدمی لکھا ہوا پڑھ نہیں سکتا نہ سمجھ سکتا ہے۔ اس لئے وہ ان کو کرم کانٹے کہتے ہیں مگر کتاب کا مصداق مطلق نقوش نہیں بلکہ وضعی نقوش ہیں جیسا کہ الفاظ کی دلالت معانی پر وضعی ہے طبعی نہیں۔ کیونکہ غیر اہل زبان اس کو نہیں سمجھ سکتا۔ اسی طرح نقوش بھی وضعی ہیں اور ان کی دلالت بھی الفاظ پر وضعی ہے۔ اسی لئے پڑھے ہوئے آدمی ان کو سمجھتے ہیں ان پڑھ نہیں سمجھ سکتے۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ کتاب کا حقیقی مصداق نقوش ہیں تو آپ تو الفاظ ہی کو غیر مقصود بتلاتے تھے اور قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوا کہ نقوش قرآن بھی قابل حفاظت و مستحق تعظیم ہیں۔ یہ تو الٹی پڑی کہ گئے تھے نماز بخشوانے، روزے بھی گلے پڑ گئے۔

مگر صاحبو! یہ گلے نہیں پڑے۔ کیونکہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی بادشاہ کسی شخص کو اشرفیاں اور جواہرات دے کر اس سے کہے کہ اس کو حفاظت سے رکھو۔ قفل اور تالا لگاؤ۔ اگر اس شخص کو روپیہ اور جواہرات کی قدر معلوم ہے تو اس حکم کی قدر کرے گا اور کہے گا

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی ☆ مرا با جان جاں ہمراز کردی

(اللہ تعالیٰ تجھے جزا دے کہ تو نے میری آنکھیں کھول دیں اور مجھ کو محبوب حقیقی کے ساتھ ہمراز کر دیا)

اور جس کو روپیہ کی قدر نہ ہوگی وہ کہے گا کہ یہ اچھی بلا میرے سر پڑی کہ حفاظت کرو اور قفل لگاؤ۔

اسی طرح جو لوگ معانی کی قدر کرتے ہیں وہ ان الفاظ و نقوش کی بھی قدر کریں گے کیونکہ یہ انہی کی حفاظت کا سامان ہے اور جو قدر نہیں کرتے وہ اس کو سر پڑی بلا سمجھیں گے۔ پس معلوم ہوا کہ جو نو تعلیم یافتہ الفاظ قرآن کے پڑھنے کو بے فائدہ سمجھتے ہیں۔ در حقیقت وہ معانی قرآن کی قدر نہیں کرتے ورنہ اس کی حفاظت کے ہر سامان کی ان کو قدر ہوتی۔

الفاظ قرآن کی حفاظت

صاحبو! الفاظ قرآن کو اس کی حفاظت میں بہت بڑا دخل ہے کیونکہ الفاظ قرآن کا یہ معجزہ ہے کہ وہ نہایت سہولت سے حفظ ہو جاتے ہیں کہ اگر خدانخواستہ! خدانخواستہ! یہ لکھے ہوئے مصاحف گم ہو جائیں تو ایک بچہ حافظ قرآن اپنی یاد سے اس کو دوبارہ لکھوا سکتا ہے، بڑوں کا تو کیا ذکر!

مظفر نگر کا واقعہ ہے کہ وہاں ایک واعظ نے قرآن کے اس معجزہ کو ظاہر کرنا چاہا تو درمیان وعظ میں ایک آیت پڑھ کر اٹک گئے اور مجمع کو خطاب کر کے کہا کہ اس مجمع میں جس قدر حفاظ موجود ہوں چھوٹے بڑے سب کھڑے ہو جائیں مجھے ایک آیت میں شبہ ہو گیا ہے اس کو حل کرنا چاہتا ہوں۔ تو چاروں طرف سے بہت سے آدمی کھڑے ہو گئے جن میں بچے بھی تھے جوان بھی اور بوڑھے بھی تھے ادھیڑ عمر بھی۔ یہ دیکھ کر واعظ نے کہا، الحمد للہ صاحبو! مجھ کو آیت میں شبہ نہیں ہوا تھا۔ مجھے صرف یہ دکھلانا تھا کہ اس مجمع میں جس کے اندر حفاظ کو بالقصد جمع نہیں کیا گیا۔ یوں ہی کیف ما اتفق یہ سب مجمع آ گیا ہے، اس قدر حفاظ قرآن موجود ہیں۔ اب قیاس کرو کہ سارے شہر میں کتنے حافظ ہوں گے۔ پھر یہ اندازہ کرو کہ پورے ضلع میں کتنے ہوں گے۔ پھر سوچو کہ سارے ہندوستان میں کتنے ہوں گے اور دنیا بھر میں کتنے ہوں گے!!!

صاحبو! یہ قرآن کا معجزہ نہیں تو کیا ہے کہ اس زمانہ میں جب کہ قرآن کی طرف رغبت کا کوئی سامان نہیں نہ اس کے حفظ کرنے والوں کو کوئی بڑا عہدہ ملتا ہے بلکہ زیادہ تر امراء کی توجہ انگریزی پڑھنے کی طرف ہے اور کفار قرآن مٹانے کی کوشش کرتے ہیں، اس قدر حفاظ موجود ہیں کہ بچے بھی حافظ ہیں اور مرد بھی اور بعض قصبات میں عورتیں بھی حافظ ہیں۔ چنانچہ قصبہ پانی پت میں بہت عورتیں حافظ ہیں اور بعضی تو سبعہ قراءت کی حافظ ہیں۔

صاحبو! میں نہایت آزادی سے صاف صاف کہوں گا کہ جو لوگ بدون معانی سمجھے الفاظ قرآن کے پڑھنے کو بیکار کہتے ہیں واللہ! وہ حضرت حق تعالیٰ کا مقابلہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن کے حافظ پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ یہ محفوظ رہے اور یہ لوگ دنیا سے حفظ قرآن کو مٹانا چاہتے ہیں کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ حفظ قرآن بچپن ہی میں اچھا ہوتا ہے۔ بڑے ہو کر ویسا حفظ نہیں ہوتا جیسا بچپن میں ہوتا ہے اور بچپن میں بچہ معانی قرآن سمجھنے کے قابل نہیں ہوتا۔ تو اب اگر ان لوگوں کے مشورہ پر بچوں کو قرآن نہ پڑھایا جائے تو اس کا انجام یہی ہے کہ حفظ کا دروازہ بند ہو جائے مگر:

یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ یَاْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۝

(یہ لوگ یوں چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھا دیں حالانکہ اللہ تعالیٰ بغیر اس کے اپنے نور کو پہنچائیں کہ کافر لوگ کیسے ہی ناخوش ہوں)

یہ خدا کے نور کو مٹانا چاہتے ہیں۔ بخدا! یہ خود ہی مٹ جائیں گے اور خدا کا نور ان کے

مٹانے سے نہ مٹے گا۔ یہ لوگ اپنے ایمان کی خیر منائیں یہ ہیں کس ہوا میں۔ خدا کی قسم ان لوگوں کا نام ونشان تک نہ رہے گا۔ یہ بالکل تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

چراغے را کہ ایزد بر فروزد ☆ ہر آں کو تف زند ریشش بسوزد

(جس چراغ کو اللہ تعالیٰ روشن کریں جو شخص اس کے بجھانے لئے پھونک مارے گا اس کا منہ جل جائے گا) انوار نہیں مٹ سکتے اور۔

اگر گیتی سراسر باد گیرد ☆ چراغ مقبلاں ہرگز نمیرد

(سراسر دنیا اگر ہوا ہو جائے، اللہ والوں کا چراغ ہرگز گل نہ ہوگا)

اس عارف نے یہ بات اہل اللہ کے انوار کے متعلق فرمائی ہے۔ تو جب اہل اللہ کے انوار کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتے تو خود اللہ کا نور کس طرح مٹ سکتا ہے۔ بعض اہل اللہ پر ظالموں نے ستم کیا اور ان کو ذلیل کرنا چاہا۔ ان کی قبر پر گوہ ڈلوایا مگر ان کا نام اور ان کے انوار اب تک تاباں اور درخشاں ہیں۔ اور وہ ظالم گم نام اور ناپید ہو گئے۔ کوئی ان کے نام سے بھی واقف نہیں نہ ان کی قبر کا نشان باقی ہے۔ اور اہل اللہ کے مزارات اس وقت تک مرجع الخلائق بنے ہوئے ہیں۔ دوسرے یہ بات مشاہد ہے کہ اہل اللہ اپنے کو خود مٹانا، ناپید کرنا، گمنام کرنا چاہتے ہیں۔ اور اہل ظاہر طرح طرح سے اپنے کو ظاہر کرنا مشہور کرنا چاہتے ہیں۔ مگر اہل اللہ یعنی اہل باطن ہی چمکتے ہیں اور اہل ظاہر کی شہرت چندروزہ ہو کر خاک میں مل جاتی ہے۔ بعض مصنفین نے اپنی کتابوں کے اندر اپنا نام تک ظاہر نہیں کیا مگر کتابیں ان کی مقبول اور متداول ہیں اور اہل ظاہر بڑے اہتمام سے اپنا نام ظاہر کرتے ہیں، مگر ان کی کتابوں کو کوئی بھی نہیں پوچھتا۔ اس پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ ایک شخص نے کسی سے، پوچھا کہ آپ کا نام کیا ہے؟ تو اس نے نام کو بڑھانا چاہا، کہا میرا نام، **ابوعبداللہ السمیع العلیم الذی لایمسک السماء ان تقع علی الارض الاباذنہ** ۔ تو دوسرے نے ہنس کر کہا، مرحبا بک یانصف القرآن! کہ آدھے قرآن کے کنیت والے تو اہل تفاخر کا یہ رنگ ہوتا ہے کہ جس طرح بن پڑتا ہے اپنے کو بڑھاتے ہیں۔

اسی طرح مثنوی میں ایک اور ایسے ہی شخص کی حکایت لکھی ہے کہ وہ غریب تھا مگر اپنے کو بڑا امیر ظاہر کرتا تھا۔ گھر میں ایک چمڑے پر چربی لگا رکھی تھی۔ روزانہ چربی سے مونچھوں کو چکنا کر کے باہر آتا اور لوگوں سے کہتا کہ آج میں نے پلاؤ کھایا ہے، آج قورمہ کھایا ہے۔ ایک دن یہ

شخص اسی طرح ڈینگیں مار رہا تھا کہ اس کا لڑکا گھر سے بھاگا ہوا آیا اور کہا، ابا آج بلی وہ چمڑا لے گئی جس سے تم مونچھوں کو چکنا کرتے تھے۔ بیٹے نے پردہ فاش کیا اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ یہ روز جھوٹ بولتا ہے۔ چربی سے مونچھوں کے بال چکنے کر کے پلاؤ قورمہ کھانے کا دعویٰ کرتا ہے۔

غرض اہل تصنع چلتا نہیں۔ کسی دن ضرور بھانڈا پھوٹتا ہے اور بجائے عزت کے لوگوں کی نگاہ میں ذلیل ہو جاتے ہیں۔ اور اہل باطن کی یہ حالت ہے کہ وہ طرح طرح سے اپنے کو گمنام کرنا، مٹانا چاہتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ ان کو اور زیادہ چمکاتے ہیں

نہ کچھ شوخی چلی باد صبا کی ☆ بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ حالت تھی کہ لباس ایسا پہنتے تھے جس سے کوئی نہ سمجھ سکے کہ یہ عالم ہیں۔ نہ عبا پہنتے تھے، نہ چوغہ، نہ ململ پہنتے تھے نہ تن زیب بلکہ گاڑھا مارکین آپ کا لباس تھا اور اسی لباس سے آپ بڑے بڑے مجمعوں میں تشریف لے جاتے تھے مگر آپ کے سامنے سارے عبا اور جبے والے دھرے رہ جاتے تھے۔ آپ ہی کا نام چمکتا تھا اور کسی کو کوئی پوچھتا بھی نہ تھا۔ چنانچہ مباحثہ شاہجہان پور میں جو مخالفین اسلام کے مقابلہ میں بڑا عظیم الشان مناظرہ تھا۔ بڑے بڑے عبا قبا والے موجود تھے اور حضرت مولانا اسی معمولی کرتہ اور لنگی میں تھے مگر جب آپ نے تقریر کی ہے تو عوام پر اتنا اثر تھا کہ شاہجہان پور کے ہندو مہاجن اور بنئے یہ کہتے تھے کہ نیلی لنگی والا مولوی جیت گیا۔ ایسی تقریر کی جیسے دریا بہتا ہے۔ کسی کو اس کی بات کا جواب نہیں آیا۔

نیز مولانا کی یہ بھی عادت تھی کہ سفر میں اپنا نام کسی پر ظاہر نہ کرتے تھے۔ اور ساتھیوں کو بھی ممانعت تھی کہ کسی پر نام ظاہر نہ کریں۔ اور اگر کوئی آپ ہی سے پوچھتا کہ جناب کا نام کیا ہے۔ فرماتے، خورشید حسین! کیونکہ آپ کا تاریخی نام یہی ہے مگر اس نام سے لوگ واقف نہ تھے۔ اس لئے کوئی نہ سمجھتا کہ مولانا محمد قاسم صاحب یہی ہیں۔ اور اگر کوئی وطن الہ آباد کا نام پوچھتا تو فرماتے الہ آباد۔ نانوتہ کا نام نہ لیتے۔ رفقاء نے کہا، حضرت! آپ کا وطن الہ آباد کدھر سے ہو گیا۔ یعنی یہ تو کذب ہے۔ فرمایا، نانوتہ بھی خدا کا آباد کیا ہوا ہے۔ پس لغۃً ہر بستی الہ آباد ہے۔ یعنی کذب لازم نہ آیا بلکہ توریہ ہوا،

وفی المعاریض مندوحۃ عن الکذب ۱۲ظ) مگر باوجود اس قدر اخفاء کے چھپتے تھوڑا ہی

تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو چمکاتے تھے۔

حضرات اہل اللہ کی عزت اتنی بڑی ہے کہ ان کو ظاہری اسباب شہرت اور سامان شوکت کی حاجت نہیں رہتی۔ یہ تو وہ کرے جس کو حقیقی عزت حاصل نہ ہو۔ وہ اسباب عزت وسامان شہرت اختیار کیا کرتا ہے۔ متنبّی کہتا ہے۔

حسن الحضارة مجلوب بتطرية   وفی البداوة حسن غير مجلوب
افدی ظباء فلاة ماعرفن بها   مضغ الكلام ولا صبغ الحواجيب
ولا برزن من الحمام مائلة   اوراكهن صقيلات العراقيب

کہ شہر والوں کا حسن تو بناوٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ دیہات کی حسینوں کا حسن فطری ہے جس میں بناوٹ کا کوئی دخل نہیں۔ پس اصلی حسن تو وہی ہے، جو بدون بناوٹ کے حسین معلوم ہو۔ اس لئے جو لوگ واقعی اہل کمال ہیں، وہ سادگی سے رہتے ہیں۔ اس میں کچھ اہل باطن ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ علوم دنیا میں بھی جو اہل کامل ہیں ان میں کمال کی وجہ سے سادگی آجاتی ہے۔ وہ ظاہری آرائش کی پروا نہیں کیا کرتے۔ آپ نے کیمیاگروں کو دیکھا ہوگا کہ کیسے شکستہ حال بنے رہتے ہیں کیونکہ کمال مستی خیال ہستی کو کم کر دیتی ہے جیسے بارات کا سامان کرنے والا اہتمام بارات میں میلا کچیلا ہوتا ہے اور براتی بڑے بھڑکدار کپڑے پہن کر آتے ہیں۔ بات یہی ہے کہ بارات کے منتظم کو ایک خاص مستی حاصل ہے۔ جس نے اس کو زینت وآرائش سے مستغنی کر دیا ہے۔ پس اگر اہل اللہ کی باطنی حالت مستی کی وجہ سے شکستہ ہو تو اس پر تعجب نہ کیجئے بلکہ اگر شکستہ نہ ہو تو تعجب کیجئے۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب اہل اللہ کے انوار کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتے تو خود اللہ تعالیٰ کا نور کیوں کر مٹ سکتا ہے۔ پس یہ خدا کی حفاظت ہے کہ قرآن کے اس قدر حفاظ ہر زمانہ میں ہوتے رہتے ہیں کہ ان کا شمار احصا دشوار ہے۔

مرضی حق کی رعایت

اس پر بعض لوگ یوں کہہ دیا کرتے ہیں کہ جب خدا قرآن کا حافظ ونگہبان ہے تو ہمیں اس کے اہتمام کی کیا ضرورت ہے۔ اے صاحبو! یہ بات ایسے دل سے نکلی ہے جس

میں خدا سے ذرا بھی علاقہ اور لگاؤ نہیں۔ کیا اگر جارج پنجم آپ کو کوئی تحفہ دیں، آپ اس کی بے قدری کر سکتے ہیں اور خصوصاً ان کی نگاہ کے سامنے؟ ہرگز نہیں! بلکہ اس کو سر اور آنکھوں پر رکھا جائے گا اور اس کی جان سے زیادہ حفاظت کی جائے گی۔ اور اگر وہ کوئی تحفہ کھانے کے واسطے آپ کو دیں اور ان کے سامنے آپ اسے کھائیں تو کیا زمین پر آپ اس کا کوئی ریزہ گرنے دیں گے؟ ہرگز نہیں بلکہ اس طرح شوق سے کھائیں گے کہ گویا کبھی یہ نعمت آپ کو ملی ہی نہ تھی اور اگر اس میں سے ذرا سا بھی زمین پر گرے گا، تو فوراً اٹھا کر سر پر رکھیں گے!

یہیں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی حقیقت سمجھ لو کہ اگر کھانا کھاتے ہوئے لقمہ زمین پر گر جائے تو اس کو اٹھا کر صاف کر کے کھا لو کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ ہم کو دیکھ رہے ہیں۔ تو ان کی نعمت کی ان کے سامنے بے قدری کرنا بڑی بے حیائی ہے۔ تو صاحبو! خداتعالیٰ نے آپ کے ہاتھوں میں یہ قرآن دے دیا ہے۔ تو کیا عطیہ حق کی ہم کو قدر نہ کرنا چاہیے۔ کیا ہم کو اس کی حفاظت خود بھی نہ کرنا چاہئے صاحبو! جب قرآن خداتعالیٰ نے آپ کے ہاتھوں میں دیدیا ہے تو اب تو یہ آپ کا ہو گیا۔ تو کیا اپنی ایسی قیمتی چیز کی جو سلطان السلاطین کے دربار سے ملی ہے آپ کو حفاظت نہ کرنا چاہئے؟ یقیناً کرنا چاہئے خصوصاً جب کہ خدا کی مرضی اس کی حفاظت میں ہے اور وہ اس کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں، تو آپ کو بھی مرضی حق پر چلنا چاہیے۔

اس کی حقیقت اولیاء اللہ سے پوچھو۔ ایک بزرگ شاہ دولہ تھے ان کی بستی کے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا، حضور! دریا بستی کی طرف آ رہا ہے۔ بستی کے غرق ہونے کا اندیشہ ہے۔ آپ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس کی دھار کو دوسری طرف پھیر دیں۔ فرمایا، کل صبح کو سب آدمی پھاوڑے لے کر حاضر ہونا ہم اس کا انتظام کر دیں گے۔ چنانچہ لوگ حاضر ہوئے تو آپ سب کو دریا کے پاس لے گئے اور فرمایا کہ بستی کی طرف کو پانی کا راستہ کھودنا شروع کرو۔ لوگوں نے کہا، حضور! اس طرح تو دو دن کا پہنچتا ایک دن میں دریا بستی کے اندر پہنچ جائے گا۔ فرمایا کہ دریا کا رخ بستی ہی کی طرف ہو رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہی منظور ہے۔ پس جدھر مولیٰ ادھر ہی شاہ دولہ! تم کھودنا شروع کرو۔ لوگ بزرگوں کے اس زمانہ میں مطیع تھے۔ بستی ہی کی طرف کھودنا شروع کیا۔ تھوڑی سی دیر میں پانی کا رخ بدل گیا اور دریا کی دھار دوسری طرف کو جاری ہو گیا۔ بستی سے خطرہ ٹل گیا۔ یہ تو اہل اللہ کی

حالت تھی کہ وہ مرضی حق کی کس قدر رعایت کرتے ہیں۔

اب دنیاداروں کی حکایت سنیئے کہ وہ حکام کی مرضی کی کس قدر رعایت کرتے ہیں۔ مجھ سے ایک معتبر آدمی نے بیان کیا کہ ایک مقام پر نہر کی پٹری ٹوٹ گئی تھی۔ انگریز انجینئر اس کو درست کر رہا تھا۔ مگر جتنی مٹی ڈالتے تھے سب بہہ جاتی تھی، اور ناکہ بند نہ ہوتا تھا۔ تو وہ انگریز دہانہ پر جا کودا اور لیٹ گیا کہ اب مٹی ڈالو میں نے پانی کا زور کم کر دیا ہے۔ اس کا دہانہ پر لیٹنا تھا کہ بڑے بڑے اہل کار وہاں جا کر لیٹ گئے اور مزدوروں نے مٹی ڈالنا شروع کی۔ ذرا سی دیر میں پانی کا زور کم ہو گیا اور دہانہ بند ہو گیا پھر آہستہ آہستہ وہ لوگ کھڑے ہوئے جو پانی کے زور کی جگہ لیٹے ہوئے تھے۔ تو یہ فطری قاعدہ ہے کہ رعایا حاکم کی مرضی کی طرف بڑھنا چاہتی ہے۔ تو کیا خدا تعالیٰ ایسے سستے ہیں کہ جس طرف ان کی مرضی ہو ادھر توجہ نہ کی جائے مولانا اسی مضمون کو بیان فرماتے ہیں۔

اے گراں جاں خوار دیدستی مرا ☆ زانکہ بس ارزاں خریدستی مرا

(اے کاہل تو نے مجھ کو بے قدر سمجھ رکھا ہے وجہ یہ ہے کہ میں تجھ کو مفت مل گیا ہوں)

خدا تعالیٰ سے بے تعلقی

واللہ! خدا تعالیٰ سے تعلق ہم کو بہت کم ہے۔ لوگوں نے صرف وظیفوں اور مقدموں کے لئے خدا تعالیٰ سے تعلق کر رکھا ہے۔ یوں کہیئے کہ صرف روٹی کے واسطے خدا سے واسطہ رکھا جاتا ہے۔ اور جب روٹی مل گئی تو اب خدا کی کیا ضرورت ہے اور قرآن کی کیا ضرورت ہے۔ اسی وقت یہ مستیاں سوجھتی ہیں کہ بدون سمجھے قرآن پڑھنے سے کیا نفع اور جب خدا خود قرآن کا حافظ ہے تو ہم کو اس کی حفاظت کی کیا ضرورت ہے۔ **استغفر اللہ العظیم!**

ہمارے قصبہ میں ایک بڑے زمیندار مالدار کا لڑکا نماز پڑھنے لگا۔ اور رمضان میں اعتکاف بھی کرنے لگا اور پھر نماز کے بعد دعا بھی دیر تک کرتا تو اس کا چچا کہنے لگا کہ سوہرا (سسرا) نماز پڑھ کر ہاتھ پھیلا پھیلا کر خدا سے کیا مانگتا ہے۔ اس کے گھر میں کس چیز کی کمی ہے۔ زمین اس کے پاس ہے، گھر اس کے پاس ہے، بیل گائے بھینس اس کے پاس ہے اور کیا مانگتا ہے۔ مطلب وہی ہے کہ خدا سے تو روٹی کے واسطے تعلق ہے۔ جب روٹی کا سب سامان موجود ہے تو اب خدا سے کیا واسطہ، نعوذ باللہ!

حضرت! اس جاہل نے تو زبان سے یہ بات کہہ دی مگر لوگوں کے طرز عمل سے ٹپک رہا ہے کہ عام طور پر آج کل یہی حالت ہے کہ خدا تعالیٰ سے تعلق بہت کم ہے۔ بس اپنے مطلب کے واسطے تعلق ہے اور جس کام میں اپنا مطلب کچھ نہ ہو، اس میں خدا سے کچھ واسطہ نہیں، اور جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ برتاؤ ہے تو پھر اگر کسی مخلوق کے ساتھ ایسا برتاؤ ہو کچھ بھی تعجب نہیں۔

ابھی چند روز کا واقعہ ہے کہ ایک شخص نے ایک رشتہ منظور کر کے توڑالیا اور یہ شخص میرا ملنے والا تھا۔ تو میرے نام دوسرے فریق کا خط آیا کہ آپ نے اپنے مریدوں کو یہی تعلیم دی ہے وغیرہ وغیرہ۔ بس یہ حالت ہے کہ اگر اپنا مطلب نکل آیا تو دوسرے کو غوث اور قطب بنالیں گے اور اپنا مطلب نہ نکلا تو دنیا بھر کی برائیاں اس کے واسطے تصنیف کر لیں گے۔ نہ معلوم لوگوں میں سے تہذیب کہاں رخصت ہوگئی۔ بھلا اس عقلمند سے کوئی پوچھے کہ لڑکا تمہارا لڑکی دوسرے کی بیچ میں مجھے گالیاں دینے کو کیوں رکھا گیا۔ اور خود لڑکی والے کو بھی برا بھلا کہنے کا اس کو کیا حق تھا کیونکہ اگر کوئی پیام منظور کر کے توڑ دے تو اس میں اس نے کون سا جرم کیا۔ تمہارا قرض دبالیا، زمین چھین لی، آخر کیا کیا؟ اپنی اولاد کے واسطے ہر شخص بھلائی کا طالب ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ اب اس کے نزدیک تمہارا پیام منظور کرنا مصلحت نہ رہا ہو۔ اس میں برا ماننے اور دوسرے کو برا کہنے کی کیا بات ہے۔ مگر لوگوں سے آج کل تہذیب رخصت ہوگئی۔ اپنے مطلب کے سامنے کسی کی آبرو کی کچھ حقیقت سمجھتے ہیں نہ ایذا رسانی کی پروا کرتے ہیں۔

اس کے بعد ابھی ایک دوسرا خط ایک شخص کا آیا ہے جس میں کم بخت نے حق تعالیٰ کی شان میں بڑی گستاخی کی ہے۔ پھر نامعقول پوچھتا ہے کہ میں کافر تو نہیں ہوا۔ کم بخت مردود! اب بھی کفر میں شک کرتا ہے۔ اسلام ایسی سستی چیز ہے کہ تم اس کو دھکے دو اور وہ لپٹا ہی رہے۔ جب خدا تعالیٰ کے ساتھ لوگوں کے تعلق کا یہ حال ہے تو مجھ ناچیز کے ساتھ اگر کوئی ایسا کرے تو کیا شکایت کی جائے۔ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو ایک لاکھ روپے دے دیں تو بس اللہ میاں سے خوش ہیں اور اللہ میاں شکر کے بھی مستحق ہیں اور تعریف کے بھی۔ اور اگر ذرا روٹیوں میں کسر آجائے۔ تو اللہ میاں نعوذ باللہ نہ شکر کے مستحق ہیں نہ تعریف کے بلکہ الٹی شکایت اور گستاخی پر اتر آتے ہیں۔

ابھی ہمارے یہاں ایک واقعہ آیا ہے کہ ایک شخص کا انتقال ہوا اس کے ورثہ میں ایک بیو

ی تھی ایک بیٹی اور ایک عصبہ جو ذرا دور کا تھا۔ اور جس سے مرنے والے کے ورثا کی مخالفت تھی۔ جب فرائض نکلوائے گئے تو مولویوں نے اس عصبہ کا حصہ بھی لکھا۔ بس اس پر سارے ورثا فتویٰ کو اور مفتی کو برا بھلا کہنے لگے کہ یہ بھی کوئی بات ہے کہ اتنے دور کے رشتہ دار کو وارث بنایا جائے۔ میں نے کہا کہ شریعت کی قدر کوئی اس عصبہ کے دل سے پوچھے جس کو خلاف امید رقم مل گئی۔ اگر تم شریعت کو برا کہو گے تو جس کے پاس رقم جائے گی وہ اچھا کہے گا۔ ظالمو! اگر تم کو کسی ایسے جگہ سے شریعت میراث دلوا دے جہاں سے تم کو امید و وہم بھی نہ ہو تو پھر اس وقت تم ہی شریعت کی تعریف کرنے لگو گے۔ الغرض خدا کے ساتھ مال اور روٹی کا تعلق ہے یہ مل جائے تو اللہ میاں سب کچھ ہیں ورنہ نعوذ باللہ کچھ بھی نہیں۔

ایک اور خط آیا ہے اس میں لکھا ہے کہ ایک عورت کا انتقال ہو گیا۔ شوہر اور بھائی وارث ہیں۔ مگر شوہر شیعہ ہے اور شیعہ کا نکاح سنیہ سے جائز نہیں۔ اس لئے تنہا میں ہی وارث ہوں یعنی بھائی۔ تو میں نے اس پر لکھا کہ سوال کے ساتھ یہ بھی تو لکھا ہوتا کہ میری بہن نے بیس سال تک حرام کرایا اور میں اس پر راضی رہا۔ تم کو شرم نہیں آتی کہ چار پیسوں کے واسطے اپنی بہن کو بعد مرنے کے زانیہ بنانے اور اپنے کو دیوث قرار دینے لگے۔ جب تم کو معلوم تھا کہ شیعہ سے سنیہ کا نکاح جائز نہیں تو تم نے اپنی بہن کا نکاح جان بوجھ کر شیعہ سے کیا ہی کیوں تھا؟ پھر میں نے لکھا کہ اگر نکاح سے پہلے مجھ سے مسئلہ پوچھتے تو میں نکاح کو ناجائز ہی کہتا۔ باقی اب تو میں تمہارے چار پیسے سیدھے کرنے کے لئے ایک مسلمان عورت کو زانیہ نہیں بنا سکتا۔

اسی طرح ہمارے قصبہ میں ایک شخص فرائض لکھوانے آیا۔ جب فرائض لکھ دی گئی تو وہ پوچھتا ہے کہ میرا کتنا حق ہے۔ جب معلوم ہوا کہ اس کا کچھ حق نہیں تو وہ فرائض کو مدرسہ ہی میں چھوڑ کر چل دیا۔ واقعی اکثر لوگ اسی واسطے فرائض لکھواتے ہیں کہ ہم کو کچھ مل جائے۔ اور اگر یہ کہہ دیا جائے کہ تم کو کچھ نہ ملے گا، تو فرائض کا نام بھی نہ لیں۔ حکم شرعی معلوم کرنا تھوڑا ہی مقصود ہے۔ صرف اپنی غرض مطلوب ہے۔

تعلق باللہ کی صورت

صاحبو! اس کا نام تعلق نہیں۔ اگر خدا تعالیٰ سے تعلق ہوتا تو یہ باتیں نہ ہوتیں۔ کسی مردار حسینہ سے کسی کو محبت ہو جاتی ہے تو یہ حالت ہوتی ہے کہ اپنا جان و مال سب اس

پر قربان کر دیتے ہیں اور اس کی کسی بات سے ناگواری نہیں ہوتی بلکہ یوں کہتے ہیں ۔

ناخوش تو خوش بود بر جان من ☆ دل فدائے یار دل رنجان من
درد از یاریست و درماں نیز ہم ☆ دل فدائے او شد و جاں نیز ہم

(محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے وہ طبیعت کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو وہ میری جان خوش اور پسندیدہ ہے میں اپنے دوست پر جو میری جان کو رنج دینے والا ہے اپنے دل کو قربان کرتا ہوں، درد بھی دوست کی طرف سے ہے اور اس کا علاج بھی۔ دل و جان آپ پر فدا ہوں)

اور یوں کہتے ہیں ۔

زندہ کنی عطائے تو در بکشی فدائے تو دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں آپ کی عطا ہے اگر قتل کریں آپ پر قربان ہیں دل آپ پر فریفتہ ہے جو کچھ کریں ہم راضی کریں)

صاحبو! محبت کا سبب کمال و جمال و نوال ہے اور یہ باتیں حق تعالیٰ شانہ کے اندر کامل طور پر موجود ہیں۔ ان سے بھی اگر محبت نہ ہو تو پھر کس سے ہوگی۔ خبر بھی ہے خدا تعالیٰ کون ہیں۔ تمام حسن و جمال کے مبداء و منتہا ہیں۔ تو جب خدا تعالیٰ ایسے محبوب ہیں تو ہم کو ان کی مرضی کی رعایت کرنا چاہیے۔ اور خدا تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ قرآن محفوظ رہے تو آپ کو اس کی طرف جھکنا چاہیے اور اس کے الفاظ کا پورا اہتمام کرنا چاہیے۔ کیونکہ الفاظ و معانی دونوں قابل اہتمام ہیں، مگر الفاظ میں اتنی بات زیادہ ہے کہ معانی کی حفاظت الفاظ کی حفاظت پر موقوف ہے کیونکہ معانی کا ضبط بدون الفاظ کے نہیں ہو سکتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حافظہ اور قوت

دیکھئے سب سے پہلے معانی قرآن کا نزول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر ہوا ہے مگر وہاں بھی بواسطہ الفاظ کے ہوا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو الفاظ کا اس قدر اہتمام تھا کہ جب وحی نازل ہوتی، تو آپ جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ ساتھ پڑھتے جاتے تھے۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حافظہ بہت قوی تھا بلکہ سارے ہی قوی مضبوط تھے کہ تریسٹھ سال کی عمر میں بھی آپ کے بال کچھ ہی سفید ہوئے تھے جو بیس سے زیادہ نہ

تھے باوجود یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر افکار سب سے زیادہ تھے۔ کیونکہ جس قوم میں آپ نے تبلیغ اسلام شروع کی ہے وہ سب کی سب جاہل تھی اور شریعت کے نام سے واقف بھی نہ تھی۔ آپ نے تنہا اس قوم میں توحید اسلام کی دعوت شروع کی۔ ابتداء میں سب کے سب آپ کے مخالف ہو گئے اور دو چار کے سوا کوئی موافق نہ ہوا۔ خیال کر لیجئے کہ ایسی حالت میں تنہا آدمی کو کتنے بڑے فکر کا سامنا ہوتا ہے خصوصاً جب کہ وہ شفیق مہربان بھی ہو اور اپنی قوم کی اصلاح کا دل سے طالب بھی ہو۔ اس کو ایسی جاہل قوم کی اصلاح کی تدابیر سوچنے میں کتنے بڑے فکر کا سامنا ہوا ہوگا۔ جس پر تو اللہ تعالیٰ جابجا آپ کو فرماتے ہیں:

لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ...... وَلَسْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ..... وَلَاتُسْئَلُ عَنْ اَصْحَابِ الْجَحِيْمِ..... وَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّايَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ.

کیا آپ ان کی فکر میں اپنی جان کو ہلاک کر دیں گے کہ یہ ایمان کیوں نہیں لاتے۔ اور کبھی فرماتے ہیں کہ آپ ان پر مسلط کر کے نہیں بھیجے گئے آپ سے ان کے متعلق یہ سوال نہ ہوگا کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لائے بس آپ کے ذمے صرف تبلیغ کر دینا ہے۔ **ان علیک الا البلاغ.** ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قوم کا بڑا غم تھا۔ اور سب سے بڑھ کر غم آخرت کا تھا۔ جس کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کو فکر آخرت کا کچھ ذوق حاصل ہوا ہو۔ حدیث میں اس کے متعلق یوں آیا ہے کہ:

کان دائم الفکرۃ متواصل الاخزن

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ متفکر اور غمگین سے رہتے تھے ہر وقت ایک دھن سی آپ کو لگی رہتی تھی۔ اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

واللہ لوتعلمون ما اعلم لضحکتم قلیلا ولبکیتم کثیرا ولخرجتم الی الصعدات تجئرون۔ (الصحیح للبخاری ۲: ۴۳، السنن الکبری للبیہقی ۳: ۳۲۲)

بخدا اگر تم کو وہ امور معلوم ہو جاتے جو مجھے معلوم ہیں (یعنی احوال آخرت) تو تم بہت کم ہنسا کرتے اور زیادہ رویا کرتے اور چیختے ہوئے جنگلوں کی طرف نکل جاتے۔ باوجود افکار عظیمہ کے پھر بھی آپ کے بال بیس سے زیادہ سفید نہ ہوئے تھے۔ جو تمام قویٰ کے مضبوط ہونے کی دلیل ہے۔ جس پر واقعات کثیرہ شاہد ہیں۔

چنانچہ حضرات صحابہؓ فرماتے ہیں کہ ہم میں سب سے زیادہ بہادر وہ شمار ہوتا تھا جو جنگ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہتا۔ کیونکہ آپ دشمن کی طرف سب سے آگے بڑھے رہا کرتے تھے۔

نیز ابورکانہ عرب میں مشہور پہلوان تھے انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا جب قائل ہوں کہ آپ کشتی میں مجھے زیر کردیں (گو اس بات کو نبوت میں دخل نہ تھا مگر آپ نے اسی طرح ان کی تسلی کردینا چاہی ۱۲) چنانچہ کشتی ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پٹک دیا۔ کہنے لگے یہ تو اتفاقی بات ہوگئی۔ دوبارہ پھر کشتی ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری بار پھر ان کو پٹک دیا اور وہ (فی تاریخ الخلفاء فوثب علیہ عمر فوطئہ وطا شدیداً۔ اھ۔ فترجم بالحاصل) اسلام لے آئے۔

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام کا واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت کو اچھی طرح ظاہر کرتا ہے کہ جب حضرت عمرؓ اس مکان پر پہنچے جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم مع اپنے اصحاب کے مخفی تھے۔ اور حضرت عمرؓ نے کواڑ کھلوانے چاہے تو کواڑوں کی درزوں سے ان کی صورت دیکھ کر حضرات صحابہ ڈر گئے اور کہا، یارسول اللہ! یہ عمر تلوار ہاتھ میں لئے کھڑے ہیں اور کواڑ کھلوانا چاہتے ہیں۔ ہم کو ان سے خطرہ ہے (کذا فی سیرۃ ابن ہشام ۱۲)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تم کواڑ کھول دو، وہ کیا کرلیں گے۔ اگر اچھی نیت سے آئے ہیں تو خوشی کی بات ہے اور برے ارادے سے آئے ہیں تو اپنی سزا کو پہنچ کر رہیں گے۔ چنانچہ کواڑ کھولے گئے۔ اور جب حضرت عمرؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچے تو آپ نے ان کی چادر کا کونہ پکڑ کر نہایت زور سے جھٹکا دیا اور فرمایا، اے عمر! کیا تیری بھلائی کے دن نہیں آئے، تو کب تک اللہ و رسول کا مقابلہ کرتا رہے گا۔ اس سے آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ جس شخص سے اتنے آدمی ڈرتے اور کواڑ کھولنے میں تامل کرتے تھے، اس کی آپ نے کچھ بھی پروا نہ کی اور اس طرح دھمکایا جیسے معمولی آدمی کو دھمکا لیا کرتے ہیں۔

اور سیرت ابن ہشام میں ایک واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان سے تنہا ملنے کا اور نہایت بےفکری سے ان کو دھمکا دینے کا مذکور ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت کا تو کیا پوچھنا۔ آج کل سے تو اس زمانہ کے سب ہی لوگ قوی تھے۔ حضرات صحابہ کا حافظہ بھی

ہم لوگوں سے زیادہ قوی تھا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تو سب ہی سے زیادہ قوی تھا۔

حفاظت الفاظ کا اہتمام

لیکن باہمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو الفاظ قرآن کا اس درجہ اہتمام تھا کہ فرشتہ کے ساتھ قرآن پڑھتے جاتے تھے۔ کیونکہ

باسایہ ترانمی پسندم عشق ست وہزار بدگمانی

(عشق میں ہزاروں بدگمانیاں ہوتی ہیں اس لئے محبوب کے سایہ کے ساتھ کسی کو ساتھ رہنا بھی عشاق پسند نہیں کرتے)

آپ کو ان محبوب الفاظ کے نکلنے کا اندیشہ تھا کہ کہیں کوئی لفظ میری یاد سے نکل نہ جائے۔ اس لئے ساتھ ساتھ پڑھتے جاتے تھے اس سے اندازہ کیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو الفاظ قرآن سے کس درجہ عشق تھا۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ کے منع کرنے کی نوبت آئی۔ آپ ساتھ ساتھ پڑھنے کی مشقت برداشت نہ کیا کریں۔ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ۔ (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آپ قبل اختتام وحی قرآن اپنی زبان نہ ہلایا کیجئے) ہم ذمہ لیتے ہیں کہ قرآن کو آپ کے دل پر جما دیں گے۔ اس تسلی کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرشتہ کے ساتھ نہیں پڑھتے تھے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو الفاظ قرآن کا اس درجہ اہتمام تھا تو ہم کو بھی ان کا احترام کرنا چاہئے کیونکہ بدون الفاظ کے معانی کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا معانی کی نگہبانی یہی ہے کہ الفاظ کو یاد کیا جائے۔ حضرات سلف صالحین نے تو قرآن کے نقوش اور رسم خط کی بھی یہاں تک حفاظت کی ہے کہ رسم خط قرآن کے متعلق مستقل رسائل تصنیف کئے اور اس کو ایک علیحدہ فن قرار دیا ہے اور اس میں تغیر وتبدل کرنا جائز فرمایا ہے۔

صاحبو! آج کل تو یادگار قدیم کی اس قدر حفاظت کی جاتی ہے کہ اس کے تغیر کے بعد بھی اس کا فوٹو لیا جاتا ہے۔ تو خدانخواستہ اگر رسم خط قدیم متغیر بھی ہوتا۔ جب بھی یادگار قدیم ہونے کی وجہ سے اس کی حفاظت ضروری تھی۔ چہ جائیکہ وہ بالکل محفوظ صحیح ہے بلکہ اس میں نکات ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ بقادر میں الف نہیں لکھا گیا کیونکہ وہاں دوسری قرأت بقدر ہے تو صحابہ نے اس جگہ بقادر میں الف نہیں لکھا تاکہ دوسری قرأت پر بھی رسم دال رہے۔ اسی طرح سورۃ

فاتحہ میں مالک یوم الدین میں الف نہیں لکھا کیونکہ ایک قرأت میں ملک ہے۔ پس رسم خط کا قرآن میں بے حد لحاظ کیا گیا ہے کہ سب قرائتوں کو جامع رہے۔ اس لئے اس کا بدلنا حرام ہے۔ صاحبو! جب قرآن کی ہر چیز کی حفاظت کی گئی ہے اور یہ مسلمانوں کے لئے بڑا فخر ہے کہ ان کے برابر کسی قوم اور کسی امت نے آسمانی کتاب کی حفاظت نہیں کی تو آپ کو بھی اس کی ہر چیز کی ویسی ہی حفاظت کرنا چاہیے جیسا کہ اب تک امت نے کی ہے۔ اور یہ مت کہو کہ خدا تو اس کا خود نگہبان ہے پھر ہم کو کیا ضرورت ہے۔ کیونکہ اس کی محافظت کی یہ بھی ایک صورت ہے کہ اس کی محافظت کا حکم اپنے بندوں کو دے دیا اور یہ ان کا احسان ہے اور انعام ہے کہ اس نے یہ خدمت ہم سے لے لی۔ اگر تم یہ کام نہ کرو گے تو اللہ تعالیٰ کسی دوسری قوم سے یہ کام لے لیں گے۔ چاہے چھوڑ کر دیکھ لو۔ تمہاری تان گاڑی نہیں چل رہی۔

خلافت کا تقاضا

اللہ تعالیٰ کو تو ہمارے پیدا کرنے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ یہ بھی ان کا انعام محض ہے کہ ہم کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا اور پیدا کرنے سے پہلے ملائکہ سے فرمایا۔ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً کہ میں زمین کے اندر اپنا خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں۔ کس قدر عنایت ہے کہ

ما نبودیم و تقاضا ما نبود ☆ لطف تو نا گفتہ ما می شنود

(نہ ہم تھے نہ ہمارا تقاضا تھا آپ کا لطف و کرم ہمارے کہے ہوئے کو سنتا تھا)

ہمارے پیدا ہونے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے ہم کو خلیفۃ اللہ کا خطاب دیا۔ تو کیا خلافت کا یہی حق ہے جو ہم ادا کر رہے ہیں کہ زبان پر یہ بات آ رہی ہے کہ خدا قرآن کا خود نگہبان ہے ہم کو کیا ضرورت ہے۔ خدا تعالیٰ کی عنایت تو دیکھئے کہ ہم کو ایسی حالت میں خلیفہ بنایا کہ دوسرے لوگ اس منصب کے طالب موجود تھے۔ ملائکہ نے اسی وقت جب کہ اللہ تعالیٰ نے انی جاعل فی الارض خلیفہ (بے شک میں زمین کے اندر اپنا خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں) فرمایا، یہ عرض کیا تھا کہ ہمارے ہوتے ہوئے انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ قرآن میں ملائکہ کا یہ سوال اور اس کا جواب مفصل مذکور ہے۔ میں اس

وقت اس کی تفصیل بیان کرنا نہیں چاہتا۔ صرف یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ حق تعالیٰ کو ہماری ضرورت نہ تھی بلکہ جس کام کے لئے ہم کو پیدا کیا گیا ہے اس کے انجام دینے کے لئے اللہ تعالیٰ کی دوسری مخلوق اپنی خدمات پیش کرنے والی موجود تھی مگر اللہ تعالیٰ کا یہ ہمارے حال پر غایت کرم ہے کہ دوسری جماعت کے ہوتے ہوئے پھر بھی ہم کو منصب خلافت عطا کیا اور ہم کو اس خدمت کے لئے پیدا کیا۔ اسی طرح خدمت قرآن کے لئے بھی خدا تعالیٰ کو ہماری کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔ اگر ہم خدمت دین میں کوتاہی کریں گے تو دوسری قوم کو اس کی خدمت کے لئے پیدا کریں گے چنانچہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اس خیال کا یہی جواب صاف صاف دیا ہے: وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ۝

اگر دین سے اعراض کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے عوض تمہاری جگہ دوسری قوم کو کر دے گا، پھر وہ تمہاری طرح (سست و کاہل اور دین سے جان چرانے والے) نہ ہوں گے۔

خطرے کا الارم

صاحبو! تمہاری تان گاڑی نہیں چل رہی۔ تم آج چھوڑ کر دیکھ لو۔ گاڑی ویسی ہی چلتی رہے گی۔ ہاں تم خود ہی گر پڑو گے۔ اللہ تعالیٰ اس دین کی خدمت اور قرآن کی حفاظت کے لئے ایسی قومیں پیدا کر دیں گے جو تمہارے جیسی نہ ہوں گی۔ صاحبو! میں آپ کو خبردار و بیدار کرنا چاہتا ہوں کہ جلدی سنبھلو۔ کہیں اس وعید کا ظہور نہ ہو جائے۔ کیونکہ مجھے اس کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ اس وقت میں ایک خوفناک منظر دیکھ رہا ہوں کہ مسلمانوں کی تحریریں تو کفر آمیز شائع ہوتی ہیں اور اہل یورپ کی تحریریں اسلام کی مدح میں شائع ہو رہی ہیں۔ گویا بعضے مسلمان تو کفر کی طرف بڑھ رہے ہیں اور بعض کفار اسلام کی طرف۔ تو اس حالت کو دیکھ کر مجھ کو سخت اندیشہ ہوتا ہے کہ جب دونوں جماعتیں سرحد پر پہنچ جائیں گی تو ایسا نہ ہو کہ وہ تو کفر سے نکل کر مسلمان ہو جائیں اور یہ اسلام سے نکل کر کافر ہو جائیں۔

صاحبو! دوسری قوموں کو اسلام کی مدح وثنا کی طرف مائل کر کے حق تعالیٰ ہم کو متنبہ فرما رہے ہیں کہ یہ نہ سمجھنا کہ خدا کو یا اسلام کو تمہاری ضرورت ہے بلکہ تم ہی کو اسلام کی ضرورت ہے۔

وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ۝

اگر تم اعراض کرو گے تو ہم تمہاری جگہ دوسری قوم کر دیں گے، جو اس وقت باوجود کفر کے اسلام کی مدح کر رہی ہے اور تم ان کی جگہ ہو جاؤ گے کہ باوجود اسلام کے اسلام کی توہین کرتے ہو اور اگر تم اعراض نہ کرو بلکہ بدستور اسلام کی خدمت انجام دیتے رہو۔ تو اس صورت میں تم بھی مسلمان رہو گے اور شاید دوسری قومیں بھی مسلمان ہو جائیں۔

اسلام کی خدمت یا قرآن کی حفاظت جو کچھ آپ کرتے ہیں، یہ محض برائے نام ہے جس سے صرف آپ کا نام ہو جاتا ہے ورنہ اب بھی قرآن کے محافظ دراصل حق تعالیٰ ہی ہیں۔ تم اپنے حفظ پر کیا ناز کرتے ہو۔ ذرا کافیہ یا اور کوئی نظم ونثر کی کتاب تو حفظ کر لو۔ آپ کو اسی وقت اپنے حفظ کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ یہ خدا تعالیٰ ہی کی تو حفاظت ہے کہ قرآن جیسی ضخیم کتاب کا حفظ کرنا ایسا آسان کر دیا ہے کہ بچے تک حفظ کر لیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن میں متشابہات بھی کثرت سے ہیں۔ اس بات پر نظر کر کے یہی کہنا پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو محض ہمارا نام کرنا مقصود ہے کہ وہ ہم کو حافظان قرآن کی فہرست میں داخل کر کے انعام دینا چاہتے ہیں ورنہ اصل حافظ ومحافظ وہی ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں مصحلت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

(مشک افشانی محبوب کے زلف کا کام ہے لیکن عشاق نے مصلحت کی وجہ سے چین کے ہرنوں کے سر منڈھ دی ہے)

واللہ! اس انعام پر جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے اوپر فرمایا ہے یوں کہنا چاہئے۔

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل ☆ نسیم صبح تیری مہربانی

اور عارفین کی نظر تو اس سے بھی آگے بڑھتی ہے۔ عارفین تو جب قرآن کی تلاوت کرتے ہیں تو ان کو یہ بات مکشوف ہوتی ہے کہ ہم خود نہیں پڑھ رہے بلکہ ارجن باجہ کی طرح بول رہے ہیں جس میں کسی اور کا کلام بند کیا گیا ہے اور باجہ سے وہی نکلتا ہے جو اس میں بند کیا گیا ہے مگر ظاہر بیں یہی سمجھتا ہے کہ باجہ بول رہا ہے۔ یا وہ اس وقت مثل شجرہ طور کے ہوتے ہیں کہ ظاہراً درخت یہ کہہ رہا تھا يٰمُوْسٰى اِنِّىْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۔ مگر درخت کی کیا مجال تھی کہ وہ خود اس طرح بولتا بلکہ کوئی دوسرا بول رہا تھا اور درخت محض اس کا ناقل

وحا کی تھا!

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں ☆ کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں

ایک عارف اسی کو فرماتے ہیں۔

درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند ☆ آنچہ استاد ازل گفت ہماں میگویم

(پس پردہ مجھے طوطی کی طرح بٹھا دیا ہے مجھے جو حکم استاد ازلی کی طرف سے ملا تھا وہی بیان کر رہا ہوں)

عارفین کو جب اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے تو کچھ نہ پوچھئے کہ تلاوت قرآن کے وقت ان کی کیا حالت ہوتی ہے۔ اور تلاوت قرآن میں تو اس حالت کا غلبہ ایک خاص وجہ سے زائد ہو جاتا ہے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ صاف صاف اپنی شوکت وعظمت وجلال کو ظاہر فرماتے ہیں۔ کہیں عتاب ہے کہیں شکایت ہے کہیں تسلی ہے کہیں بشارت کہیں تکلم ہے کہیں خطاب ہے۔ ورنہ ایک تلاوت قرآن ہی کیا انسان کے تو سارے ہی افعال ایسے ہیں کہ ان میں انسان محض برائے نام فاعل ہے ورنہ اصل کو کرنے والے وہی ہیں یہ کیا ناز کرتا ہے اپنے علم وعمل پر کہ میں نے یہ کمال کیا میں نے فلاں مسئلہ کو حل کیا۔ واللہ! اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی شخص دوسرے کے کھیت پر دعویٰ کرے کہ یہ کھیتی میری ہے مگر ساتھ میں یہ بھی اقرار کرتا ہے کہ زمین بھی دوسرے کی بیج اور بیل بھی دوسرے کا۔ اسی نے اس کو پانی دیا، کھاد ڈالا اور کھیت کو پرورش کیا ہے ظاہر ہے کہ ہر شخص اس مدعی کو احمق بتلائے گا کہ جب ساری چیز دوسرے کی ہے تو کھیتی تیری کدھر سے ہوئی۔ صاحبو! مگر اس حماقت میں ہم سب مبتلا ہیں کیونکہ جس دماغ اور جن ہاتھ پیروں سے ہم کام کرتے ہیں ہر ایک کو اقرار ہے کہ یہ سب سامان خدا تعالیٰ کا عطا کیا ہوا ہے۔ عقل وفہم اور قوت ارادہ اور قوت عمل بھی انہی کی دی ہوئی ہے۔ اب فرمایئے کہ ان سب قوی اور جوارح سے جو افعال وکمالات ظاہر ہوں گے وہ ہمارے کدھر سے ہو گئے۔

نیاوردم از خانہ چیزے نخست ☆ تو دادی ہمہ چیز من چیز تست

(میں اپنے گھر سے کوئی چیز نہیں لایا یہ سب آپ ہی کا دیا ہوا ہے، میری حقیقت ہی کیا ہے)

حیرت ہے اگر ہم اب بھی یہ دعویٰ کریں کہ ہم خود قرآن کی حفاظت کرتے ہیں۔ جب ہمارا پڑھنا اور یاد کرنا ہمارے قبضہ کا نہیں تو ہم حفاظت کرنے والے کون ہیں بلکہ وہی محافظ ہیں جنہوں نے ہم سے یہ کام لیا اور اس کے اسباب عطا کئے۔ اور حفاظت کا تو ادھر سے ہونا بہت ہی ظاہر ہے۔ حقیقت میں تو ہمارا پڑھنا اور تلاوت کرنا بھی ادھر ہی سے ہے۔ اگر اُدھر سے توفیق نہ ہو تو کسی کی مجال نہیں کہ ایک لفظ بھی زبان سے نکال سکے۔

کانپور کا واقعہ ہے کہ ایک شخص نے جمائی لی تھی۔ اس کے بعد منہ بند نہ ہوا کھلا کا کھلا رہ گیا۔ بڑی مصیبت ہوئی نہ کھانے کا رہا نہ بات کرانے کا۔ پھر بڑی وقت کئی دن میں منہ بند ہوا۔ شاید کوئی کہے کہ دوا دارو سے منہ بند ہو گیا۔ یہ کام تو انسان کی تدبیر سے ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ اس میں بھی تدبیر کا محض نام ہی ہے خدا کو منظور نہ ہوتا تو قیامت تک منہ بند نہ ہو سکتا۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ بعض دفعہ تمام اطباء اور ڈاکٹر عاجز ہو جاتے ہیں اور بیمار کو شفا نہیں ہوتی۔ بلکہ جوں جوں دوا کرتے ہیں مرض کو ترقی ہی ہوتی ہے اور یہ حال ہوتا ہے

از قضا سر کنگبیں صفرا فزود ☆ روغن بادام خشکی مے نمود

(قضا و قدر سے شہد صفرا زیادہ کرتا ہے، روغن بادام خشکی پیدا کرتا ہے)

ہر تدبیر الٹا کام کرتی ہے اور جس دوا کو تریاق سمجھا جاتا ہے وہی زہر کا اثر پیدا کرتی ہے اگر شفا طبیبوں ڈاکٹروں کے قبضہ میں ہے تو ان کے بیوی بچے تو ہمیشہ مرض کے بعد ضرورت صحت یاب ہو جایا کریں کیونکہ اس موقع پر طبیب و ڈاکٹر بھی تدبیر میں کمی نہیں کر سکتا۔ مگر مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ پس مجبوراً ماننا پڑے گا کہ

درد از یار است و درماں نیز ہم ☆ دل فدائے او شد و جاں نیز ہم
ہر چہ میگویند آں بہتر ز حسن ! ☆ یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

(درد بھی دوست کی طرف سے ہے اور علاج بھی اسی کی طرف سے، دل و جان میری اس پر فدا ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آن حسن سے بہتر ہے، ہمارا محبوب یہ آن بھی رکھتا ہے اور وہ حسن بھی)

اب تو آپ کو معلوم ہو گیا کہ قرآن پڑھنا بھی مستقلاً ہمارا کام نہیں اس کے محافظ ہی کیا ہوتے۔ تو اب یہ محض حق تعالیٰ کا انعام ہے کہ وہ ہمارا نام ہی کرنا چاہتے ہیں ورنہ در اصل

سب تصرفات وہ خود کرتے ہیں۔ اگر اب بھی اس انعام کی صرف رغبت نہ ہو تو سخت محرومی کی علامت ہے۔ یہ مضمون درمیان میں استطراداً آ گیا اس امر پر تنبیہ کرنے کیلئے کہ قرآن کی حفاظت جو آپ کے سپرد کی گئی ہے تو آپ اس پر ناز نہ کریں، خدا کو آپ کی ضرورت نہیں بلکہ آپ ہی کو خدا کی ضرورت ہے اب میں پھر مقصود کی طرف عود کرتا ہوں۔

آخرت کے سکے

یہ کہنا ہرگز صحیح نہیں کہ بدون معنی کے سمجھے قرآن پڑھنے سے کیا فائدہ۔ کیونکہ ایک فائدہ تو یہی ہے کہ معانی کی حفاظت بدون الفاظ کے نہیں ہو سکتی اور حفظ معانی کی ضرورت آپ کو بھی مسلم ہے۔ یہ جواب تو سائنس وعقل کے موافق ہے اور آج کل عقل وسائنس کی پرستش زیادہ ہے۔ اس لئے یہ جواب نو تعلیم یافتہ جماعت پر زیادہ حجت ہے۔ اور ایک جواب نقلی ہے جو دینداروں پر حجت ہے جو نقل کے سامنے عقل کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے۔ وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قرآن کے ہر لفظ پر دس نیکیاں ملتی ہیں۔ جس نے ایک بار زبان سے الحمد کہا، اس کے نامہ اعمال میں اس وقت پچاس نیکیاں لکھی گئیں شاید عقل پرستوں کو یہ جواب پھیکا معلوم ہوا ہوگا مگر صاحبو! حقیقت میں یہ بڑا قیمتی نفع ہے جس کی قدر مرنے کے بعد معلوم ہوگی جب کہ نیکیوں ہی کی بوجھ ہوگی اور اس کے سوا تمام چیزیں ردی ثابت ہوں گی۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کے پاس مکہ کے ہلالے اور مجیدیاں بہت سی جمع ہوں اور ہندوستان والے اس کا مضحکہ اڑائیں کہ اس سکہ کو جمع کرنے سے تجھے کا نفع؟ وہ اس کے جواب میں کہتا ہے کہ ہاں ابھی تو کچھ نفع نہیں معلوم ہوتا لیکن ایک خاص دن میں معلوم ہو جائے گا۔ پھر یہ شخص اور اس کا مضحکہ اڑانے والے دونوں حج کو جائیں تو وہاں پہنچ کر معاملہ برعکس ہوگا کہ اب وہ شخص جس کے پاس ہلالے اور مجیدیاں جمع تھیں ان لوگوں کا مضحکہ اڑائے گا جن کے پاس ہندوستان کے تانبہ کے پیسے بہت ہیں مگر مکہ کا سکہ کچھ نہ تھا اور اب یہ لوگ اس کے سامنے شرمندہ ہوں گے۔

صاحبو! اسی طرح ایک اور عالم آنے والا ہے جس کے بازار میں آپ کے ان سکوں کی کچھ قدر نہیں جو آپ جمع کر رہے ہیں۔ نہ وہاں روپیہ کی قدر ہے، نہ اشرفی کی، نہ انٹرنیس کی قدر ہے نہ

بی اے کی، نہ ایل ایل بی، کی نہ آئی، سی ایس کی۔ وہاں کا سکہ یہی نیکیاں ہیں جن کی آپ اس وقت بے قدری کر رہے ہیں، پس قرآن کے الفاظ کا دوسرا نفع یہ ہے کہ یہ آخرت کا سکہ ہے جس کی ایک ایک سورت سے آخرت کے بے شمار خزانے جمع ہو جاتے ہیں۔ جب آپ وہاں جا کر دیکھیں گے کہ ایک سورۃ فاتحہ اور قل ہو اللہ سے اتنا بے شمار ثواب مل گیا، تو بے ساختہ یوں کہیں گے

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را ☆ کہ بیک گل می خری گلزار را

(ایسا بازار کہاں ہوگا کہ ایک پھول کے بدلے میں سارا چمن مل جائے)

مگر ابھی اس واسطے قدر نہیں کہ یہ بازار اس سکہ کا نہیں ہے یہاں یہ سکہ رائج نہیں لیکن آخر آپ مسلمان ہیں اور آخرت و قیامت کے آنے کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ پھر اس نفع کی بے قدری کس لیے ہے۔ واللہ وہاں جا کر آپ افسوس کریں گے کہ ہائے ہم نے رات دن قرآن کی تلاوت کیوں نہ کی جو آج مالا مال ہو جاتے۔ اور اس وقت اپنے ان عذروں اور بہانوں پر افسوس ہوگا جو آج کل تحصیل قرآن میں کیے جاتے ہیں۔

عقلی اور طبعی محبت

مجھے دیندار طبقہ کی بھی شکایت ہے کہ یہ طبقہ بھی تلاوت قرآن کا پوری طرح اہتمام نہیں کرتا۔ بعضے یہ عذر کرتے ہیں کہ ہم کو فرصت نہیں ملتی۔ طلبہ اور مدرسین کو زیادہ تر یہی عذر ہے مگر یہ محض لغو ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ دوستوں سے باتیں کرنے میں بہت وقت ضائع کر دیتے ہیں۔ اس وقت انکو کہاں سے فرصت مل جاتی ہے۔ پھر افسوس ہے کہ تلاوت قرآن کے لئے تھوڑا سا وقت نہیں دیا جاتا۔

قلق از سوزش پروانہ داری ☆ ولے از سوز ما پروا نہ داری

(تم کو پروانے کے جلنے کا قلق ہے لیکن ہمارے جلنے کی تم کو پرواہ نہیں ہے)

دوستوں کے راضی کرنے کا تو اتنا اہتمام اور خدا کے راضی کرنے کا مطلق اہتمام نہیں۔ بتلایئے اگر خدا تعالیٰ آخرت میں یہ سوال فرمائیں کہ تم نے فلاں دن فلاں دوست سے ایک گھنٹہ تک باتیں بنائیں مجھ سے آدھ گھنٹہ بھی باتیں نہ کیں تو اس کا کیا جواب دو گے۔ پس سچا جواب تو یہ ہوگا کہ یوں کہہ دو کہ ہم کو معاذ اللہ خدا سے محبت نہیں۔ اگر یہ کہہ

دو تو پھر ہم آپ سے خطاب ہی نہ کریں لیکن آپ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ آپ کو خدا تعالی سے محبت ہے اس لئے کہ آپ مومن ہیں اور مومن کی شان یہ ہے

والذین امنوا اشد حباللہ (کہ جو لوگ ایماندار ہیں ان کو اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ محبت ہے۔ ۱۲)

بس آپ کو اللہ تعالیٰ سے ضرور محبت ہے اور ایسی محبت ہے کہ کسی سے بھی اتنی محبت نہیں۔

بعض لوگوں کو شاید اس میں یہ خلجان ہو کہ ہم کو تو بظاہر اپنی اولاد اور بیوی کے ساتھ محبت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ خیال صحیح نہیں اولاد اور بیوی کے ساتھ طبعی محبت ہے عقلی محبت نہیں۔ اور طبعی محبت تو جانوروں کو بھی اپنی اولاد وغیرہ سے ہوتی ہے۔ یہ کچھ کمال نہیں اور نہ خدا اور رسولؐ کے ساتھ ایسی محبت مامور بہا ہے بلکہ محبت عقلیہ مامور بہا ہے جس کا منشا محبوب کا کمال ہوتا ہے۔ سو یہ محبت اللہ و رسولؐ کے ساتھ زیادہ ہے اور کسی کے ساتھ ان کے برابر نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے برابر صاحب کمال کوئی نہیں۔ خدا تعالیٰ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کوئی صاحب کمال نہیں۔ اس لئے آپ کے ساتھ بھی یقیناً بہ نسبت سب کے زیادہ محبت ہے مگر عقلی ہے۔ اور اگر غور کر کے دیکھا جائے تو طبعی محبت بھی مسلمانوں کو اللہ و رسولؐ ہی سے زیادہ ہے اور کسی کے ساتھ اتنی محبت نہیں مگر اس کا ظہور کسی محرک کے وقت پر ہوتا ہے چنانچہ ایک قصہ سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔

ہمارے اطراف میں ایک بزرگ مولانا ظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ گزرے ہیں جو تقویٰ کے اندر ہمارے اکابر میں مسلم و ممتاز تھے۔ وہ ایک بار موضع گڑھی پختہ میں تشریف لے گئے۔ وہاں کے رئیس نے مولانا سے سوال کیا کہ حدیث میں آیا ہے۔

> **لایؤمن احدکم حتی یکون اللہ ورسولہ احب الیہ من نفسہ ومالہ وولدہ اجمعین.** (مسند الإمام أحمد ۳:۲۰۷، ۲۷۸)

کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہ ہو گا جب تک اللہ و رسولؐ اس کی جان و مال و اولاد وغیرہ سب سے زیادہ اس کو محبوب نہ ہو جائیں۔

مگر میں دیکھتا ہوں کہ مجھے اپنے والد صاحب سے محبت زیادہ ہے مولانا نے اس وقت تو اس کا ایک مناسب جواب دے دیا۔ پھر یہ چاہا کہ ان کے اس شبہ کو عملی طور پر دفع

کردیا جائے تو زیادہ اطمینان کا باعث ہوگا۔ چنانچہ آپ نے عملی طور اس کا جواب اس طرح دیا کہ تھوڑی دیر میں باتوں باتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ شروع کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ایسا ہے جس میں ہر مسلمان کو لطف آتا ہے۔ سب لوگ شوق سے سننے لگے۔ اور وہ رئیس بھی بہت مزے لے لے کر سن رہے تھے۔ جب مولانا نے دیکھا کہ رئیس صاحب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ میں بہت مزہ آرہا ہے۔ تو درمیان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر قطع کرکے فرمانے لگے کہ اچھا خان صاحب اس ذکر کو تو رہنے دیجئے۔ اب میں کچھ آپ کے والد ماجد کے کمالات ومناقب بیان کرتا ہوں کہ وہ بھی بڑے اچھے آدمی تھے۔ وہ رئیس بولے حضرت توبہ توبہ یہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ میں میرے والد صاحب کا تذکرہ کہاں سے ٹھونس دیا۔ نہیں نہیں! آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا تذکرہ کیجئے۔ میرے والد کے کمالات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا نسبت! جو آپ درمیان میں خواہ مخواہ ان کا ذکر کرنے لگے۔ میرے قلب کو اس سے بہت گرانی ہوئی۔ مولانا نے ہنس کر فرمایا، کیوں خان صاحب! تم تو یہ کہتے تھے کہ مجھے اپنے والد کے ساتھ محبت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ میں والد صاحب کا تذکرہ گراں کیوں ہوا؟ خان صاحب سمجھ گئے کہ مولانا نے میرے شبہ کا عملی جواب دیا ہے۔ کہنے لگے، مولانا جزاک اللہ! اب میرا شبہ جاتا رہا اور معلوم ہوگیا کہ الحمدللہ! مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایسی محبت ہے کہ والد کی محبت کو اس سے کچھ بھی نسبت نہیں۔

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی ☆ مرا باجان جاں ہمراز کردی

(اللہ تعالیٰ تجھے اچھا بدلہ دیں کہ تو نے میری آنکھیں کھول دیں اور میرا محبوب حقیقی سے تعلق کردیا)

تو صاحبو! موازنہ کے وقت معلوم ہوتا ہے کہ واقعی اللہ ورسولؐ کے برابر مسلمان کو کسی سے محبت نہیں اور موازنہ ہوتا ہے کسی محرک کے پائے جانے پر۔ مثلاً فرض کرو کہ ایک شخص تمہارے ماں باپ کو گالی دے اور ایک شخص اللہ ورسول ﷺ کی شان میں (معاذ اللہ) گستاخی کرے تو بتاؤ تم کو کس پر غصہ زیادہ آئیگا۔ یقیناً جس کے اللہ ورسول ﷺ کی شان میں گستاخی کی ہے اس پر زیادہ غصہ آئے گا اور تم آپے سے باہر ہو کر اس کی زبان نکالنے پر آمادہ ہو جاؤ

گے۔ جب ہر مسلمان کی یہ حالت ہے کہ وہ اپنی ذلت اور ماں باپ کی ذلت کو گوارا کرسکتا ہے۔ مگر اللہ و رسولؐ کی شان میں ذرا سی گستاخی کا تحمل نہیں کرسکتا، تو اب مطمئن رہو کہ بحمد اللہ تم کو طبعی محبت بھی اللہ و رسولؐ سے ہی زیادہ ہے مگر اس کا ظہور کسی محرک کے پائے جانے پر ہوتا ہے اور جب آپ کو اللہ و رسولؐ سے محبت زیادہ ہے تو اب اس کے کیا معنی کہ بدون سمجھے قرآن پڑھنے سے کیا فائدہ!

حق تعالیٰ سے ہم کلامی

صاحبو! اگر کوئی محبوب ایک مہمل زبان تصنیف کرکے عاشق سے اس میں باتیں کرے تو عاشق اگر سچا عاشق ہے تو یقیناً اس کی قدر کرے گا اور وہ مہمل زبان ہی اس کی نظر میں فصیح زبان سے زیادہ پیاری ہوگی۔ کیونکہ محبوب کی زبان ہے اور قرآن تو مہمل بھی نہیں بلکہ نہایت فصیح اور بلیغ، عجیب و غریب شیریں زبان ہے جو لوگ سمجھتے ہیں وہ تو اس کی فصاحت و بلاغت اور شیرینی کو سمجھتے ہی ہیں مگر جو نہیں سمجھتے ان کو بھی اس میں بہت مزہ آتا ہے تجربہ کرکے دیکھ لو۔ اور جو لوگ تلاوت قرآن کے عادی ہیں وہ اس کا خوب تجربہ کئے ہوئے ہیں۔ اور اگر کسی وقت کوئی خوش الحان قاری مل جائے تو ذرا اس سے قرآن سن کر دیکھ لو کہ بدون معنی سمجھے تم کو مزہ آتا ہے نہیں۔ واللہ! بعض دفعہ نہ سمجھنے والوں کو بھی ایسا مزہ آتا ہے کہ دل پھٹ جاتا ہے۔ بس قرآن کی یہ حالت ہے ؎

بہار عالم حسنش دل و جان تازہ می دارد ☆ برنگ اصحاب صورت را ببو ارباب معنی را

(اس کے عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل و جان کو اپنے حسن صوری سے اور حقیقت پرستوں کے دل و جان کو اپنے حسن معنوی سے تروتازہ رکھتی ہے)

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ قرآن پڑھنا گویا اللہ تعالیٰ سے باتیں کرنا ہے۔ پھر حیرت ہے کہ آپ عاشق ہو کر اپنے محبوب سے باتیں کرنا نہیں چاہتے۔ حالانکہ محبت وہ چیز ہے کہ عاشق طرح طرح سے اس کے بہانے ڈھونڈا کرتا ہے کہ محبوب سے باتیں کرنے کا موقع ملے۔

حضرت سیدنا موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے سوال ہوا تھا

وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يَا مُوْسٰى؟ اے موسیٰ! تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟

اس کے جواب میں صرف اتنا کافی تھا کہ عصا کہہ دیتے مگر نہیں چونکہ ان کو محبت تھی تو اس وقت کو غنیمت سمجھا کہ محبوب سے باتیں کرنے کا موقع ملا ہے۔ انہوں نے تفصیل سے جواب دیا:

هِيَ عَصَايَ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ۔

یہ میری لاٹھی ہے۔ میں اس پر سہارا لگا لیتا ہوں اور اس سے بکریوں کیلئے پتے جھاڑتا ہوں۔

کتنی تطویل کی ہے کہ ھی بڑھایا تو یا متکلم کا اضافہ کیا آخر میں پھر اس لاٹھی کے منافع دو جملوں میں بیان کئے اور اس کے بعد فرمایا۔ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ۔ کہ اس میں میرے اور بھی مقاصد ہیں۔ یہ اس واسطے بڑھایا تا کہ آئندہ بھی کلام کی گنجائش رہے کہ شاید حضرت حق دریافت فرمائیں کہ ہاں صاحب وہ اور مقاصد کیا ہیں، ذرا وہ بھی بیان کیجئے۔ تو پھر اور باتیں کروں گا۔ یا خود ہی عرض کروں گا کہ حضور! اس وقت اس کی شرح نہ ہوئی تھی، اب میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ غرض آئندہ باتیں کرنے کی گنجائش رکھ لی۔ یہ بات ابھی ذہن میں آئی۔

غرض عشاق کو محبوب سے باتیں کرنے میں عجیب مزہ آتا ہے اور یہ دولت مسلمانوں کو گھر بیٹھے ہر وقت نصیب ہے کہ وہ جب چاہیں اللہ تعالیٰ سے باتیں کرلیں یعنی قرآن کی تلاوت کرنے لگیں۔ پھر حیرت ہے کہ قرآن کے بدون سمجھے پڑھنے کو بے فائدہ بتلایا جائے۔ کیا یہ فائدہ کچھ کم ہے۔ صاحبو! یہ بہت بڑی دولت ہے مگر اس کی قدر محبت والے جانتے ہیں۔ بس محبت کی ضرورت ہے عشاق کی تو یہ حالت ہے کہ محبوب کا نام سننے میں بھی مزہ آتا ہے۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے ؎

الا فاسقنی خمرا وقل لی ھیٰ خمر   ولا تسقنی سرا متی امکن الجھر

(مجھ کو شراب پلا اور زبان سے کہہ یہ شراب ہے جب تک ممکن ہو زور سے کہنا یہ شراب ہے اور آہستہ سے مت پلا)

کہ مجھ کو شراب پلا اور زبان سے یہ بھی کہتا رہ کہ شراب ہے شراب ہے۔ آخر شراب منہ سے لگ جانے کے بعد اس کی کیا ضرورت ہے کہ نام بھی لیا جائے۔ اس کا یہی راز ہے کہ محبوب کا نام سننے میں بھی مزہ آتا ہے۔ پھر غضب ہے کہ مسلمانوں کو خدا کا نام سننے

میں مزہ نہ آئے۔ اور قرآن سے زیادہ خدا کا نام کس کتاب میں ہوگا۔ ہر آیت میں قریب قریب بار بار خدا کا نام آتا ہے اور جا بجا خدا کی حمد و ثنا اس طرح کی گئی ہے کہ اس سے زیادہ کوئی نہیں کرسکتا اور گو ذکر اللہ کے اور طریقے بھی ہیں مگر نماز اور تلاوت قرآن سے زیادہ کوئی طریقہ بہتر نہیں۔ حدیث سے یہ بات تصریح کے ساتھ ثابت ہے۔

الفاظ سے عشق

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کے الفاظ کا اس قدر عشق تھا کہ آپ خود تلاوت کرتے ہی تھے۔ ایک دفعہ آپ نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے فرمایا کہ مجھے قرآن سناؤ۔ انہوں نے عرض کیا **اعلیک اقراء و علیک انزل**۔ (اوکما قال) کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو میں سناؤں حالانکہ آپ ہی پر تو قرآن اترا ہے۔ فرمایا، ہاں! میں دوسرے کی زبان سے سننا چاہتا ہوں۔ آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابی سے یہ درخواست کیوں کی حالانکہ سارا قرآن آپ کو حفظ تھا۔ اور اس کے معانی بھی آپ کے ذہن میں حاضر تھے۔ صرف اسی لئے کہ قرآن کے الفاظ سے آپ کو عشق تھا۔ اور دوسرے کی زبان سے سننے میں بوجہ یکسوئی کے مزہ زیادہ آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ صرف الفاظ قرآن بھی بدون لحاظ معنی کے مطلوب و مقصود ہیں۔

صاحبو! اس سے بڑھ کر الفاظ قرآن کا نفع اور کیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ قرآن پڑھنے والے کی قرأت کی طرف بہت توجہ فرماتے اور نہایت توجہ سے سنتے ہیں۔ اب غور کر لیجئے کہ اگر کسی عاشق کو کسی مخبر سے یہ معلوم ہو جائے کہ محبوبہ تیرا گانا سن رہی ہے تو بتلایئے وہ کیسے مزے لے لے کر گائے گا اور کس طرح بنا سنوار کر پڑھے گا۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل اور اصدق کون مخبر ہوگا۔ سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو خبر دی ہے کہ حق تعالیٰ قرآن پڑھنے والے پر بہت متوجہ ہوتے اور نہایت توجہ سے اس کی قرأت سنتے ہیں۔ اس سے بھی الفاظ کا مقصود ہونا ظاہر ہے کیونکہ قرأت اور استماع، الفاظ ہی کے متعلق ہے نہ کہ معانی کے۔ اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہم کو قرآن پڑھتے ہوئے اس امر کا استحضار کرنا چاہیے کہ حق تعالیٰ ہماری قرأت کو سن رہے ہیں۔ اس مراقبہ کا اثر یہ ہوگا کہ نہایت احتیاط اور اہتمام کے

ساتھ صحت کا لحاظ کر کے قرأت کی جائے گی اور بے پروائی کے ساتھ نہ پڑھا جائے گا۔

توجہ علی الالفاظ کی ضرورت

دوسرے اچھا میں نے مانا کہ معانی ہی اصل مقصود ہیں مگر یہ کبھی نہ مانوں گا کہ معانی ہر وقت مقصود ہوتے ہیں بلکہ ایک وقت ایسا بھی ضرور ہونا چاہئے جس میں صرف الفاظ ہی مدنظر ہوں اور معانی پر التفات نہ ہو۔ جیسا کہ ریاضی میں پہاڑے یاد کئے جاتے ہیں اس وقت مقصود پر اصلاً نظر نہیں ہوتی بلکہ صرف الفاظ ہی کو رٹا جاتا ہے۔ اور جیسے کھانا کھانے سے مقصود قوت ہے مگر کھانے کے وقت لذت پر نظر ہوتی ہے۔ صورت پر بھی نظر ہوتی ہے کہ روٹی جلی ہوئی سیاہ نہ ہو، سالن میں نمک مرچ بہت تیز نہ ہو۔ اس وقت کوئی یہ نہیں کہتا کہ مقصود تو قوت ہے۔ صورت اور لذت پر نظر کرنا بے فائدہ ہے۔ افسوس دنیا کی چیزوں میں تو صورت اور لذت پر نظر ہو اور قرآن میں یہ امور بے فائدہ ہو جائیں حیرت ہے۔ اور تلاوت قرآن میں لذت اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب کہ تلاوت کے وقت معانی پر توجہ نہ ہو صرف الفاظ پر ہی توجہ ہو۔ کیونکہ وہ مراقبہ جو ابھی بیان ہوا ہے کہ تلاوت کے وقت اپنے کو پڑھنے والا سمجھے بلکہ حق تعالیٰ کو متکلم سمجھے اور اپنے کو مثل شجرہ طور کے حاکی اور ناقل سمجھے۔ یہ مراقبہ صرف الفاظ ہی پر توجہ کرنے میں حاصل ہو سکتا ہے معانی پر توجہ کے ساتھ جو مراقبہ نہیں ہو سکتا چاہے تجربہ کر کے دیکھ لو۔ اسی طرح یہ مراقبہ بھی کہ اللہ تعالیٰ ہماری تلاوت کو سن رہے ہیں۔ صرف توجہ علی الالفاظ سے حاصل ہوتا ہے بدون اس کے نہیں ہو سکتا۔ پھر الفاظ بدون فہم معانی کے بیکار کیوں ہوئے۔

صاحبو! دریا کی سطح کی سیر میں جو لذت ہے وہ سیر عمق میں نہیں ہے گو سیر عمق سے موتی ہاتھ لگتے ہیں جو سطح کی سیر سے حاصل نہیں ہوتے۔ مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ سطح دریا کی سیر بیکار ہے ہرگز نہیں۔ اطباء سے پوچھو، وہ سطح دریا کی سیر کو فرحت بخش بتلاتے اور کہتے ہیں کہ اس سے دل اور دماغ کو سرور اور نگاہ کو تازگی و نور حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ مدقوق کے لئے سیر دریا اسی واسطے تجویز کی جاتی ہے کہ اس کو فرحت ہو۔ اور فرحت سے طبیعت کو قوت حاصل ہو جس سے مرض کو وہ از خود دفع کر دے، تو کیا سطح دریا کی سیر کو تو بیکار نہ کہا جائے اور سطح قرآن کی سیر کو بیکار کہا جائے کتنا بڑا ستم ہے۔

لذت الفاظ و معانی

علاوہ ازیں یہ کہ اصل مقصود تمام طاعات سے قرب حق ہے۔ حق تعالیٰ کے یہاں سے اولاً الفاظ آئے ہیں اور معانی ان کے تابع ہو کر آئے ہیں۔ پس الفاظ کو اللہ تعالیٰ سے قرب زیادہ ہوا۔ اگر یہ الفاظ قرآن بے معنے بھی ہوتے تو عاشق کے لئے یہی کافی تھے۔ کیونکہ محبوب اگر عاشق کو کوئی چیز دے تو وہاں دو لذتیں ہیں۔ ایک لذت محبوب کے ہاتھ سے ملنے کی۔ دوسرے لذت اس چیز کے کھانے کی۔ اور ظاہر ہے کہ عاشق کے رقص کے لئے تو یہی لذت کافی ہے کہ اس کو محبوب کے ہاتھ یہ چیز ملی ہے۔ چنانچہ بعض دفعہ اس چیز کو صرف بھی نہیں کیا جاتا بلکہ محبوب کی یادگار سمجھ کر بطور تبرک کے رکھ لیا جاتا ہے۔ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو ایک قیراط زیادہ دیا تھا۔ انہوں نے اس کو خرچ نہیں کیا بلکہ اس کو ہمیشہ اپنے پاس ہی رکھا۔ پس عشاق کے لئے تو الفاظ قرآن ہی رقص کے واسطے کافی تھے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اولاً و بالذات ہم کو ملے ہیں۔ گو ان میں معانی بھی نہ ہوتے مگر معانی کے ساتھ دو لذتیں جمع ہو گئیں تو اب یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ لذت معانی سے لذت الفاظ کو چھوڑ دیا جائے بلکہ دونوں لذتیں قابل لحاظ ہیں۔ اور الفاظ کی لذت اس جہت سے زیادہ قابل لحاظ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اولاً آئے ہیں۔ گویا باعتبار قصد کے معانی اصل ہیں اور الفاظ ان کے تابع۔ غرض بعض جہات سے الفاظ کو زیادہ قرب ہے اور بعض جہات سے معانی کو زیادہ قرب ہے اور کوئی ایک دوسرے سے مغنی نہیں۔ یہ میں نے اس لیے کہہ دیا ہے کہ کہیں حفاظ خوش نہ ہوں کہ ہم سب سے افضل ہو گئے کیونکہ الفاظ کو اللہ تعالیٰ سے قرب زیادہ ہے۔ تو وہ ایک طرفہ فیصلہ کر کے خوش نہ ہوں۔ میں ایک طرفہ فیصلہ کر کے ڈگری نہیں دیتا بلکہ دونوں جماعتوں کے لیے فیصلہ کرتا ہوں کہ بعض جہات سے اہل الفاظ افضل ہیں اور بعض جہات سے اہل معانی۔ اور قرآن کی دونوں چیزیں قابل اہتمام ہیں صورت بھی اور معنی بھی کیونکہ ہر چیز کی طرف صورت و معنی دونوں ہی کی وجہ سے رغبت ہوتی ہے۔ صورت کو کوئی بیکار نہیں کہہ سکتا۔

الفاظ کی اہمیت

دیکھئے! کالپی کی مصری شیرینی میں تو یہاں کی بجری کے برابر ہے مگر صورت اور صفائی کی وجہ سے لوگ اس کو منگاتے ہیں کیونکہ صورت خوش دیکھ کر کسی چیز کا کھانا عجیب لطف دیتا ہے۔

اسی طرح کپڑوں میں ایک صورت ہے ایک معنی۔ مقصود تو ستر عورت ہے اور گرمی و سردی سے بچنا۔ اس میں ہر قسم کا کپڑا یکساں ہے اور ایک صورت ہے یعنی کپڑے کی باریکی، نزاکت اور نقش ونگار وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ صورت محض بیکار نہیں بلکہ اس کے لئے بھی بڑی کوشش کی جاتی ہے۔

اور دیکھئے! عورت کی ایک صورت ہے ایک معنی۔ معنی تو ہم بستری اور خانہ داری کا کام لینا ہے۔ اس مقصود کے لئے ہر عاقل و بالغ عورت کافی ہے اور ایک صورت ہے کہ رنگ بھی اجلا ہو، ناک نقشہ بھی خوبصورت ہو، خاندان کی بھی بڑی ہو۔ اگر صورت بیکار ہے تو یہاں صورت پر کیوں مرتے ہو؟ اور کیوں اس کے لئے خاک چھانی جاتی ہے؟

اسی طرح ادویہ میں بہت چیزیں ایسی ہیں جو باہم یکساں خاصیت رکھتی ہیں مگر بعض ادویہ کو صورت نوعیہ کی وجہ سے اختیار کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ادویہ میں بعض موثر بالخاصہ بھی ہوتی ہیں جیسے تعلیق کہربا خفقان کو نافع ہے۔ تو ایسی ادویہ صورت نوعیہ کی وجہ سے موثر ہوتی ہیں۔ یہاں صورت کا لحاظ کیا جاتا ہے۔

اسی طرح بہت سے الفاظ باہم متحد المعانی ہوتے ہیں مگر صورت کی وجہ سے ان میں بڑا فرق ہوتا ہے اسلئے بعض الفاظ القاب و آداب میں اپنی صورت کی وجہ سے مطلوب ہوتے ہیں اگر ان کی جگہ دوسرے الفاظ انہی کے ہم معنی بولے جائیں تو سخت حماقت قرار دی جاتی ہے۔ مثلاً کوئی باپ کو برخوردار، نور چشم لکھے تو پاگل شمار ہوگا۔ حالانکہ اس کے معنی کچھ بھی برے نہیں۔ برخوردار بمعنی دام ظلکم کے ہے کہ ہمیشہ دنیا سے پھل کھاتے رہیں یا صاحب نصیب ہوں۔ اور نور چشم کے معنی ہیں آنکھ کی روشنی۔ تو باپ تو آنکھ اور کان سب ہی کا وسیلہ ہے۔ یہ آنکھ کی روشنی بھی اولاد کو باپ ہی سے ملی ہے۔ تو بمعنی تو برے نہیں مگر الفاظ کی صورت کی وجہ سے کاتب کو احمق اور پاگل بنایا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ دعویٰ غلط ہے کہ معنی ہی ہمیشہ مطلوب ہوتے ہیں اور الفاظ مطلوب نہیں ہوتے۔

اس سے بڑھ کر اور سنئے۔ انسان کی ایک صورت ہے اور ایک معنی۔ چنانچہ معنی انسان روح انسانی ہے جس کی بدولت آدمی گدھے، کتوں سے ممتاز ہے۔ تو اگر یہ دعویٰ مان لیا جائے کہ صورت محض بیکار ہے تو ان مدعیوں کو چاہیے کہ اپنی اولاد کا گلا گھونٹ دیا کریں کیونکہ یہ تو محض صورت ہے۔ اس کی کیا ضرورت ہے بلکہ مقصود تو معنی ہے یعنی روح اور وہ گلا گھونٹنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے کیونکہ موت سے ارواح فنا نہیں ہوتیں۔ تو کیا اس کو کوئی عاقل گوارا کر سکتا ہے؟ ہر گز نہیں۔

معلوم ہوا کہ معنی کی طرح صورت بھی مطلوب ہے۔ پھر قرآن ہی میں اس کے خلاف یہ نیا قاعدہ کیوں جاری کیا جاتا ہے کہ اس کی صورت یعنی الفاظ بدون معنی کے بیکار ہے۔ الحمدللہ! میں نے مختلف وجوہ سے مسئلہ کو ثابت کر دیا کہ الفاظ قرآن بدون فہم معنے کے بھی مطلوب ہیں اور ان کا پڑھنا ہر گز بیکار نہیں۔ اور یہ دعویٰ بالکل باطل ہو گیا کہ بدون معنی کے الفاظ پڑھنے سے کیا فائدہ۔

بلا متن قرآن کا اردو ترجمہ

اس خیال کے لوگوں نے ایک قرآن صرف اردو ترجمہ کی صورت میں بدون متن قرآن کے شائع کیا ہے۔ خوب سن لیجئے کہ اس کا خریدنا حرام و ناجائز ہے۔ کیونکہ اس کا منشا وہی ہے کہ یہ لوگ الفاظ قرآن کو بیکار سمجھتے ہیں۔ دوسرے اس میں بڑی خرابی یہ ہے کہ اگر یہ صورت شائع ہو گئی تو اندیشہ ہے کہ کبھی یہود و نصاریٰ کی طرح مسلمانوں کے پاس بھی قرآن کا ترجمہ ہی رہ جائے۔ اور اصل غائب ہو جائے جیسا کہ تورات و انجیل کے تراجم ہی آج کل دنیا میں رہ گئے ہیں اور اصلی کتاب معدوم ہو گئی۔ پھر ترجمہ کے اندر ہر شخص کو آسانی سے تحریف کا موقع مل جائے گا۔ اور جب اصل قرآن بھی ترجمہ کے ساتھ ہو گا تو کسی کی تحریف چل نہیں سکتی کیونکہ اس سے ہر شخص ترجمہ کا مقابلہ کر کے اس کی صحت و خطا کو موازنہ کر سکے گا۔

اردو میں نماز

اسی خیال کے بعض لوگوں نے ایک زمانہ میں یہ حرکت بھی شروع کی تھی کہ نماز کے اندر قرآن کا اردو ترجمہ پڑھنے لگے تھے اور دلیل وہی تھی کہ بے سمجھے قرآن پڑھنے سے کیا نفع ہے

۔ اس کے چند جواب عقلی اور نقلی میں اوپر دے چکا ہوں اور ایک جواب سر سید احمد خان نے دیا ہے جس کو مجھ سے مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی نے نقل کیا ہے اور وہ اس خیال کی جماعت پر زیادہ حجت ہوگا کیونکہ وہ جواب نہی کے ہم جنس کا اور ان کے مذاق کے موافق ہے ۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ بعض خاصیتیں قرآن مجید کے الفاظ کی ہیں اور بعض خاصیتیں اس کے معانی کی۔ معانی کی خاصیت تو یہ ہے کہ ان کو سمجھ کر پڑھنے سے قرآن کا مطلب معلوم ہوگا۔ اور الفاظ کی خاصیت متکلم کی عظمت وشوکت وصولت کا استحضار ہے اور یہ صرف قرآن ہی کے الفاظ کے ساتھ خاص ہے ۔ دوسری کسی زبان کو خواہ اس میں کیسا ہی فصیح وبلیغ ترجمہ کر دیا جائے ہر گز نصیب نہیں ہوسکتی اور عبادت سے مقصود معبود کی عظمت دل میں پیدا کرنا ہے اور افعال جوارح سے اس عظمت کا ظاہر کرنا نہ کہ استحضار قصص وواقعات ۔ پس جو لوگ اردو ترجمہ سے نماز پڑھیں گے ان کے دل میں خدا کی وہ عظمت نماز کے اندر پیدا نہ ہوگی جو الفاظ قرآن کے ساتھ نماز پڑھنے والوں کے دل میں ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ لوگ نماز میں ایسی زبان میں قرآن پڑھیں گے جو بندوں کی ایجاد ہے جو یقیناً اصلی کلام الٰہی کے برابر باعظمت وشوکت نہ ہوگی۔ نیز ان لوگوں کو نماز میں یکسوئی بھی حاصل نہ ہوگی کیونکہ یکسوئی کے لئے استحضار عظمت ضروری ہے اور ترجمہ سے اس درجہ استحضار عظمت نہ ہوگا جو اصل قرآنی الفاظ سے ہوتا ہے۔ غرض محبت وعشق کے لحاظ سے بھی اور نقل وعقل کے اعتبار سے بھی اور تمدن و سیاست کے لحاظ سے بھی الفاظ قرآن کے اہتمام کا نہایت ضروری ہونا ثابت ہوگیا۔ پس مسلمانوں کو تعلیم قرآن اور تلاوت قرآن کا پابندی کے ساتھ اہتمام کرنا چاہیے۔

صحت قرأت کا اہتمام

جب الفاظ قرآن مقصود ہوگئے تو ان کے صحیح پڑھنے کا بھی اہتمام ضروری ہے کیونکہ جب تک الفاظ کو صحیح طور پر ادا نہ کیا جائے گا، اس وقت تک وہ عربی زبان نہ کہلائے گی اور تصحیح الفاظ کے بعد اگر عربی لہجہ (اس سے تکلف وتغنی کا لہجہ مراد نہیں بلکہ بے تکلف لہجہ جس میں صفات ومخارج کی پوری رعایت ہو۔ گو بلا قصد طبیعت کی موزونیت سے کسی لحن غنا پر منطبق بھی ہوجائے بقصد تطبیق نہ ہو۔ ۱۲ منہ) بھی حاصل کرلیا جائے تو نور علیٰ نور ہے۔ چنانچہ آج

کل انگریزی میں بڑا قابل وہ شمار ہوتا ہے جس کا لہجہ بھی انگریزوں سے ملتا جلتا ہو اور انگریزی لب ولہجہ حاصل کرنے کی بڑی کوشش کی جاتی ہے کہ بعض لوگ تو اسی غرض سے اپنے بچوں کو میموں ہی کے ہاتھ سے پلواتے ہیں تاکہ بچپن ہی سے انگریزی لہجہ بمنزلہ فطری ہو جائے حالانکہ لب ولہجہ پر ڈگری ملنا موقوف نہیں اور سارٹیفکیٹ بغیر اس کے بھی مل سکتا ہے۔ صرف حسن کلام اور زیادہ مدح وثنا کے لئے اس میں کوشش کی جاتی ہے۔ پھر دین میں اس کو بیکار وفضول کیوں کہا جاتا ہے؟

مجھے بعض پڑھے لکھوں پر تعجب ہے کہ وہ قرأت میں لہجہ کے مخالف ہیں اور اس کو فضول ولایعنی بتلاتے ہیں حالانکہ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ہر زبان کا ایک خاص لب ولہجہ ہوتا ہے۔ فارسی کا لہجہ الگ ہے انگریزی کا جدا۔ بنگلہ کا جدا، اردو کا علیحدا اور ہر زبان میں لہجہ کی قدر ہے۔ پھر حیرت ہے کہ عربی میں لہجہ کی قدر نہ ہو اور یہاں اسے فضول قرار دیا جائے۔ یہ سب باتیں قلت محبت سے ناشی ہیں۔ اگر محبت ہوتی تو قرآن کے اندر بھی لب ولہجہ، عربی کی عظمت ہوتی اور اس کی کوشش کی جاتی کہ قرآن کو اس طرح پڑھیں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے تھے۔ بعض لوگ اس میں کلام کرتے ہیں کہ تجوید کی ضرورت کس دلیل سے ہے؟ اس کا جواب فقہ وحدیث سے تو یہ ہی جن میں اس کے وجوب (یعنی ایک درجہ قرأت کا واجب ہے اور وہ حروف کی تصحیح اور مخارج سے صحیح ادا کرنا ہے۔ دوسرا درجہ مستحب ہے۔ کہ صفات الفاظ ولہجہ ادا بھی حاصل کیا جائے۔ علاء السنن کے علاوہ کتاب القراۃ میں قرآن وحدیث وفقہ سے اس کے لزوم پر کافی بحث کی گئی ہے۔ قابل مطالعہ ہے ۱۲ظ) واستحباب کے دلائل بالاستیعاب مذکور ہیں۔ مگر میں اس کا جواب ایک نئے طریقے سے دیتا ہوں۔ وہ یہ کہ ہماری زبان میں ''جھاڑو'' کے اندر 'ہا' کا اخفاء ہے۔ اب اگر کوئی شخص ''جھاڑو بفتح ہا'' کہے تو اہل زبان اس شخص کو بے وقوف بنائیں گے اور کہیں گے کہ ہندوستانی نہیں بلکہ بنگالی معلوم ہوتا ہے۔ ایسے ہی پنکھا، گنگا، سنگ، زنگ وغیرہ میں نون کو اخفا سے ادا کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص نون کو ظاہر کر کے پڑھے یعنی پن کھا اور، گن گا اور سن گ اور زن گ کہے تو سب اس کو احمق اور غلط خوان کہیں گے۔

اسی طرح بعض الفاظ کے ادا کا عربی میں خاص طریقہ ہے۔ مثلاً ان کان میں نون

کا اخفاء ہے۔ اگر یہاں نون کو ظاہر کیا جائے گا غلط ہوگا مگر لوگ اس کی طرف توجہ ہیں کرتے اور اس کو سچ سمجھتے ہیں مگر میں سختی کے ساتھ کہتا ہوں کہ شرعاً علم قرأت کی تحصیل ضروری ہے۔ پس اس کو اعتقاداً تو ضروری ہی واجب سمجھو۔ پھر جس کا جی چاہے عمل بھی کرے۔ اگر عمل نہ کرے گا تو محض گناہ ہی ہوگا۔ اعتقاد تو سلامت رہے گا مگر اس کا مطلب نہیں کہ اگر قرأت نہ آئے تو قرآن کی تعلیم ہی حاصل نہ کی جائے؟ نہیں! بلکہ قاری میسر نہ ہو قرآن کو اول بلا قرأت ہی پڑھ لو۔ پھر جب قاری مل جائے اس سے تصحیح حروف بھی کر لو۔

دینی و دنیوی ناکامی کا اثر

اس پر بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ بوڑھے طوطے اب کیا پڑھیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر آج ہی سرکار کی طرف سے اعلان ہو جائے کہ جو شخص قانون کی کتاب یاد کر لے گا اس کو سو روپیہ یا ہزار روپیہ کا انعام ملے گا، تو یہ سب بوڑھے طوطے آج ہی پوتے بن جائیں گے اور قانون یاد کرنے لگیں گے۔ مگر افسوس! خدا کے یہاں کے انعام وثواب کی قدر نہیں حالانکہ بعد کوشش کے ناکامی کے بعد خدا کے یہاں سے ثواب زیادہ ملتا ہے۔ دنیا میں تو ناکامی کے بعد کچھ بھی نہیں ملتا۔ اگر کوئی شخص سرکاری تعلیم حاصل کرے اور امتحان میں اس کو ناکامی ہو جائے تو اس کی ساری محنت اکارت جاتی ہے۔ مگر خدا کے یہاں یہ قاعدہ نہیں ہے بلکہ وہاں یہ قاعدہ ہے کہ جو شخص کوشش میں لگ جائے وہ کامیاب ہی ہوتا ہے۔ خواہ ظاہر میں کوشش کا نتیجہ حاصل ہو یا نہ ہو۔

مثلاً آپ تصحیح قرآن کے اسباب اختیار کر لیں اور کسی قاری سے حروف کی مشق شروع کریں۔ اگر حروف صحیح ہو گئے تب تو کامیابی ظاہر ہے۔ اگر صحیح بھی نہ ہوئے اور قاری نے کہہ دیا کہ تم سے اس کی امید نہیں۔ تمہاری زبان درست نہ ہوگی، تو اس وقت ظاہر میں آپ ناکام ہیں مگر خدا کے یہاں کامیاب ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو وہی ثواب دیں گے جو صحیح پڑھنے والوں کو دیا جائے گا۔ حدیث میں ہے:

الماهر بالقرآن مع السفرة الكرام البررة والذى يتتعتع به وهو عليه شاق فله اجران (اوكما قال) (الصحيح للبخاری ۹:۱۹۳، سنن ابن ماجة:۳۷۷۹)

یعنی جو شخص قرآن پڑھنے میں ماہر ہے وہ تو ملائکہ کے ساتھ ہے اور جو اٹک اٹک

کر پڑھتا ہے اور قرآن کا پڑھنا اس کو دشوار ہے، اس کے لئے دوہرا ثواب ہے کیونکہ یہ قرأت بھی کر رہا ہے اور مجاہدہ بھی کر رہا ہے۔ تو اس کو قرأت کا ثواب الگ ملے گا اور مشقت ومجاہدہ کا ثواب الگ۔ سبحان اللہ! کیسی قدرداں سرکار ہے مگر لینے والا بھی کوئی ہو۔ مولانا ایسی ہی ناکامی کو فرماتے ہیں۔

بس زبون وسوسہ باشی ولا   گرطرب راباز دانی ازبلا
گرمرادت رامذاق شکرہست   بے مرادی نے مراد دلبرست

(پس براوسوسہ ہوائے دل اگر خوشی سے بلا کو جدا کیا جائے، اگر تمہاری مراد شکر کی طرح میٹھی ہے، کیا مرادی محبوب کی مراد نہیں ہے)

یعنی جب تک تم کامیابی اور ناکامی میں فرق کرتے ہو اس وقت تم وسوسہ نفس سے مغلوب ہو بلکہ اس طریق میں اصل مقصود کوشش اور طلب ہے۔ اس کے بعد اگر ظاہر میں بھی کامیابی ہو جائے تو نفس کا مطلوب بھی حاصل ہو گیا اور اگر ظاہر میں ناکامی ہو تو وہ اس وقت حضرت حق کا مطلوب ہے!

تفویض وطلب کی ضرورت

اب حیرت ہے کہ تم اپنے مطلوب کو محبوب کے مطلوب پر ترجیح دیتے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ تم کو تفویض کے ساتھ طلب میں مشغول ہونا چاہیے اور ہر نتیجہ پر راضی رہنا چاہیے خواہ نتیجہ اپنی مراد کے موافق ہو یا خلاف ہو۔ بس یہاں تو بڑا مطلوب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ دیکھ لیں کہ ہم ان کی طلب میں مشغول ہیں اور یہ مدعا ہر حالت میں حاصل ہے۔

مولانا غلام رسول صاحبؒ کانپوری جو رسول نما کے لقب سے مشہور ہیں۔ کیونکہ ان کی یہ کرامت تھی کہ وہ ہر شخص کو بیداری میں سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرادیا کرتے تھے۔ ان کا قصہ ہے کہ جب وہ اپنے مرشد کے پاس بغرض بیعت حاضر ہوئے تو شیخ نے فرمایا کہ پہلے استخارہ کرو اس کے بعد آؤ۔ یہ وہاں سے اٹھ کر مسجد میں تھوڑی دیر بیٹھ کر جلدی ہی حاضر خدمت ہو گئے۔ شیخ نے فرمایا کہ استخارہ کر لیا۔ کہا، جی ہاں کر لیا۔ فرمایا تم تو بہت جلدی آ گئے۔ تم نے کس طرح استخارہ کیا تھا۔ کہا، میں نے اپنے نفس سے پوچھا تھا

تو کس لئے بیعت ہونا چاہتا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ خدا تعالیٰ ملے گا۔ میں نے کہا کہ بیعت کے بعد تجھے اپنی جان و مال پر کچھ اختیار نہ رہے گا بلکہ جو شیخ کہے گا وہی کرنا پڑے گا۔

میرے نفس نے جواب دیا کہ کچھ پرواہ نہیں خدا تو ملے گا۔ میں نے پھر یہ کہا کہ اگر خدا بھی نہ ملا تو کیا ہوگا۔ نفس نے جواب دیا کہ بلا سے نہ ملے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ میں نے ان کو طلب کیا تھا۔ بس مجھے یہی کافی ہے۔

ہمینم بس کہ داند ماہ رویم ☆ کہ من نیز از خریداران ادیم

(یہی کافی ہے کہ محبوب کو معلوم ہو جائے کہ میں بھی اس کے خریداروں میں ہوں)

شیخ نے فرمایا کہ تمہارا استخارہ سب سے بڑھا ہوا ہے۔ آؤ بیعت ہو جاؤ۔ تم ان شاء اللہ ناکام نہ ہوگے۔

صاحبو! طلب اس کا نام ہے کہ صرف طالبوں میں داخل ہونے ہی کو کافی سمجھے۔ اسی کا نام طلب صادق ہے اور جس کی ایسی طلب ہو وہ ان شاء اللہ کامیاب ہی ہوتا ہے مگر افسوس! آج کل لوگوں میں طلب ہی نہیں۔

چنانچہ ایک عالم جلیل نے میری طرف ذکر و شغل کے لئے رجوع کیا تھا۔ اب میرے پاس ان کا خط آیا ہے کہ ہم نے بہت محنت کی۔ اب تک ہمارا مقصود حاصل نہیں ہوا تو آپ مجھ کو یہ بتلا دیں کہ مجھ میں اس مقصود کے حاصل ہونے کی استعداد ہے یا نہیں۔ اگر استعداد ہو تو ہم محنت کریں نہیں تو ہم نے دنیا کی عیش کو بھی کیوں ترک کیا اور کچھ کریں۔ میں نے جواب میں لکھا کہ آپ کا خط نہایت گستاخانہ آیا جس سے معلوم ہوا کہ آپ کے دل میں خدا تعالیٰ کی طلب اور عظمت نہیں ہے۔ آپ نے ایسی بات لکھی ہے جو ایک مردار رنڈی کا عاشق بھی رنڈی سے نہیں کہہ سکتا کہ بی! اگر آپ سے وصال کی امید ہو تو میں آپ کی رضا و عشق میں کوشش کروں اور اگر وصال کی امید نہ ہو تو مجھے اطلاع دو تا کہ میں تمہارے عشق کو چھوڑ کر دوسرے کام میں لگوں۔ اور اگر کوئی آپ جیسا مدعی عشق کسی رنڈی سے یہ بات کہے تو غور کر لیجئے وہ کیا جواب دے گی۔ یقیناً یہ کہے گی کہ نامعقول! میں نے کب تیری خوشامد کی تھی کہ تو مجھ سے عشق بازی کر جو میں اس کے انجام کی تجھے خبر کروں اور وعدے کروں۔ اگر تجھے عشق کا تحمل نہیں تو عاشق

ہونے کا دعویٰ ہی کیوں کیا تھا؟ جا اپنا کام کر! مولانا، آپ کو اب تک طلب ہی حاصل نہیں تو مطلوب کیوں کر حاصل ہو۔ طلب تو وہ چیز ہے کہ دل کے اندر پیوستہ ہو جائے جو کسی کے نکالے نہ نکل سکے۔ اگر عاشق خود بھی اس کو نکالنا چاہے تو نکالنے پر قادر نہیں ہوتا۔ شاعر کہتا ہے۔

عذل العوازل حول قلبی التاۂ ☆ وھوی الاحبۃ منہ فی سوداۂ

(ملامت گروں کی ملامت قلب کے گرداگرد ہے، اور دوستوں کی محبت سودائے قلب میں ہے)

اور جب آپ طلب کو دنیوی عیش و راحت حاصل کرنے کے لئے چھوڑ سکتے ہیں تو یقیناً آپ کے دل میں طلب نہیں بلکہ محض نام ہی نام ہے۔ عشق وہ چیز ہے کہ اگر عاشق کو یقین ہو جائے کہ اس میں میری جان جاتی رہے گی اور وصال سے پہلے ہی مر جاؤں گا، جب بھی وہ عشق کو نہیں چھوڑ سکتا اور یوں کہے گا۔

گر نہ شاید بدوست راہ بردن ☆ شرط عشق ست در طلب مردن

(اگر دوست کی طرف راہ لے جانا نہیں ناممکن ہے تو شرط عشق یہ ہے کہ طلب میں مرجائے)

عاشق موت سے کبھی نہیں ڈرتا۔ ہاں اس کو یہ تمنا ہوتی ہے کہ محبوب بھی دیکھ لے کہ یہ میری محبت میں جان دے رہا ہے تاکہ اس وقت محبوب سے خطاب کر کے یوں کہہ سکے۔

بجرم عشق توام می کشند غوغائیست ☆ تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشائیست

(عشق کے جرم میں مجھ کو قتل کرتے ہیں تو بھی بام پر آ جا، اچھا تماشائی تو ہی ہے)

واللہ! عاشق کے لیے محبوب کی نظروں کے سامنے اس کی محبت میں جان دے دینا یہی بڑی کامیابی ہے اور حق تعالیٰ کا ہم کو اور ہماری محبت کو دیکھنا اور جاننا یقینی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس کو لوگ کامیابی نہیں سمجھتے۔

میرے جواب کے بعد ان عالم صاحب کا دوسرا خط آیا کہ اب تو مجھے صاف ہی کہنا پڑا۔ اگر اجازت ہو تو صاف صاف لکھوں۔ میں نے جواب دیا کہ میری اجازت نہیں ہے کیونکہ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تم بدفہم شخص ہو۔ نہ معلوم صاف کہنے پر آؤ گے تو کیا گل کھلاؤ گے۔ تمہارے اجمال نے تو میرے دل کو اتنا زخمی کیا ہے جس کو میں ہی جانتا ہوں تفصیل سے نہ معلوم کیا حال ہوگا۔ بس مجھے معاف کرو۔ اور کسی ایسے شخص سے رجوع کرو جو اول ہی دن تمہارا اطمینان

کردے کہ تم ضرور کامیاب ہوگے اور میرے یہاں تو ایسے طالب کو کان پکڑ کے نکال دیا جاتا ہے جو خدا کے طلب میں ایسی شرطیں لگائے۔ طالب کی شان تو یہ ہونا چاہیے کہ ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من ☆ دل فدائے یار دل رنجان من

(تیرا ناخوش ہونا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے، ایسے محبوب پر دل و جان قربان ہے
جو میرے دل کو رنجیدہ کرنے والا ہے)

کیا طالب خدا کو خدا کے ساتھ اتنا تعلق بھی نہ ہو جتنا بچہ کو ماں سے ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ماں بچہ کو مارتی بھی ہے، دھکے بھی دیتی ہے مگر جتنے دھکے دیتی ہے بچہ اتنا ہی ماں کو لپٹتا ہے اور اس کو نہیں چھوڑتا واللہ جو طالب حق ہیں اگر ان کو ادھر سے دھکے بھی دیئے جائیں اور پورا یقین ہو جائے کہ ہم محروم ہی رہیں گے اور دوزخ میں جائیں گے جب بھی وہ طلب کو ہاتھ سے نہ دیں گے۔ عبد کی شان ہی یہ ہے کہ وہ اپنے آقا کے راضی کرنے کی کوشش میں لگا رہے۔ اور میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ عاشق حق اور طلب حق کی ناکامی، عاشق غیر اور طلب غیر کی اس کامیابی سے ہزار درجہ بہتر ہے جس کو وہ اپنے زعم میں کامیابی سمجھ رہا ہے۔ اگر ناکامی فرض بھی کر لی جائے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا سچا عاشق اور سچا طالب کبھی ناکام نہیں رہ سکتا، نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔

راحت طلبی کا نتیجہ

کیونکہ دنیا میں اصل کامیابی راحت و اطمینان کا نام ہے۔ تمام اسباب کامیابی اسی کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں اور یہ طالبان حق کے پاس سب سے زیادہ ہے۔ کیونکہ پریشانی کی اصل وجہ تجویز ہے کہ ہم نے چاہا تھا کچھ اور، ہوگیا کچھ اور۔ سو اہل اللہ اس کو فنا کر دیتے ہیں۔

ہمارے اس چاہنے کا سلسلہ ایسا ہے جیسے ایک مجذوب کی لنگوٹی کا قصہ ہے کہ ایک مجذوب ننگا رہتا تھا۔ اس کے معتقدوں نے اصرار کیا کہ حضور کم از کم ایک لنگوٹی تو باندھ لیا کریں۔ ان کے اصرار سے اس نے لنگوٹی باندھ لی، مگر کھانا کھاتے ہوئے اس پر دودھ سالن گرنے لگا۔ کیونکہ بعض مجذوبوں کا کھانے کا طریقہ ہیں آتا وہ اسی طرح کھاتے ہیں کہ بہت سا کھانا سینہ پر اور ہاتھوں پر گرتا رہتا ہے۔ جب لنگوٹی پر دودھ وغیرہ گرنے لگا

توچوہوں نے اسے کترنا شروع کیا معتقدوں نے چوہوں کے واسطے بلی پالی اور بلی کھانا کھانے لگی۔ اس کی حفاظت کے لئے ایک آدمی رکھا گیا جورات وہیں رہے۔ جب آدمی نے عمدہ غذائیں کھائیں تو نکاح کی ضرورت ہوئی۔ نکاح ہوا، تو بچے بھی ہو گئے۔ ایک دفعہ مجذوب نے دیکھا کہ ایک مجمع گھیرے ہوئے ہے۔ معتقدوں سے اس کا سبب پوچھا، انہوں نے سب تفصیل بیان کی۔ معلوم ہوا کہ یہ سارا جھگڑا لنگوٹی کی وجہ سے ہے تو اس نے لنگوٹی اتار پھینکی کہ جاؤ ہم جڑ ہی کاٹے دیتے ہیں۔ ایک ذراسی لنگوٹی کے لئے اتنا بڑا سامان! اسی طرح ہماری تجویز مجذوب کی لنگوٹی ہے کہ اس میں شاخ سے شاخ نکلتی جاتی ہے اور برابر پریشانیاں بڑھتی جاتی ہیں۔ اس لئے اہل اللہ نے اس تجویز ہی کو رخصت کر دیا۔

اہل اللہ کی راحت کا راز

اوران کی دعا کرنے سے تجویز کا شبہ نہ کیا جائے۔ دعا اہل اللہ بھی کرتے ہیں اور دنیا والے بھی۔ مگر اہل اللہ کی دعا ایک وجہ خاص سے دنیا والوں کی دعا سے جدا ہے۔ اور وہ وجہ خاص ایک ایسی چیز ہے جس سے یہ بزرگ ہیں اور تم بزرگ نہیں۔ گو ظاہر میں تم ان سے زیادہ ماتھا رگڑتے ہو اور گھنٹوں دعا میں گڑگڑاتے ہو۔ اسی کو شاعر کہتا ہے ؎

شاہد آں نیست کہ موئے ومیانے دارد ☆ بندہ طلعت آں باش کہ آنے دارد
(معشوق وہ نہیں جو اچھے بال اور پتلی کمر رکھتا ہو، حسین وہ کہ اس میں کچھ آن ہو)

اور کہتے ہیں ؎

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند ☆ نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند
ہزار نکتہ باریک تر زمو ایں جاست ☆ نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

(یہ ضروری نہیں کو جو شخص بھی چہرہ روشن کرے وہ دلبری بھی جانتا ہو نہ ضروری ہے کہ جس کے پاس آئینہ ہو وہ سکندر بھی ہو، اس جگہ ہزاروں نکتے بال سے زیادہ باریک تر ہیں نہ یہ ضروری کہ جو شخص سر منڈائے وہ قلندر بھی ہو)

وہ آن یہ ہے کہ اہل اللہ دعا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے سب کچھ مانگتے ہیں مگر رضا باللہ کے ساتھ کہ اگر دعا قبول بھی نہ ہوئی تب بھی اللہ تعالیٰ سے اسی طرح رہیں گے جیسے دعا سے پہلے تھے۔ وہ محض حکم کی وجہ سے اظہار عبدیت کے لئے دعا کرتے ہیں۔ اس واسطے

دعا نہیں کرتے کہ جو ہم نے مانگا ہے وہی مل جائے۔ بلکہ ہر حال میں خدا کی رضا پر راضی رہتے ہیں سو جس شخص کا یہ حال ہو اس کے برابر کس کو راحت ہو سکتی ہے۔ واللہ سلاطین کو اہل اللہ کی راحت کی ہوا بھی نہیں لگی۔ پھر جس وقت وہ خلوت میں اللہ تعالیٰ کی طرف یک سو ہو کر متوجہ ہوتے ہیں اس وقت کی راحت کو تو کچھ نہ پوچھئے۔ اس کا اندازہ تو اہل اللہ کا دل ہی کر سکتا ہے۔ جس کا کچھ پتہ ان کے اقوال سے ملتا ہے۔ چنانچہ عارف فرماتے ہیں ؎

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں ☆ کہ ناز بر فلک وحکم بر ستارہ کنم

(گدائے میکدہ ہوں لیکن مستی کی حالت میں دیکھو کہ فلک پر ناز اور ستارہ پر حکم کرتا ہوں)

اور فرماتے ہیں ؎

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے ☆ بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہاؤ ہوئے

(ایک ساعت ایک لمحہ محبوب کو اطمینان سے دیکھنا، دن بھر کی دار و گیر شاہی سے بہتر ہے)

یہ تو راحت کا حال تھا۔

عزت حکام واہل اللہ کا فرق

عزت کو اگر دیکھو تو اہل اللہ کی عزت دنیا دار حکام تک کے قلوب میں ہوتی ہے جن کی دنیا والے خوشامد کرتے پھرتے ہیں۔ پچھلے دنوں لفٹیننٹ گورنر مولانا شاہ فضل الرحمان صاحبؒ کی زیارت وملاقات کو حاضر ہوئے تھے۔ یہ عزت نہیں تو اور کیا ہے۔ کوئی ہاتھی پر چڑھنے کا نام عزت تھوڑا ہی ہے۔ پھر اہل اللہ کی عزت محبت وانشراح کے ساتھ ہوتی ہے اور دنیا والوں کی عزت خوف ضرور انقباض کے ساتھ ہوتی ہے۔ اگر جنگل میں بھی بیٹھ جائیں تو وہیں قلوب مجتمع ہو جاتے ہیں۔ اور دنیا والے جہاں اپنے مقام عہدہ سے الگ ہوئے پھر ان کی خاک بھی عزت نہیں ہوتی۔ اور اگر کبھی اپنی وضع لباس کو بھی بدل دیں پھر تو کوئی ان کو سلام بھی نہیں کرتا۔ یہ جو لوگ ان کو جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ یہ اصل میں ان کے کوٹ پتلون کو سلام ہوتا ہے۔ ذرا یہ کوٹ پتلون کو چھوڑ کر معمولی لباس پہن کر نکلیں، پھر دیکھیں کہ آدمی سلام کرتے ہیں۔ اور اہل اللہ کی حالت یہ ہے کہ جس لباس اور جس وضع میں بھی ہوں لوگ ان کی عزت کرتے ہیں۔ کیونکہ عزت لباس کی وجہ سے نہیں بلکہ اس دولت

باطنیہ کی وجہ سے ہے۔ جس کا نوران کی پیشانی سے ظاہر ہوتا ہے اور ہر شخص کو نظر آتا ہے۔

نور حق ظاہر بود اندر ولی ☆ نیک بیں باشی اگر اہل ولی

(انوارِ الٰہی ولی میں نمایاں ہوتے ہیں، اگر تو اہل دل ہے تو اس کا ادراک کرسکتا ہے)

اور کسی نے اردو میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔

مرد حقانی کی پیشانی کا نور ☆ کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

پس دنیا کی کامیابی جس کا نام ہے یعنی عزت وراحت، وہ طالبان حق سے زیادہ کسی کو حاصل نہیں مگر یہ سب بدون نیت وارادہ ان کو عطا ہوتا ہے کہ وہ اپنے کو مٹاتے رہتے ہیں اور خدا ان کو زندہ کرتا رہتا ہے۔ بس یہ رنگ ہوتا ہے۔

کشتگان خنجر تسلیم را ☆ ہر زماں از غیب جان دیگر ست

(خنجر تسلیم کے کشتوں کو ہر زمانہ میں ایک اور جان عطا ہوتی ہے)

صاحبو! بادشاہوں کے نام ونشان آج دنیا سے غائب ہوگئے مگر اہل اللہ کا نام زندہ ہے۔ لوگوں کے دلوں میں ان کی یادگار نقش ہے دیکھئے! حضرت خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا نام سب کو کیسا معلوم ہے۔ سب کے دلوں میں ان کی عظمت کیسی تازہ ہے۔ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا خرقہ، کہن جس میں صدہا پیوند لگے ہوئے ہیں آج تک تبرک ہے اور بادشاہوں کے قیمتی تاج بھی آج معدوم ہوگئے۔ یہاں ایک بات قابل تنبیہ ہے وہ یہ کہ حضرت شیخ کے خرقہ میں صدہا پیوند اس واسطے لگے ہیں کہ شیخ نے سالہا سال تک اس کو پہنا تھا۔ جہاں سے پھٹا وہاں بھی کسی قسم کا کبھی کسی طرح کا پیوند لگا دیا۔ مگر آج کل جو درویشوں کا خرقہ تیار ہوتا ہے اس میں قصداً رنگ برنگ کے پیوند لگائے جاتے ہیں۔ جس سے محض خوبصورتی اور نام مقصود ہوتا ہے۔

چنانچہ کانپور میں ایک درویش نے خرقہ بنایا تھا جو غالباً دو سال میں سل کر تیار ہوا تھا۔ ظالم نے اس میں قیمتی کپڑوں کے پیوند رنگ برنگ کے لگائے تھے۔ اور وہ بھی درزیوں سے مانگ کر جس میں کثرت سے چوری کے تھے۔ سو یہ خرقہ ریا ہے، خرقہ گدائی ہے، خرقہ دزدی ہے جو حافظ رحمۃ اللہ علیہ کے اس شعر کا ٹھیک مصداق ہے

نقد صوفی نہ ہمہ صافی وبیغش باشد ☆ اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد

(تمام صوفی بے کھوٹ نہیں ہوتے بہت خرقہ آگ کے قابل ہیں کہ آگ میں جلایا جائے، خلاصہ یہ کہ بہت سے صوفی مکار ہوتے ہیں)

یہ جملہ معترضہ تھا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اہل اللہ کے برابر کسی کو دنیوی عزت بھی نصیب نہیں۔ ان کی عزت دنیا میں تو ہے ہی مرنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔

تعظیم اولیاء کی صورت

چنانچہ ایک انگریز سیاح نے ہندوستان کے متعلق اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ میں نے ہندوستان میں ایک عجیب منظر کو دیکھا کہ اجمیر میں ایک مردہ قبر میں پڑا ہوا تمام ہندوستان پر بادشاہت کر رہا ہے کہ چاروں طرف سے لوگ آتے اور اس کے سامنے ادب و تعظیم کیساتھ دست بستہ کھڑے ہوتے اور سر خم کرتے ہیں اور جو حاضر نہیں ان کے قلوب بھی عظمت سے پُر ہیں۔

مگر اس سے اس فعل انحناء وافعال بدعت کے جواز پر استدلال نہیں ہوسکتا۔ یہ فعل حرام ہے۔ میں بار بار کہتا ہوں کہ قبروں کو چومنا، انکے آگے سر جھکانا بالکل حرام ہے۔ مگر منشاء تو اس کا وہی عزت وعظمت ہے جو قلوب عالم میں جاگزیں ہے۔ گو اس کا ظہور بری طرح ہو رہا ہے۔ سلاطین کی قبر پر برسوں کوئی جا کر بھی نہیں پھرتا۔

اس طرح حضرات اولیاء اللہ کے مزارات اسی تعظیم کی وجہ سے بڑے عالی شان پختہ بنائے جاتے ہیں۔ یہاں بھی منشاء وہی عظمت ہے مگر اس کا ظہور بری طرح ہوا کیونکہ شرعاً تعظیم اولیاء کی یہ صورت حرام ہے اہل اللہ کی تعظیم کچھ اسی میں منحصر نہیں کہ ان کے مزار پختہ بنائے جائیں۔ وہ تو کچی قبر میں بھی ویسے ہی معظم ومحترم ہیں جیسے پکی قبر میں۔ بلکہ کچی قبروں پر بوجہ موافقت سنت کے انوار زیادہ ہوتے ہیں۔ حضرت شیخ بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی کچی قبر پر ایسی ہیبت برستی ہے جو سلاطین کی قبروں پر خاک بھی نہیں۔ اگر کسی کی آنکھیں ہوں تو اس کو معلوم ہو جائیگا کہ کچی قبر پر جو انوار ہیں وہ پختہ قبر پر کہاں! اور اگر کسی کی آنکھیں بند ہوں تو وہ اس دلیل ہی سے سمجھ لے کہ اول تو انوار سنت کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اور یہ پختہ مزارات تمام تر رؤسا، اور امراء اور سلاطین کے بنائے ہوئے ہیں۔ بزرگوں کے بنائے ہوئے نہیں ہیں اور ظاہر ہے کہ امراء اور سلاطین کی بنائی ہوئی چیزوں میں انوار کہاں! اور اہل اللہ کو اپنے بدن تک کی تو پروا نہیں پھر یہ چوچلے قبروں کے پختہ وآراستہ بنانے کے

ان میں کہاں سے آ جاتے۔ یقیناً یہ بزرگوں کا کام نہیں بلکہ سلاطین و امراء کے چوچلے ہیں انہی کو ایسی باتیں سوجھا کرتی ہیں۔ جو سلاطین و روسا دین سے ناآشنا ہیں، ان کو دوسری طرح کے فسق و فجور کے چوچلے سوجھتے ہیں اور جن کو ذرا دین سے کچھ تعلق اور دین داروں سے محبت ہے ان کو پختہ مزار بنانے کے اور بدعات کے چوچلے نہیں سوجھتے۔

جیسے ایک رئیس حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے ایک نہایت قیمتی، خوشنما، بھڑک دار پوستین لائے تھے کہ حضرت اس کو پہنا کریں۔ مولانا نے ایک نواب صاحب کو دے دیا اور فرمایا کہ نواب صاحب اس کو آپ پہن لیجئے۔ آپ کے کپڑوں پر یہ اچھی لگے گی کیونکہ آپ کا اور لباس بھی اس کے موافق قیمتی ہوگا۔ اور میں لٹھے گاڑھے دھوتر کے اوپر اس کو پہن کر کیا اچھا لگوں گا۔ پھر اس کی حفاظت کیڑے سے کون کرے گا۔ مجھے اتنی فرصت نہیں فضول اس کو رکھ کر بھی ضائع کروں۔ غرض اہل اللہ جب اپنے بدن کے واسطے یہ جھگڑے پسند نہیں کرتے تو قبروں کے لئے تو ضرور ہی ان خرافات کو پسند کریں گے!

اخلاص کی قدر و قیمت

مگر اہل دنیا ان حضرات کو اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں کہ معمولی ہدیہ سے پیر صاحب کیا خوش ہوں گے۔ کوئی قیمتی ہدیہ لے جانا چاہیے حالانکہ میں سچ کہتا ہوں کہ اہل اللہ کے یہاں تمہاری قیمتی چیزوں کی کچھ قیمت نہیں ان کے یہاں تو اخلاص کی قدر و قیمت ہے۔ اخلاص کے ساتھ اگر ایک پیسہ کی چیز بھی لے جاؤ تو اس کو سر پر رکھیں گے۔ اور خالی ہاتھ چلے جاؤ تو اس کی بھی قدر کریں گے۔ اور بدون اخلاص کے ہزاروں کی بھی ان کی نظر میں خاک وقعت نہیں۔

چنانچہ ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ وہ دوسرے بزرگ سے ملنے کو چلے۔ چونکہ ہاتھ میں پیسہ نہ تھا اس لئے خالی ہاتھ ہی چل پڑے۔ کوئی ہدیہ ساتھ نہ لیا۔ آج کل تو اگر ہدیہ ساتھ نہ ہو تو بزرگوں کی زیارت ہی نہیں کرتے۔ یہ قلت محبت کی دلیل ہے غرض راستہ میں ان کے دل نے محبت کی وجہ سے تقاضا کیا کہ بزرگ کیلئے کچھ ہدیہ ساتھ لینا چاہئے پھر دل میں آیا کہ اور کچھ نہیں تو جنگل سے لکڑیاں ہی جمع کر لینا چاہیے۔ شیخ کے حمام ہی میں کام آ جائیں گے۔ چنانچہ لکڑیوں کا ایک گٹھا جمع کر کے چلے اور پیش کر کے عرض کر دیا کہ یہ حضرت کے لئے ہدیہ ہے۔ میں نے راستہ میں سے آپ کے حمام کے لئے جمع کر لیا تھا۔ کیونکہ دل نے

تقاضا کیا کہ کچھ ہدیہ لے کر چلوں۔ شیخ نے خادم سے فرمایا کہ یہ ہدیہ نہایت خلوص کا ہے ان لکڑیوں کو حفاظت سے رکھو۔ ہمارے انتقال کے بعد ان سے پانی گرم کر کے ہم کو غسل دیا جائے۔ شاید اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے میری مغفرت فرمادیں۔

تو دیکھئے ظاہر میں ہدیہ معمولی تھا مگر اخلاص کی وجہ سے ان بزرگ نے اس کی کیسی قدر کی کہ اپنے غسل بعد الموت کے لئے اس کو حفاظت سے رکھا کہ شاید اسی سے مغفرت ہو جائے۔ اس سے آپ اہل اللہ کے مذاق کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ پس ان کو اپنے اوپر قیاس نہ کرو کہ وہ بھی ان خرافات سے خوش ہوتے ہیں جن سے تم خوش ہوتے ہو۔

زیارت قبور کی غرض

یہ پختہ مزارات اہل اللہ کے مذاق کے بالکل خلاف ہیں۔ پھر یہ قبر کی وضع کے بھی خلاف ہیں۔ کیونکہ قبروں کی زیارت سے جو مقصود ہے وہ ان کی پختہ قبروں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ زیارت قبور سے غرض یہ ہے کہ موت یاد آئے اور دنیا کے زوال و فنا کا نقشہ سامنے آجائے۔ تو یہ بات کچی اور شکستہ قبروں ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ شکستہ قبر سے دل پر اثر ہوتا اور موت یاد آتی ہے۔ ان شاہی قبروں سے موت تھوڑا ہی یاد آتی ہے نہ زوال و فنائے دنیا پیش نظر ہوتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ ایسی قبروں سے بزرگوں کی محبت و عظمت تو دل میں آتی ہے تو میں کہوں گا کہ یہ محبت تعزیوں والی ہے کہ ان کو بدون تعزیہ بنائے اور مرثیہ گائے شہدا پر رونا نہیں آتا۔ سچی محبت و عظمت کو اس ساز و سامان کی ضرورت نہیں۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عظمت نہ تھی۔ ان کو تو ایسی محبت تھی کہ حضورؐ کے وضو کا پانی کبھی زمین پر نہ گرتا تھا بلکہ صحابہؓ اس کو ہاتھوں میں لے کر اپنے منہ اور آنکھوں پر ملتے تھے۔ مگر با ایں ہمہ صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پختہ نہیں بنائی بلکہ کچی ہی رکھی۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پختہ قبر بنانے سے منع فرمایا ہے۔ پس محبت و عظمت نبوی کا تقاضا یہی تھا کہ قبر پختہ نہ بنائی جائے۔ اور ظاہر ہے کہ اولیاء اللہ اپنی زندگی میں حضورؐ کی اتباع پر جان و دل سے فدا تھے۔ پس جس بات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی ہے اسی میں اولیاء اللہ کی بھی خوشی ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ پختہ قبر بنانے میں اہل اللہ کے نشان کا بقاء ہے تو اس کے جواب میں اول تو میں کہتا ہوں کہ خدا ان کو باقی رکھنے والا ہے۔ تمہارے باقی رکھنے سے وہ باقی نہیں رہ سکتے۔ دیکھو! بہت سی پختہ قبر والے مردے ایسے بھی ہیں جن کے نام سے بھی کوئی آشنا نہیں تو کیا پختہ قبر بنانا ہی بقاء کا ذریعہ ہے۔ ہرگز نہیں! بلکہ اصل باقی رکھنے والی چیز اہل اللہ کی ولایت اور ان کے کمالات معرفت و محبت ہیں۔ پس وہ آپ کی بقاء کے محتاج نہیں۔ عارفؒ فرماتے ہیں

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ☆ ثبت ست بر جریدہ عالم دوام ما

(جس کو عشق سے روحانی حیات حاصل ہوگئی وہ بھی مر جائے تو واقع میں اس کو لذت قرب کامل حاصل ہے اس کو مردہ نہ کہنا چاہیے)

اور مولانا نیازؒ فرماتے ہیں

طمع فاتحہ از خلق نداریم نیاز ☆ عشق من از پس من فاتحہ خوانم باقی ست

(نیاز ہم کو مخلوق سے فاتحہ کی طمع نہیں ہے ہمارا عشق ہمارے بعد فاتحہ پڑھنے والا باقی ہے)

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ نشان باقی رکھنے کی یہ بھی صورت ہے کہ قبر کچی رکھو اور ہر سال اس کی لیپ پوت کرتے رہو۔ مٹی ڈلواتے رہو اور ایک عجیب تماشا ہے کہ یہ اہل دنیا پکی قبر اسی بزرگ کی بناتے ہیں جس کو یہ اپنے زعم میں پورا متبع سنت نہیں سمجھتے اور جس کو متبع سنت سمجھتے ہیں اس کی قبر کچی ہی بناتے ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی قبر کچی ہے۔ اور وہاں عورتیں بھی حاضر نہیں ہوتیں ان کے مجاوروں سے میں نے اس کی وجہ پوچھی تو کہا کہ حضرت متبع شریعت بہت تھے۔ اس لئے ان امور کو جائز نہیں رکھا گیا۔ گویا نعوذ باللہ دوسرے اولیاء متبع شریعت نہ تھے۔ سو اس وجہ سے بھی یہ فعل قابل ترک ہے۔

سماع کی شرائط

اسی طرح حضرت شیخ شمس الدین ترک پانی پتیؒ کی قبر پر سماع و قوالی نہیں ہوتی، محض قرآن خوانی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی بتلائی جاتی ہے کہ شیخ متبع سنت بہت تھے اس لئے قبر پر قوالی نہیں ہوتی اس جواب میں ان لوگوں نے یہ تسلیم کرلیا کہ سماع اور قوالی اور پختہ قبر بنانا یہ سب افعال خلاف سنت ہیں۔ جبھی تو تم اس بزرگ کی قبر پر یہ نہیں کرتے جس کو کامل متبع سنت سمجھتے ہو۔ گو یہ

لوگ اس نیت سے کہ یہ امور خلاف سنت ہیں یہ جواب نہ دیتے ہوں مگر سچی بات تو بے ساختہ منہ سے نکل ہی جاتی ہے اور اہل انصاف تو صاف صاف اپنی غلطی کا اقرار کر لیتے ہیں۔

چنانچہ میں ایک بار حضرت شاہ سلطان نظام الدین قدس سرہٗ کے مزار پر حاضر ہوا۔ اس وقت وہاں پر سماع کا سامان جمع کیا جا رہا تھا۔ میں فاتحہ پڑھ کر چلنے لگا، تو اہل سماع نے مجھے روکا کہ آپ سماع میں شریک کیوں نہیں ہوتے۔ آپ بھی تو چشتی ہیں اور چشتیہ تو سب صاحب سماع ہوئے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں اس لئے شریک نہیں ہوتا کہ سلطان جی ناراض ہو جائیں گے۔ کہا کیوں؟ سلطان جی تو خود صاحب سماع تھے۔ میں نے کہا، ہاں! مگر سلطان جی نے اپنے رسالہ فوائد الفواد میں سماع کی چار شرطیں لکھی ہیں۔

۱۔ سامع ۲۔ مسمع ۳۔ مسموع ۴۔ آلہ سماع

سامع کے متعلق فرمایا ہے کہ ”اہل ہوی و شہوت نباشد“ (خواہش نفسانی اور شہوت پرست نہ ہوں) اور مسمع کی نسبت ارشاد ہے کہ ”مرد تمام باشد، زن و کودک نباشد“ (تمام مرد ہوں اور عورتیں اور بچے نہ ہوں) اور مسموع میں شرط لگائی ہے کہ ”ہزل و فحش نباشد“ (بے ہودہ اور فحش کلام نہ ہو) اور آلہ سماع کے باب میں فرمایا ہے کہ ”چنگ و رباب درمیان نباشد“ (آلات سماع و ساز نہ ہوں) اور میں دیکھتا ہوں کہ یہاں یہ شرائط مجتمع نہیں۔ تو مجھ میں حضرت کے ناراض کرنے کی ہمت نہیں۔ پس یہ جواب سن کر سب شرمندہ ہو گئے۔ اگر میں عام مولویوں کی طرح وہاں بحث کرنے لگتا کہ سماع مطلقاً حرام ہے تو کوئی میری بات کو نہ سنتا مگر اس نرمی کے جواب کا یہ اثر ہوا کہ سب نے اقرار کر لیا کہ واقعی تم سچے کہتے ہو اور جیسا سماع ہم سنتے ہیں وہ بزرگوں کی شرائط کے خلاف ہے۔

پختہ قبروں کی ممانعت

غرض اہل انصاف تو التزاماً اور اہل عناد لزوماً حق کا اقرار کر ہی لیتے ہیں۔ چنانچہ مجاوروں نے من حیث انداون اقرار کر ہی لیا کہ قبر پختہ بنانا شریعت میں ممنوع ہے۔

اور اس کے ممنوع ہونے کی ایک اور حکمت سمجھو۔ وہ یہ کہ پکی قبر بنانے سے جو شریعت نے منع کیا ہے۔ حقیقت میں یہ ہم پر بڑا احسان کیا۔ کیونکہ اگر ابتداء سے اس وقت تک سب قبریں

پختہ ہی ہوتیں تو آدمیوں کو تو رہنے کے لئے بھی جگہ بھی نہ ملتی نہ زراعت کے لئے زمین ملتی۔ کیونکہ مردے اس قدر گزر چکے ہیں کہ کوئی حصہ زمین کا مردوں سے خالی نہیں بتلائیے اگر سب کی قبریں پختہ ہوتیں تو ہمارے لئے کہاں ٹھکانا ہوتا بس قبروں کے اوپر دو منزلہ سہ منزلہ مکان بناتے جو ایک پہاڑ سا ہو جاتا۔ اور کچی قبر میں تو یہ بات ہے کہ جب نشان مٹ گیا تو اب وہاں دوسری قبر بنا سکتے ہیں اور اگر زمین وقف نہ ہو تو اس پر اتنی مدت کے بعد زراعت بھی کر سکتے ہیں۔

جس میں یہ یقین ہو جائے کہ مردہ کا جسم خاک خوردہ ہو گیا ہوگا۔ اور یہ بات کہ ہر جگہ مردے ہیں، زندوں مردوں کی مردم شماری پر نظر کر کے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے۔ کہ جب ایک زمانہ میں تنے آدمی مجتمع ہیں تو اس چھ سات ہزار سال کی مدت میں کس قدر بے شمار ہوں گے۔ اور ہر شخص کی قبر کے لئے کتنی جگہ ضروری ہوتی ہے۔ تو زمین میں اتنی جگہ کہاں تھی اور اسی حساب پر نظر کر کے اہل سائنس یہ کہتے ہیں کہ اگر آج سب زندہ ہوتے تو اس زمین پر رہنے کو جگہ نہ ملتی۔ غرض قبروں کے پختہ ہونے سے یہ تنگی ہوتی۔ اور اب تو ان ہی کے دفن ہونے کی جگہ میں سب بس رہے ہیں۔ ان ہی کے مدفن بلکہ خود ان کے جسد کی مٹی سے مکان بنا رہے ہیں، برتن بنا رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ ہمارے گھروں کے گھڑے، صراحی، پیالے ہمارے بزرگوں کی مٹی کے بنے ہوئے ہوں۔

چنانچہ ایک اہل کشف کا قصہ یاد آیا۔ ایک گاؤں میں ایک مولوی صاحب کا گزر ہوا جو صاحب کشف تھے۔ اس گاؤں میں ایک عجیب آبخورہ تھا جس میں پانی ہر موسم میں گرم رہتا تھا حتی کہ چلہ کے جاڑوں میں بھی۔ ان مولوی صاحب سے اسکی وجہ پوچھی گئی۔ انہوں نے فرمایا اس کو میرے پاس چھوڑ دو۔ چنانچہ ایک شب ان کے پاس رہا۔ صبح کو جو دیکھا تو اس میں پانی ٹھنڈا تھا۔ لوگوں نے وجہ پوچھی فرمایا، یہ ایک گنہگار دوزخی کی مٹی کا بنا ہوا تھا۔ آج میں نے دعا کی، اس کی مغفرت ہوگئی۔ اس لئے پانی ٹھنڈا ہو گیا۔ تو قبر کا پختہ بنانا ان مفاسد پر مشتمل ہے۔ علاوہ اس کے موت تو مٹانے ہی کے واسطے ہے۔ اس کے بعد بقاء کا سامان کرنا ایک امر فضول ہے۔

فیوض قبور کی نوعیت

اس پر اگر کوئی کہے کہ قبروں سے فیض ہوتا ہے۔ اس لئے قبروں کے بقاء کی ضرورت ہے تو میں اس کے وقوع کا انکار نہیں کرتا۔ مگر اول تو وہ فیض معتد بہ نہیں کیونکہ قبروں سے جو فیض ہوتا ہے وہ ایسا نہیں جس سے تکمیل ہو سکے بلکہ اس کا درجہ صرف اتنا ہے کہ صاحب نسبت کی نسبت

کو اس سے کسی قدر قوت ہو جاتی ہے۔ غیر صاحب نسبت کو تو خاک بھی فیض نہیں ہوتا۔ صرف صاحب نسبت کو اتنا فیض ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے نسبت کو قوت اور حالت میں زیادتی ہو جاتی ہے مگر وہ بھی دیرپا نہیں ہوتی بلکہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے تنور کے پاس بیٹھ کر کچھ دیر کے لئے جسم میں حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ جہاں تنور سے ہٹے اور ہوا لگی، وہ سب گرمی جاتی رہی۔ اور زندہ مشائخ سے جو فیض ہوتا ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی مقوی دوا کھا کر قوت و حرارت حاصل ہوتی ہے کہ وہ تمام جسم میں پیوستہ ہو جاتی ہے۔ پس صاحب نسبت کو اول تو قبر سے فیض لینے کی ضرورت نہیں۔ زندہ شیخ اس کے لئے قبروں سے زیادہ نافع ہے۔ اور ضرورت بھی ہو تو صاحب نسبت کے لئے قبر کا پختہ ہونا ضروری نہیں۔ وہ تو آثار سے معلوم کر لے گا کہ یہاں کوئی صاحب کمال مدفون ہے۔ پس یہ وجہ بھی کالعدم ہو گئی۔

طاعت کی برکت

میں یہ کہہ رہا تھا کہ اہل اللہ سے زیادہ صاحب عزت کوئی نہیں ان کی عزت و عظمت مرنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے گو قبر کا بھی نشان نہ رہے۔ اسی طرح راحت حقیقی بھی ان ہی کا حصہ ہے جیسا اوپر ثابت ہو چکا۔ تو جب راحت بھی سب سے زیادہ ان ہی کو حاصل اور عزت بھی سب سے زیادہ انہی کو حاصل، تو دنیا میں بھی ان سے بڑھ کر کوئی کامیاب نہیں۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے طاعات کی ساری جزا ادھار پر نہیں رکھی۔ آخرت میں تو ان کی جزا ملے ہی گی دنیا میں بھی جزا ملتی ہے۔ وہ یہی راحت و اطمینان اور عزت و عظمت ہے چنانچہ نص میں:

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ اور دوسری جگہ ہے: فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً طاعت ذکر اللہ کی برکت سے دنیا میں اہل طاعت کو حیات طیبہ حاصل ہوتی ہے جس کی سلاطین و امراء کو ہوا بھی نہیں لگی۔ پھر کس کا منہ ہے جو ان کو ناکام کہہ سکے۔ پس طالب حق بشرطیکہ سچا طالب ہو نہ دنیا میں ناکام ہوتا ہے نہ آخرت میں۔ دنیا کی کامیابی تو وہی ہے جس کا میں نے اس وقت بیان کیا اور آخرت کی کامیابی کو سب جانتے ہیں کہ اہل طاعت کے لئے وہاں کیا کچھ نعمتیں اور راحتیں ہیں۔ حدیث قدسی میں وارد ہے:

اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر (مسند الإمام أحمد: ۲: ۴۳۸)

نوتعلیم یافتہ طبقہ کی کوتاہی

مضمون بہت طویل ہوگیا۔ میں نے یہ بات اس پر بیان کی تھی کہ اگر کسی کو تصحیح قرآن کی امید نہ ہو تو وہ اپنی سی کوشش کرلے۔ اس کے بعد وہ ناکام نہ ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ اس کو صحیح پڑھنے والوں کے برابر بلکہ ان سے زیادہ ثواب دیں گے۔ اس پر یہ گفتگو شروع ہوگئی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی عجیب سرکار ہے کہ یہاں کوئی سعی کرنے والا ناکام نہیں ہوتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ بندہ کی طلب کو دیکھتے ہیں چاہے واصل الی المطلوب ہو یا نہ ہو۔ پس اب کسی کو تلاوت قرآن اور تصحیح حروف میں بہانہ کرنے کا کوئی موقع نہیں۔ بحمد اللہ! اس وقت میں نے دلائل سے بھی اور امثال سے بھی یہ ثابت کردیا ہے کہ قرآن کے صورت و معنی دونوں کی ضرورت ہے اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ بدون سمجھے قرآن پڑھنے سے کیا نفع وہ سخت بات زبان سے نکالتے ہیں جس سے ایمان سلب ہونے کا اندیشہ ہے۔

یہ تو اس شبہ کا جواب تھا جس میں نوتعلیم یافتہ طبقہ بدنام ہے اور یہ لوگ جلدی بدنام ہوجاتے ہیں کیونکہ ان کی صورت وضع اور ظاہری افعال احکام اسلام کے خلاف ہوتے ہیں مگر خدانخواستہ عقائد سب کے خراب نہیں بلکہ ان میں بعض کے عقائد اچھے بھی ہوتے ہیں۔ مگر ظاہری صورت کی وجہ سے بدنام سب ہیں۔

میں نے ڈھاکہ میں ایک مرتبہ خاص نواب صاحب کے اعزہ میں وعظ کہا تھا جن میں زیادہ تر جنٹلمین تھے۔ میں نے اس جلسہ میں خاص طور پر تصحیح عقائد ہی کا بیان کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ آپ لوگ اگر اپنی پوری اصلاح نہ کرسکیں تو کم از کم دو باتوں کا اہتمام کرلیں۔ ایک یہ کہ اپنے عقائد صحیح کرلیں۔ دوسرے جو ناجائز اعمال آپ کرتے ہیں ان کو حرام سمجھ کر کریں۔ کھینچ تان کر ان کے جائز کرنے کی کوشش نہ کریں کیونکہ آپ کی لغو تاویل سے حرام فعل حلال تو ہو نہیں سکتا مگر اس تاویل سے یہ مفسدہ لازم آئے گا کہ آپ حرام کو حلال سمجھیں گے اور حرام کو حلال سمجھنا کفر ہے۔ قطعی یا ظنی تو یہ حالت سخت خطرناک ہے اور اگر حرام سمجھ کر کریں گے، تو کفر کا خطرہ نہ رہے گا، صرف معصیت رہ جائے گی۔ یہ کفر سے اہون ہے دوسرے جب آپ اس کو حرام سمجھتے رہیں گے تو کیا عجب ہے کہ کسی وقت توبہ کی توفیق ہوجائے۔ اور اگر مان لیا جائے کہ آپ عمر بھر ان افعال کو نہ چھوڑ سکیں گے تو کفر سے تو بچاؤ رہے گا۔ اس مضمون کو میں

نے ایک خاص جلسہ میں بھی بیان کیا تھا۔ اس وقت بہت لوگوں کا خوش عقیدہ ہونا ان کے اظہار خیالات سے معلوم ہوا۔ خیر یہ تو شبہ نو تعلیم یافتہ جماعت کا تھا جس کا جواب مذکور ہوا۔

جاہل درویشوں کی غلطی

ایک شبہ درویشوں کا ہے جو دینداروں میں اعلیٰ طبقہ ہے اور مسلمانوں کو عموماً درویشوں کی طرف میلان بھی زیادہ ہے حتیٰ کہ نو تعلیم یافتہ طبقہ بھی ان سے رجوع کرتا ہے اور وہ بھی ان کے معتقد ہیں۔ خواہ وہ سچے درویش ہوں یا بنے ہوئے ہوں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ ان کو کارخانہ الٰہی میں دخیل سمجھتے ہیں اور اس کے لئے ایک شعر مشہور کر رکھا ہے

اولیاء راہست قدرت ازالہ ☆ تیر جستہ بازگرد انند زراہ

(اولیاء اللہ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے قدرت ہے کہ تیر نکلے ہوئے کو راستہ سے پھیر دیں)

مگر اس کے جو معنی عام لوگوں نے سمجھے ہیں وہ بالکل غلط ہیں کیونکہ اس میں ازالہ کی قید مذکور ہے معلوم ہوا کہ اصل مدار قضا و قدر پر ہے۔ تو اس میں بھی اللہ تعالیٰ ہی سے پالہ پڑا جو کچھ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے تو ان میں سے بعضے درویش یوں کہتے ہیں کہ شریعت کا ایک ظاہر ہے ایک باطن۔ ایک صورت ہے ایک معنی اور اصل مقصود معنی ہے صورت مقصود نہیں۔ اور قرآن کے الفاظ اور اس طرح نماز روزہ کے ارکان یہ سب صورت ہے لہٰذا مقصود نہیں۔ اسی لئے وہ اس کے بعد معتقد ہیں کہ جب معنی اور حقیقت تک رسائی ہو جاتی ہے۔ تو عبادات ساقط ہو جاتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ مسئلہ شریعت کا ہے اس میں کسی کا قول اور کشف معتبر نہیں اور شریعت کا حکم ہے کہ

واعبد ربک حتیٰ یاتیک الیقین (موت آنے تک اپنے رب کی عبادت کرتے رہیں)

جس سے معلوم ہوا کہ موت آنے تک عبادت ضروری اور عبادت صورت و معنی دونوں کے متعلق ہے بلکہ زیادہ حصہ عبادت کا افعال جوارح ہی ہیں۔ قلب سے صرف نیت شرط ہے اس لئے یہ قول غلط ہے کہ مقصود صرف معنی ہے ظاہر مقصود نہیں۔ مگر ان جاہل درویشوں نے ایک اور کمال کیا کہ خود اس آیت ہی کے معنی بدل دیئے اور یہ کہا کہ یقین سے مراد ایک خاص درجہ ولایت کا ہے جب عارف اس درجہ پر پہنچ جاتا ہے تو عبادت معاف ہو جاتی ہے۔ اور اس سے پہلے پہلے عبادت کا مامور ہے۔ اس مقام پر پہنچنے کے بعد صرف باطن سے عبادت کا مامور

ہوتا ہے کہ دل سے خدا کا ذکر کرتا رہے۔ نماز روزہ کی صورت لازم نہیں رہتی اور اس کا نام ان لوگوں نے طریقہ قلندری رکھا ہے مگر یہ ساری خرابی فن کے نہ جاننے کی ہے۔

حقیقت قلندری

قلندر صوفیہ کی خاص اصطلاح ہے اس کو اہل فن سے دریافت کرو۔ چنانچہ اس فن میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں بعض کتابیں بہت ہی عمدہ ہیں جیسے عوارف المعاف وغیرہ۔ ان میں اس اصطلاح کی حقیقت بہت وضاحت سے لکھی گئی ہے قلندر اس کو کہتے ہیں جو ظاہری عبادت میں تقلیل کرے کہ جس پر ذکر و فکر۔ نوافل و مستحبات سے زیادہ غالب ہو یعنی وہ نفلیں زیادہ نہیں پڑھتا بلکہ ذکر اللہ زیادہ کرتا ہے۔ یہ معنی نہیں کہ فرائض و واجبات کو بھی ترک کر دیتا ہے مگر آج کل تو قلندر اسے کہتے ہیں جو چار ابرو کا صفایا کر دے اور سر منڈا دے۔ ایسی قلندری تو بہت سستی ہے حجام کو دو پیسہ دے کر جس کا جی چاہے قلندر بن جائے۔ اسی کو فرماتے ہیں۔

نہ ہرکہ چہرہ برافروخت دلبری داند ☆ نہ ہرکہ آئینہ دارد سکندری داند
ہزار نکتہ باریک تر ز مو ایں جاست ☆ نہ ہرکہ سربتر اشد قلندری داند

(یہ ضروری نہیں کہ جو شخص بھی چہرہ روشن کرے وہ دلبری بھی جانتا ہوں، یہ ضروری ہے کہ جس کے پاس آئینہ ہو وہ سکندر بھی ہو، اس جگہ ہزاروں نکتے بال سے باریک تر ہیں، یہ ضروری نہیں کہ جو شخص سر منڈائے وہ قلندری بھی جانتا ہو)

اور قلندر کے مقابل ایک دوسرا فرقہ بھی ہے جس کو ملامتی کہتے ہیں۔ یہ بھی اصطلاحی لفظ ہے۔ ملامتی وہ ہے جو اعمال میں تکثیر تو کرتا ہے مگر ان کے اخفاء کا اہتمام کرتا ہے۔ جس سے عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو دوسروں سے زیادہ کچھ بھی نہیں کرتے۔ یہ کیسے بزرگ ہیں۔ مگر آج کل اس کے معنی بھی لوگوں نے بگاڑ دیئے۔ اب ملامتی اسے کہتے ہیں جو شراب و کباب اور زنا کاری کے ساتھ تصوف کا دم بھرتا ہو۔ غرض یہ الفاظ اصطلاحی ہیں۔ ان کے معنی اہل فن سے پوچھو۔ تم کو اپنی طرف سے معنی بیان کرنے کا حق نہیں۔

اور اگر کوئی یہ کہے کہ لا مشاحۃ فی الاصطلاح ہم کو اپنی جدا اصطلاح قائم کرنے کا حق ہے تو پھر میں کہوں گا کہ تمہاری اصطلاحی قلندری کو دین سے کچھ واسطہ نہیں بلکہ شریعت میں اس کو زندقہ اور بے دینی کا لقب دیا گیا ہے۔ اور آیت کے جو معنے تم نے بیان کئے ہیں وہ

بالکل غلط ہیں کیونکہ یقین سے ولایت کا خاص درجہ مراد لینا تمہاری اصطلاح ہے اور قرآن تمہاری اصطلاحات میں نازل نہیں ہوا۔ بلکہ لغات عرب میں نازل ہوا ہے اور کتب لغت تمہارے سامنے ہیں۔ لغت کی کتاب سے بتلاؤ کہ یہ معنی کس نے لکھے ہیں ورنہ ہم بتلاتے ہیں کہ جب یہ ایقان کا فاعل ہوتا ہے تو اس کے معنی موت کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ جمہور مفسرین اسی بناء پر بیان کرتے ہیں کہ یقین سے موت مراد ہے۔ یہ تو لغوی دلیل ہے۔

دوسری ایک شرعی دلیل ان کے پاس نہایت قوی موجود ہے وہ یہ کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترک فرائض پر جو وعیدیں فرمائی ہیں ان سے کسی کو مستثنیٰ نہیں فرمایا۔ پس یہ خیال غلط ہے کہ عبادات وطاعات ظاہرہ کسی مقام پر معاف ہوجاتی ہیں۔ بلکہ معاملہ برعکس ہے کہ جس قدر قرب بڑھتا ہے اتنی ہی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ عوام سے ترک مستحبات وسنن غیر موکدہ کے ترک پر مواخذہ نہیں ہوتا اور مقرب سے ذرا سی مخالفت سنت پر مواخذہ ہوتا ہے۔ دنیا میں اس کی نظیر موجود ہے۔ گنواروں سے حکام کے اجلاس میں بے تمیزی کی باتیں صادر ہوں تو کچھ مواخذہ نہیں کیا جاتا اور پیش کار ذرا بے موقع ایک بات کہہ دے یا بلا وجہ ہنس پڑے تو اس کی مصیبت آجاتی ہے ؎ نزدیکاں رابیش بود حیرانی (مقربین کو حیرانی زیادہ ہوتی ہے)

پھر حیرت پر حیرت ہے کہ خدا کا مقرب ہوکر بندہ بالکل آزاد ہوجائے یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔

اور بالفرض اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ صورت مقصود نہیں بلکہ معنی مقصود ہے جب بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نماز روزہ معاف اور ساقط ہوجائے کیونکہ معنی کی انواع مختلف ہیں۔ جیسے شیرینی کی اقسام مختلف ہیں۔ ایک شیرینی امرود کی ہے۔ ایک انار کی، ایک آم کی، ایک گنے کی۔ ظاہر ہے کہ شیرینی کی جنس مشترک ہے مگر انواع مختلف ہیں۔ اب کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ گنا چوسنے سے انار اور آم کی شیرینی حاصل ہوسکتی ہے؟ ہرگز نہیں! اسی طرح میں کہتا ہوں کہ جس معنی کو آپ مقصود سمجھے ہوئے ہیں ان کی انواع مختلف ہیں۔ ایک روح نماز کی ہے، وہ نماز ہی سے حاصل ہوگی۔ ایک روح صوم کی ہے، وہ روزہ ہی سے حاصل ہوگی۔ ایک روح تلاوت قرآن کی ہے وہ تلاوت قرآن ہی سے حاصل ہوگی۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ صرف ذکر قلبی سے نماز کی روح بھی حاصل ہوجائے اور روزہ کی بھی اور تلاوت قرآن کی بھی۔ پس میں نے مانا کہ معنی مقصود ہیں مگر وہ معنی بدون ان خاص صورتوں کے حاصل نہیں

ہو سکتا۔ اب جو شخص بدون نماز کے یہ دعویٰ کرے کہ مجھے نماز کی روح حاصل ہے وہ جھوٹا ہے۔ اس کی بالکل وہی مثال ہے جیسے کوئی گنا چوس کر یہ کہے کہ مجھے انار وآم کی شیرینی کا مزہ حاصل ہے۔ پس درویش کان کھول کر سن لیں کہ نماز اور تلاوت قرآن کی روح نماز پڑھنے اور قرآن پڑھنے ہی سے حاصل ہوگی۔ بدون اس کے قیامت تک ان کی روح حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ان کو بھی تلاوت قرآن لازم ہے۔ اس کا خاص طور سے اہتمام کریں اور محض ذکر پر کفایت نہ کریں۔ یہ درویشوں کی غلطی تھی۔

جماعت علماء کی غلطی

اب میں استطراداً اپنی جماعت کی بھی ایک غلطی ظاہر کرتا ہوں۔ یعنی علماء کی کہ وہ خوش نہ ہوں کہ ہم سب سے اچھے ہیں بلکہ وہ بھی ایک غلطی میں مبتلا ہیں۔ وہ یہ کہ علماء نے محض کتابی علم کو کافی سمجھ رکھا ہے۔ یہ علم حاصل کر کے عمل کی ضرورت نہیں سمجھتے حالانکہ علم سے مقصود عمل ہی ہے۔ ان کی حالت یہ ہے کہ ان کے اخلاق باطنہ درست نہیں نہ اس کی فکر ہے۔ جن میں دو خلق مجھے سخت ناگوار ہیں اور میں کیا چیز ہوں۔ اللہ تعالیٰ کو ان سے سخت نفرت ہے۔

ایک طمع یعنی حب مال، ایک حب جاہ! علماء کو انہی دو باتوں نے زیادہ تباہ کیا ہے۔ مدرسین کی یہ حالت ہے کہ تنخواہ پر جھک جھک کرتے ہیں۔ یہ نہایت واہیات ہے۔ اسی لئے کسی مدرسہ مہتمم کو اپنے کسی مدرس پر اعتماد نہیں ہوتا کہ یہ رہے گا یا نہیں۔ کیونکہ اگر دوسری جگہ سے پانچ روپیہ زائد پر بھی دعوت آ گئی، تو مدرس صاحب فوراً اس مدرسہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ چل دیں گے، اگرچہ وہاں دین کی خدمت زیادہ نہ ہو۔

اور پہلی جگہ دین کی خدمت زیادہ ہو رہی ہو اور گزر بھی ہو یہ صریح دین فروشی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو محض تنخواہ مقصود ہے دین کی خدمت مقصود نہیں۔ البتہ اگر پہلی جگہ کی تنخواہ میں گزر نہ ہوتا ہو، ضروریات میں تنگی پیش آتی ہو تو دوسری جگہ جانے کا مضائقہ نہیں۔ بشرطیکہ وہ تنگی واقعی ضروریات میں ہو کیونکہ فضول ضرورتوں میں تنگی ہونا معتبر نہیں۔ وہ دراصل ضروریات ہی نہیں۔ اس شخص نے خواہ مخواہ ان کو ضروریات میں ٹھونس رکھا ہے۔ پس یہ نہایت نازیبا حرکت ہے کہ عالم دین ہو کر مال پر رال ٹپکاتے پھریں۔

اور دوسرا مرض ان میں حب جاہ کا ہے جس کی وجہ سے علماء کے اندر پارٹی بندی ہوگئی ہے۔ ہر شخص اپنی ایک جدا جماعت بنانے کی فکر میں ہے۔ علماء کا مال کے باب میں تو یہ مذاق ہونا چاہیے ۔

اے دل آں بہ کہ خراب از مئے گلگوں باشی ☆ بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی

(اے دل یہی بہتر ہے کہ محبت الٰہی کی شراب پی کر حشمت قارون سے بڑھ جا)

ان کو اپنی فقیری ہی میں مستغنی اور مست ہونا چاہیے کہ دنیا داروں کے مال پر نگاہ بھی نہ اٹھائیں اور یہ باتیں ہی نہیں ہیں بلکہ اہل اللہ نے ایسا کر کے بھی دکھا دیا ہے۔

چنانچہ ایک بادشاہ کسی بزرگ کی زیارت کو گئے۔ خانقاہ کے دروازہ پر پہنچے تو دربان نے روک دیا کہ میں اول شیخ کو اطلاع کر دوں۔ اگر اجازت دے دی تب اندر جاتا۔ بادشاہ کو دربان کی یہ حرکت سخت ناگوار ہوئی مگر چونکہ معتقد نہ آیا تھا اسی لئے خاموش رہ گیا۔ دربان نے شیخ کو اطلاع کی کہ بادشاہ سلامت زیارت کو آنا چاہتے ہیں وہاں سے اجازت ہوگئی۔ جھلایا ہوا تو تھا ہی بزرگ کے سامنے جاتے ہی برجستہ یہ مصرع پڑھا کہ ۔

در درویش را درباں نہ باید (درویش کے دروازہ پر دربان نہ ہونا چاہیے)

بزرگ نے فی البدیہہ جواب دیا۔

بباید تا سگ دنیا نیاید (ضرور ہونا چاہیے تا کہ دنیا کا کتا اندر نہ آسکے)

بادشاہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

اسی طرح جب شاہ جہاں حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کی زیارت کو گئے تو شیخ پہلے تو پیر سمیٹے ہوئے بیٹھے تھے۔ بادشاہ کے پہنچنے پر پیر لمبے کر کے بیٹھ گئے۔ بادشاہ کے ساتھ ایک عالم بھی تھے۔ انہوں نے اس حرکت سے نفرت ظاہر کرتے ہوئے سوال کیا کہ آپ نے پیر لمبے کب سے کر دیئے شیخ نے فی البدیہہ جواب دیا کہ جب سے ہاتھ سمیٹ لئے۔

تو یہ حضرات بوجہ استغناء کے تہذیب عرفی کے پابند نہیں ہوتے اسی کو حضرت عارف فرماتے ہیں ۔

اے دل آں بہ کہ خراب از مئے گلگوں باشی بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی

(اے دل یہی بہتر ہے کہ محبت الٰہی کی شراب پی کر بصد حشمت قارون سے بڑھ جا)

یہ تو حب مال کے متعلق ارشاد تھا۔ آگے حب جاہ کے متعلق فرماتے ہیں ۔

دررہ منزل جاناں کہ خطرہاست بجاں ☆ شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی
(محبوب کی منزل کے راستہ میں بہت سے خطرات ہیں اس راہ میں قدم رکھنے والی شرط یہ ہے کہ مجنوں بن جا)

مجنوں سے مراد فانی ہے کیونکہ مجنوں عاشق کو کہتے ہیں۔ اور عاشق ہمیشہ فانی ہوتا ہے کہ اپنی عزت وآبرو کو محبوب پر نثار کردیتا ہے چنانچہ شاعر کہتا ہے ؎

عاشق بدنام کو پروائے ننگ ونام کیا ☆ اور جو خود ناکام ہو اس کو کسی سے کام کیا

حضرت عارف فرماتے ہیں ؎

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں ☆ مانمی خواہیم ننگ ونام را
(اگرچہ عقلاء کے نزدیک بدنامی ہے لیکن ہم ننگ ونام کے خواہاں نہیں)

اور مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق آں شعلہ ست کو چوں برفروخت ☆ ہرچہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
(عشق وہ شعلہ ہے کہ جب روشن ہوتا ہے تو سوائے محبوب کے سب کو فنا کردیتا ہے)

علماء میں یہی بڑی کمی ہے کہ یہ اس دولت عشق کو حاصل نہیں کرتے اسی لئے ان میں حب جاہ باقی رہتا ہے۔ اسی لئے ان کو مناسب اور امامت کی فکر رہتی ہے۔ ہر شخص اپنے لئے اسی کی کوشش کرتا ہے جیسے کونسل کی ممبری کے ووٹ لئے جاتے ہیں۔ صاحبو! اس میں کچھ عزت نہیں۔ ہماری عزت تو اسی میں ہے کہ ہم امتیاز کی سب سے پچھلی صف میں کھڑے ہوں اور دوسرے ہم کو کھینچ کر آگے کریں۔ مگر یہاں معاملہ برعکس ہے کہ لوگ ہم کو پیچھے کرنا چاہتے ہیں اور ہم آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ اور اگر کوئی اس آفت سے بچا ہوا ہو تو اس دوسری آفت سے تو کوئی بھی بچا ہوا نہیں الا نادراً کہ اگر آج اس کی بستی میں کوئی دوسرا امام آجائے جو اس سے اچھا قرآن پڑھتا ہو یا کوئی واعظ آجائے جو اس سے اچھا وعظ کہتا ہو یا مدرسہ میں کوئی دوسرا لائق مدرس آجائے جو اس سے اچھا پڑھاتا ہو تو اس سے جلتے ہیں، حسد کرتے ہیں اور دل دل میں گھٹتے ہیں۔ چاہے زبان سے کچھ نہ کہیں۔ حالانکہ اخلاص اور دینداری اس کا نام ہے کہ اگر اپنے سامنے دین کی خدمت کرنے والے ہزار بھی ہوجائیں تو ہزاروں خوشیاں کی جائیں کہ الحمدللہ دین کی اشاعت کرنے والوں کی تعداد بڑھ گئی۔

ہمارے استاد مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ بھائی اگر کوئی شخص "راہ نجات" بھی پڑھاتا ہے یا قاعدہ بغدادی پڑھاتا ہے تو وہ بھی ہمارا کام بٹاتا ہے۔ مطلب یہ کہ ہم ساری مخلوق کو تعلیم دینے سے عاجز ہیں اور تمنا یہ ہے کہ دین کا چرچا گھر گھر ہو جائے۔ تو جو شخص جس جگہ بھی دین کا کام کر رہا ہے وہ ہمارا معاون و مددگار ہے۔ اس لئے ہم کو تو یہ سن کر خوشی ہونا چاہیے کہ دیوبند کی طرح سہارنپور و کانپور میں بھی عربی مدرسہ قائم ہو گیا ہے۔

علماء کو انتباہ

میں علماء سے خاص طور پر کہتا ہوں کہ اپنے اندر یہ مذاق پیدا کرو اور اپنے اعمال و اخلاق کو درست کرو۔ کہاں کے مناصب اور کیسی امامت؟ یاد رکھو! تم قوم کے ذمہ دار ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے ان افعال کی وجہ سے لوگ دین کو ذلیل سمجھنے لگیں۔ اور میں دیکھ رہا ہوں کہ ان حرکات پر یہ نتیجہ بد مرتب ہو رہا ہے۔ لوگوں نے علماء کی طمع اور پارٹی بندی کی وجہ سے علم دین کو ذلیل سمجھ رکھا ہے۔ تم نے ہی قوم کو ڈبویا ہے۔ تم نے ہی ان کے اعمال کو خراب اور ستیاناس کیا ہے۔ جب عوام علماء کو پارٹی بندی کرتے دیکھیں گے تو بتلاؤ کیا وہ پارٹی بندی نہیں کریں گے۔ ضرور کریں گے پھر ان کی اصلاح کے لئے ہمارا کیا منہ رہے گا۔

صاحبو! تم مسلمانوں کے خادم ہو مخدوم نہیں ہو۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ راستہ میں چلتے ہوئے کسی عامی کا سامنا ہو تو تم اس کو خود سلام نہیں کرتے بلکہ اس کے سلام کے منتظر رہتے ہو۔ یہ بھی وہی حب جاہ ہے کہ تم اپنے کو بڑا سمجھتے ہو۔ کہاں تک روؤں؟ ہزاروں باتیں ہیں۔ بقول شاعر ؎

یک تن دخیل آرزو دل بچہ مدعا دہم ☆ تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

(ایک تن اور بہت سی آرزوئیں ہیں کس کس کو پوری کروں، بدن پر داغ ہی داغ ہیں کہاں کہاں پھایہ رکھوں)

ایک بات ہو تو اس کو رویا جائے۔ افسوس! ہم تو سر سے پیر تک ذمائم میں غرق ہیں۔

صاحبو! ہمارے اکابر تو ایسے نہ تھے بلکہ ان کی تو یہ حالت تھی کہ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ایک بار چارپائی کی پائینتی کی طرف بیٹھے ہوئے تھے کہ خط بنانے کو حجام حاضر ہوا۔ آپ نے اسے فرمایا کہ بھائی بیٹھ جاؤ۔ اس نے کہا، حضرت! میں تو سرہانے

نہیں بیٹھ سکتا۔ آپ سرہانے بیٹھ جائیں تو میں بیٹھوں فرمایا، تو پھر اس وقت چلا جا۔ جب تو مجھے سرہانے بیٹھا ہوا دیکھے اس وقت آ کر حجامت بنا دینا۔ میں کہاں جھگڑا کروں کہ پائینتی چھوڑ کر سرہانے جا کر بیٹھوں۔ ایک دوسرے بزرگ اس وقت موجود تھے انہوں نے حجام سے کہا کہ ارے! یہ سرہانے نہیں بیٹھیں گے۔ تو ہی بیٹھ جا۔ صاحبو! ہمارے اکابر تو اس شان کے تھے۔

قابل عمل مثال

گو میں کچھ نہیں ہوں مگر الحمد للہ! اپنے اکابر کے اس طرز کا عاشق ہوں اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اس رمضان گزشتہ میں لوگوں نے جامع مسجد کی امامت کے لئے مجھ سے درخواست کی۔ حالانکہ امامت وخطابت قدیم سے ہمارے قصبہ میں خطیبوں ہی کے خاندان میں ہے جن میں سے میں بھی ہوں۔ مگر اب تک دوسرے خاندان کے لوگ امام تھے۔ تو مجھے واللہ ایک دن بھی یہ وسوسہ نہیں آیا کہ اپنا منصب دوسرے کے پاس کیوں ہے مگر اب بعض وجوہ سے لوگوں کو پہلے امام سے انقباض ہو گیا اور مجھے امام کرنا چاہا تو میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک خود وہ امام اجازت نہ دے میں امامت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ خود ان لوگوں نے بھی درخواست کی، تو میں نے منبر پر کھڑے ہو کر صاف کہہ دیا کہ میں اس وقت آپ لوگوں کے کہنے سے امامت قبول کرتا ہوں اور صاف کہتا ہوں کہ یہ میرا حق نہیں جیسا کہ عام طور پر لوگ اس کو اپنا حق سمجھ لیتے ہیں۔ نہ میرے خاندان کو اس حق کی میراث پہنچے گی۔ اور میں صرف اس وقت تک امام رہوں گا جب تک آپ سب لوگ راضی رہیں اور اگر کسی ایک شخص کی بھی مرضی نہ ہو خواہ وہ جولاہا یا تیلی ہو تو وہ ڈاک میں جس وقت بھی ایک کارڈ میرے نام ڈال دے گا کہ امامت سے الگ ہو جاؤ، اسی دن میں امامت سے الگ ہو جاؤں گا۔ واللہ! مجھے منبر اور وعظ وامامت کی خواہش نہیں لوگ مجھ سے منبر اور وعظ وغیرہ کا کام لے لیں اور مجھے اس سے منع کر دیں اور ایک حجرہ مجھے مل جائے تو میں اس پر راضی ہوں۔ اور اگر حجرہ بھی چھین لیا جائے تو مجھے اس سے بھی دریغ نہیں۔ میں اپنے گھر میں یا جنگل میں بیٹھ کر اپنے خدا کو یاد کر لوں گا۔

دنیا و دین کی راحت کا راز

افسوس! آج کل کے علماء کے اندر یہ بات نہیں دیکھی جاتی بلکہ جگہ جگہ یہ سننے میں آیا

ہے کہ وہاں امامت پر جھگڑا ہے وہاں وعظ پر فساد ہے۔ بات یہ ہے کہ مقصود جاہ ہے اس میں دوسرا شریک ہوجاتا ہے تو ناگواری ہوتی ہے۔ خدا مقصود نہیں ۔ اگر خدا مقصود ہوتا تو یہ امامت ومنصب وبال جان معلوم ہوتا۔

ہمارے حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ حضرت کو ایک شخص نے رقعہ دیا۔ اس میں یہ مضمون تھا کہ آپ کا فلاں مرید ایسے ایسے کام کرتا ہے۔ اس کو منع کردیجئے ورنہ اندیشہ ہے کہ لوگ حضرت سے بے اعتقاد ہوجائیں گے ۔ حضرت نے فرمایا کہ بھائی دوسروں پر کیوں رکھتے ہو۔ اگر تمہارا جی بے اعتقاد ہونے کو چاہتا ہے تو تم بے اعتقاد ہوجاؤ اور مجھے تم لوگوں کی بے اعتقادی سے کیا ڈراتے ہو۔ میں تو خدا سے چاہتا ہوں کہ مخلوق مجھے چھوڑ دے اور مردود سمجھ کر مجھ سے سب الگ ہوجائیں۔ بس میں ہوں اور میرا خدا !

ارے مجھے تو تمہارے اعتقاد نے پریشان کردیا ہے کہ مجھے اپنے خدا کو یاد کرنے کا بھی یک سوئی کے ساتھ وقت نہیں ملتا۔ واقعی عاشق تو یہ چاہتا ہے کہ اس کا یہ حال ہو ؎

چہ خوش وقتے وخرم روزگارے ☆ کہ یارے برخورد از وصل یارے

(وہ کیا اچھا وقت ہے اور اچھا زمانہ ہے کہ اس میں کوئی محب اپنے محبوب کے وصال سے متمتع ہو)

اگر کسی کا یہ مذاق ہوجائے تو اس کو منصب اور امامت وشہرت سے خود ہی نفرت ہوجائے گی۔ اور اگر یہ مذاق نہ ہو اور شہرت کی ہوس ہی ہو تو اس کی تحصیل کا بھی وہ طریق نہیں جو رسمی علماء نے آج کل اختیار کیا ہے بلکہ اس کا طریق بھی فنا اور مٹانا ہی ہے۔ اپنے کو جتنا مٹاؤ گے اتنا ہی مشہور ہوگے۔ گو اس نیت سے فنا کا اختیار مذموم ہے مگر اس پر شہرت کا ترتب ضرور ہوجائیگا۔ جو تمہارا مدعا ہے نیز اہل اسلام تمہاری پارٹی بندیوں کے ضرر سے محفوظ رہیں گے۔ اسی کو ایک شاعر کہتا ہے ؎

اگر شہرت ہوس داری اسیر دام عزلت شو ☆ کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نام عنقارا

(اگر شہرت کی خواہش ہے تو گوشہ اختیار کر اس لئے کہ گوشہ گیری سے عنقا کے نام کی شہرت ہے)

مگر شہرت کی طلب نہ معلوم لوگوں کو کیوں ہے۔ اس میں کیا خوبی انہوں نے دیکھی ہے اگر غور کر کے دیکھا جائے تو اس کی حقیقت تو صرف اتنی ہے کہ لوگ ہم کو بڑا سمجھیں جو کہ محض ایک خیالی شے ہے تو نفع تو محض وہمی وخیالی اور ضرر اس کا واقعی۔ جس کو مولانا فرماتے ہیں ؎

اشتہار خلق بند محکم ست ☆ بند ایں ار بند آہن کے کم ست
چشمہا وخشمہا ورشک ہا ☆ برسرت ریز وچو آب از خسکہا

(مخلوق میں شہرت مضبوط بند ہے، یہ بند لوہے کے بند سے کم نہیں ہے، غصہ اور آنکھیں اور رشک سے تیرے سر پر ایسا ٹپکتے ہیں جیسے مشکوں سے پانی ٹپکتا ہے)

مشہور آدمی سے لوگوں کو حسد وعداوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے درپے ہو جاتے ہیں۔ اور بستی میں جب کوئی غمی واردات ہوتی ہے، تو سب سے پہلے مشہور آدمیوں کی گردن ناپی جاتی ہے۔ گم ناموں، گھس گھدوں کو کون پوچھتا ہے۔ اس لئے سلامتی اسی میں ہے کہ

خویش رارنجور سازوزار زار ☆ تاترا بیروں کنند از اشتہار

اپنے آپ کو گم نام کرو۔ دنیا کی راحت بھی اسی میں ہے اور دین کی راحت بھی۔ کیونکہ گم نام آدمی کو یک سوئی اور خلوت کا موقعہ بہت ملتا ہے اور خلوت کو صفائی قلب میں بہت دخل ہے۔

قعر چہ بگزید ہر کو عاقل ست ☆ زانکہ در خلوت صفائی ہا دل ست

(جو شخص عاقل ہے وہ خلوت کو اختیار کرتا ہے، اس لئے کہ خلوت میں صفائی قلب ہے)

اصلاح عوام کی صورت

ہاں جس شخص کو خود اللہ تعالیٰ مشہور فرما دیں اور وہ شہرت کا طالب نہ ہو تو وہ مجبور ہے اور اس مجبوری کی وجہ سے یہ شہرت اس کو مضر بھی نہیں ہوتی کیونکہ غیب سے اس شخص کی امداد ہوتی ہے اور جو طالب شہرت کا ہوگا۔ اس کو ضرور نقصان پہنچے گا۔ جس کی دلیل حدیث صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبدالرحمٰن بن سمرہ صحابیؓ کو فرمایا تھا۔

لاتسئل الامارة فانک ان اعطیتها عن مسئلة وکلت الیها وان اعطیتها عن غیر مسئلة اعنت علیها (مسند الإمام أحمد: ٥: ٢٢، ٢٣)(متفق علیه)

(ترجمہ: تم حکومت کے عہدہ کے طالب نہ ہو، اگر تم نے اس کو طلب کیا تو تم کو اس کی طرف سونپا جائے گا اور اگر بلا طلب وہ عہدہ تم کو مل گیا تو تمہاری اس میں اللہ کی طرف سے امداد کی جائے گی)

یہ مضمون میں نے اس لئے بیان کر دیا کہ میں نے سنا تھا کہ اس شہر میں امامت وغیرہ پر بہت جھگڑے رہتے ہیں۔ تو علماء کیلئے لازم یہ ہے کہ ان کی امامت سے اگر ایک شخص کو بھی

کراہت ہو، تو فوراً اس سے علیحدہ ہو جائیں۔ پھر ان شاء اللہ بہت جلد وہ الگ کرنے والے ہی آگے ہاتھ جوڑیں گے۔ اور یاد رکھئے جب تک علماء حب مال وحب جاہ کو زائل نہ کریں گے، اس وقت تک عوام کی اصلاح نہیں ہو سکتی نہ عوام کی نظر میں دین کی وقعت ہو سکتی ہے۔

یہ مضمون بہت طویل ہو گیا اور وقت بھی زیادہ گزر گیا۔ مگر امید ہے کہ سب ضرورت کے موافق بیان ہوا ہے۔ اور یہ مضمون گو تلخ ہے کیونکہ اس میں تمام فرقوں کو دعوت دی گئی ہے مگر مصالحہ دار ہے ایسا تلخ نہیں جس میں کچھ لطف ہی نہ ہو بلکہ اس کی تلخی تمبا کو اور افیون کی تلخی جیسی ہے کہ ایک بار کوئی اس کا تحمل کر لے تو پھر عمر بھر بندہ بے دام ہو جائے گا۔ اسی طرح اس مضمون کی تلخی کو ایک بار آپ گوارا کر لیجئے پھر ان شاء اللہ عمر بھر دعا دیں گے۔

چند علمی نکتے

اب میں آیت کی طرف عود کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اس غلطی کو رفع فرمایا ہے جو بعض لوگ سمجھے ہوئے ہیں کہ قرآن سے صرف معانی مقصود ہیں۔ یہ خیال غلط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آیات کو قرآن و کتاب فرمایا ہے کہ یہ لکھنے والے کی چیز ہے اور ظاہر ہے کہ لکھنا پڑھنا الفاظ ہی کے متعلق ہے نہ کہ معانی محضہ کے۔

اب یہاں ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ ایک جگہ تو لفظ قرآن کو مقدم کیا ہے لفظ کتاب سے اور ایک جگہ اس کا عکس ہے جس سے معلوم ہوا کہ من وجہ الفاظ میں مقصود بہت زیادہ ہے اور من وجہ معانی میں مقصودیت زیادہ ہے اور یہ نکتہ اس طرح حاصل ہوا کہ قرأت الفاظ کی ہوتی ہے اور الفاظ اس کا مدلول قریب معانی ہیں اور کتابت نقوش کی ہوتی ہے اور اس کا مدلول قریب الفاظ ہیں اور معانی مدلول بعید۔ پس قرأت کی حالت میں معانی کی طرف اول ہی توجہ ہو جاتی ہے اور کتابت میں اول الفاظ کی طرف اور ان کے واسطہ سے معانی کی طرف اور مقصودیت سے مراد بھی مدلولیت ہے۔ پس قرأت میں زیادہ مقصودیت معانی میں ہوئی اور کتابت میں زیادہ مقصودیت الفاظ میں ہوئی۔ پس اس مجموعہ میں اشارہ ہو گیا کہ الفاظ بھی اس درجہ میں مقصود ہیں کہ معانی میں من کل الوجوہ مقصودیت بڑھی ہوئی نہیں بلکہ بعض وجوہ سے الفاظ میں بھی مقصودیت بڑھی ہوئی ہے۔

اور اسی مقام سے ایک اور مسئلہ بھی حاصل ہو گیا جس میں علماء کا اختلاف ہے کہ قرآن کو دیکھ کر مصحف میں پڑھنا افضل ہے یا حفظ پڑھنا افضل ہے جو حضرات حفظ پڑھنے کو افضل کہتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اس میں تدبر زیادہ ہوتا ہے۔ الفاظ سے بلاواسطہ معانی کی طرف التفات ہو جاتا ہے اور نقوش سے التفات بواسطہ ہوتا ہے۔ اور بعض نے مصحف سے پڑھنے کو افضل کہا ہے۔ اس لئے کہ اس میں محل توجہ متعدد ہوتے ہیں۔ الفاظ تو بلاواسطہ نقوش اور معانی بواسطہ الفاظ تو اس میں عبادت متعدد ہوتی ہے۔ یہ تعدد تو باعتبار مدلول کے ہے اور دال کے اعتبار سے بھی تعدد ہے ایک نقوش کے اعتبار سے یعنی عبادت بصر، دوسرے الفاظ کے اعتبار سے یعنی عبادت لسان۔ پس اس میں دو عبادتیں مجتمع ہو جاتی ہیں (**هذا هو المؤيد بالحديث بظاهر لفظه وهو قوله عليه السلام قراء ة الرجل القرآن فی غير المصحف الف درجة وقرا ته فی المصحف تضعف علی ذالک الی الفی درجة (مشکوٰة المصابيح: ۲۱۶۷)رواة البيهقی والا ول مؤيد بقوله عزوجل وليد بروااٰياته وليتذکر الوالالباب کمافی اللمعات عن النووی انه (ای الحديث) ليس علیٰ اطلاقه بل ان کان القاری من حفظه يحصل له من التدبر والتفکر وجمع القلب اکثرمما يحصل من المصحف فالقرأة من الحفظ افضل وان استويافمن المصحف افضل هذا مراد السلف ۱۲**)۔

اور ایک نکتہ اور ہو سکتا ہے وہ یہ کہ قرآن کے محفوظ ہونے میں من وجہ الفاظ مقررہ کو زیادہ دخل ہے کہ خدانہ کردہ اگر جمیع مصاحف تلف ہو جائیں تو حافظان الفاظ از سر نو قرآن کو مدون کر سکتے ہیں اور من وجہ نقوش کو زیادہ دخل ہے کہ اختلاف فی الالفاظ کے وقت مکتوب کی طرف مراجعت کر کے فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد مبین کی قید ہے۔ اس میں یہ اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ قرآن کی قرأت و کتابت دونوں واضح اور ظاہر ہونی چاہئیں۔ اسی لئے فقہاء نے قرآن کی تقطیع چھوٹی کرنے سے منع فرمایا ہے بلکہ مستحب یہ ہے کہ قرأت کی تقطیع بڑی ہو تا کہ کتابت واضح اور صاف ہو لیکن متوسط تقطیع کا مضائقہ نہیں جیسے حمائل کی تقطیع ہے کہ اس سے سفر میں سہولت ہوتی ہے۔ ہاں یہ جو آج کل بعض تعویذی قرآن شائع ہوئے ہیں۔ یہ بے شک مکروہ ہے۔

نکات متعلق حروف مقطعات

اب حروف مقطعات کا نکتہ بیان کرتا ہوں جو ان آیات کے شروع میں وارد ہیں۔ اور میں ان سے بھی اپنا مدعا بیان کروں گا جیسا کہ میں نے شروع میں وعدہ کیا تھا۔ حروف مقطعات میں بہت سے نکات ہیں ایک نکتہ یہ ہے کہ یہ اسرار ہیں درمیان اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے معانی سے واقف تھے مگر دوسروں پر آپ نے ان کے معانی ظاہر نہیں فرمائے کیونکہ ان کا تعلق محکمہ شرائع عالیہ سے نہیں بلکہ دوسرے محکمہ سے ہے۔ ان اسرار کو اسی محکمہ کے آدمیوں پر ظاہر کیا جاتا ہے کہ ملائکہ اور انبیاء علیہ السلام کو ان سے واقف کیا گیا ہے۔ چونکہ امت کو اس محکمہ سے تعلق نہیں اس لئے ہم لوگوں کو ان اسرار سے مطلع نہیں کیا گیا۔

ایک مرتبہ میں نے درس میں یہی تقریر کی تھی اور اس وقت ایک کورٹ انسپکٹر موجود تھے۔ وہ کہنے لگے آپ سچ کہتے ہیں۔ واقع ہر محکمہ کے خاص اسرار ہوتے ہیں جن سے دوسرے محکمہ والوں کو مطلع نہیں کیا جاتا۔ میں نے کہا آپ تو ایسی تصدیق کر رہے ہیں جیسے آپ پر یہ بات گزری ہو۔ کہنے لگے جی ہاں! مجھے آج کل ہی میں یہ بات پیش آئی ہے۔ میں ایک دن سپرنٹنڈنٹ کی کوٹھی پر گیا ہوا تھا۔ ان کی میز پر ایک کتاب رکھی تھی۔ میں اس کو دیکھنے لگا تو صاحب نے وہ کتاب میرے ہاتھ سے لے لی اور کہا یہ آپ کے دیکھنے کی نہیں ہے۔ اس میں محکمہ خفیہ پولیس کے اسرار ہیں۔ جن سے دوسرے محکمہ والوں کو مطلع نہیں کیا جاتا اور وہ اسرار کچھ اصطلاحات ہیں کہ سی آئی ڈی والے ان اصطلاحات میں ایک دوسرے کو تار کے ذریعہ سے خبر دیتے ہیں اور دوسرے لوگ ان اخبار پر مطلع نہیں ہوتے۔ اس سے میرا بڑا جی خوش ہوا کہ حسیات میں بھی اس کی نظیر موجود ہے۔

دوسرا نکتہ اس میں ابھی میرے ذہن میں آیا ہے وہ یہ کہ ممکن ہے اس میں اس مضمون پر تنبیہ مقصود ہو کہ قرآن سے محض معانی مقصود نہیں بلکہ الفاظ بھی مقصود ہیں۔ کیونکہ بعض الفاظ قرآن میں غیر معلوم المعنی ہیں۔ اگر صرف معانی مقصود ہوتے تو قرآن میں یہ ایسے الفاظ کیوں ہوتے حالانکہ وہ جزو قرآن ہیں جن کی قرآنیت کا انکار کفر ہے ایک نکتہ اس

میں یہ ہے کہ حروف مقطعات میں احاد وعشرات ومآت کو جمع کیا گیا ہے جس سے بعض اہل کشف نے بعض حوادث پر بطور پیشین گوئی کے استدلال کیا ہے جو ایک مستقل علم ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے نکات ہیں۔

خلاصہ بیان کا یہ ہے کہ نہ محض الفاظ کو مقصود سمجھو اور معانی کو بیکار نہ محض معانی کو مقصود سمجھو اور الفاظ کو بیکار۔ بلکہ قرآن کے الفاظ ومعانی دونوں مقصود ہیں۔ اس لئے اصولیین نے کہا ہے کہ القرآن اسم اللفظ والمعنی جمیعًا۔ اور امام صاحب سے جو قرأت بالفارسیہ کا جواز مذکور ہے اس کا یہ مبنی نہیں کہ وہ قرآن کا مصداق صرف معنی کو سمجھتے ہیں بلکہ اس کا مبنی دوسرا ہے جس کو اصولیین نے مفصل بیان کیا ہے۔ پھر امام صاحب کا یہ قول مرجوع عنہ بھی ہے۔ جس سے امام صاحب نے بعد میں رجوع کر لیا ہے، تو ایسے قول سے استدلال لغو ہے۔ غرض دین صحیح وہی ہے جو صورت ومعنی دونوں کا جامع ہے۔ سو قرآن کی بھی یہی شان ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

بہار عالم حسنش دل وجاں تازہ میدارد ☆ برنگ اصحاب صورت را بو ارباب معنی را

(اس کے عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل وجان کو اپنے حسن صوری سے اور حقیقت پرستوں کے دل وجان کو اپنے حسن معنوی سے تروتازہ رکھتی ہے)

میں نے شاید پہلے بھی کہا تھا اور اب پھر کہتا ہوں کہ آخر آپ جو نکاح کرتے ہیں تو کیا بیوی کی صرف سیرت ہی دیکھتے ہیں یا صورت کا بھی لحاظ ہوتا ہے۔ یقیناً صورت وسیرت دونوں کی رعایت کی جاتی ہے پھر دین ہی میں صورت بیکار کیوں ہو گئی۔ بعض لوگوں نے اس کے خلاف مولانا رومی کی طرف ایک شعر منسوب کر رکھا ہے۔

من زقرآن مغز را برداشتم ☆ استخواں پیش سگاں بگذاشتم

(میں نے قرآن کے مغز کو لے لیا، ہڈی کتوں کے لئے چھوڑ دی)

سو خوب سن لیجئے کہ یہ شعر مثنوی کا نہیں ہے نہ معلوم کس کا شعر ہے اس لئے اس سے احتجاج نہیں ہو سکتا۔ پھر دلائل شرعیہ کے سامنے اشعار سے احتجاج کرنا کب جائز ہے خواہ کسی کا ہو بلکہ خود اس شعر میں تاویل کرنا واجب ہو گا اگر کسی مقبول کا ہو، ورنہ وہ شعر ہی مردود ہے۔ اور قرآن میں سب مغز ہی ہے، لفظ بھی معنی بھی، اس میں چھلکا

گٹھلی کچھ نہیں اس کی تو یہ شان ہے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم ☆ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

(سر سے قدم تک جس جگہ دیکھتا ہوں کرشمہ دامن دل کھینچتا ہے کہ یہی جگہ محبوبیت کی ہے)

حسین آدمی کی ہر ادا دلربا ہوتی ہے۔ اس کی کوئی چیز زائد و بیکار نہیں ہوتی بلکہ ایک چیز بھی کم ہو جائے تو حسن میں کمی ہو جائے گی، بس اب میں ختم کرتا ہوں اور میں نے آپ حضرات کا بہت وقت لیا اس کی معافی چاہتا ہوں (مجمع سے آواز آئی مرحبا! مرحبا! جزاک اللہ! جب تک جی چاہے بیان فرمایئے ہم سب مشتاق ہیں۔ فرمایا) بس اب میں ختم کر چکا۔ حق تعالیٰ سے دعا فرمایئے کہ ہم کو عمل کی توفیق ہو اور فہم سلیم عطا ہو۔

وصلی اللہ علی سیّدنا و مولانا محمّد و علیٰ آلہٖ و اصحابہ اجمعین و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین.

تعمیم التعلیم

تعلیم کو عام کرنے کے متعلق یہ وعظ ۲۱ جمادی الثانی ۱۳۴۰ھ مدرسہ محمودیہ سروٹ مظفر نگر میں بیٹھ کر فرمایا جس میں ۶۰۰ کے قریب علماء وطلباء اور نو تعلیم یافتہ حضرات موجود تھے حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ نے اسے قلمبند فرمایا جو ساڑھے چار گھنٹے میں ختم ہوا۔

عوام نے علم دین کو عربی ہی کے ساتھ مخصوص سمجھ لیا ہے اور عربی پڑھنے کی ہر ایک کو فرصت نہ تھی تو اب انہوں نے اردو میں بھی مسائل نہ سیکھے کیونکہ اردو میں مسائل پڑھ لینے کو وہ علم ہی نہیں سمجھتے (حالانکہ) اردو میں علم دین پڑھ لینے سے بھی وہ فضائل حاصل ہو سکتے ہیں جو احادیث وقرآن میں علم کے لئے وارد ہیں۔

خطبۂ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد لله نحمده ' ونستعينهٗ ونستغفرهٗ ونومن به ونتوكل عليه ونعوذبالله من شرورانفسنا و من سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ' ومن يضلله فلاهادى له ونشهد ان لااله الاالله وحدهٗ لاشريک له ونشهد ان سيدنا ومولانا محمدًا عبدهٗ ورسوله صلى الله تعالىٰ عليه وعلىٰ اٰله واصحابه وبارک وسلم

امابعد فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم. بسم الله الرحمن الرحيم.

وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۭ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ڜ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ (البقرہ:۱۰۲)

(ترجمہ: اور ایسی چیزیں سیکھ۔ لیتے ہیں جو خود ان کو ضرر رساں اور ان کو نافع نہیں ہیں اور ضرور یہ (یہودی) بھی اتنا جانتے ہیں کہ جو شخص اس کو اختیار کرے ایسے شخص کا آخرت میں کوئی حصہ باقی نہیں اور بے شک بری چیز (سحر و کفر) جسمیں وہ لوگ اپنی جان دے رہے ہیں کاش ان کو (اتنی) عقل ہوتی؟)

تمہید

ان آیتوں میں جزو اول ایک بڑی آیت کا ٹکڑا ہے جس میں ایک قصہ مذکور ہے۔ پوری آیت میں نے اس لئے نہیں پڑھی کہ جو مقصود اس وقت قابل بیان ہے وہ اس میں مذکور نہیں بلکہ وہ صرف اسی جزو میں مذکور ہے جس کو میں نے تلاوت کیا ہے۔ اگر چہ وہ قصہ بھی جو پوری آیت میں ذکر کیا گیا ہے ضروری ہے۔ اور قرآن کا کوئی جزو ایسا نہیں ہے جو ضروری نہ ہو مگر خاص وقت اور خاص محل کی وجہ سے کسی ایک جزو کو بیان کے لئے اختیار کرلیا جاتا ہے۔ اسی

لئے میں نے پوری آیت کی تلاوت نہیں کی بلکہ اخیر جزو پر اکتفا کیا اور تبلیغ کے موقعہ پر ایسا کرنا جائز ہے چنانچہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بعض دفعہ موقع استشہاد میں جزو آیت کی تلاوت پر اکتفا کیا ہے۔ لیکن نماز میں ایسا نہ کرنا چاہیے کہ ایک آیت کو بیچ میں سے پڑھنا شروع کر دے یا وسط میں سے قطع کر دے۔ نماز میں پوری آیت بلکہ پوری سورت پڑھنی چاہیے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ لمبی لمبی سورتیں پوری پڑھا کرے جس سے مقتدیوں کو تکلیف ہو بلکہ ہر وقت کے مناسب جتنی مقدار فقہاء نے بتلائی ہے اس کے موافق سورتیں پڑھنا چاہئیں۔ نماز کا تو یہی حکم ہے مگر تبلیغ میں اس کا مضائقہ نہیں کہ ایک آیت وسط میں سے شروع کر دے یا وسط میں قطع کر دے۔ یہ توجیہ تھی جزو آیت پر اکتفا کرنے کی۔

رہا یہ کہ میں نے اس جزو کو اس وقت کیوں اختیار کیا۔ سو ہر چند کہ مضامین قرآن سب ہی ضروری ہیں اور اسی بناء پر وہ قصہ بھی ضروری ہے جو پوری آیت میں مذکور ہے لیکن اس وقت یہ بیان ایک علمی مدرسہ میں ہو رہا ہے جو کہ علم دین کی تعلیم کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ اس لئے مناسب ہوا کہ علم کے متعلق کچھ بیان اور بحث کی جائے اور طلبہ کو علم کے حقوق سے آگاہ کیا جائے اور اس میں جو کچھ کمی کی جا رہی ہے اس کی اصلاح کر دی جائے۔

علم سحر

علم کا بیان جس خاص طریق پر میں اس وقت کرنا چاہتا ہوں وہ اسی جزو آخیر میں مذکور ہے جس کو میں نے پڑھا ہے۔ چنانچہ ترجمہ سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ط اور یہ لوگ سیکھتے ہیں اس علم کو جو ان کے لئے مضر ہے اور نفع نہیں دیتا۔ ان لوگوں سے مراد یہود ہیں اور اس علم سے مراد سحر ہے۔ اوپر سے یہود کی مذمت مختلف طریقوں سے مذکور ہوتی آ رہی ہے۔ چنانچہ اسی ضمن میں ان لوگوں کی بھی مذمت بیان کی گئی ہے جو سحر میں مبتلا تھے اور اس کے متعلق ہاروت ماروت کا قصہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ ہر چند کہ اس قصے کو مقصود وعظ کے ساتھ زیادہ تعلق نہیں مگر ربط کے لئے اس کا ذکر دیا مناسب ہے۔

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ
كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۚ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ

وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ

(ترجمہ: اور انہوں نے ایسی چیز کا (یعنی سحر کا) اتباع کیا جس کا شیاطین چرچا کیا کرتے تھے اور حالت یہ تھی کہ آدمیوں کو بھی سحر کی تعلیم کیا کرتے تھے اور اس (سحر) کا بھی جو کہ ان دونوں فرشتوں پر نازل کیا گیا تھا شہر بابل میں، جن کا نام ہاروت اور ماروت تھا اور وہ دونوں کسی کو نہ بتلاتے تھے جب تک یہ (نہ) کہہ دیتے کہ ہمارا وجود بھی ایک امتحان ہے، پس تم کہیں کافر نہ بن جانا (کہ اس میں پھنس جاتے پس بعضے لوگ اس قسم کا سحر سیکھ لیتے تھے جس کے ذریعہ سے (عمل کر کے) کسی مرد اور اس کی بیوی میں تفریق پیدا کر دیتے تھے، اور یہ (ساحر) لوگ اس کے ذریعے سے کسی کو بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے مگر خدا ہی کے تقدیری حکم سے)

اس کے بعد آیت کا وہی حصہ ہے جو میں نے تلاوت کیا تھا۔ مقصود ان آیتوں سے یہود کی مذمت بیان کرنا ہے کیونکہ ان میں سحر کا بہت چرچا تھا اور اس میں بڑے ماہر تھے۔ چنانچہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی سحر کیا تھا جس کا اثر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ہو گیا تھا۔ پھر وحی کے ذریعہ آپ کو مطلع کیا گیا کہ آپ پر فلاں شخص نے سحر کیا ہے۔ چنانچہ سورۂ الفلق میں اس کی طرف اشارہ ہے: **ومن شر النفثت فی العقد**۔ (الفلق آیت نمبر۳) اور (آپ کہیئے کہ) میں پناہ مانگتا ہوں بدی سے ان عورتوں کی جو گرہوں پر (پڑھ پڑھ کر) پھونک مارنے والی ہیں۔ گرہوں پر پھونک مارنے کی تخصیص اس لئے ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جو سحر ہوا تھا وہ اسی قسم کا تھا کہ ایک تانت کے ٹکڑے میں گیارہ گرہیں دی گئی تھیں اور ہر گرہ پر کلمات سحر کو دم کیا گیا تھا۔ اور عورتوں کی تخصیص اس لئے ہے کہ اس واقعہ میں عورتوں ہی نے یہ سحر کیا تھا۔ دوسرے کچھ تجربہ سے اور نیز علم طبعی کے لحاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کا سحر بہ نسبت مردوں کے زیادہ موثر ہوتا ہے کیونکہ سحر میں قوت خیالی کو زیادہ دخل ہے خواہ وہ سحر حلال ہو یا سحر حرام!

نیت کا اثر

سحر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک سحر حرام کہ محاورات میں اکثر اسی پر سحر کا اطلاق ہوتا ہے۔ دوسرا سحر حلال جیسے عملیات اور عزائم اور تعاویذ وغیرہ کہ لغۃً یہ بھی سحر میں داخل ہیں اور ان

کو سحر حلال کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تعویذ وعزائم وغیرہ مطلقاً مباح نہیں بلکہ اس میں بھی تفصیل ہے کہ اگر اس میں اسماء الٰہی سے استعانت ہو اور مقصود بھی جائز ہو، تو جائز ہے۔ اگر مقصود ناجائز ہو تو حرام ہے۔ اور اگر شیاطین سے استعانت ہو تو مطلقاً حرام ہے۔ خواہ مقصود اچھا ہو یا برا۔ بعض لوگوں کا یہ گمان ہے کہ جب مقصود اچھا ہو تو شیاطین کے نام سے بھی استعانت جائز ہے۔ یہ بالکل غلط ہے خوب سمجھ لو۔

یہاں سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ **انما الاعمال بالنیات** کا حکم مطلق نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اچھی نیت سے حرام کام بھی جائز ہو جائیں امور محرمہ کسی نیت سے بھی کئے جائیں وہ حرام ہی رہیں گے بلکہ یہ حدیث امور مباحہ اور طاعت کے ساتھ مخصوص ہے۔ یعنی اگر جائز کام اچھی نیت سے کیا جائے تو اس پر ثواب ملتا ہے اور بری نیت سے کیا جائے تو گناہ ہوتا ہے۔ نیز بعض فرائض وواجبات بدون نیت کے صحیح نہیں ہوتے۔

خلاصہ یہ کہ مقصود سے پہلے ذریعہ کو دیکھ لینا ضروری ہے اگر ذریعہ جائز ہے مثلاً اسما الٰہی سے استعانت ہو تو پھر مقصود کو دیکھا جائے۔ اگر مقصود محمود ہے تو اس صورت میں تعویذ عملیات کو جائز کہا جائے گا اور اگر مقصود ناجائز ہے تو ان کو حرام کہا جائے گا۔ اور اگر ذریعہ ہی حرام ہو۔ جیسے استعانت بالشیاطین تو اب مقصود چاہے کیسا ہی ہو وہ حرام ہی رہے گا۔ اور اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے کوئی شخص نماز کے لئے لوگوں کو جمع کرنا چاہے اور اس غرض کے لئے ناچ کرائے تاکہ ناچ کے شوق مس سب آجائیں اور نماز پڑھ لیں۔ تو مقصود اگرچہ بہت محمود ہے مگر چونکہ اس کے لئے حرام کو ذریعہ بنایا گیا ہے۔ اس لئے اس صورت کو حرام ہی کہا جائے گا۔ سو آپ نے دیکھا کہ نماز باوجودیکہ حق تعالیٰ کو محبوب ہے مگر اس کے لئے بھی جب حرام کو ذریعہ بنایا گیا تو اس کو شریعت حرام ہی کہے گی۔ یہاں سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہوگئی جو تعویذ وعملیات کو نفع رسانی کے موقع میں مطلقاً جائز سمجھتے ہیں گو اس میں شیاطین ہی سے استعانت ہو اور وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ صاحب ہم نے تو مخلوق کو نفع پہنچانے کیلئے کیا ہے۔ پھر اس میں کیا خرابی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ نماز کے مقابلہ میں دنیوی نفع کوئی چیز نہیں ہے۔ دنیا حق تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہے اور نماز محبوب ہے۔ جب نماز کیلئے حرام کو ذریعہ بنانا جائز نہیں تو دنیوی نفع کے لئے شیاطین سے استعانت کیونکر جائز ہو۔

مسلمان کا مذاق تو یہ ہونا چاہے کہ ہر کام میں سب سے پہلے یہ دیکھے کہ اس سے خدائے تعالیٰ راضی ہیں یا نہیں۔ جس کام میں خدا تعالیٰ ناراض ہوں بالکل ہیچ ہے۔ چاہے اس میں دنیوی نفع کتنا ہی ہو۔ مسلمانوں کے واسطے خدا کی رضا سے زیادہ کوئی چیز نہیں ہے۔

غور کیجئے کہ اگر کوئی محبوب اپنے محبوں کے دھولیں مارتا ہو اور نافرمانی کو روپے دیتا ہو تو اس وقت عاشق کیا چاہے گا۔ یقیناً عاشق محبوب کی نافرمانی روپے حاصل کرنے کیلئے کبھی گوارا نہ کرے گا۔ بلکہ وہ نہایت خوشی سے دھولیں کھانا پسند کرے گا۔ کیونکہ محبوب کی رضا اسی میں ہے اسی طرح خدا کا محبّ دنیوی نفع نقصان کی پروا خدا کی رضا کے سامنے کبھی نہیں کرسکتا بلکہ اس کا مذاق یہ ہوتا ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں۔

ناخوش تو خوش بود برجان من　　دل فدائے یار دل رنجان من
ہرکجا دلبر بود خرم نشیں　　فوق گردون ست نے قعر زمیں
ہرکجا یوسف رخے باشد چو ماہ　　جنت ست آں گرچہ باشد قعر چاہ

(تیرا رنجیدہ کرنا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے دل فدا ہے ایسے یار پر جو دل کو رنجیدہ کرتا ہے، جہاں محبوب ہو وہ جگہ جنت ہے اگرچہ کنواں ہی کیوں نہ ہو، جہاں محبوب بیٹھا ہو وہ جگہ آسمان سے بلند تر ہے)

مقام عشاق

یہاں تک کہ عشاق تو رضائے الٰہی کے سامنے جہنم کی بھی پروا نہیں کرتے۔ اگر خدا تعالیٰ اسی میں راضی ہوں کہ ان کو جہنم میں بھیج دیا جائے تو وہ اس پر بھی خوش ہیں اور اس وقت وہ دوزخ ہی ان کے واسطے جنت بن جائے گی۔ مولانا اسی کو فرماتے ہیں۔

بے تو جنت دوزخ است اے دلربا ☆ با تو دوزخ جنت است اے جانفزا

(اے دلربا تیرے بغیر جنت بھی دوزخ ہے اور آپ کے ساتھ دوزخ جنت ہے)

کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ شاعرانہ مبالغہ ہے اور نہ اگر دوزخ میں ان کو بھیج دیا جائے تو ساری بہادری کرکری ہو جائے۔ سو خوب سمجھ لو کہ یہ مبالغہ نہیں بلکہ سچی بات ہے اور اس وقت بھی اللہ کی ایک مخلوق ایسی ہے جو خدا کی رضا کے سامنے جہنم کی پروا نہیں کرتی۔

دیکھو! ملائکہ جو خدا کے مطیع و فرماں بردار اور طالب رضا ہیں، ان میں ایک جماعت زبانیہ جہنم کی بھی ہے جو دوزخ کی داروغہ اور کارکن ہے اور وہ ہر وقت دوزخ ہی میں رہتے ہیں اگرچہ دوزخ میں ان پر عذاب نہیں ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ ان کے سامنے ہر وقت آگ اور دھواں ہے۔ خون اور پیپ کا منظر ہے بری بری ڈراونی صورتیں ہیں۔ سانپ اور بچھو اور اژدھا وغیرہ ہیں۔ اور ایک جماعت جنت کی کارکن ہے جہاں ہر وقت ان کے سامنے مناظر جنت ہیں۔ باغ اور پھول پھلواری ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں ہیں حسین جمیل عورتیں ہیں، پھر جنتیوں کی صحبت ہے۔ جو سب کے سب مہذب اور شائستہ ہیں۔ اور زبانیہ جہنم کو دوزخیوں سے پالا پڑتا ہے جن کی باتوں میں لہنا نہیں۔ ہر وقت لعن طعن اور گالم گلوچ ہی ہوگی۔

كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا (جس وقت بھی کفار کی کوئی جمات داخل دوزخ ہوگی اپنی دوسری جماعت کو لعنت کرے گی)

تو کیا دوزخ اور جنت کے محافظوں کے ان خارجی حالات ہیں کچھ تفاوت نہیں ہے؟ ضرور ہے مگر کیا زبانیہ جہنم کو وہاں کچھ کلفت ہے ہرگز نہیں۔ اگر ان سے یہ کہا جائے کہ خدا کی مرضی تو نہیں لیکن اگر تم چاہو تو تم کو جنت کا محافظ بنا دیا جائے جہاں ایسے ایسے مناظر حسنہ ہیں۔ باغات اور نہریں ہیں۔ مہذب آدمیوں کی صحبت ہے لیکن مرضی خدا کی اسی میں ہے کہ تم دوزخ میں رہو، جہاں ایسے مناظر کریہہ ہیں تو وہ یہی کہیں گے

بے تو جنت دوزخ است اے دلربا ☆ با تو دوزخ جنت است اے جانفزا

(اے محبوب تیری جدائی میں جنت بھی دوزخ ہے، اور آپ کے ساتھ دوزخ بھی جنت ہے)

پھر جب ملائکہ میں ایک ایسی جماعت موجود ہے جو دوزخ میں رہنے پر ویسے ہی راضی ہے جیسا کہ جنت کے محافظ جنت میں رہنے پر، تو اگر انسانوں میں عشاق کی جماعت اس شان کی ہو تو اس پر تعجب کیا ہے۔ کیونکہ انسان میں تو عشق و محبت کا مادہ سب سے زیادہ ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ عشق و محبت انسان ہی میں ہے۔ الغرض یہ مبالغہ شاعرانہ نہیں ہے بلکہ سچا کلام ہے اور محقق کا کلام ہمیشہ محقق ہی ہوتا ہے۔

مبالغہ شاعرانہ پر مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ جب میں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر تھا تو اس وقت ہم لوگ مثنوی حضرت سے پڑھا کرتے تھے۔ ایک

مرتبہ مطالعہ میں یہ شعر آیا جس میں توحید کا مضمون ہے۔

حملہ شاں پیدا و ناپیدا ست یاد ☆ آنچہ ناپیدا ست ہرگز کم مباد

(ان کا حملہ نظر آتا ہے اور (حملہ کرنے والی) ہوا نظر نہیں آتی یا اللہ جو چیز نظر نہیں آتی یعنی تاثیر حق یا اللہ ہمارے دل سے کبھی کم نہ ہو)

اس شعر میں بہت چکرایا کیونکہ آنچہ ناپیداست سے مراد اس میں حق تعالیٰ ہیں۔ چنانچہ پہلے اشعار سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ مولانا نے اس سے پہلے یہ بیان فرمایا ہے کہ عالم میں جو کچھ ہوتا ہے۔ اس کے فاعل حقیقت میں حق تعالیٰ ہیں اور ہماری مثال ایسی ہے جیسے علم پر شیر کی تصویر بنی ہوتی ہے جب ہوا سے جھنڈا اہلتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیر حملہ کر رہا ہے۔ حالانکہ حقیقت میں وہ شیر نہ حرکت کر سکتا ہے نہ حملہ بلکہ ہوا کی وجہ سے اس کو حرکت ہوتی ہے اور حرکت کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیر حملہ کر رہا ہے لیکن ہوا ہم کو نظر نہیں آتی بلکہ ظاہر میں وہ تصویر ہی متحرک معلوم ہوتی ہے یہی مثال ہماری ہے کہ ہم حقیقت میں محض ہیچ ہیں مگر حق تعالیٰ کے فعل کی وجہ سے ظاہر میں ہم فاعل معلوم ہوتے ہیں۔

ما ہمہ شیراں ولے شیر علم ☆ حملہ شاں از باد باشد دمبدم

(ہماری ایسی مثال ہے جیسے پرچم کا شیر ہوتا ہے ہوا چلنے سے حملہ کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے)

اس کے بعد فرماتے ہیں۔

حملہ شاں پیدا و ناپیدا ست باد ☆ آنچہ ناپیدا ست ہرگز کم مباد

(ان کا حملہ نظر آتا ہے اور ہوا (حملہ کرنے والی) نظر نہیں آتی، یا اللہ جو چیز نظر نہیں آتی (ویسی مؤثریت حق) وہ ہمارے دل سے کبھی کم نہ ہو)

یعنی شیروں کا حملہ کرنا تو ظاہر ہے مگر ہوا جو ان کو حرکت دے رہی ہے ناپید ہے یعنی مخفی ہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ جو چیز مخفی ہے خدا کرے وہ کم نہ ہو۔ تو اس میں ناپید سے مراد حق تعالیٰ ہیں۔ اس پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کے لئے یہ دعا کیونکر صحیح ہو سکتی ہے کہ ہرگز کم مباد، تو میں یہ سمجھا کہ مولانا نے محبت کے جوش میں محض شاعرانہ طریقہ پر یہ دعا کی ہے۔ جیسے شبان موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ایسے ہی مضامین مذکور ہیں کہ وہ محض غلبہ محبت میں حق تعالیٰ کی شان میں ایسی باتیں کر رہا تھا جو محبوبان مجازی کے مناسب ہوتی ہیں اور حق

تعالیٰ ان سے پاک ہیں۔ اسی طرح حق تعالیٰ اس دعا سے بھی مستغنی ہیں مگر محض غلبہ محبت میں مولانا نے یہ فرمادیا کہ جو چیز مخفی ہے خدا کرے وہ کم نہ ہو یعنی اللہ میاں ہمیشہ سلامت رہیں غرض میں اس شعر میں تاویلیں کرتا تھا لیکن کوئی بات دل کو نہ لگتی تھی کیونکہ یہ سب تاویلیں مولانا کے مرتبہ سے بعید تھیں۔ مولانا اگرچہ بہت بڑے صاحب حال ہیں مگر شبان موسیٰ کی طرح ایسے مغلوب الحال بھی نہیں ہیں۔ جب حضرت حاجی صاحب کے سامنے درس شروع ہوا تو آپ نے اس شعر کو سن کر بطور تفسیر کے ایک کلمہ ایسا فرمادیا جس سے سارے اشکالات ختم ہو گئے اور معلوم ہوا کہ یہ مضمون شاعرانہ نہیں بلکہ سچی بات ہے۔

حملہ شاں پیدا و ناپیداست باد ☆ آنچہ ناپیداست ہرگز کم مباد

(ان کا حملہ نظر آتا ہے اور (حملہ کرنے والی) ہوا نظر نہیں آتی یا اللہ جو چیز نظر نہیں آتی یعنی تاثیر حق یا اللہ ہمارے دل سے کبھی کم نہ ہو)

حضرت حاجی صاحب فرماتے ہیں اے از دل ما۔ سبحان اللہ! اس ایک کلمہ سے شعر میں جان پڑ گئی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ شعر میں تو جان پڑی ہوئی تھی مگر ہم نہ سمجھے تھے۔ حاجی صاحب کے ارشاد سے حقیقت ظاہر ہو گئی یعنی مطلب یہ ہے کہ جو چیز مخفی ہے خدا کرے وہ دلوں سے کم نہ ہو۔ اب کوئی اشکال نہ رہا اور معلوم ہو گیا کہ محقق کا کلام محقق ہی ہوتا ہے البتہ اس کے سمجھنے کے لئے بھی محقق ہونا ضروری ہے اسی طرح اس شعر میں بھی مبالغہ نہیں ہے۔

بے تو جنت دوزخ است اے دلربا ☆ با تو دوزخ جنت است اے جانفزا

(اے دلربا تیری جدائی میں جنت دوزخ ہے اور تیری ہمراہی دوزخ میں جنت ہے)

کیونکہ بہادری تو جب ہو کہ دوزخ میں اس کو عذاب بھی ہو اور اس شخص کے لئے رضا الٰہی کے ساتھ دوزخ میں عذاب ہی نہ رہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک تو عذاب نام فراق کا ہے اور جب خدا تعالیٰ کی رضا اس کو دوزخ میں بھی حاصل ہے تو فراق کہاں! یہ تو عین وصل ہے۔ غرض عاشق کے نزدیک ظاہری تکالیف کا نام عذاب ہے ہی نہیں، وہ صرف فراق اور ناراضی محبوب کو عذاب سمجھتا ہے۔ حضرت عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

شنیدہ ام سخن خوش کہ پیر کنعاں گفت ☆ فراق یار نہ آں می کند کہ بتواں گفت
حدیث ہول قیامت کہ گفت واعظ شہر ☆ کنایتیست کہ از روزگار ہجراں گفت

(پیر کنعاں نے نہایت عمدہ بات کہی، وجہ یہ کہ فراق محبوب ایسی مصیبت ہے، جو کہ بیان نہیں کر سکتے۔ واعظ شہر نے جو ڈراؤنے حالات قیامت کے بیان کیے ہیں وہ روز گا ہجر سے ایک اشارہ ہے)

اور راز اس میں یہ ہے کہ رضا و تفویض و محبت و معیت کی لذت میں وہ آلام و تکالیف ایسے مغلوب ہو جاتے ہیں کہ ان کا اثر معتد بہ محسوس نہیں ہوتا۔ پس اگر فرشتوں کو جہنم میں عذاب ظاہری بھی ہوتا تب بھی وہ اس پر راضی ہوتے کیونکہ خدا تعالیٰ کی رضا اسی میں ہوتی اور وہ مقبول بندے رضا کے طالب ہیں۔ مگر ان پر تو عذاب بھی نہیں ہے۔ غرض ان کے نزدیک جہنم میں رہنا ویسا ہی ہے جیسا کہ جنت میں رہنا۔ مقصود میرا اس بیان سے یہ تھا کہ اصل مضرت خدا تعالیٰ کی ناراضی ہے اس کے سامنے دنیا کا نفع نقصان کوئی چیز نہیں۔

علت اور شریعت

بعض لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر نیت اچھی ہو اور کسی کا نفع ہو تو سفلی عمل بھی جائز ہے جس میں شیاطین سے استعانت ہوتی ہے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اسی طرح آج کل یہ مرض پیدا ہوا ہے کہ بعض لوگ گناہوں کے متعلق وجہ دریافت کیا کرتے ہیں کہ سود کیوں حرام ہوا؟ اس میں کیا یہ خرابی ہے؟ جان بیمہ کیوں ناجائز ہے؟ اس میں تو بڑا نفع ہے۔ سو یاد رکھو کہ اس سوال کا کسی مسلمان کو حق نہیں۔ مسلمان کے لئے اتنی وجہ کافی ہے کہ حق تعالیٰ اس فعل سے ناراض ہیں۔ عاشق کو اتنی بات معلوم کر لینے کے بعد کہ محبوب اس بات سے ناراض ہوتا ہے کسی اور درجہ کا انتظار نہیں ہوتا۔ پھر مسلمانوں کو گناہوں کے متعلق علل اور اسباب کی تلاش کا انتظار کیوں ہے۔ اور اگر تم عاشق نہیں بنتے تو خدا کے غلام تو ہو۔ اب خود ہی انصاف کر لو کہ اگر تمہارا کوئی نوکر یا غلام تم سے یہ دریافت کرنے لگے کہ آپ فلاں کام سے کیوں ناراض ہوتے ہیں؟ اس کی وجہ پہلے بتا دیجئے تب میں اس کام سے باز آؤں گا ورنہ میں اپنی رائے پر عمل کروں گا، تو آپ اس کے ساتھ کیا برتاؤ کریں گے؟

افسوس! تم اس غلام سے بھی گئے گزرے ہو گئے جس کو ایک شخص نے خرید کیا اور پوچھا کہ تیرا نام کیا ہے۔ اس نے کہا کہ اب تک خواہ کچھ ہی نام تھا لیکن اب سے تو وہی نام ہے جس سے آپ پکاریں۔ آقا نے پوچھا تو کیا کھاتا ہے؟ کہنے لگا جو حضور کھلائیں گے وہی

کھاؤں گا۔ جو آپ پہنائیں گے وہی پہنوں گا۔

افسوس! ہم خدا کے ساتھ اتنا بھی برتاؤ نہیں کرتے اور اس کے احکام میں علتیں ڈھونڈھتے ہیں۔ آج کل اکثر نو تعلیم یافتہ اس میں مبتلا ہیں کہ ان کو یہ جواب کافی نہیں ہوتا کہ سود اس واسطے حرام ہے کہ خدا تعالیٰ اس سے ناراض ہیں بلکہ وہ اس کی عقلی علت معلوم کرنا چاہتے ہیں اور جب تک علت معلوم نہ ہو اس وقت تک ان کی تسلی نہیں ہوتی۔

ایک صاحب کہنے لگے کہ میں سود کے مذموم ہونے کی علت یہ نہیں تسلیم کرتا کہ اس سے دوزخ میں جانا ہوگا بلکہ میں اس واسطے اسے حرام سمجھتا ہوں کہ اس میں بے مروتی بہت زیادہ ہے کہ اپنے ایک بھائی کو دیئے تو تھے سو روپے اور لے لئے دو سو۔ میں کہتا ہوں کہ یہ علت ایسی ہے جس کو ذرا سے تامل کے بعد ہر عاقل توڑ سکتا ہے کیوں کہ ذہین آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ ایسی بے مروتی ہر تجارت میں ہے مثلاً ہم نے ایک کپڑا خریدا تو دس روپے میں اور اس کو فرخت کرنے لگے بیس روپے میں، یہ بھی بے مروتی ہے۔ ایک مکان ہم نے تیار کیا دو ہزار میں اور بیچنے لگے دس ہزار میں، یہ بھی بے مروتی ہے۔ اسی طرح ایک جائیداد ہم نے خرید کی تھی ہزار میں اور فروخت کرنے لگے پندرہ ہزار میں۔ اب وہ شخص جو سود کی صورت میں کوئی فرق عقلی بیان کرے سو ہرگز وہ کوئی فرق عقلی نہ بیان کر سکے گا۔

چنانچہ کفار مکہ کو بھی یہی شبہ پیش آیا تھا۔ ان کو بھی یہی حیرت تھی وہ کہتے تھے اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا (بیع بھی تو مثل سود کے ہے) کہ ربوا اور بیع میں کیا فرق ہے۔ دونوں ظاہر میں یکساں معلوم ہوتے ہیں۔ تو اب وہ علت کہاں رہی؟ قرآن میں اس کا جواب جو دیا گیا ہے وہ سننے کے قابل ہے حق تعالیٰ نے عقلی وجہ فرق کوئی نہیں فرمائی بلکہ یہ فرق بیان فرمایا۔

وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (یعنی اللہ تعالیٰ تجارت کو حلال کیا اور سود کو حرام کیا)

کہ دونوں یکساں کیوں کر ہو سکتے ہیں بلکہ دونوں میں بڑا فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے بیع اور تجارت کو تو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔ اور حق تعالیٰ مالک ہیں، انہیں اختیار ہے کہ جس چیز کو چاہیں حلال کر دیں اور جس کو چاہیں حرام کر دیں۔ کسی کو وجہ دریافت کرنے کا کوئی حق نہیں۔

علماء کو چاہیے کہ ایسے سوالات کے جواب میں قرآن کا طرز اختیار کیا کریں۔ عوام کو مذاق

علماء نے بھی خراب کر دیا ہے کہ جب ان سے ایسے سوال کیے جاتے ہیں تو وہ عوام کی مرضی کے موافق جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ سو یاد رکھو! جو لوگ علتیں گھڑ کر بتلاتے ہیں، وہ شریعت کی جڑ کھوکھلی کرتے ہیں کیونکہ ممکن ہے کہ جو علت وہ بتلا دیں اس کو کوئی ذہین آدمی مخدوش کر دے۔ اور جب آپ نے حرمت کا مدار اسی علت پر رکھا تھا تو اس کے مخدوش ہونے کے بعد حکم بھی مخدوش ہو جائے گا۔ میں علماء کو وصیت کرتا ہوں کہ عوام کا ایسا اتباع نہ کریں کہ اس میں عوام کا بھی نقصان ہے اور علماء کا بھی اور شریعت کی بنیاد بھی کمزور ہوتی ہے بلکہ جب کوئی ان سے یہ پوچھے کہ فلاں کام کے حرام ہونے کی علت کیا ہے، تو صرف اتنا جواب دے دیا کریں کہ حق تعالیٰ نے اس سے منع کیا ہے یا حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے۔

اصول شریعت

بعض لوگ سوال میں یہ قید لگا دیتے ہیں کہ اس کا ثبوت قرآن سے دیا جائے اور علماء بھی خواہ مخواہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کو قرآن ہی سے ثابت کیا جائے۔ حالانکہ جب اصول شریعت چار ہیں، کتاب و سنت و اجماع امت و قیاس، تو ہر عالم کو حق ہے کہ وہ کسی مسئلہ کو قرآن سے ثابت کر دے یا حدیث سے یا اجماع سے یا قیاس مجتہد سے۔ آخر تمام مسائل کو قرآن سے آپ کہاں تک ثابت کریں گے۔ اگر تمام مسائل قرآن سے معلوم ہو سکتے تو پھر دوسرے حجج شرعیہ کی ہی ضرورت کیوں ہوتی۔

بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ قرآن میں ہر چیز ہے۔ یہاں تک کہ وہ ریل اور تار وغیرہ کا ثبوت بھی قرآن سے دینے لگے۔ حالانکہ قرآن میں ہر چیز کے بیان ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں، ورنہ پھر کپڑا بننے کی ترکیب مشینیں اور کلیں بنانے کا طریقہ بھی قرآن میں ہونا چاہیے۔ تو پھر قرآن کیا ہوا وہ صنعتوں کی کتاب ہوئی۔ بھلا اگر کوئی شخص طب اکبر میں ایسی ترکیبیں بھی لکھی ہوتیں تو اس کو طب کی کتاب ہرگز نہ کہتے طب اکبر میں ایسی باتوں کا ہونا اس کے لئے کمال نہ ہوگا۔ اسی طرح قرآن میں جو کہ طب روحانی کی کتاب ہے ایسی فضولیات کا ہونا اس کے لئے کمال نہ ہوگا بلکہ عیب ہوگا۔

قرآن میں دین کی سب باتیں مذکور ہیں مگر یہ ضرور نہیں کہ سب صراحۃً مذکور ہوں بلکہ اس میں قواعد کلیہ مذکور ہیں جن سے مجتہدین مسائل جزئیہ استنباط کر لیتے ہیں۔ چنانچہ ایک

قاعدہ قرآن میں یہ بھی مذکور ہے: مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو جو کچھ (حکم) دیں اس کو لے لو اور جس بات سے منع کریں اس سے باز رہو۔) تو اب جتنے احکام احادیث نبویہ سے ثابت ہیں وہ سب اس قاعدہ کی جزئیات ہیں۔ لہٰذا ہم کو حق ہے کہ بعض احکام کا ثبوت احادیث سے دے دیں۔

نیز قرآن میں ایک قاعدہ یہ بھی مذکور ہے: فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ (ترجمہ: اے بصیرت والو! اعتبار حاصل کرو) اور اعتبار کہتے ہیں ایک نظیر کو دوسری نظیر پر قیاس کرنے کو۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض احکام قیاس سے بھی ثابت ہوتے ہیں وعلیٰ ہذا القیاس! پھر ہم کو اس پابندی کی کیا ضرورت ہے کہ ہر مسئلہ کا جواب قرآن ہی سے دیں۔

آج کل ایک فرقہ قرآنیہ پیدا ہوا ہے جو قرآن کے سوا کچھ نہیں مانتے۔ یہ غیر مقلدوں سے بھی بڑھ گئے۔ وہ تو قیاس ہی کو نہ مانتے تھے انہوں نے حدیث کو بھی اڑا دیا۔ اس فرقہ کے ایک عالم سے یہ پوچھا گیا کہ عدد رکعات کا ثبوت قرآن سے دو۔ کیونکہ قرآن میں تو مطلق نماز کا حکم ہے اور بعض آیات میں نماز کے اوقات بھی اشارۃً مذکور ہیں لیکن عدد رکعات کہ صبح کی دو رکعتیں فرض ہیں اور ظہر کی چار۔ اس کا بیان قرآن میں کہیں بھی نہیں تو تم لوگ یہ عدد کہاں سے سمجھے ہو۔ اگر احادیث سے سمجھے ہو تو احادیث کا حجت ہونا مسلم ہو گیا ورنہ قرآن میں دکھلاؤ کہ یہ اعداد کہاں مذکور ہیں۔ اس نے ایک دن کی مہلت مانگی۔ اسی سے ان کے مذہب کا لچر ہونا معلوم ہو گیا کہ ابھی تک عدد رکعات کی دلیل بھی معلوم نہیں اور عمل پہلے ہی سے شروع کر دیا۔ غرض اگلے دن انہوں نے بہت کچھ سوچ سوچ کر یہ آیت پڑھی:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ
مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ (سورہ فاطر:۱)

(ترجمہ: تمام تر حمد اسی اللہ کو لائق ہے جو آسمان اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے جو فرشتوں کو پیغام رساں کرنے والا ہے، جن کے دو دو، تین تین اور چار چار پر اور بازو ہیں)

تمام حمد اللہ کیلئے ہے جو آسمان وزمین کا پیدا کرنے والا ہے فرشتوں کو بازوؤں والا بنانے والا ہے، دو دو اور تین تین اور چار چار۔ یہ دلیل تھی نماز کی رکعتوں کے اثبات کی۔

سبحان اللہ! وہی مثال ہوئی ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ بھلا اس آیت میں فرشتوں کے بازوؤں کے شمار کا ذکر ہے یا رکعات صلوٰۃ کے عدد کا۔ اگر محض عدد کا ذکر ہی اس کے لئے کافی ہے تو ایک یہی آیت کیا اور بھی آیتیں ایسی مل جائیں گی۔ چنانچہ ارشاد ہے:

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ

(ترجمہ: تو اور عورتوں سے جو تم کو پسند ہوں نکاح کرلو، دو دو عورتوں سے اور تین تین عورتوں سے اور چار چار عورتوں سے)

یہاں بھی وہ عدد مذکور ہے جو پہلی آیت میں ہے۔ باقی اس سے تو غرض ہے ہی نہیں کہ یہ عدد کس چیز کا ہے۔ نماز کا ہے یا فرشتوں کے بازوؤں کا یا منکوحہ عورتوں کا۔ استغفر اللہ العظیم۔

غرض علماء کو یہ طرز اختیار کرنا چاہیے کہ ہر مسئلہ کا قرآن سے ثبوت دینے کی کوشش کریں یا ہر مسئلہ کی عقلی علت بیان کریں۔ کیونکہ بعض جگہ آپ کو علت ہی نہ ملے گی یا ملے گی مگر کمزور ہوگی۔ تو اس طرز سے گویا آپ شریعت کی جڑ کو کھوکھلا کرنا چاہتے ہیں۔

ایک صاحب نے مجھ سے اپنا قصہ بیان کیا کہ ایک جنٹلمین کو میں نے نصیحت کی کہ تم داڑھی کیوں منڈاتے ہو یہ گناہ ہے۔ اس سے توبہ کرنی چاہیے۔ وہ کہنے لگے کہ داڑھی کا ثبوت تم قرآن سے اگر دے دو تو میں بھی توبہ کرلوں گا۔ میں نے کہا کہ قرآن سے داڑھی کا ثبوت میں دے سکتا ہوں چنانچہ میں نے یہ آیت پڑھی: **قال یابن ام لاتأخذ بلحیتی ولا برأسی** (سورہ طٰہٰ)

(ترجمہ: ہارون علیہ السلام نے (موسیٰ علیہ السلام سے) کہا کہ اے میرے ماں جائے! میری داڑھی اور سر کو نہ پکڑ)

اس سے معلوم ہوا کہ ہارون علیہ السلام کے داڑھی تھی ورنہ موسیٰ علیہ السلام اسے کس طرح پکڑتے۔

میں نے ان حضرت سے یہ کہا کہ اگر وہ شخص تم سے یہ سوال کرتا کہ اس آیت سے تو داڑھی کا وجود ثابت ہوا کہ ہارون علیہ السلام کے داڑھی تھی وجوب تو ثابت نہ ہوا کہ اس کا رکھنا واجب ہے۔ تو تم کیا جواب دیتے۔ اور وجود ثابت کرنے کیلئے تم نے قرآن کو کیوں تکلیف دی اپنی ہی داڑھی دکھلا دی ہوتی کہ لو میری داڑھی دیکھ لو اس سے وجود ثابت ہو گیا۔ وہ کہنے لگے کہ اجی اس کو اتنی عقل تھوڑا ہی تھی کہ وہ یہ سوال کر سکتا۔ میں نے تو اس کو ڈر

بڑا ہی لیا۔ میں نے کہا، بس یہی فرق ہے ہم طالب علموں میں اور آپ میں۔ ہم ایسی دلیل کبھی نہیں بیان کر سکتے جو خود ہمارے نزدیک بھی مخدوش ہو۔ ہماری زبان ہی ایسی دلیل پر نہیں چلتی۔ ہم تو حتی الامکان وہی بات منہ سے نکالتے ہیں جو دنیا بھر کے عقلاء سے نہ ٹوٹ سکے۔ گو مخاطب کے مذاق کے موافق نہ ہو۔ پس خوب سمجھ لو کہ یہ طرز شریعت کے لئے بہت ہی ضرر رساں ہیں۔ یہ لوگ اپنے دل ہی میں خوش ہوتے ہوں گے کہ ہم نے شریعت کے ساتھ دوستی کی مگر ان کی یہ دوستی ویسی ہے جیسے ریچھ کی دوستی مشہور ہے۔

ایک شخص نے ایک ریچھ پالا تھا اور اسے پنکھا جھلنا سکھایا تھا کہ جب آقا سو جاتا تو وہ کھڑا ہو کر اسے پنکھا جھلا کرتا تھا۔ بعض دوستوں نے اسے منع بھی کیا کہ جانور کا اعتبار نہیں۔ اس سے ایسی خدمت نہ لینا چاہیے کہ خود سو جاؤ اور اسے آزاد چھوڑ دو۔ کہنے لگا نہیں صاحب! یہ تعلیم یافتہ ہے (یعنی اب یہ مہذب اور شائستہ ہو گیا ہے وحشی نہیں رہا) اب اس سے کچھ خطرہ نہیں۔ ایک دن یہ آقا صاحب پڑے سو رہے تھے اور ریچھ حسب معمول پنکھا جھل رہا تھا کہ ایک مکھی اس کے ناک پر آ کر بیٹھی۔ ریچھ نے اسے اڑایا وہ پھر آ بیٹھی۔ بعض مکھی ایسی لیچڑ ہوتی ہے کہ جتنا اس کو اڑاؤ وہ باز ہی نہیں آتی وہ بار بار آ کر بیٹھ جاتی چنانچہ اس مکھی نے ریچھ کو تنگ کر دیا۔ وہ بار بار اڑاتا تھک گیا مگر وہ پھر آ موجود ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ ریچھ کو غصہ آ گیا اور اس نے پنکھا ڈال کر ایک بڑا سا پتھر تلاش کیا کہ اب کے اگر یہ مکھی آئے گی تو میں اس پتھر سے اس کو مار ڈالوں گا۔ چنانچہ وہ مکھی آئی اور ریچھ نے تاک کر ایک بڑا سا پتھر آقا کی ناک پر مارا۔ مکھی تو نہ معلوم مری یا نہیں مگر آقا کے دماغ کا بھرتہ ہو گیا۔

جس طرح اس ریچھ نے اپنے نزدیک تو آقا کی خدمت ہی کی تھی اور اس کا ارادہ موذی کو مارنے کا تھا۔ اس نے آقا کو ہلاک کرنا نہ چاہا تھا۔ مگر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ دوستی حقیقت میں آقا کے ساتھ دشمنی تھی۔ اسی طرح آج کل ہمارے یہ نادان بھائی شریعت کے ساتھ ریچھ کی سی دوستی کر رہے ہیں۔

عجب و کبر

اصل راز ایسے گستاخانہ سوالات کا یہ ہے کہ لوگوں میں آج کل عجب و کبر غالب ہے۔ انقیاد کا مادہ مفقود ہوتا جاتا ہے۔ اسی لئے احکام شرعیہ کو عبدیت کے طور پر ماننے پر طبیعت

آمادہ نہیں ہوتی۔ اور ایک احکام شرعیہ ہی میں کیا اس عدم انقیاد اور عجب و کبر کا مذاق ہر معاملہ میں جھلک رہا ہے۔ حتی کہ اگر کسی امر میں اپنی کوئی غلطی بھی محسوس ہو جائے اور اس غلطی کے اعتراف کے لئے آمادہ بھی ایسا تجویز کیا ہے جس سے ذرہ برابر ندامت و تواضع نہیں معلوم ہوتی۔ بس چند الفاظ ضابطہ کے دہرا لینا کافی سمجھتے ہیں اور شان کی اس میں بھی حفاظت رکھی جاتی ہے۔ چنانچہ آج کل کی تہذیب میں معافی چاہیے کا ایسا ہی عجیب طریقہ مشاہد ہے کسی کم بخت کا ان کے ہاتھ سے کیسا ہی نقصان ہو جائے۔ بس اتنا ہی کہہ کر چھوٹ گئے کہ میں نہایت افسوس کرتا ہوں کہ میری وجہ سے آپ کا نقصان ہو گیا۔ سبحان اللہ کسی کے جوتے مار لئے اور یہ کہہ کر الگ ہو گئے کہ میں افسوس کرتا ہوں۔

مجھے اس پر ایک حکایت یاد آئی۔ ایک شخص کی داڑھ میں درد تھا۔ وہ ڈاکٹر کے پاس گئے کہ اس داڑھ کو نکال دو۔ نہ معلوم ڈاکٹر سے کیا غلطی ہوئی کہ اس نے وہ داڑھ تو نہ نکالی اس کی بجائے ایک اچھی داڑھ نکال دی۔ جس کے نکالتے ہی یہ شخص فوراً اندھا ہو گیا۔ اس نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ نے یہ کیا کیا۔ وہ بولے کہ میں افسوس کرتا ہوں کہ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ اس غریب کی تو آنکھ گئی اور انہوں نے افسوس کر کے بزعم خود اس کی تلافی کر دی۔ پھر غضب یہ کہ افسوس دل سے نہیں کرتے۔ ان کا لہجہ افسوس میں بھی ایسا ہوتا ہے جس سے فرعونیت ٹپکتی ہے۔

کانپور میں ایک طالب علم نے ایک مدرس کی شان میں گستاخی کی تھی۔ مقدمہ میرے پاس آیا۔ میں نے اس سے کہا کہ استاد سے معافی مانگو ورنہ تم کو مدرسہ سے نکال دیا جائے گا۔ وہ معافی چاہنے پر راضی ہوا مگر معافی کی یہ صورت تھی کہ آپ دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے کر کے تن کر کھڑے ہو گئے اور زبان سے کہا میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ مجھے یہ صورت دیکھ کر غصہ آ گیا۔ میں نے دو تین طمانچے لگائے کہ گستاخ یہ طریقہ ہوتا ہے معافی چاہنے کا۔ آگے ہاتھ جوڑ پیر پکڑو ورنہ ابھی مدرسے سے نکال دوں گا۔ یہ آج کل کی تہذیب کا اثر ہے جو افسوس ہے کہ طلباء اور علماء میں بھی سرایت کر گیا ہے۔ معافی اس طرح چاہتے ہیں جس میں ندامت نام کو بھی نہیں ہوتی۔

خیر یہ تو استطراداً ذکر آ گیا تھا۔ میں یہ بیان کر رہا تھا کہ آج کل لوگوں میں یہ خبط ہے کہ ہر چیز کو قرآن میں ٹھونسنا چاہتے ہیں۔

ایک قصہ یاد آیا کہ اہل سائنس نے یہ تحقیق کیا ہے کہ انسان کی منی میں ایک قسم کا کیڑا ہوتا ہے اس سے حمل قرار پاتا ہے۔ ایک صاحب کو اس کی فکر ہوئی کہ قرآن سے اس مسئلہ کو ثابت کیا جائے۔ کیونکہ سائنس والوں کی تحقیق تو غلط ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ تو یقیناً صحیح ہے۔ بس کسی طرح اس کو قرآن میں ٹھونسنا چاہئے۔ استغفر اللہ العظیم۔ غرض انہوں نے کھینچ تان کر اس کو قرآن سے ثابت کیا۔ اب سنئے! کیا خوبصورت استدلال ہے آپ نے اس آیت سے ثبوت دیا۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ

(ترجمہ: اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کا نام لے کر پڑھا کیجئے، جس نے مخلوقات کو پیدا کیا جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا)

علق کے معنی لغت میں خون بستہ بھی ہیں اور جونک کو بھی علق کہتے ہیں۔ آپ نے یہ تفسیر کی کہ خدا نے پیدا کیا انسان کو جونک سے۔ کیا واہیات ہے۔ بھلا ان سے کوئی پوچھے کہ اس تفسیر سے سائنس کا مسئلہ کیوں کر ثابت ہو گیا کیونکہ وہ لوگ اس کے قائل نہیں ہیں کہ انسان کی منی میں جونک ہوتی ہے۔ ہاں اس پر ایک حاشیہ اور لگانا چاہیے کہ جونک سے مراد وہ نہیں ہے جسے عام لوگ جونک کہتے ہیں بلکہ مطلق کیڑا مراد ہے۔ بس یہ تفسیر کر کے وہ صاحب خود ہی اپنے جی میں خوش ہو لیے ہوں گے تو آپ نے دیکھا کہ اس طرز میں شریعت کی کس قدر تحریف لازم آتی ہے۔ اور اس سے احتراز کس قدر ضروری ہے کہ اگر کوئی ایسے مسائل کو ثبوت قرآن سے مانگے تو اس سے صاف کہہ دینا چاہیے کہ قرآن علم تشریح کی کتاب نہیں ہے۔ اسی طرح جب کسی چیز کے حرام ہونے کی وجہ دریافت کی جائے تو بس یہی جواب دو کہ خدا نے اس کو منع کیا ہے۔ خواہ مخواہ اپنی طرف سے علتیں نہ گھڑنا چاہئیں۔

عقلی علت

بعض لوگ کلموا الناس علیٰ قدر عقولھم (إتحاف السادۃ المتقین: ۱:۳۴۴) سے استدلال کرتے ہیں کہ حدیث میں اس کا امر ہے کہ لوگوں کی عقل کے اندازہ سے کلام کیا کرو اور جب آج کل طبائع کا یہ حال ہے کہ بدون عقلی علت معلوم کئے ان کو تسلی نہیں ہوتی۔ تو ہم کو اسی طرز سے کلام کرنا چاہیے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ نے حدیث کا مطلب

صحیح نہیں سمجھا۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ عام لوگوں کے سامنے ایسی تدقیقات اور باریک باریک مضامین نہ بیان کرو جوان کی سمجھ میں نہ آسکیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ تم ان کے مذاق فاسد کی رعایت کیا کرو۔

اب آپ خود فیصلہ کرلیں کہ امور محرمہ کی علت واضح اور سہل کونسی ہے اور باریک اور دقیق کون سی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جواب سے سے زیادہ سہل یہی ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس سے منع کیا ہے۔ اس لئے یہ حرام ہے۔ حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے اس لئے ایسا کرنا گناہ ہے۔ اور جو علتیں اور حکمتیں آپ اپنی طرف سے گھڑتے ہیں درحقیقت وہی عوام کی عقول سے باہر ہیں۔ تو اس حدیث سے بھی میری ہی تائید ہوتی ہے۔

رہا یہ کہ عوام کی اس جواب سے تسلی نہیں ہوتی۔ تو آپ ان کی تسلی کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ آپ کو وہی جواب دینا چاہیے جو اصلی اور حقیقی جواب ہے کہ خدا نے ہم کو اس سے منع کیا ہے۔ یہ ایسا جواب ہے کہ قیامت تک اس پر کوئی جرح نہیں ہو سکتی۔ اور اگر عقلی جواب دینے کا ایسا ہی شوق ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس حقیقی جواب کو بیان کردو اور کہہ دو کہ جواب اصلی تو یہی ہے۔ پھر اس کے بعد تبرعاً عقلی جواب بھی بیان کردو تا کہ اگر کوئی اس پر جرح کردے تو پہلا جواب تو جرح سے سالم رہے گا۔ اور حکم شرعی کا مدار آپ کی بیان کردہ علت پر تو نہ ہوگا۔

ایک مرتبہ میں ریل میں سفر کررہا تھا۔ اتفاق سے ایک جنٹلمین صاحب بھی گاڑی میں اسی درجہ میں رونق افروز تھے۔ ایک اسٹیشن پر پہنچ کر ان کا ایک ملازم ایک کتا ان کے سپرد کرگیا۔ جس کو انہوں نے ایک سینچہ سے باندھ دیا۔ جب گاڑی چلی تو میری طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ شریعت نے کتا پالنے سے کیوں منع کیا ہے حالانکہ اس میں ایسے ایسے کمالات ہیں۔ انہوں نے اس کے وہ کمالات بیان کئے جو خود آقا صاحب میں بھی نہ تھے۔

میں نے کہا اس کے دو جواب ہیں۔ ایک جواب عام اور ایک جواب خاص۔ جواب عام تو یہ ہے کہ نھانا عنه رسول الله صلی الله علیه وسلم ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے زیادہ جاننے والے تھے۔ اس لئے ہم کو اس کی تلاش کی ضرورت نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں منع کیا۔ اس کو سن کر وہ ساکت ہوگئے۔ مگر ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ اس جواب سے ان کی

تسلی نہیں ہوئی۔ پھر کہنے لگے میں خاص جواب سننے کا بھی مشتاق ہوں۔ میں نے کہا کہ خاص جواب یہ ہے کہ کتے میں جہاں بہت سے کمالات ہیں وہاں اس پر ایک عیب بھی اتنا بڑا ہے جس نے اس کے سارے کمالات کو دھو دیا ہے۔ وہ یہ کہ اس میں قومی ہمدردی نہیں ہے۔ اپنے آقا کے ساتھ چاہے کیسا ہی وفادار ہو مگر اپنی قوم سے اس کو ایسی نفرت ہے کہ جہاں دوسرا کتا اس کو نظر پڑا اور یہ اس کو پھاڑ کھانے کو دوڑا۔ پس جس میں قومی ہمدردی نہیں وہ پاس رکھنے کے قابل نہیں۔ یہ جواب چونکہ ان کے مذاق کے موافق تھا کیونکہ یہ لوگ قومی ہمدردی کا سبق رات دن رٹا کرتے ہیں گو اس پر عمل کی توفیق نہ ہو۔ اس جواب سے پھڑک اٹھے اور کہنے لگے کہ جواب یہ ہے۔ حالانکہ یہ جواب کچھ بھی نہیں محض لطیفہ ہے۔

پھر بریلی میں میں نے ایک تحصیلدار صاحب سے سنا کہ کالج علی گڑھ میں اس جواب کا بڑا چرچا ہے اور طلبہ کہتے ہیں کہ واقعی امت کو ایسے علماء کی ضرورت ہے جو ایسی تحقیقات بیان کر سکیں۔ پڑیں پتھر! میں کہتا ہوں کہ وہی لوگ اس جواب سے خوش ہوں گے ورنہ ہمارے نزدیک یہ جواب خاک بھی نہیں۔ میں اس جواب پر خود جرح کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ ایک کتا جو دوسرے کو دیکھ کر بھونکتا ہے تو غور کرنا چاہیے اس کا منشا کیا ہے۔ آیا اس کا سبب اپنی قوم سے بے وفائی ہے یا آقا کی وفاداری سو بظاہر آقا کی وفاداری اس کا سبب ہے۔ وہ یہ سمجھ کر اس پر بھونکتا ہے کہ یہ میرے آقا کا دشمن ہے۔ چنانچہ اگر ایک شخص کے گھر میں دس کتے پلے ہوئے ہوں تو وہ آپس میں ایک دوسرے پر نہیں بھونکتے۔ بلکہ وہ ہمیشہ اجنبی کتے پر بھونکتا ہے اور وہ بھی اس وقت تک کہ مالک اس کر روک نہ دے۔ اور جہاں اس نے روکا فوراً خاموش ہو جاتا ہے کیونکہ اب سمجھ جاتا ہے کہ میرے مالک کا دشمن نہیں۔ اسے اس سے کچھ خوف نہیں۔ پھر اس کے بعد مالک کے پیروں کو آ کر لپٹ جاتا ہے۔ اور ایسی خوشامدیں کرتا ہے جیسے کوئی بہت ہی بڑا عاشق ہو حتی کہ اس کی اس محبت سے طبیعت گھبرانے لگتی ہے کتے کی دشمنی بھی بری اور دوستی بھی بری۔

لیجیے جس جواب پر یہ لوگ اتنے خوش ہوئے تھے اس کو میں نے خود ہی مجروح کر دیا۔ بخلاف پہلے جواب کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اس کے پالنے سے منع فرمایا ہے کہ اس جواب پر کوئی جرح ہو ہی نہیں سکتی۔ اب اگر ہم سے کوئی پوچھے کہ رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم نے کیوں منع فرمایا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تم کو ہم سے اس سوال کا کوئی حق نہیں۔ یہ سوال اگر تمہارے اندر ہمت ہے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کر لینا۔

ایک جج کے سامنے مقدمہ پیش ہوتا ہے اور وہ قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ اس سے یہ سوال کرنے کا کسی کو حق نہیں کہ یہ قانون کیوں وضع ہوا۔ اور اگر کوئی ایسا بیہودہ سوال کرے تو وہ کہہ سکتا ہے کہ میں عالم قانون ہوں واضع قانون نہیں ہوں۔ یہ سوال تم کو پارلیمنٹ یا مجلس واضعان قانون سے کرنا چاہیے اور جج کے اس جواب کو تمام عقلاء معقول سمجھتے ہیں۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ یہی جواب اگر علماء دیں تو وہ معقول نہ ہو۔ ان پر جرح قدح کیوں کی جاتی ہے۔ علماء نے اس کا کب دعویٰ کیا ہے کہ ہم واضع قانون ہیں بلکہ وہ تو صاف کہتے ہیں کہ ہم صرف قانون کے جاننے والے ہیں۔ ہم سے یہ سوال کر سکتے ہو کہ یہ قانون کہاں ہے۔ ہم تم کو قرآن یا حدیث یا فقہ میں وہ قانون دکھلا دیں گے۔ باقی وضع قانون کی علت کو ہم نہیں مانتے۔ یہ سوال وضع قانون سے کرو اور واضع قانون حق تعالیٰ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی واضع نہیں ہیں۔ آپ بھی صرف مبلغ ہیں۔ آپ کی تو یہ شان ہے ؎

گفتہ او گفتہ اللہ بود ☆ گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان گویا اللہ کا فرمان ہے، اگرچہ ایک اللہ کے بندہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے ادا ہوا ہے)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے علماء کی یہ حالت ہے ؎

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند ☆ آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

(پس پردہ مجھے طوطے کی طرح بٹھا دیا ہے، مجھے جو حکم استاذ ازل سے ملا تھا وہی میں کہہ رہا ہوں)

حکمت احکام

اس کے یہ معنی نہیں کہ ان احکام میں حکمت نہیں ہے۔ حکمت ہے اور ضرور ہے اور اس کو علماء جانتے بھی ہیں۔ مگر یہ کیا ضرور ہے کہ تم کو بتلا بھی دیں۔ ہمارے پاس گنی ہے مگر ہم تم کو نہیں دیتے کسی کا کیا اجارہ ہے۔ غرض ہم واضع قانون نہیں ہیں۔ جو قانون کی علتیں ہمارے ذمہ ضروری ہوں ہم تو اتنی بات جانتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے سود کو حرام کیا ہے اس

لئے وہ حرام ہے۔ اگر یہ سوال کرو کہ کہاں حرام کیا ہے۔ اس کا جواب البتہ ہمارے ذمہ ہے۔ ہم کہہ دیں گے حق تعالیٰ نے فرمایا ہے: اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا میں اوپر یہ بیان کر رہا تھا کہ ایک صاحب نے سود کے حرام ہونے کی علت یہ سمجھی تھی کہ اس میں بے مروتی ہے۔ سو یہ علت علت نہیں کیونکہ اس طرح تو ہر تجارت میں بے مروتی ثابت کی جا سکتی ہے بلکہ اصل علت وہی ہے جو میں نے بتلائی۔

بعض لوگ اپنی طرف سے احکام کی علتیں تراش کر غلہ کی تجارت کو حرام سمجھنے لگے۔ سو یہ بالکل غلط ہے۔ غلہ کی تجارت ویسی ہے جیسے اور چیزوں کی تجارت اس میں کچھ حرج نہیں رہا یہ اس میں گرانی کا انتظار ہوتا ہے۔ سو میں کہتا ہوں کہ گرانی کا طبعی انتظار ہونے میں بھی کچھ مضائقہ نہیں۔ ہاں زیادہ گرانی کی دعا مانگنا یا تمنا کرنا برا ہے۔ باقی اپنے نفع کی دعا کرنا یہ جائز ہے گو اس میں گرانی کی تمنا بھی لازم آتی ہے۔ اور فقہاء نے جو احتکار کو منع کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قحط کے زمانہ میں غلہ کا روکنا جب کہ بستی میں غلہ ملتا ہی نہ ہو اور لوگوں کو تکلیف ہونے لگے اس وقت حرام ہے۔ اگر دکانوں پر غلہ ملتا ہو تو روکنا حرام نہیں ہے۔ غرض یہ جو مشہور ہے کہ نفع کی امید میں بھی غلہ کا روکنا حرام ہے یہ صحیح نہیں۔ خلاصہ یہ کہ ہم نے اپنی طرف سے علتیں گھڑ کر حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر رکھا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے ہاتھ سے غلہ کی تجارت بالکل نکل گئی اور صرف ہندوؤں کے ہاتھ میں رہ گئی ہے۔ اگر آج وہ مسلمانوں کے ہاتھ غلہ بیچنا موقوف کر دیں تو وہ نہایت پریشان ہو جائیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ہر شہر اور گاؤں اور قصبہ میں غلہ کی تجارت کرنے والے مسلمان بھی ہونے چاہئیں۔ تاکہ کسی وقت مسلمانوں کو پریشانی لاحق نہ ہو۔ غرض ایسی حکمت و علت کا اول تو علماء ہی کو معلوم ہونا ضروری نہیں۔ پھر اگر معلوم بھی ہو تو وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نہیں بتلاتے۔

بھلا اگر تم ڈاکخانہ میں جا کر بابو سے پوچھو کہ ایک تولہ کا محصول کیا ہے اور وہ تم کو بتلا دے کہ تین پیسے محصول ہے۔ پھر تم اس سے یہ سوال کرو کہ تین پیسے محصول ہونے کی کیا وجہ ہے تو اس کے جواب میں کیا کہے گا۔ ظاہر ہے کہ وہ یہی کہے گا کہ صاحب میں قانون کے مطابق کام کرنے والا ہوں اگر تم تین پیسے سے کم ٹکٹ لگاؤ گے میں لفافہ کو بیرنگ کر دوں گا۔ آگے میں کچھ نہیں جانتا اس کی وجہ کیا ہے اور کیا نہیں۔ ہاں اگر تم کو میرے کہنے کا اعتبار نہ ہو

تو میں تم کو قواعد ڈاک کی کتاب میں دکھلا سکتا ہوں کہ ایک تولہ کا محصول وہی ہے جو میں نے بتلایا۔ اس سے زیادہ تم مجھ سے سوال نہیں کر سکتے۔

افسوس ہے کہ ڈاکخانہ کا بابو یہ جواب دے دے تو سب اس کو تسلیم کر لیں اور علماء کے ایسے ہی جواب کو تسلیم نہ کیا جائے۔ آخر دونوں صورتوں میں فرق کیا ہے؟ مگر آج کل تو ہر شخص دین کے بارہ میں اپنے کو مجتہد سمجھتا ہے کہ اپنی عقل سے علتیں گھڑ کران پر احکام کا مدار سمجھتا ہے۔ چنانچہ بعض کا مقولہ سنا گیا ہے کہ نماز کے لئے وضو اس لئے فرض کیا گیا تھا کہ اہل عرب اونٹوں کے چرانے والے وحشی لوگ تھے ان کے منہ پر غبار اور ہاتھ پر پیشاب کی چھینٹیں بھی پڑتی تھیں۔ اس لئے ان کو حکم کیا گیا کہ نماز سے پہلے وضو کیا کرو۔ چنانچہ وضو میں انہی اعضا کا دھونا فرض بھی کیا گیا جو اکثر کام کاج میں ملوث ہو جاتے ہیں۔ باقی ہم لوگ تو مہذب ہیں اکثر اوقات ہمارے ہاتھ پیروں کو گرد بھی نہیں پہنچتی۔ اس لئے ہم پر وضو فرض نہیں۔

یہ دلیل ویسی ہی ہے جیسے ایک سرحدی پٹھان نے بیان کی تھی ایک سرحدی پٹھان ریل سے اترا تو اس کی بغل میں دو من کا ایک بورا بھی تھا جس کی بلٹی وغیرہ اس نے کچھ نہ کرائی تھی۔ جب ٹکٹ دینے لگا تو بابو نے کہا اس بورے کی بلٹی لاؤ۔ کہنے لگا کہ بلٹی کیا ہوتا ہے؟ بابو نے کہا کہ اس سامان کا ٹکٹ۔ اس نے پھر وہی ٹکٹ دکھا دیا جو پہلے دکھایا تھا۔ بابو نے کہا کہ یہ تو تمہارا ٹکٹ ہے اس کا ٹکٹ لاؤ۔ وہ کہنے لگا نہیں! یہی ٹکٹ ہمارا ہے اور یہی ٹکٹ اس کا ہے۔ بابو نے کہا کہ پندرہ سیر سے زیادہ سامان کے لئے دوسرا ٹکٹ ہونا چاہیے۔ تو آپ فرماتے ہیں کہ ہمارا یہی پندرہ سیر ہے۔ ریلوے نے پندرہ سیر کا جو قانون وضع مقرر کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جس قدر سامان آدمی بلاتکلف خود اٹھا سکے وہ معاف ہے۔ اور ہندوستانی آدمی پندرہ سیر ہی اٹھا سکتا ہے۔ اس لئے اس نے پندرہ سیر لکھ دیا اور ہم دو من اٹھا سکتے ہیں۔ اس لئے ہمارا یہی پندرہ سیر ہے۔

تو کیا اس جواب کو ریل بابو تسلیم کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! وہ یہی کہے گا کہ ہم قانون کا راز کچھ نہیں جانتے۔ ہمارے پاس کتاب میں یہی قانون لکھا ہوا ہے کہ پندرہ سیر سے جو زیادہ ہو اس کی بلٹی ہونی چاہیے۔ جس میں ہندوستانی اور کابلی کی کوئی تخصیص یا استثنا نہیں ہے اور اس کے اس جواب کو تمام مہذب لوگ صحیح مانیں گے۔

اسی طرح ہم اس دلیل کے جواب میں کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے وضو کو فرض کیا ہے۔ جس میں مہذب اور دیہاتی کا کوئی فرق نہیں۔ اس لئے وضو ہر شخص پر فرض ہے ہم تم کو قرآن میں عام حکم دکھلا سکتے ہیں اس سے آگے ہم کچھ نہیں جانتے۔ ہم کو خبر نہیں کہ اس حکم کی علت کیا ہے۔

نسبت مع اللہ

یہ مضمون اس پر بیان ہوا تھا کہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ضرر سے بچنے کیلئے یا کسی دنیوی منفعت کیلئے تعویذ وغیرہ کرنا مطلقا جائز ہے خواہ اس میں شیاطین ہی سے استعانت ہو۔ یہ بالکل غلط ہے اور میں نے یہ بیان کیا تھا کہ دنیوی مضرت کا اعتبار نہیں۔ اصل مضرت حق تعالیٰ کی ناراضی ہے مگر اس کو لوگ ہلکا سمجھتے ہیں۔ یہ خیال کر لیا ہے کہ ابھی حق تعالیٰ سے ملاقات تھوڑا ہی ہو رہی ہے۔ گناہ کر کے توبہ کر لیں گے پھر پاک صاف ہو کر حق تعالیٰ سے مل لیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ اول تو حق تعالیٰ سے ملنے کا وقت کسی کو معلوم نہیں۔ شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود۔ اگر تم کو ایسا ہی زندگی پر بھروسہ ہے تو یہ کونسی عقلمندی ہے کہ توبہ کے سہارے گناہوں کا ارتکاب کیا جائے۔ تو اس کی بعینہ وہ مثال ہے جیسے کوئی تریاق کے بھروسہ پنکھیا کھانا چاہیے یا منتر جاننے کی وجہ سے سانپ سے کٹوانا چاہے کہ زہر کھا کر تریاق کھا لوں گا یا سانپ کے کاٹنے کے بعد منتر سے جھاڑ لوں گا۔ تو کیا جو لوگ توبہ کے بھروسہ گناہ کرتے ہیں وہ ایسا بھی کر سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں! علاوہ اس کے حق تعالیٰ کے ساتھ محبت کا تعلق بھی تو ہے تو کیا اس کا مقتضا یہی ہے۔

صاحبو! اگر کسی عاشق کو یہ معلوم ہو جائے کہ میرا محبوب فلاں کام سے ناراض ہوتا ہے تو اس کو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ ابھی تو محبوب کی ملاقات میں دیر ہے۔ لاؤ اس کام کر لوں۔ صاحبو! عاشق سے یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس کی محبت ہرگز محبوب کے خلاف رضا کام کرنے کی اجازت نہ دے گی۔ گو ملاقات میں کتنی ہی دیر ہو بلکہ گو ملاقات بھی ہونے والی نہ ہو۔ پھر افسوس ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ ہم اس کے خلاف برتاؤ کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ پوری محبت ہی نہیں ہے۔ تو اس صورت میں شکایت اور زیادہ ہو گئی کہ ہم کو بیوی اور بال بچوں سے تو کیسی محبت ہے ایک ادنیٰ حسین صورت سے ہم کو کیسا تعلق ہو جاتا ہے اور حق تعالیٰ سے ہم کو اس درجہ کی محبت نہ ہو جو کہ جلال و کمال و نوال میں سب سے زیادہ کامل ہے اور جو کچھ

دوسروں میں ہے سب اسی کا عطا کیا ہوا ہے۔

اے کہ صبرت نیست از فرزند ☆ صبر چوں داری زر ذوالمنن
اے کہ صبرت نیست از دنیائے دوں ☆ صبر چوں داری زنعم الماہدون

(اے بندہ خدا! تو اپنے اہل وعیال سے صبر نہیں کرسکتا تو اللہ تعالیٰ سے کس طرح صبر کرسکتا ہے۔ اے بندہ خدا! تجھے کمینی دنیا سے صبر کرنے کی طاقت نہیں تو اللہ تعالیٰ سے کیونکر صبر کرسکتا ہے)

اور گو نفس محبت تو ہے مگر دوسروں کی محبت نے اسے مغلوب کر رکھا ہے اس لئے ناراضی حق کی گرانی کا ہم کو احساس نہیں ہوتا۔ جب آدمی کو سانپ ڈس لیتا ہے تو اس کو نیم کے پتے تلخ نہیں معلوم ہوتے اسی طرح ہم کو دنیا کے سانپ نے ڈس رکھا ہے۔ اس لئے ناراضی خداوندی کی تلخی ہم کو محسوس نہیں ہوتی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہم کو رضا الٰہی کی حلاوت ہی کا ادراک نہیں ہوا، اس لئے ناراضی کی تلخی کا بھی احساس نہیں ہوتا الاشیاء تعرف باضدادھا یعنی ہر چیز کی حقیقت اس کی ضد سے معلوم ہوتی ہے حضرات اہل اللہ کو رضا الٰہی کی حلاوت معلوم ہو چکی ہے اس لئے وہ ناراضگی کی تلخی کو بھی محسوس کرتے ہیں سالک کے دل میں تعلق مع اللہ کی ایک حلاوت ہوتی ہے۔ نسبت مع اللہ کی وجہ سے ایک نور ان کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے جس کے فقدان سے ان کی یہ حالت ہوتی ہے

بر دل سالک ہزاراں غم بود ☆ گر ز باغ دل خلالے کم بود

(عارف کے دل پر ہزاروں غم چھا جاتے ہیں، اگر اس کے باغ دل سے ایک تنکا بھی کم ہو جاتا ہے)

جب ان کی قلبی کیفیت میں ذرا سی بھی کمی ہوتی ہے تو ان کے دل پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ دوسروں کو ناراضی الٰہی کا احساس کیوں کر ہو۔ دل تو پہلے ہی سے کالا تو ہو رہا ہے۔ دل میں تعلق مع اللہ کا نور پیدا کرو۔ اس وقت سمجھو گے کہ ناراضی حق کی تلخی کیسی ہوتی ہے۔ پھر خود بخود یہ مسئلہ سمجھ میں آجائے گا کہ واقعی اصلی مضرت خدا کی ناراضی ہے۔ اس کے سامنے دنیا کے منافع اور مضرتوں کی کچھ حقیقت نہیں۔

حرمت کا مدار

چنانچہ اس مسئلہ کو قرآن شریف میں بہت صاف طور پر حل کردیا گیا ہے۔ ارشاد

فرماتے ہیں: يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ لوگ آپ سے شراب اور جوئے کی بابت سوال کرتے ہیں کہ یہ حلال ہیں یا حرام۔ آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں میں ایک گناہ (ہے مگروہ) بڑا (گناہ) ہے اور لوگوں کے لئے منافع متعدد ہیں۔ سبحان اللہ! کیا پاکیزہ طرز کا جواب ہے۔ یعنی لوگوں کو شراب اور جوئے کی حرمت میں یہ وسوسہ ہوسکتا تھا کہ ان میں منافع دنیویہ بہت ہیں اس لئے ان کو حرام نہ کرنا چاہیے تو حق تعالیٰ اس شبہ کے اصل سے انکار نہیں فرماتے بلکہ اس کو تسلیم فرماتے ہیں کہ واقعی ان میں لوگوں کے لئے نفع بھی ہے۔ اور ایک ہی نفع نہیں بلکہ ہم صیغہ واحد کی بجائے جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہیں کہ ان میں بہت سے منافع ہیں مگر بات یہ ہے کہ ان میں ایک گناہ بھی ہے۔

اس جگہ یہ بات قابل غور ہے کہ حق تعالیٰ نے منفعت کے بیان میں تو جمع کا صیغہ اختیار فرمایا یعنی مَنَافِعُ لِلنَّاسِ اور مضرت کے بیان میں صیغہ واحد لایا گیا یعنی اثم۔ اگر یہ کلام بشر کا ہوتا تو مقابلہ کے لئے یہاں بھی جمع کا صیغہ اثام ہوتا۔ مگر حق تعالیٰ نے اس جگہ صیغہ واحد ہی اختیار فرمایا۔ جس سے اس حقیقت پر متنبہ فرمانا منظور ہے۔ اگر کسی چیز میں ہزاروں منفعتیں ہوں مگر اس میں ایک گناہ بھی ہو یعنی ادنیٰ شائبہ ناراضی حق کا ہو تو وہ ہزاروں منفعتیں ایک گناہ کے سامنے ہیچ ہیں۔

کیونکہ جس طرح خدا کی رضا خواہ ذرا ہی سی ہو بڑی دولت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ (اور اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی بہت بڑی چیز ہے) اسی طرح خدا کی ناراضی بھی بڑی وبال کی چیز ہے خواہ اس ناراضی کا سبب ایک ہی گناہ کیوں نہ ہو۔ اسی لئے اس جگہ اثم بصیغہ واحد لایا گیا مگر اس کو کبیر کے ساتھ موصوف کر دیا گیا ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ شراب اور جوئے میں منافع تو بہت ہیں مگر ایک گناہ بھی ہے اور وہ ایک ہی گناہ اتنا بڑا ہے جس نے ان سب منافع کو گاؤ خورد کر دیا ہے۔ اس لئے آگے منافع کا لفظ اختیار نہیں کیا گیا بلکہ نفع کا لفظ اختیار فرمایا۔ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا

کہ ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بہت بڑا ہے۔ یہاں صیغہ واحد اختیار کرنے کی وجہ یہی ہے کہ پہلے کلام سے یہ بات سمجھ میں آگئی ہے کہ ان منافع کے مقابلہ میں ایک گناہ

بھی ہے۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ اگر ایک من مٹھائی میں تولہ بھر زہر ملا ہوا ہو تو وہ ساری مٹھائی اس ایک تولہ زہر کی وجہ سے خاک میں مل جاتی ہے۔ اسی طرح جب وہ منافع ایک گناہ کی وجہ سے خاک میں مل گئے تو اب وہ اس قابل نہیں رہے کہ ان کو جمع کے صیغہ سے تعبیر کیا جائے۔ اس لئے فرماتے ہیں: وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا

اس آیت نے فیصلہ کر دیا کہ کسی چیز کے حرام ہونے اور گناہ ہونے کا مدار دنیاو نقصان پر نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ سمجھے ہوئے ہیں اور بعض دفعہ زبان سے بھی کہہ دیتے ہیں کہ اس کام میں کیا حرج ہے یہ تو نفع کی چیز ہے۔ چنانچہ تعویذ اور عملیات میں بہت لوگ اسی دھوکا میں پڑے ہوئے ہیں کہ جس عمل سے کسی کو نفع ہوتا ہو وہ جائز ہے۔ خواہ اس میں شیاطین سے استعانت ہو یا کیسے ہی بیہودہ کلمات استعمال کرنے پڑتے ہوں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ شراب اور جوئے کی نسبت حق تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ ان میں لوگوں کے لئے ایک نفع نہیں بلکہ بہت سے منافع ہیں مگر پھر بھی یہ حرام ہیں، کیوں؟ محض اس لئے کہ خدا تعالیٰ ان کو پسند نہیں فرماتے، ان سے ناراض ہوتے ہیں۔ اب یہ مسئلہ بالکل حل ہو گیا کہ حرمت کا مدار خدا تعالیٰ کی ناراضی پر ہے۔

پس معلوم ہو گیا **انما الاعمال بالنیات** کا حکم گناہوں میں نہیں۔

(الصحیح للبخاری: ۱: ۲، ۸، سنن النسائی، سنن ابن ماجۃ: ۳۲۲۷)

گناہ کسی نیت سے بھی جائز نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا مطلب وہی ہے جو میں نے پہلے بیان کیا ہے کہ بعض اعمال نیت کے بغیر موجب ثواب نہیں ہوتے جیسے مباحات اور بعض بغیر نیت کے صحیح نہیں ہوتے جیسے نماز روزہ وغیرہ۔

بے وضو نماز

چنانچہ اگر کوئی شخص نماز کی صورت بنا لے لیکن نماز کی نیت نہ کرے تو وہ نماز نہیں ہے۔ یہاں سے میں آپ کو ایک بات بتلاتا ہوں اگرچہ اس کے بیان کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ لیکن صرف اس لئے بیان کرتا ہوں تاکہ تنگی کے وقت لوگ اپنے ایمان کو محفوظ کر لیا کریں اور کفر سے بچ جائیں۔ وہ بات یہ ہے کہ بعض دفعہ ایسی صورت پیش آتی ہے کہ کوئی بے نمازی نمازیوں میں جا پھنستا ہے۔ نماز کا وقت آ گیا اور سب لوگ نماز کے لئے تیار ہو گئے۔

اب یہ بے نمازی آدمی بڑا پریشان ہوتا ہے۔ نماز نہ پڑھے تو سب لوگ اس کو ملامت کرتے ہیں۔ برا بھلا کہتے ہیں۔ اور نماز پڑھتا ہے تو یہ مصیبت ہے کہ اس کو غسل جنابت کی ضرورت ہے۔ سب کے سامنے غسل کرے تو زیادہ بدنامی ہوتی ہے۔ اب ایسی صورت میں یہ بے نمازی بدنامی سے بچنے کے لئے نماز میں شریک ہو جاتا ہے۔ اور فقہاء نے لکھا ہے کہ بے وضو نماز پڑھنا کفر ہے، تو میں کہتا ہوں کہ ایسی حالت میں اگر کوئی ایسا شخص نماز پڑھے تو اس کو چاہیے کہ نماز کی نیت نہ کرے بلکہ بدون نیت کے نماز کی نقل کرتا رہے۔ اس طرح یہ شخص کفر سے بچ جائے گا۔ اگرچہ ترک نماز کے گناہ کے ساتھ دھوکا دینے کا بھی گناہ ہوگا۔ کہ لوگ اس کو نمازی سمجھیں گے اور ہے بے نمازی۔ مگر کفر سے تو بچ جائے گا۔

دیکھئے شریعت میں کس قدر رعایت ہے کہ مجرم بھی اس سے محروم نہیں۔ پھر بھی افسوس ہے کہ لوگ شریعت کو تنگ بتلاتے ہیں مگر خدا کے واسطے اس ترکیب سے ہمیشہ کام نہ لینا اور نہ اس حالت میں امامت کرنا ورنہ سارے نمازیوں کی نماز کا وبال تمہاری گردن پر ہوگا۔ غرض عیب کرنے کیلئے بھی ہنر چاہیے۔ اگر کوئی شخص بدنامی سے بچنے کیلئے بے وضو ہی نماز میں شریک ہو تو اس کو کفر سے بچنے کیلئے نماز کی نیت نہ کرنا چاہیے۔ آج کل بہت آدمی ایسے ہیں جو ظاہر میں نمازی معلوم ہوتے ہیں مگر بے وضو ٹرخاتے ہیں یا بلا عذر ارکان کو اڑا دیتے ہیں۔ اور افسوس یہ ہے کہ ایسے لوگ مقتدا اور لیڈر بھی ہو جاتے ہیں۔

لیڈر کی نماز

چنانچہ آج کل ایک لیڈر ہیں جو پہلے تو بے نمازی ہی تھے مگر اب چند روز سے وہ نمازی ہو گئے ہیں۔ مگر حالت یہ ہے کہ ایک مرتبہ سٹیشن پر اتر کر موٹر میں سوار ہوئے۔ نماز کا وقت تھا تو موٹر ہی میں بیٹھے بیٹھے آپ نے نماز شروع کر دی۔

انہیں لیڈر کا ایک قصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ نماز کا وقت آیا۔ پانی موجود نہ تھا تیمّم کی ضرورت ہوئی۔ آپ کو تیمّم کا طریقہ تو معلوم نہ تھا اور کسی سے اس لئے نہیں پوچھا کہ لیڈر اور مقتدا ہو کر کسی سے پوچھنا عیب کی بات ہے۔ لوگ کہیں گے کہ یہ اچھا لیڈر ہے جسے تیمّم کا قاعدہ بھی معلوم نہیں۔ غرض خود ہی تیمّم شروع کر دیا۔ سب سے پہلی حرکت تو آپ نے یہ کی

کہ مٹی لے کر ہاتھ کو ملی جس طرح پانی کو ملا کرتے ہیں۔ حالانکہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ مٹی پر ہاتھ مار کر مٹی کو جھاڑ کر پھر ملنا چاہیے۔ شریعت نے بدن کو بھبوت ملنے سے منع کیا ہے کیونکہ یہ مثلہ ہے جس سے انسان کی صورت بگڑ جاتی ہے۔ سبحان اللہ! کس قدر رعایت ہے کہ تمہاری صورت بھی بگاڑنا نہیں چاہتے۔ تو ان لیڈر صاحب نے اول تو مٹی کو پانی کی طرح ہاتھ پر بہایا۔ پھر منہ میں بھی مٹی دی گویا آپ نے مٹی سے کلی کرنا چاہی۔ اس پر سب لوگ ہنس پڑے اور سب کو ان کی جہالت معلوم ہوگئی۔ اس سے تو یہی اچھا ہوتا کہ وہ پہلے سے چپکے سے ایک آدمی سے پوچھ لیتے کہ تیمّم کا طریقہ کیا ہے۔ اگر جہالت ظاہر ہوتی تو ایک آدمی پر ظاہر ہوتی یا دوسروں کے تیمّم کو دیکھ لیتے۔ مگر آپ نے اجتہاد سے کام لیا جس سے سب کو معلوم ہوگیا کہ بالکل ہی جاہل ہے۔ اس پر بھی وہ مسلمانوں کے پیشوا اور لیڈر بنے ہوئے ہیں۔

ایک اور صاحب کی حکایت ہے کہ انہوں نے سفر میں مغرب کی نماز پڑھائی تو دو رکعت پر سلام پھیر دیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ یہ کیا حرکت کی ہے۔ کہنے لگے میں مسافر ہوں اس لئے میں نے قصر کیا ہے۔

ایک صاحب نے سفر میں مقیم امام کے پیچھے نماز پڑھی۔ جب امام تیسری رکعت کے لئے اٹھنے لگا تو یہ حضرت سلام پھیر کر بیٹھ گئے بعد میں لوگوں نے وجہ پوچھی تو آپ فرماتے ہیں کہ میں مسافر ہوں اس لئے میں نے قصر کیا ہے۔

غرض آج کل کثرت سے اس قسم کے بھی نمازی ہیں کہ ظاہر میں نمازی معلوم ہوتے ہیں مگر نہ معلوم وہ کیا کیا گڑبڑ کرتے ہیں۔ ہر شخص اپنے اجتہاد سے کام لیتا ہے۔ مسائل سیکھنے سے عار معلوم آتی ہے۔ ساری خرابی تکبر کی ہے۔ اگر کسی ملا سے چند اردو ہی کے رسائل پڑھ لیا کریں تو یہ رسوائی نہ ہو۔ اور یہ شکایت عوام ہی کی نہیں، بلکہ بعض مولوی بھی جو معقول وغیرہ میں مشغول ہوتے ہیں ایسی ہی حرکتیں کرتے ہیں۔

مولوی کی تعریف

ایک مولوی صاحب جو آج کل ایک بڑے لیڈر مشہور ہیں ابتداء میں وہ ایک عربی مدرسہ میں ملازم ہوئے تھے۔ معقول میں تو بڑی مہارت تھی مگر دین سے ایسے ناآشنا کہ اسی

زمانہ میں ان کی شادی ہوئی جب گھر سے مدرسہ میں آئے تو آپ کے ہاتھوں میں مہندی لگی ہوئی تھی۔ غرض بعضے مولوی بھی جاہل ہوتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بعض جاہل مولوی مشہور ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ مولوی اصل میں وہ ہے جو اللہ والا ہو اور اللہ والا آدمی شریعت سے جاہل نہیں ہو سکتا۔ مگر آج کل جہاں کسی نے عربی کی دو چار کتابیں پڑھ لیں اسے مولوی کہنے لگتے ہیں چاہے اس نے محض معقول و ادب ہی پڑھا ہو۔ اور دینیات کا ایک سبق بھی نہ پڑھا ہو۔ حالانکہ یہ شخص حقیقت میں مولوی ہی نہیں۔

اگر معقول پڑھنے سے آدمی یوں مولوی ہو جایا کرے تو ارسطو اور جالینوس سب سے بڑے مولوی ہونے چاہئیں کیونکہ یہ لوگ معقول کے امام ہیں حالانکہ ان کے موحد ہونے میں بھی کلام ہے۔ اور اگر ادب پڑھنے اور عربی میں گفتگو کر لینے اور تحریر لکھ لینے سے مولوی ہو جایا کرے تو ابولہب اور ابوجہل سب سے بڑے مولوی ہونے چاہئیں۔ کیونکہ یہ لوگ بہت بڑے عربی دان اور فصیح و بلیغ تھے۔ تو محض معقول و ادب سے انسان مولوی نہیں ہو سکتا۔ مگر آج کل ان کو بھی مولوی مشہور کر دیتے ہیں اور یہ مرض اوپر ہی سے چلا آتا ہے۔

چنانچہ ملا محمود جونپوری اپنے زمانہ میں بڑا فاضل مشہور تھا حالانکہ وہ محض ایک فلسفی آدمی تھا۔ علوم شریعت میں اسے مہارت نہ تھی، مگر مشہور بہت ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ شاہ دہلی نے اس کو طلب فرمایا اور بہت اعزاز و اکرام کیا۔ ایک ملا بادشاہ کے یہاں پہلے سے مقرب تھے ان کو فکر ہوئی کہ اگر ملا محمود کی دال گل گئی تو پھر ہماری پوچھ کم ہو جائے گی۔ اس لئے وہ اس فکر میں تھے کہ کسی موقعہ پر ملا محمود کا جاہل ہونا بادشاہ پر ظاہر کیا جائے۔ خشک مولویوں میں مرض حسد وغیرہ کا ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ ایک دن کوئی جنازہ آیا اور لوگوں نے ملا سے کہا کہ جنازہ کی نماز پڑھا دو۔ انہوں نے ملا محمود سے کہا کہ آپ کے ہوتے ہوئے میں نماز نہیں پڑھا سکتا آپ پڑھا دیں۔ ملا محمود نے انکار کیا مگر اصرار کے بعد مجبور ہو کر آگے بڑھے۔ ان ملا نے کان میں کہہ دیا۔ مجمع زیادہ ہے ذرا قرائت بلند آواز سے پڑھئے اللہ اکبر کہہ کر انہوں نے الحمد للہ رب العلمین باآواز بلند پڑھنا شروع کر دی۔ لوگوں نے نماز توڑ دی اور ایک شور مچ گیا کہ یہ کون جاہل ہے جسے جنازہ کی نماز بھی نہیں آتی۔ غرض مصلےٰ سے پیچھے ہٹائے گئے اور سب لوگوں میں ان کی جہالت کا چرچا مشہور ہو گیا۔ میں یہ بیان کر رہا تھا کہ اگر کوئی بے نمازی نمازیوں میں پھنس جائے تو اس کو نماز کی نیت نہ کرنا چاہیے کیونکہ بے وضو پڑھنا کفر ہے۔

بسم اللہ پڑھنا

اسی طرح فقہاء نے لکھا ہے کہ حرام مال پر بسم اللہ کہنا کفر ہے۔ اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا۔ ایک مفسر نیچری نے ایک تفسیر لکھی ہے جس کی اس جماعت میں بڑی شہرت ہے مگر اللہ کے بندے نے اپنی تمہید میں بسم اللہ تک نہیں لکھی۔ بس جہاں سے قرآن شروع ہوا ہے وہیں بسم اللہ ہے۔ مفسر کی تمہید بسم اللہ سے شروع نہیں ہوتی۔ اس تفسیر کا ایک جواب البرہان میں بہت ہی عمدہ ہے۔ اس میں بطور لطیفہ کے اس کی ایک عجیب وجہ بیان کی ہے۔ لکھا ہے کہ ہمارے احباب میں اس کی توجیہ میں اختلاف ہے۔ بعض کی یہ رائے ہے کہ تقلید ملاحدہ یورپ اس کا سبب ہے۔ بعض کی رائے یہ ہے کہ مخالفت اہل اسلام اس کا باعث ہے مگر ہمارے نزدیک ان دونوں توجیہوں کے ساتھ ایک تیسری وجہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ مفسر کو پہلے سے یہ معلوم ہے کہ میں اس تفسیر میں جو کچھ لکھوں گا سب شریعت کے خلاف ہوگا اور فعل حرام پر بسم اللہ کہنا کفر ہے۔ اس لئے مفسر نے اپنے ایمان کی حفاظت کیلئے تمہید میں بسم اللہ نہیں لکھی۔ خوب لطیفہ ہے گو مفسر کو خود بھی نہ سوجھا ہو۔

غرض شریعت نے حرام مال کھانے، حرام مال سے صدقہ کرنے میں بسم اللہ پڑھنے سے اور امید ثواب رکھنے سے منع کیا ہے۔ اس مسئلہ کو سن کر بعض لوگ گھبرائے ہوں گے کہ ہمارے تو اکثر مال مشتبہ ہوتے ہیں پھر ان کو استعمال کرتے ہوئے بسم اللہ کہنے سے اگر ایمان جاتا رہا تو سارے بے ایمان ہی ہوئے۔ میں کہتا ہوں کہ وہم مت کرو۔ اس مسئلہ کا مطلب یہ ہے کہ جو مال یقینی حرام ہو اس میں بسم اللہ کہنا منع ہے۔ جیسے کوئی شخص رشوت کا روپیہ لیتے ہوئے بسم اللہ کہے یہ کفر ہے۔ باقی جس مال میں حرام وحلال دونوں ملے ہوئے ہوں اور حلال غالب ہو، وہ یقینی حرام نہیں وہ مشتبہ ہو گیا۔ اس میں بسم اللہ کہنا حرام نہیں مگر بسم اللہ کہنے سے اس کی کراہت زائل نہ ہوگی۔ جیسا کہ بعض جاہلوں کا خیال ہے۔ اسی طرح بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ رشوت اور سود کے روپے میں سے کچھ خیرات کر دیا جائے تو باقی حلال ہو جاتا ہے۔ یہ بھی بالکل غلط ہے۔ میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ حرام مال کے صدقہ کرنے میں کفر کا خوف ہے۔ غرض کوئی حرام کام کسی نیت سے یا بسم اللہ کہنے سے جائز

نہیں ہو جاتا۔ بلکہ ایسے کاموں میں خدا کا نام لینے سے ایمان پر اندیشہ ہے کیونکہ اس میں خدا تعالیٰ کے نام کی بے تعظیمی ہے۔ جیسے کوئی شخص پاخانہ جانے کے وقت بسم اللہ کہنے لگے۔ فقہا نے اس کو کفر لکھا ہے اور جو حدیث میں آتا ہے کہ پاخانہ میں جاتے ہوئے بسم اللہ کہو اس کا مطلب یہ ہے کہ پاخانہ کی حد سے باہر بسم اللہ کہو۔ یہ مطلب نہیں کہ اندر جا کر کہو۔ خوب یاد رکھو۔ اور اس میں حکمت یہ ہے کہ حدیث میں آتا ہے کہ پاخانہ میں خبیث شیاطین ہوتے ہیں۔ جب آدمی ننگا ہوتا ہے تو اس کے بدن کو دیکھتے ہیں۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے ستر کو شیاطین سے چھپانے کے لئے ان کو یہ تعلیم فرمائی کہ پاخانہ میں جانے سے پہلے

بسم اللہ اعوذ باللہ من الخبث والخبائث. (سنن ابن ماجة :١٩٨)

کہہ لیا کرو۔ اس کے بعد نہ وہ تمہارے بدن کو دیکھ سکیں گے نہ ایذاء دے سکیں گے۔

یہ سب مضمون نماز کو بلا وضو یا بلا نیت کے پڑھنے کے متعلق استطراداً آ گیا تھا۔ اس سے اوپر اصل مضمون یہ تھا کہ جس نفع میں حق تعالیٰ کی ناخوشی ہو وہ نفع ہی نہیں۔ دیکھو اگر کسی عاشق کے پاس سونا چاندی بھرا ہوا ہو مگر محبوب کی نظر میں نہ آتا ہو تو کیا عاشق اس کو نفع کی چیز سمجھے گا۔ نفع کی چیز وہی ہے جو محبوب کو بھا جائے ۔

چو در چشم شاہد نیاید زرت ☆ زر و خاک یکساں نماید برت

(جب محبوب کی نظر میں تمہارا مال وزر نہیں آتا تو مال وزر اور خاک تمہارے نزدیک برابر ہیں)

نفع کی چیز

اسی طرح مسلمان کے لئے نفع کی چیز وہی ہے جس سے خدا راضی ہو۔ اور جس چیز سے خدا راضی نہ ہو ہرگز نفع کی چیز نہیں۔ اگر تمہارے پاس سلطنت بھی ہو مگر خدا راضی نہ ہوا تو وہ کچھ بھی نہیں۔ تم خدا کو راضی رکھو۔ اس کے احکام کی اتباع کرو خواہ سلطنت ہو یا نہ ہو۔ رضائے الٰہی سے اگر تم کو یہاں سلطنت نصیب بھی نہ ہوئی تو آخرت میں تمہاری ہی سلطنت ہوگی۔ اور وہ ایسی مستحکم ہوگی جس کو کوئی دشمن تم سے چھین نہیں سکتا۔ ہاں اگر خدا کو راضی رکھ کر تم کو دنیوی منفعت بھی حاصل ہو جائے تو وہ خدا کی نعمت ہے۔ اسی طرح باطنی احوال

اگر ذاکر کو پیش نہ آئیں مگر حق تعالیٰ کی رضا حاصل ہو وہ نفع میں ہے اور اگر حالات و کیفیات کسی درجہ کی پیش آئیں مگر اعمال مرضی حق کے خلاف ہوں تو وہ سب ہیچ ہیں۔

حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کا مقولہ ہے۔ ”برہوا پری مگسے باشی برآب روی خسے باشی، دل بدست آر کہ کسے باشی“ یہ نظم نہیں بلکہ نثر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم ہوا میں اڑنے لگے تو کیا ہوا۔ ایک مکھی کے برابر ہوئے کیونکہ مکھی بھی ہوا میں اڑتی ہے۔ اور اگر پانی پر چلنے لگے تو ایک تنکے کے برابر ہو گئے۔ پس یہ امور کوئی کمال نہیں۔ اب کمال یہ ہے کہ دل بدست آر کہ کسے باشی۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ محبوب کو راضی رکھو۔ اس وقت تم آدمی ہو گئے۔

یہاں سے سالکین کو یہ سمجھنا چاہیے کہ جن خوارق و کیفیات کے وہ دلدادہ ہوتے ہیں یہ کوئی چیز نہیں بلکہ اصل مقصود رضائے محبوب ہے اگر رضائے حق حاصل ہے تو کشف و کرامت گو نہ ہو تو کیا ہے۔ اور اگر یہ نہیں تو ہزار کشف و کرامات گو ہو تو کیا ہے۔ اور رضا حاصل ہوتی ہے اتباع احکام سے۔ پس اصل مقصود اس کو سمجھو۔ اسی لئے مجھ کو احوال سے زیادہ اعمال کا اہتمام ہے۔ میں اس کو نہیں دیکھتا کہ ذاکر پر حالات و کیفیات وارد ہوتے ہیں یا نہیں۔ میری نظر زیادہ اس پر ہوتی ہے کہ اس کو اعمال کا بھی اہتمام ہے یا نہیں۔ خلاصہ یہ کہ منافع چاہے ظاہری ہوں یا باطنی سب غیر مقصود ہیں۔ اصل مقصود رضائے حق ہے اس کا طالب ہونا چاہیے۔

سفلی و علوی عمل

میں یہ مضمون سحر کے متعلق بیان کر رہا تھا کہ نفع کی نیت سے حرام عمل جائز نہیں ہو جاتا۔ پس سفلی عمل تو اپنی حقیقت ہی کے اعتبار سے گناہ ہے گو نیت کیسی ہی اچھی ہو۔ مگر علوی عمل بھی مطلقاً جائز نہیں اگر کوئی علوی عمل پڑھے تو اس کو دیکھنا چاہیے کہ نیت کیا ہے۔ اگر مباح کام کے واسطے پڑھا جائے تو جائز ہے جیسے حلال نوکری کے واسطے پڑھے یا کوئی شخص مقروض ہو وہ ادائے قرض کے واسطے عمل پڑھے اور اگر مثلاً کسی اجنبی عورت کو مسخر کرنے کے واسطے پڑھا ہے تو حرام ہے۔

اگر بلا نکاح ہی مسخر کرنا مقصود ہے تب تو حرام ہے اور اگر نکاح کے لئے مسخر کرنا ہے تب چونکہ اس سے نکاح کرنا اس کے ذمہ واجب نہیں ہے وہ بھی جائز نہیں۔ ہاں اگر کسی کی بیوی

نافرمان ہو، اس کے مسخر کرنے کے واسطے عمل پڑھے تو جائز ہے۔ اسی طرح کسی عورت کا شوہر ظالم ہو اس کا مسخر کرنا بھی۔ لیکن بعض افراد اس کے بہت نازک ہیں اکثر لوگ ان کو علی الاطلاق جائز سمجھتے ہیں مگر فقہاء نے ان کو بھی حرام لکھا ہے۔ مثلاً کوئی عورت اپنے شوہر کو تابعدار بنانے کے واسطے عمل پڑھے تو اس میں تفصیل ہے۔ اگر وہ ادائے حقوق میں کمی کرتا ہے تو اس درجہ کے حاصل کرنے کے واسطے جائز ہے۔ اور اگر حقوق ادا کرتا ہے تو محض عاشق و مفتون بنانے کے واسطے عمل کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح کسی امیر آدمی کے واسطے عمل پڑھنا کہ وہ ہم کو پچاس روپے دے دے ناجائز ہے۔ ہاں اگر کسی امیر پر ہمارے روپے آتے ہوں اور وہ ٹالتا ہو اس وقت اگر علوی عمل اس غرض سے پڑھا جائے کہ وہ ہمارا قرض ادا کردے تو جائز ہے لیکن محض اس واسطے عمل پڑھنا کہ وہ ہمارا مسخر ہو جائے کہ جب ہم ملا کر دیں وہ ہم کو پچاس روپے دے دے۔ یہ بالکل حرام ہے۔ خواہ اس کے لئے عمل کیا جائے یا تصرف کے طور پر توجہ کی جائے دونوں حرام ہیں مگر اس کو لوگ عموماً حرام نہیں سمجھتے۔ بلکہ اس کو تو مشائخ کے کمالات میں بیان کیا کرتے ہیں کہ ہمارے حضرت نے ایک عمارت بنانا شروع کی تھی اس میں ہزار روپیہ کی ضرورت تھی۔ بس ایک رئیس حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے ذرا سی توجہ اس کے اوپر ڈالی۔ فوراً ہزار روپے کا نوٹ نذر کر دیا۔ بڑے ہی صاحب تصرف ہیں۔ یاد رکھو کہ جو شیخ ایسا ہو وہ راہزن ہے وہ ڈاکو ہے۔ توجہ ڈال کر کسی سے روپے وصول کرنا ایسا ہی ہے جیسے ڈرا دھمکا کر چھین لینا کیونکہ توجہ دینے سے وہ شخص بالکل مجبور ہو جاتا ہے اور محض توجہ کے دباؤ سے نذر پیش کرتا ہے اور مسلمانوں کا مال بدون طیب قلب کے لینا ہرگز جائز نہیں۔

توجہ و مسمریزم کی حقیقت

اس مقام پر یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ توجہ کی حقیقت اور مسمریزم کی حقیقت ایک ہی ہے۔ بس اتنا فرق ہے کہ اگر کوئی بزرگ اپنی قوت نفسانی سے کام لینے لگے تو اس کو اصطلاح میں توجہ کہتے ہیں۔ اور ایک آوارہ آدمی قوت نفسانی سے کام لے اسے مسمریزم کہتے ہیں باقی حقیقت دونوں کی ایک ہی ہے کہ دونوں میں نفسانی قوت اور خیال سے کام لیا جاتا ہے۔ بعض لوگ توجہ کو بڑا کمال سمجھتے ہیں مگر حقیقت میں یہ کچھ بھی نہیں۔ ایک فاسق فاجر بلکہ کافر شخص بھی توجہ سے اثر ڈال سکتا ہے اس کا مشق پر مدار ہے اور بعض لوگ فطری طور پر

بدون مشق ہی کے صاحب تصرف ہوتے ہیں۔ یہ کچھ کمال نہیں۔ کیونکہ جو کام کافر بھی کر سکے وہ مسلمان کے واسطے کمال کیوں کر ہو جائے گا۔ مجھے ساری عمر میں ایک شخص ایسے ملے ہیں جو اس حقیقت کو بخوبی سمجھے۔ شاہجہاں پور میں ایک شخص صاحب سماع تھے۔ بہت مخلص آدمی تھے عقائد بھی عمدہ تھے صرف اتنی کسر تھی کہ صاحب سماع تھے لیکن دوکاندار نہ تھے صاحب دل آدمی تھے۔ ایک بار میرے پاس ان کا خط آیا کہ ایک شخص میرا دشمن تھا مجھے بہت ستاتا تھا۔ ایک دن میرے منہ سے اس کے حق میں بددعا نکل گئی کہ الٰہی اس کو ہلاک کر دے۔ اسی عرصہ میں وہ ہلاک ہو گیا۔ بے شک سچ ہے ؎

بس تجربہ دریں دیر مکافات ☆ بادردکشاں ہرکہ درافتاد برافتاد

(میری جسم وجاں میں تو ہی سمایا ہے جو کچھ دور سے ظاہر ہوتا ہے تجھ کو گمان کرتا ہوں)

اہل اللہ کا دل دکھانا بڑے وبال کا سبب ہے۔ غیرت حق ایک دن ضرور اس کو تباہ کر دیتی ہے۔ چنانچہ حدیث قدسی میں بھی آیا ہے۔ **من عادی لی ولیا فقد اذنتہ بالحرب۔ (السنن الکبری للبیھقی ۳:۳۴۶)** جو میرے ولی سے عداوت کرے اس کو میں اپنی طرف سے اعلان جنگ دیتا ہوں۔ پھر جس کو حق تعالیٰ الٹی میٹم دیں۔ اس کا کہاں ٹھکانا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

از خدا جوئیم توفیق ادب ☆ بے ادب محروم ماند از فضل رب
بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد ☆ بلکہ آتش درہمہ آفاق زد
چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد ☆ میلش اندر طعنہ پاکاں برد

(ہم اللہ تعالیٰ سے ادب کی توفیق طلب کرتے ہیں، اس لئے کہ بے ادب اللہ تعالیٰ کے فضل سے محروم ہوتا ہے، بے ادب نے تنہا اپنے آپ کو ذلیل نہیں کیا بلکہ ساری دنیا میں آگ لگا دی، جب اللہ تعالیٰ کسی کو رسوا کرنا چاہتے ہیں تو اس کا رجحان نیکوں پر طعنہ زنی کے لئے لگا دیتے ہیں)

غرض ان بزرگ نے لکھا کہ میں نے بددعا کی تھی جس کے بعد وہ شخص ہلاک ہو گیا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ واقعہ اگر کسی دوسرے کو پیش آتا تو وہ اپنے مریدوں میں بیٹھ کر ڈینگیں مارتا کہ دیکھو! ہماری بددعا سے ہلاک ہو گیا۔ بھلا ہماری بددعا خالی جا سکتی تھی۔ مگر ان بزرگ

میں اس کی بجائے دوسری حالت پیدا ہوئی۔ انہوں نے لکھا ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ قتل کا گناہ نہ ہوا ہو۔ سبحان اللہ! خوف خدا کی یہی شان ہوتی ہے۔ میرے اوپر اس خط کا بہت اثر ہوا۔ اور اس سوال سے مجھے سائل کی بہت قدر ہوئی۔ کیونکہ ایسا سوال عمر بھر مجھ سے کسی نے نہ کیا تھا۔ اور سوال بھی ایسے واقعہ کا جو ظاہر میں مشابہ کرامت کے معلوم ہوتا ہے۔

میں نے جواب لکھا کہ واقعی آپ کا اندیشہ درست ہے مگر اس میں تفصیل ہے وہ یہ کہ بددعا کے وقت دو حالتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ محض سرسری طور پر حق تعالیٰ سے درخواست کر دی اور اپنے دل کو اور خیال کو اس کے ہلاک کرنے کی طرف متوجہ نہیں کیا۔ اس صورت میں اگر وہ شخص ہلاک ہو جائے تو یہ بددعا کرنے والا قاتل تو نہ ہوگا کیونکہ بددعا سے ہلاک ہونے میں اس کا دخل نہیں بلکہ اس میں محض حق تعالیٰ سے درخواست ہے اور حق تعالیٰ اپنی مشیت سے اس کو ہلاک کرنے والے ہیں۔ پس یہ شخص قاتل تو نہیں۔ البتہ وہ شخص اگر بددعا کے قابل تھا تب تو گناہ بھی نہیں ہوا اور اگر بددعا کے قابل نہ تھا تو قتل کا گناہ تو نہیں ہوا مگر بددعا کرنے کا گناہ ہوا۔ اس سے توبہ واستغفار کرنا لازم ہے۔

اور ایک صورت بددعا کی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے درخواست کرنے کے ساتھ اپنے دل کو بھی اس کے ہلاک کرنے کی طرف متوجہ کیا اور اپنے تصرف سے کام لیا۔ اس صورت میں یہ تفصیل ہے کہ اگر اس شخص کو تجربہ سے اپنا صاحب تصرف نہ ہونا معلوم ہے۔ مثلاً بارہا تصرف کا قصد کیا مگر کچھ نہیں ہوا۔ اس وقت بھی قتل کا گناہ نہیں ہوا۔ البتہ اگر وہ شرعاً قابل قتل نہ تھا تو اس کی ہلاکت کی تمنا کا گناہ ہوگا۔ اور اگر تجربہ سے اپنا صاحب تصرف ہونا معلوم ہے تو یہ شخص قاتل ہے۔ کیونکہ تلوار سے قتل کرنا اور تصرف سے قتل کرنا برابر ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ وہ قتل عمد ہے اور یہ قتل شبہ عمد۔

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ شخص جس کے ہلاک کرنے کے واسطے تصرف کیا گیا ہے قتل کا مستحق ہے یا نہیں۔ اگر مستحق تھا تو صاحب تصرف قاتل تو ہوا۔ مگر گناہ نہیں ہوا کیونکہ تصرف کا استعمال اپنے محل میں ہوا اور اگر مستحق قتل نہ تھا تو صاحب تصرف کو قتل کا گناہ ضرور ہوا۔ اس صورت میں اس کو علاوہ دیت کے ایک غلام کا آزاد کرنا اور اس کی وسعت نہ ہو تو دو مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں اور توبہ واستغفار کرنا چاہیے۔

اس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ توجہ کی کیا حقیقت ہے۔ یاد رکھو کسی کو توجہ سے ہلاک کرنا یا ضرر پہنچانا علی الاطلاق جائز نہیں بلکہ اس میں وہ تفصیل ہے جو میں نے بیان کی مگر آجکل تو اس کو کمال سمجھا جاتا ہے۔ کسی کو بھی التفات نہیں ہوتا کہ اس میں بعض دفعہ گناہ بھی ہوتا ہے لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ ہم نے تو محض توجہ کی تھی۔ ہم نے قتل کہاں کیا۔ خوب سمجھ لو کہ توجہ سے قتل کرنا بھی ویسا ہی ہے جیسے تلوار سے قتل کرنا۔ اسی لئے ایسے مواقع میں توجہ سے بچنا چاہیے اور اگر کوئی شخص توجہ کا مشتاق بھی نہ ہو اسے بھی ایسے مواقع میں توجہ سے کام نہ لینا چاہیے۔ کیونکہ بعض لوگ فطرۃ صاحب تصرف ہوتے ہیں گو ان کو خبر نہ ہو تو ممکن ہے تم اپنے آپ کو صاحب تصرف نہ سمجھتے ہو مگر واقع میں تم صاحب تصرف ہو۔ تو اگر اس حالت میں تم نے کسی کو ضرر پہنچانے کا قصد کیا اور وہ اس کا مستحق نہ ہوا اور ضرر پہنچ گیا تو تم کو گناہ ہو گا۔ اور یہی حکم عملیات سے ہلاک کرنے کا ہے۔

چنانچہ ایک عمل کچی اینٹ کا ہے کہ جس کو ہلاک کرنا منظور ہوتا ہے اس کے واسطے ایک کچی اینٹ پر عمل پڑھتے ہیں۔ پھر اس کو کفن وغیرہ دے کر اس پر نماز جنازہ پڑھ کر ندی میں ڈالتے ہیں۔ پانی سے وہ اینٹ گھلنا شروع ہوتی ہے۔ جوں جوں وہ گھلتی ہے اسی قدر یہ شخص گھلنا شروع ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ اینٹ بالکل گھل جاتی ہے۔ یہ شخص بھی گھل گھل کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ یہ بہت ہی سخت عمل ہے۔

سو خوب سمجھ لو کہ اگر وہ شخص مستحق قتل نہ ہو گا تو تم کو قتل کا گناہ ضرور ہو گا۔ بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہم نے تو قرآن سے مارا ہے۔ پھر ہمیں گناہ کیوں ہو گا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر تم ایک بڑا بھاری قرآن کسی کے سر پر مار دو جس سے اس کا سر پھٹ جائے اور مر جائے تو کیا تم کو گناہ نہ ہو گا۔ ضرور ہو گا۔

علوی عمل کی حدود

علوی عملیات میں ایک بات تو یہ دیکھنے کے قابل ہے کہ مقصود جائز ہے یا نہیں۔ دوسرے یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ کلمات طیب ہیں یا نہیں اگر علوی عمل میں خبیث الفاظ نہ ہوں مگر طیب بھی نہ ہوں، وہ بھی ناجائز ہے چنانچہ بعض لوگوں نے موکلوں کے عجیب عجیب نام گھڑے ہیں۔ کلکائیل۔ دردائیل۔ اسی طرح اس کے قافیہ پر بہت سے نام ہیں

اور غضب یہ ہے کہ ان ناموں کو سورۂ فیل کے اندر ٹھونسا ہے۔

الم ترکیف فعل ربک باصحب الفیل یاکلکائیل الم یجعل کیدھم فی تضلیل یادردائیل وعلی ھذالقیاس. (ترجمہ: کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم نہیں کہ آپ کے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا، کیا ان کی تدبیر کو سرتاپا غلط نہیں کیا)

یہ سخت واہیات ہے۔ اول تو نام ہی بے ڈھنگے ہیں۔ نہ معلوم کلکائیل کہاں سے ان لوگوں نے گھڑا ہے۔ بس یہ لوگ رات دن کل کل ہی میں رہتے ہوں گے۔ پھر ان کو قرآن میں ٹھونسنا یہ دوسرا بے ڈھنگا پن ہے اور نہ معلوم یہ موکل ان لوگوں نے کہاں سے تجویز کئے ہیں۔ محض خیالات ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ اس کا مصداق معلوم ہوتے ہیں۔ **ان ھی الا اسماء سمیتمو ھا انتم واباء کم ماانزل اللہ بھا من سلطان.** (ترجمہ: چند بے حقیقت نام جن کو تم نے اور تمہارے باپ داداؤں نے آپ ہی (معبود) ٹھہرا رکھا ہے، جس کی اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی)

موکل پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا کہ ایک وکیل صاحب گھر میں اپنی والدہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ باہر سے ایک شخص نے ان کو آواز دی۔ وکیل نے پوچھا کون ہے؟ وہ کوئی دیہاتی تھا جس نے ان کو اپنے مقدمہ میں وکیل بنایا تھا۔ اس نے کہا جی میں ہوں تمہارا موکل۔ وکیل صاحب باہر جانے لگے۔ ان کی والدہ نے ہاتھ پکڑ لیا کہ کہاں جاتے ہو، وہ تو موکل ہے تم کو مار ڈالے گا۔ انہوں نے سمجھایا کہ کہاں جاتے ہو، وہ تو موکل ہے تم کو مار ڈالے گا۔ انہوں نے سمجھایا کہ یہ عملیات کا موکل نہیں بلکہ اس نے مجھے وکیل بنایا ہے اسے بھی موکل کہتے ہیں غرض بڑے اصرار کے بعد والدہ نے اجازت دی اور کہا کہ اچھا جاؤ خدا حافظ!

اسی طرح ایک عمل بچھو کا ہے انا اعطینک الکوثر فصل لربک وان یہاں تک پڑھ کر پانی پیتے ہیں پھر حر کہتے ہیں پھر دم کرتے ہیں نہ معلوم یہ کون سا طریقہ ہے۔ بچپن میں ہم نے بھی ان عملیات کو لکھ لیا تھا مگر کبھی ان پر عمل نہیں کیا۔ صرف ایک آدھ بار بچھو کا عمل غلطی سے کیا۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمادے۔

سو اس کا بہت لحاظ رکھنا چاہیے کہ عملیات علویہ میں الفاظ طیب ہوں۔ قرآن کے الفاظ کو بگاڑا نہ گیا ہو، ایک بات عملیات میں قابل لحاظ یہ ہے کہ جو عملیات دنیا کے واسطے ہوتے

ہیں۔ وہ موجب ثواب نہیں ہوتے، ان میں ثواب کا اعتقاد رکھنا بدعت ہے۔ اسی طرح ایسے عملیات کو مسجد میں بیٹھ کر نہ پڑھنا چاہیے اور نہ اس قسم کے تعویذ مسجد میں بیٹھ کر لکھنے چاہئیں۔ کیونکہ یہ یا تو تجارت ہے اگر تعویذ پر اجرت لی جائے جس کو مسجد سے باہر ہی کرنا چاہیے۔ فقہا نے تصریح کی ہے کہ جو مدرس اور ملا بچوں کو تنخواہ لے کر پڑھاتا ہو اس کو مسجد میں نہ بیٹھنا چاہئے۔ کیونکہ مسجد میں اجرت کا کام کرنا بیع وشراء میں داخل ہے۔ اسی طرح جو شخص اجرت پر کتابت کرتا ہو یا جو درزی اجرت پر کپڑے سیتا ہو، یہ سب لوگ مسجد میں بیٹھ کر یہ کام نہ کریں (قلت الا ان یکون معتکفا فیجوزله ذلک کما ھو مقتضی قواعد ھم والله اعلم ۱۲ جامع) اور اگر اپنے لئے عمل پڑھا جائے تو تجارت تو نہیں مگر ہے دنیا کا کام وہ بھی مسجد میں نہ چاہیے۔

اس نکتہ پر حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد سے متنبہ ہوا۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک شخص نے آ کر عرض کیا کہ میں نے خواب میں یہ دیکھا ہے کہ مسجد میں پاخانہ پھر رہا ہوں۔ حاجی صاحبؒ نے فوراً ارشاد فرمایا کہ تم مسجد میں کوئی عمل دنیا کے واسطے پڑھتے ہو گے۔ اس نے اقرار کیا آپ نے فرمایا کہ دنیا کے واسطے مسجد میں وظیفے نہ پڑھنے چاہئیں۔

تو علوی عملیات کے جائز ہونے کے لئے اتنے شرائط ہیں۔ یہ مسائل آپ نے کبھی نہ سنے ہوں گے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ کسی محقق عالم کو لپٹ جاؤ اور اس سے پوچھ پوچھ کر کام کیا کرو۔ اس کی بہت ضرورت ہے۔ اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ غرض ان شرائط کے ساتھ تعویذ وعملیات وغیرہ سحر حلال ہیں۔ یہ چیزیں مطلقاً سحر حلال میں داخل نہیں ہیں جیسا کہ عوام کا خیال ہے۔

میں یہ بیان کر رہا تھا کہ یہود میں سحر کا بہت چرچا تھا۔ اس پر سحر حلال اور سحر حرام کی تقسیم کا بیان یہاں تک طویل ہو گیا۔ لیکن یہ سب مضامین ضروری تھے۔ ان کا بیان فائدہ سے خالی نہیں۔ اب میں پھر اصل قصہ کی طرف لوٹتا ہوں۔

سحر کی تاثیر

یہود میں سحر کا بہت چرچا تھا۔ اور وہ لوگ سحر حرام ہی میں مبتلا تھے۔ جس کا ذکر النفثت فی العقد میں کیا گیا ہے۔ اس میں عورتوں کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ عورتوں کا سحر زیادہ قوی

اور موثر ہوتا ہے۔ اور اس میں ایک راز ہے جو کہ فلسفی مسئلہ پر مبنی ہے۔ وہ راز یہ ہے کہ سحر و عملیات وغیرہ کی تاثیر کا مدار توجہ اور قوت خیال پر ہے۔ الفاظ اور کلمات کا اس میں زیادہ دخل نہیں۔ مگر چونکہ بدون قیود کے خیال میں قوت اور یکسوئی نہیں پیدا ہوتی۔ اس لئے کچھ کلمات والفاظ اس کے لئے مقرر کر لئے جاتے ہیں اور عامل کے ذہن میں یہ بات جمادی جاتی ہے کہ ان الفاظ ہی میں یہ اثر ہے جس سے اس کا خیال مضبوط ہو جاتا ہے کہ جب میں یہ الفاظ پڑھوں گا فوراً اثر ہوگا۔ چنانچہ اثر ہو جاتا ہے لیکن دراصل وہ خیال کا اثر ہوتا ہے الفاظ کا نہیں ہوتا لیکن یہ اعتقاد مقصود عامل کو مضر ہوتا ہے۔ اگر عامل یہ سمجھنے لگے کہ ان الفاظ میں کچھ تاثیر نہیں، تو اس کے عمل کا کچھ بھی اثر نہ ہوگا کیونکہ اس اعتقاد کے بعد اس کا خیال کمزور ہو جائے گا کہ نہ معلوم اثر ہوگا یا نہیں۔ اس لئے عامل کے واسطے یہ جہل مرکب ہی مفید ہوتا ہے۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ الفاظ میں اثر نہیں بلکہ اس کا مدار توجہ پر ہے۔

پھر بعضے آدمی تو فطری طور پر متصرف ہوتے ہیں۔ ان کو اپنے خیال میں یکسوئی حاصل کرنے کے لئے خاص اہتمام اور زیادہ مشق کی ضرورت نہیں ہوتی اور بعضے مشق سے صاحب تصرف ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ ایک مرتبہ ایک طلسمی انگوٹھی ہندوستان میں بہت شائع ہوئی تھی جس پر غائب اور مردہ آدمیوں کی تصویریں نظر آتی تھیں۔ اس کا مدار بھی محض خیال پر تھا۔ اسی لئے اس میں یہ شرط تھی کہ اس انگوٹھی کو کوئی عورت یا بچہ دیکھتا رہے تو اس کو صورتیں نظر آئیں گی تو اس میں راز یہی تھا کہ تم نے کسی آدمی کا تصور کیا اور اس کا خیال جمایا تمہارے تخیل کا اثر انگوٹھی دیکھنے والے کے خیال پر پڑا، اس کو وہی صورتیں نظر آنے لگیں۔ اور اگر تم کسی کا تصور نہ کرو بلکہ یہ خیال جمالو کہ اس کو کوئی صورت نظر نہ آئے تو اس کو ہرگز ایک صورت بھی نظر نہ آئے گی۔

کانپور میں ایک مولوی صاحب نے کچھ مشق کی تھی جس سے غائب لوگوں کی صورتیں دکھادیا کرتے تھے۔ ان کا قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی آدمی آیا اور اس نے درخواست کی کہ مجھے فلاں شخص کی صورت دکھادو، انہوں نے اس سے کہا کہ جاؤ وضو کر کے حجرہ میں جا بیٹھو۔ ادھر انہوں نے گردن جھکا کر توجہ کی۔ تھوڑی دیر میں اسے کچھ بادل وغیرہ نظر آتے تھے پھر اس شخص کی صورت نظر آجاتی تھی۔ اس کی یہی حقیقت تھی کہ وہ مولوی صاحب توجہ سے دوسرے

کے خیال پر اثر ڈالتے تھے جس کی وجہ سے اس کے متخیلہ میں وہ صورت پیدا ہو جاتی تھی۔

چنانچہ ایک مرتبہ ان مولوی صاحب کی مجلس میں ایک طالب علم بیٹھے تھے۔ ایک شخص آیا اور اس نے درخواست کی کہ مجھ کو فلاں بزرگ کی صورت دکھلا دیجئے۔ وہ حسب معمول ادھر متوجہ ہو گئے۔ اس طالب علم نے چپکے چپکے یہ آیت پڑھنی شروع کی **قل جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقا** (ترجمہ: اور کہہ دیجئے کہ حق آیا اور باطل گیا، اور باطل چیز تو یوں ہی آتی جاتی رہتی ہے) تو اس شخص کو پہلے پہل کچھ مقدمات تو نظر آنے لگے تھے جب اس طالب علم نے یہ آیت پڑھنی شروع کی تو وہ بھی غائب ہو گیا۔ اب وہ بزرگ پوچھتے ہیں کہ کچھ نظر آیا۔ اس نے کہا جو کچھ نظر آیا تھا وہ بھی سب غائب ہو گیا اور صورت تو کیا نظر آتی۔ غرض انہوں نے بڑا ہی زور لگایا مگر خاک بھی نظر نہ آیا اور اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

تو بات کیا تھی کہ اس طالب علم نے ان کے خیال کے خلاف خیال جمایا۔ دونوں میں تصادم ہو گیا اور کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ ان عملیات اور سحر وغیرہ کا مدار محض خیال پر ہے۔ اسی لئے معمول کسی بچہ یا عورت کو بناتے ہیں کیونکہ ان میں عقل کم ہوتی ہے اور اسی خیال کے مطابق صورتیں نظر آنے لگتی ہیں۔ عاقل پر اثر کم ہوتا ہے کیونکہ اسے وہم آتے رہتے ہیں کہ دیکھئے ایسا ہوتا بھی ہے یا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کم عقل ذاکر پر احوال وکیفیات کا ورود زیادہ ہوتا ہے کیونکہ اس میں یکسوئی زیادہ ہوتی ہے اور احوال وکیفیات کا ورود یکسوئی کی حالت میں زیادہ ہوتا ہے۔ عاقل پر ورود وکیفیات کم ہوتا ہے کیونکہ اس کا دماغ ہر وقت کام کرتا رہتا ہے۔ اسلئے جس ذاکر کو کیفیات پیش نہ آئیں وہ غمگین نہ ہو بلکہ خوش ہو کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ وہ عاقل ہے۔

کشف کے خطرات

دوسرے جو لوگ کشف وغیرہ کے زیادہ معتقد ہوتے ہیں ان کے ساتھ شیطان تمسخر بھی کرتا ہے بعض اکابر نے لکھا ہے کہ شیطان کو تخیل میں تصرف کرنے کی بڑی قدرت حاصل ہے۔ وہ خیالی آسمان ذاکر کو دکھلا دیتا ہے جس میں نور اور تجلی اور فرشتے سب کچھ نظر آتے ہیں جس کو یہ ذاکر جو کیفیات وکشف وغیرہ کا معتقد ہے حقیقی آسمان اور سچ مچ کے فرشتے سمجھنے لگتا ہے۔ اس لئے محققین نے لکھا ہے کہ کشف کا راستہ بہت خطرناک ہے۔ اس

میں شیطان کو دھوکا دینے کا بہت موقع ملتا ہے اسی کو عارف شیرازی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

در راہ عشق وسوسہ اہرمن بسے ست ☆ ہشدار و گوش را بہ پیام سروش دار

(طریق باطن میں شیطان کے وساوس اور خطرات ہیں ان سے بچنا چاہتے ہو تو ہوشیار رہو اور شریعت کا اتباع کرو)

بعض لوگ حافظ کو رند بتلاتے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے آنکھیں ہی نہیں۔ حافظ کے کلام میں سلوک کے مسائل بکثرت ہیں اور یہ نہیں کہ یہ مسائل محض اعتقاد کی وجہ سے ہم نے ان کے کلام سے نکال لئے بلکہ واقعی ان کا کلام تصرف سے بھرا ہوا ہے۔ ورنہ کسی دوسرے کے کلام سے تو کوئی یہ مسائل نکال دے۔ بات یہ ہے کہ جب تک اندر کچھ نہیں ہوتا اس وقت تک کوئی نکال بھی نہیں سکتا۔ تو حافظ فرماتے ہیں کہ اس راستہ میں شیطان کے وسوسے بہت ہیں۔ بس سالک کو ہوشیار ہو کر پیام سروش کی طرف کان لگائے رہنا چاہیے۔ پیام سروش سے مراد ہاتف نہیں ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ یہی سمجھے ہوں اور اپنے دل میں خوش ہوں کہ اس سے تو کشف پر اعتماد کرنے کی تعلیم حاصل ہوئی۔ نہیں! بلکہ یہاں سروش سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہیں اور پیام سروش سے مراد وحی ہے جو کہ جبرائیل علیہ السلام کے ذریعہ سے نازل ہوئی تھی۔ مطلب یہ ہوا کہ وحی کا اتباع کرنا چاہیے۔ پھر شیطان کے وسواس کارگر نہ ہوں گے۔ غرض کشف میں یہ خطرے ہیں۔ اور جس کو کشف ہی نہ ہوتا ہو اس کو شیطان کیا دھوکا دے لیگا۔

جب یہ بات ثابت ہوئی کہ سحر وغیرہ کا مدار تخیل پر ہے تو اب سمجھئے کہ عورتوں کا تخیل مرد سے بڑھا ہوا ہوتا ہے کیونکہ اول تو ان کو عقل کم ہوتی ہے اور کم عقل آدمی کو جو کچھ بتلا دو، وہ اس کے خیال میں جلدی جم جاتا ہے۔ اسے جانب مخالف کا وہم ہی نہیں ہوتا۔ دوسرے ان کی معلومات بھی بہ نسبت مردوں کے کم ہوتی ہیں۔ ان کا خیال زیادہ منتشر نہیں ہوتا۔

تعلیم نسواں کی صورت

لیکن آج کل نئے تعلیم یافتہ طبقہ میں اس کی بھی کوشش ہے کہ عورتوں کے معلومات وسیع کیے جائیں۔ اور ان کو علوم وفنون کی تعلیم دی جائے۔ میں عورتوں کی تعلیم کا مخالف نہیں، مگر اس تعلیم کا ضرر مخالف ہوں جو یہ لوگ عورتوں کو دیتے ہیں۔ بھلا عورتوں کو جغرافیہ اور تاریخ

پڑھانے سے کیا فائدہ؟ میں نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ عورتوں کو اب تک یہ بات معلوم نہیں تھی کہ ہمارے شہر میں کتنے محلے ہیں۔ اور ضلع میں کتنے شہر ہیں اور کون راستہ کدھر کدھر کو جاتا ہے۔ اسی لئے اب تک وہ اپنے گھر میں مقید رہنا پسند کرتی تھیں۔ لیکن اب ان کو دنیا بھر کے نقشے اور راستے بتلائے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو بھاگنے کا طریقہ بتلایا جاتا ہے۔ سو واقعی میری سمجھ میں اس کی حکمت نہیں آئی کہ عورتوں کو جغرافیہ پڑھانے میں کیا فائدہ ہے۔ ان کا تو کمال یہی ہے کہ اپنے شہر اور اپنے گھر کے سوا انہیں کچھ نہ معلوم ہو۔ عورتوں کی تعلیم کیلئے دینی مسائل سے زیادہ کوئی چیز مفید نہیں۔ اگر تاریخ پڑھائی جائے تو محض بزرگوں کے حالات پڑھانے چاہئیں۔ جس کا اثر ان کے اخلاق پر بھی اچھا ہو۔ مگر آج کل تو ان کو دنیا بھر کے قصے پڑھائے جاتے ہیں جس کا بہت ہی برا نتیجہ ہوتا ہے۔

قرآن شریف میں نیک عورتوں کی ایک صفت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ وہ غافل ہوں۔ چنانچہ ارشاد ہے: **ان الذین یرمون المحصنت الغفلت المؤمنات لعنوا فی الدنیا والاخرہ.**

جو لوگ پاک دامن مسلمان عورتوں کو متہم کرتے ہیں ان پر دنیا و آخرت میں لعنت ہے۔

غافلات کا مطلب یہ ہے کہ وہ چالاک نہیں ہیں۔ نشیب و فراز سے بے خبر ہیں۔

تو صاحبو! عورتوں کا تو کمال یہی ہے کہ وہ اپنے گھر اور اپنے شوہر کے سوا تمام دنیا سے بے خبر ہوں۔ اور یہ وصف عورتوں میں فطری ہوتا ہے مگر لوگ اس کو بگاڑ دیتے ہیں۔

ایک شخص مجھ سے ایک بزرگ کی حکایت بیان کرتے تھے کہ وہ ایک مرتبہ بہلی میں سفر کر رہے تھے۔ اور وہ خود نہایت حسین تھے اور گاڑیبان ایسا بدشکل اور بدصورت تھا کہ خدا کی پناہ۔ راستہ میں اس گاڑیبان کا گھر آ گیا اور اس نے اپنی بیوی کو آواز دی۔ اس کی بیوی آواز سنتے ہی آئی جس وقت دفعۃً اس پر نگاہ پڑی ہے تو ایسا معلوم ہوا کہ چاند نکل آیا۔ نہایت ہی حسین تھی۔ ان کو یہ خیال ہوا کہ یہ عورت تو ایسی حسین و جمیل اور اس کا مرد ایسا بدصورت۔ یہ اس کو منہ بھی لگاتی ہے یا نہیں۔ ان کو اپنے حسن پر بہت ناز تھا۔ انہوں نے سوچا کہ دیکھوں یہ عورت میری طرف بھی نظر کرتی ہے یا نہیں مگر اس اللہ کی بندی نے ایک نگاہ بھر کر بھی یہ نہ دیکھا کہ گاڑی میں کون ہے کون نہیں۔ اس کی ساری توجہ اپنے شوہر ہی کی طرف تھی اور اسی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ بہلی آگے بڑھ گئی اور وہ اپنے گھر میں چلی گئی

وہ صاحب کہتے تھے کہ اس کی یہ صفت دیکھ کر بہت ہی دل خوش ہوا کہ پاک دامن ایسی ہونی چاہیئے جو ایسے بدصورت خاوند سے بھی خوش ہو اور دوسروں کو مڑ کر بھی نہ دیکھے۔

سو میں کہتا ہوں کہ عورتوں میں یہ صفت فطری ہے مگر ہم لوگ اس کو بگاڑ دیتے ہیں۔ افسوس اس جوہر کی نگہبانی نہیں کی جاتی۔ پس عورتوں کو اگر تعلیم دی جائے تو سب سے پہلے ناولوں اور خراب قصوں کا داخلہ اپنے گھر میں بند کرو۔ ان ناولوں کی بدولت شریف گھرانوں میں بڑے بڑے قصے ہو چکے ہیں۔

دوسرے عورتوں کو لکھنا مت سکھاؤ اور اگر بقدر ضرورت سکھاؤ تو اس کا بہت اہتمام رکھو کہ وہ نامحرموں کے نام خط نہ لکھیں۔ بعض عورتیں اپنے بہنوئی اور چچازاد بھائی اور ماموں زاد بھائی کے نام خطوط روانہ کرتی ہیں۔ اس کی پوری بندش کرنی چاہیئے۔ اور بعضی عورتیں محلہ والیوں کے خطوط لکھ دیا کرتی ہیں۔ اس سے بعض دفعہ مرد کو لکھنے والی سے تعلق ہو جاتا ہے جس سے بہت فتنہ پھیلتا ہے۔ اس لئے عورتوں کو خوب تاکید کر دو کہ محلہ بھر کے خطوط نہ لکھا کریں۔ اور ایک اس کا اہتمام کرو کہ اپنے محارم کے نام بھی خطوط لکھیں تو کارڈ اور لفافہ پر پتہ اپنے ہاتھ سے نہ لکھیں بلکہ پتہ گھر کے مردوں سے لکھانا چاہیئے ایک جگہ ایسا قصہ پیش آیا کہ ایک عورت نے پتہ اپنے ہاتھ سے لکھا وہ خراب ہو گیا تو لفافہ کو دھویا جس سے مہر مشتبہ ہو گئی اور ڈاکخانہ والوں نے اس پر مقدمہ قائم کر دیا۔ اس وقت بڑی دقت پیش آئی کہ پردہ نشین عورت کو عدالت میں بھیجنا پڑے گا۔ آخر اس کے ایک عزیز نے اپنے اوپر بات لی اور عدالت میں کہا کہ یہ خط میں نے بھیجا تھا اور پتہ میں نے لکھا تھا۔ اس نے خیال کیا کہ اگر مقدمہ قائم ہو تو میرے اوپر قائم ہو۔ میں قید بھگت لوں گا مگر پردہ نشین عورت کی تو بے عزتی نہ ہو۔

اس لئے میں اس کو ضروری سمجھتا ہوں کہ عورتیں اپنے ہاتھ سے پتہ ہرگز نہ لکھیں۔ تو اگر کسی کو عورتوں کی تعلیم کا بہت ہی شوق ہو، تو اس کو ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔

غرض چونکہ عورتوں کی معلومات عموماً وسیع نہیں ہوتیں اس لئے ان کا تخیل صحیح اور کامل ہوتا ہے اور سحر کا مدار تخیل ہی پر ہے۔ اس لئے عورتوں کا سحر زیادہ قوی ہوتا ہے۔ اس لئے **النفثت فی العقد** (گنڈے کی گرہوں پر پڑھ پڑھ کر پھونکے مارنے والیاں) میں عورتوں کی تخصیص کی گئی۔

عجائب پرستی

یہود سحر حرام میں بہت مبتلا تھے۔ ان کی عورتیں بھی سحر جانتی تھیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لبید کی بیٹیوں نے سحر کیا تھا۔ جہلا یہود تو سحر میں مبتلا تھے مگر علماء نے بجائے اس کے کہ اسکو حرام اور کفر کہتے اور عوام کو اس سے منع کرتے الٹا اس کو ہاروت وماروت کا علم بتا کر ایک اسمانی علم بنا دیا۔ یہ قاعدہ ہے کہ عالم جب بگڑتا ہے تو بہت دور جاتا ہے۔ عالم ہر چیز کو خدا اور رسول تک پہنچا کر رہتا ہے۔ چنانچہ اب بھی لوگ کہتے ہیں کہ دین تو علماء کے ہاتھ میں ہے جس طرف چاہیں موڑ دیں۔ جس چیز کو چاہیں حرام کر دیں اور جس کو چاہیں حلال گویا ان کے قبضہ کی بات ہے۔ میں کہتا ہوں کہ عوام اگر ایسا کہیں تو ان کا کچھ قصور نہیں۔ واقعی بعض اہل علم ایسا ہی کرتے ہیں۔

تو یہود کے علماء کی یہی حالت تھی۔ انہوں نے سحر کو ہاروت وماروت کا علم بتایا اور اس کے متعلق ایک عجیب قصہ زہرہ کا انہوں نے گھڑ لیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہودی عجائب پرست تھے۔ لوگوں کو حیرت میں ڈالنے کیلئے نئے نئے انداز سے قصے گھڑتے تھے تاکہ ذرا مجلس میں رنگ آجائے۔

چنانچہ آج کل یہی مذاق ہمارے واعظین کا ہے۔ یہ لوگ ایسا غضب کرتے ہیں کہ وعظ کا رنگ جمانے کے لئے بہت ہی بعید از عقل حکایات بیان کرتے ہیں۔ چونکہ عوام آج کل عجائب پرست زیادہ ہیں، اس لئے ایسے واعظوں کو پسند کرتے ہیں۔ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ صاحب واعظ میں نئی نئی باتیں ہونی چاہیئں جو کبھی سنی بھی نہ ہوں۔ پرانی باتوں کو دہرانے سے لطف نہیں آتا۔ میں کہتا ہوں کہ بالکل غلط ہے۔ لطف پرانی ہی باتوں میں ہے چاہے ان کو کتنی ہی بار بیان کیا جائے مگر اس کا لطف اہل سلامت ہی کو حاصل ہوتا ہے جو تحقیق حق کے طالب ہیں اور عجائب پرست نہیں ہیں۔ اور جنکی فطرت سلیمہ نہیں انکو تو طلسم ہوش ربا میں لطف آئے گا۔ پرانی باتوں میں کیا لطف آئے گا۔

دیکھئے! قرآن کا طرز یہی ہے۔ اس میں بعض مضامین کو بار بار بیان کیا گیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا قصہ قرآن میں متعدد جگہ مذکور ہوا ہے مگر ہر جگہ نئے انداز سے اور نئے طرز سے بیان ہوا ہے۔ تو یہی طریقہ وعظ کا ہونا چاہئے کہ وہی پرانی باتیں مختلف طرز سے بیان کی جائیں۔ موقع

کے مناسب مضامین ذکر کئے جائیں۔ ان پرانی باتوں میں وہ لطف ہے جیسے کہا گیا ہے۔

ہر چند پیر وخستہ وبس ناتوں شدم ☆ ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

(اگرچہ بہت بوڑھا اور ناتواں ہوگیا ہوں مگر جس وقت تیرے چہرے پر نظر ڈالتا ہوں جوان ہو جاتا ہوں)

ان سے دل میں نور اور تازگی پیدا ہوتی ہے اور ان نئی نئی حکایات سے ظلمت بڑھتی ہے وعظ تو وہی ہے جس میں بدعت نہ ہو اور یہ نئی باتیں تو بدعت ہیں۔

غلو فی الدین

حلال روزی طلب کرنے کے متعلق ایک قصہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص کو حلال کی طلب تھی۔ لوگوں نے اس سے کہا کہا کہ آج کل حلال روزی ایک شخص کے پاس ہے جو بصرہ میں رہتا ہے۔ اس کے سوا حلال روزی یقینی طور پر کسی کی نہیں۔ چنانچہ وہ بصرہ پہنچا اور ان بزرگ سے ملا اور ان سے اپنا قصہ بیان کیا کہ میں حلال کی طلب میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کی روزی بالکل حلال ہے جس میں کوئی شبہ نہیں۔ وہ بزرگ یہ سن کر رونے لگے اور کہا کہ اب تک تو میری روزی بلاشبہ حلال تھی لیکن اب نہیں رہی کیونکہ میرے بیل ایک شخص کے کھیت میں گھس گئے تھے۔ اس کے کھیت کی مٹی ان کے پیروں کو لگ گئی اور وہ مٹی میرے کھیت میں مل گئی۔ اب مجھے شبہ پیدا ہو گیا۔

یہ حکایت قواعد شریعت کے بالکل ہی خلاف ہے کیونکہ جتنی مٹی بیلوں کے پیروں کو لگی ہوگی وہ کوئی متقوم چیز نہیں جس سے شبہ پیدا ہو سکے۔ یہ محض غلو فی الدین ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک دانہ گیہوں کی تعریف کرے یعنی لوگوں سے پوچھتا پھرے کہ یہ دانہ کس کا ہے تو حاکم وقت کو چاہئے کہ اس شخص کو سزائے تعزیر دے کیونکہ ایک دانہ متقوم نہیں ہے جس کی تعریف کی جائے تو یہ شخص حدود شریعت سے تجاوز کرتا ہے۔ غرض یہ حکایت سراسر خلاف شریعت ہے۔ مگر واعظین اس کو بڑے زور شور کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور سننے والے بھی اس پر سبحان اللہ کہتے ہیں اور وجد کرتے ہیں مگر ان حکایات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ حلال روزی بہت دشوار ہے جو ہم کو نصیب نہیں ہو سکتی۔ اس لئے وہ طلب حلال سے ہمت ہار دیتے ہیں۔

حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب کے ایک خادم تھے۔ مولانا ان کے لئے کوئی کھانا بھیج دیتے۔ تو انہوں نے ایک بار عرض کیا کہ حضرت آپ تحقیق بھی کر لیتے ہیں کہ حلال ہے یا حرام۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ ارے بھوکوں مر جائے گا، بڑا حلال کھانے والا آیا۔ جا کھا لیا کر۔ جب ہمیں ایک مسلمان نے ہدیہ دیا اور ہم کو اس کی آمدنی کا حال معلوم نہیں تو مسلمان پر ہم کو بدگمانی کی کیا ضرورت ہے کہ اس کی آمدنی حرام ہوگی۔

گنگوہ میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ایک شاہ صاحب مہمان ہوئے جو حلال روزی کھانے کا دعویٰ کرتے تھے اور بہت تفتیش کرتے تھے۔ حضرت کے یہاں سے ان کے لئے کھانا آیا تو واپس کر دیا اور کہا میں خالص حلال کھاتا ہوں مشتبہ مال نہیں کھاتا اور مجھ کو معلوم نہیں کہ یہ کھانا کیسا ہے۔ یہ کہہ کر وہ اپنے دل میں اس کے منتظر ہوئے ہوں گے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ خود آ کر اس کھانے کی حقیقت بیان کریں گے کہ یہ کھانا اس قسم کی آمدنی سے تیار ہوا ہے۔ جس میں کوئی شبہ نہیں، تب کھاؤں گا۔ مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ ایسے روگ نہیں پالتے تھے جب کھانا واپس آیا تو آپ نے فرما دیا کہ کھانا تو گھر میں رکھ لیا جائے اور ان شاہ صاحب سے کہہ دیا جائے کہ خانقاہ میں جو گولر کھڑا ہے اس کے پھل بالکل حلال ہیں جس میں کوئی شبہ نہیں پس گولر توڑیں اور کھائیں۔

خوب علاج کیا اگر وہ شخص سچا طالب ہوتا تو ایسا ہی کرتا مگر اس کو تو محض تنگ کرنا اور اپنا نام مقصود تھا۔ چنانچہ جاہلوں کو بہت تنگ کیا کرتا تھا اور وہ اس کی خوشامدیں کرتے اور تلاش کر کر کے اس کے لئے حلال کھانا لایا کرتے تھے مگر حضرت کے یہاں سے جب صاف جواب مل گیا تو آپ بہت خفا ہوئے اور دوسرے ہی وقت وہاں سے چل دیئے۔

تو صاحبو! یہ تقویٰ نہیں بلکہ تقویٰ کا ہیضہ ہے۔ شریعت نے اس قدر غلو سے منع کیا ہے مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ دردہ ہو جاؤ حلال وحرام کی پروا نہ کرو بلکہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ جب تم کو بغیر تجسس کے معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص کے یہاں بالکل حرام آمدنی ہے، تو اس کے گھر کا کھانا مت کھاؤ اور اگر یہ معلوم ہوا کہ اس کی کچھ آمدنی حرام ہے اور کچھ حلال تو اس کے گھر کا کھانا مشتبہ ہے جو فتویٰ کے اعتبار سے کھانا جائز ہے مگر احتیاط کرنا تقویٰ ہے اور اگر کسی کا حال کچھ بھی معلوم نہ ہو تو تم کو بدگمانی کی کچھ ضرورت نہیں اس کو حلال ہی سمجھو

مگر آج کل عوام کی نظر میں اس شخص کی بہت وقعت ہوتی ہے، جو شریعت میں غلو کرے۔ اور راز اس کا یہ ہے کہ غلو فی الدین سے امتیاز پیدا ہوتا ہے اور اگر اعتدال سے کام لیا جائے تو اس سے کچھ امتیاز نہیں ہوتا۔ شہرت اسی کام سے ہوتی ہے جو نیا ہو۔

عوام کا اعتقاد

گڑھی میں ایک شاہ صاحب آئے۔ ان کی یہ عادت تھی کہ جب کوئی ان کی دعوت کرتا تو پہلے آپ مراقبہ کرتے۔ کبھی تو مراقبہ کر کے کہہ دیتے کہ تیرے یہاں آمدنی حلال نہیں۔ اس لئے میں دعوت قبول نہیں کرتا اور کبھی کہہ دیتے کہ ہاں تیری آمدنی حلال ہے تیری دعوت منظور ہے لوگوں میں بڑی شہرت ہوئی کہ واقعی شاہ صاحب بڑے بزرگ ہیں، حرام آمدنی کبھی کھاتے ہی نہیں، مراقبہ کر کے معلوم کر لیتے ہیں کہ آمدنی کیسی ہے۔ مگر چند لوگ ہوشیار بھی تھے۔ انہوں نے کہا کہ شاہ صاحب کے مراقبہ کا امتحان کرنا چاہیے کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ محض ظاہری آثار سے سمجھ لیتے ہوں کہ یہ شخص امیر ہے اور امیروں کے یہاں ایسی ہی گڑ بڑ آمدنی ہوتی ہے اور فلاں شخص مزدور خستہ حال ہے اور غریبوں کے یہاں اکثر مزدوری کی آمدنی ہوتی ہے جس میں شبہ کم ہوتا ہے اس لئے ان کا امتحان لینا چاہیے۔

چنانچہ وہ لوگ ایک کسبی کے یہاں گئے کہ تیرے پاس کوئی تازہ آمدنی کا روپیہ ہو تو ذرا ایک دو روز کے واسطے ہمیں دے دے۔ چنانچہ اس نے تازہ آمدنی کا ایک روپیہ دے دیا۔ وہ روپیہ ان لوگوں نے ایک مزدور غریب آمدنی کو دیا کہ اس روپے سے تو شاہ صاحب کی دعوت کر۔ چنانچہ وہ گیا اور شاہ صاحب سے عرض کیا کہ حضور آج میرے یہاں دعوت قبول کر لیجئے۔ شاہ صاحب نے حسب معمول مراقبہ کیا اور سر اٹھا کر کہا کہ سبحان اللہ! تمہاری آمدنی میں بڑا نور ہے بالکل حلال ہے تمہاری دعوت منظور ہے۔ لوگ سمجھ گئے کہ شاہ صاحب کا مراقبہ محض ڈھونگ ہی ہے جب وہ اس گھر پر گئے اور کھانا کھا چکے تو ان لوگوں نے کہا کہ شاہ صاحب! ذرا پھر مراقبہ کر لیجئے کہ آپ نے جو کھانا کھایا ہے وہ حلال ہے یا حرام۔ آپ نے پھر مراقبہ کیا اور کہا ماشاء اللہ! اس کھانے میں بہت ہی انوار ہیں جس سے دل منور ہو گیا۔ لوگوں نے جوتہ نکال کر شاہ صاحب کی خوب مرمت کی کہ جھوٹے مکار بس تیرے مراقبہ کا حال معلوم ہو گیا۔ تو مخلوق کو دھوکا دیتا اور پریشان کرتا ہے۔ یہ کھانا جو تو نے کھایا ہے ایک کسبی کی آمدنی سے تیار ہوا ہے جس میں تجھے انوار نظر آتے ہیں۔

واقعی خوب امتحان لیا مگر ایسے امتحان لینے والے بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ اکثر تو ان مکاروں کے دھوکا ہی میں آجاتے ہیں۔ اسی لئے محققین نے کہا ہے کہ عوام کی مدح وثنا سے کسی کو معتقد نہ ہونا چاہیے یہ لوگ ہر ایک کے معتقد ہوجاتے ہیں اور خود مشائخ کو بھی عوام کی تعریف سے اپنا معتقد نہ ہونا چاہیے جب تک کوئی صاحب نظر شہادت نہ دے کہ تمہاری اچھی حالت ہے۔ صائب کہتے ہیں ۔

بنمائے صاحب نظرے گوہر خود را ☆ عیسیٰ نتواں گشت بہ تصدیق خرے چند

(کسی صاحب نظر کو اپنا موتی دکھاؤ کہ وہ اصلی ہے یا نہیں چند گدھوں کی تصدیق سے وہ عیسیٰ نہیں ہوسکتا)

واعظین کا مذاق

آج کل ہماری یہ حالت ہے کہ جہاں چند لوگوں نے ہاتھ پیر چومنے شروع کر دیئے تو ہم خود بھی اپنے معتقد ہوجاتے ہیں کہ واقعی میں کچھ تو ہوں جو یہ لوگ میرے ہاتھ پیر چومتے ہیں۔ عوام کے اعتقاد کی بھی ایک ہی رہی۔ ان کے اعتقاد کی تو یہ حالت ہے کہ گنگوہ میں ایک واعظ آیا جس کا شین قاف بھی درست نہ تھا۔ جہنم کو جہندم کہتا تھا مگر عوام کے اعتقاد کی یہ حالت تھی کہ بعض لوگ یوں کہتے تھے کہ یہ شخص بہت ہی بڑا عالم ہے۔ مولوی رسید کو تو بارہ برس پڑھا دے۔ واقعی سچ کہا، مولانا کو تو بارہ برس کے بعد بھی یہ لغات معلوم نہ ہوتے کہ وہ جہنم کو جہندم کہتے۔ پس عوام کی تو یہ حالت ہے کہ جو شخص واہی تباہی قصے بیان کرتا ہو اس کے معتقد ہوجاتے ہیں۔ چاہے اسے خاک بھی نہ آتا ہو۔

کانپور میں ایک واعظ آئے۔ ممبر پر بیٹھتے ہی انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ آج میں ایسی بات کہوں گا جو کسی نے نہ کہی ہوگی وہ یہ کہ خدا عالم الغیب نہیں ہے۔ اس پر چاروں طرف سے لوگ لاحول پڑھنے لگے۔ اس کے بعد تھوڑی دیر خاموش رہ کر آپ نے یہ کہا کہ صاحبو! یہ بات سن کر آپ نے مجھے اپنے دل میں کافر وزندیق کہا ہوگا مگر اس کی حقیقت سمجھنے کے بعد آپ کہیں گے کہ میری بات سچی ہے، بات یہ ہے کہ غیب کہتے ہیں پوشیدہ کو اور خدا تعالیٰ سے کوئی چیز مخفی نہیں۔ تو خدا تعالیٰ عالم الغیب کیوں کر ہوسکتے ہیں۔ ان کو جس چیز کا بھی علم ہے وہ ان کے سامنے ہے۔ آپ نے یہ نکتہ بیان کیا اور اپنے دل میں بڑے خوش ہوئے کہ

میری بات سچی مگر یہ نہ سمجھے کہ اس سے قرآن کے ایک لفظ کو اس نے بیکار اور لغو بنا دیا۔ جب قرآن میں خدا تعالیٰ کی صفت عالم الغیب موجود ہے تو اس کا انکار کرنا کیوں کر جائز ہوگا۔ اسے یہ کہنا چاہیے تھا کہ خدا تعالیٰ کی صفت جو عالم الغیب ہے وہ مخلوق کے اعتبار سے ہے کہ جو چیزیں مخلوق سے غائب ہیں خدا تعالیٰ کو ان کا علم بھی ہے اور ذات خداوندی کے اعتبار سے علم کی ایک ہی قسم ہے یعنی علم حضوری۔

غرض آج کل واعظین کا مذاق وہی ہے جو یہود کا مذاق تھا ایسی باتیں بیان کرتے ہیں جو عوام کو حیرت میں ڈال دیں۔ اسی طرح آج کل کے واعظین شہادت نامہ خوب پڑھتے ہیں تاکہ لوگ روئیں اور اس کی کچھ پروا نہیں کرتے کہ روایات صحیح ہوں یا غلط جس جو جی میں آیا بیان کر دیا کیونکہ ان کا مقصود تو محض رلانا ہے۔

ایک شخص نے قل ھو اللہ کی تفسیر میں شہادت نامہ بیان کیا۔ آپ کو حیرت ہوئی ہوگی کہ قل ھو اللہ کی تفسیر میں شہادت نامہ کا کیا جوڑ تھا۔ سنئے ان حضرت نے اس طرح جوڑ لگایا کہ یہ وہ سورت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی جن کے نواسے میدان کربلا میں امت ہی کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے۔ پس پھر سارا قصہ بیان کر دیا۔ اس پر بعضے سننے والے کہنے لگے کہ واہ کیا ربط ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ربط نہیں بلکہ خبط ہے جس کی وجہ سے یہ ساری تقریر قابل ضبط ہے۔ مگر ضبط کے معنی وہ نہیں کہ قلمبند کی جائے بلکہ مشہور معنی مراد ہیں یعنی یہ اس قابل ہے کہ اس کو ردی میں ڈال دیا جائے اشاعت بند کی جائے۔ بھلا اگر اس کا نام ربط ہے تو ایک قل ھو اللہ کیا ہر سورت کی تفسیر میں تم شہادت نامہ کو بلکہ ہزاروں واقعات کو ٹھونس سکتے ہو۔ پس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہود کا بھی یہی مذاق تھا جو آج کل کے ان واعظوں کا ہے۔ اس لئے انہوں نے عوام کو خوش کرنے کے لئے عجیب و غریب قصے گھڑ لیے تھے۔

ہاروت و ماروت

انہی میں سے ہاروت و ماروت و زہرہ کا قصہ بھی ہے جس کو آج کل بھی بہت لوگ صحیح سمجھتے ہیں کیونکہ بعض مفسرین نے یہ غضب کیا ہے کہ اس قصہ کو تفسیروں میں ٹھونس دیا ہے مگر محدثین نقاد نے اس کو موضوع کہا ہے۔ وہ قصہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ایک زمانہ میں بنی آدم کے اندر معاصی کی کثرت ہوئی تو فرشتوں نے طعن کیا کہ یہی وہ لوگ ہیں

جو خلیفۃ اللہ بنائے گئے ہیں کہ گناہ کر کے خدا تعالیٰ کو ناراض کرتے ہیں اور ہم خدا کی نافرمانی کبھی نہیں کرتے تو ہمیشہ اس کی اطاعت ہی کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ انسان میں جو شہوت کا مادہ رکھا گیا ہے اگر وہ تمہارے اندر پیدا کر دیا جائے تو تم بھی گناہ کرنے لگو گے۔ فرشتوں نے کہا کہ ہم ہرگز گناہ نہ کریں گے۔ بلکہ اس وقت بھی ہم اطاعت ہی کریں گے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اچھا تم اپنے میں سے دو فرشتوں کو منتخب کرو جو سب سے زیادہ عبادت گزار ہوں۔ چنانچہ ہاروت و ماروت کو منتخب کیا گیا۔ خدا تعالیٰ نے ان دونوں میں شہوت کا مادہ رکھ دیا اور زمین پر ان کو اتارا اور حکم دیا کہ انسانوں کے مقدمات کا فیصلہ کیا کرو اور خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا۔ نہ شراب پینا اور نہ زنا کرنا۔ نہ کسی آدمی کو ناحق قتل کرنا چنانچہ وہ دن بھر مقدمات کا فیصلہ کرتے اور شام کو اسم اعظم پڑھ کر آسمان پر چلے جاتے۔

اسی طرح ایک زمانہ گزر گیا۔ ایک دن ان کے پاس ایک عورت کا مقدمہ آیا جو کہ نہایت ہی حسین و جمیل تھی۔ یہ دونوں اس پر فریفتہ ہو گئے اور اس کے موافق فیصلہ کر دیا۔ پھر اس سے اپنی خواہش ظاہر کی۔ اس نے کہا ایک شرط سے میں راضی ہو سکتی ہوں یا تم شراب پیو، یا میرے شوہر کو قتل کر دیا اس بت کو سجدہ کرو جو تمہارے سامنے ہے یا مجھ کو وہ اسم اعظم بتلا دو جس سے تم آسمان پر جاتے ہو۔ اول تو انہوں نے انکار کیا مگر پھر نہ رہا گیا تو انہوں نے شراب پینے کو منظور کیا اور یہ سمجھا کہ یہ سب سے سہل گناہ ہے اس سے توبہ کر لیں گے۔

چنانچہ شراب پی کر اس سے زنا کیا اور اسی مدہوشی کی حالت میں شوہر کو بھی قتل کر دیا اور بت کو سجدہ بھی کیا اور بے خبری کی حالت میں اس عورت کو اسم اعظم بھی بتلا دیا۔ وہ عورت تو اسم اعظم پڑھ کر آسمان پر چلی گئی۔ خدا تعالیٰ نے اسے ستارہ کی صورت میں مسخ کر دیا چنانچہ زہرہ ستارہ وہی ہے۔

یہ دونوں فرشتے جب مستی سے ہوش میں آئے تو بڑے پریشان ہوئے۔ شام کو آسمان پر جانے لگے تو ان کو روک دیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ یا تو دنیا کا عذاب اختیار کر و یا آخرت کا۔ انہوں نے دنیا کے عذاب کو آسان سمجھ کر اختیار کیا۔ چنانچہ وہ دونوں بابل کے کنویں میں اوندھے منہ لٹکے ہوئے ہیں جہاں ان کو عذاب ہو رہا ہے اور یہ دونوں فرشتے سحر بھی تعلیم کرتے تھے جس کی تعلیم کا ان کو حکم ہوا تھا۔ یہ سحر انہی سے منقول چلا آتا ہے۔

اس قصہ کو سن کر وہ شخص جس کو حدیث سے ذرا بھی مس ہے۔ فوراً موضوع کہے گا۔ اس کا طرز بتلا رہا ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث نہیں ہو سکتی۔ یقیناً اسرائیلیات میں سے ہے۔ دوسرے شرعی حیثیت سے اس میں بہت سے اشکالات ہیں۔

ایک اشکال تو یہی ہے کہ فرشتے خدا تعالیٰ کے سامنے اس طرح گفتگو نہیں کر سکتے کہ حق تعالیٰ تو یہ فرمائیں کہ اگر تم میں شہوت پیدا کر دی جائے تو تم بھی انسانوں کی طرح گناہ کرنے لگو گے اور وہ خدا تعالیٰ کی بات کو رد کر دیں کہ نہیں ہم اس حال میں بھی گناہ نہیں کر سکتے۔ فرشتے ہرگز خدا کی بات کو رد نہیں کر سکتے۔

دوسرا اشکال یہ ہے کہ جس زنا کی وجہ سے یہ فرشتے معذب ہوئے وہ عورت کیوں نہ معذب ہوئی۔ وہ اسم اعظم پڑھ کر آسمان پر کیوں کر چلی گئی اور ایسی مقرب کیوں کر ہو گئی۔

اور بہت سے اشکالات ہیں جن کے بیان کی اس وقت گنجائش نہیں مگر بعض مفسرین نے تفاسیر میں اس واقعہ کو لکھ دیا ہے۔ اس لئے بہت لوگ اسے صحیح سمجھتے ہیں۔ اسی لئے ہر کتاب دیکھنے کے قابل نہیں ہوتی۔ کسی عالم کو تجویز کرو۔ اس کو کتاب دکھلا کر جب وہ کہہ دے کہ یہ دیکھنے کے قابل ہے اس کے بعد مطالعہ کرنا چاہیے اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ جن کتابوں میں یہ قصہ مذکور ہے، وہ معتبر کتابیں نہیں ہیں مگر یہ ضرور ہے کہ ہر معتبر کتاب کا ہر جز و معتبر نہیں ہوتا۔ یہ ممکن ہے کہ ایک کتاب معتبر ہو لیکن اس میں کوئی بات غیر معتبر بھی ہو۔ ایک دو مضمون کے غیر معتبر ہونے سے ساری کتاب کو غیر معتبر نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اس کا امتیاز عالم محقق ہی کر سکتا ہے کہ اس کتاب میں کون سی بات غیر معتبر ہے۔ غرض یہ قصہ محض غیر معتبر ہے۔

صرف ہاروت و ماروت کے قصہ کی مختصر حقیقت یہ ہے کہ ایک زمانہ میں دنیا میں بالخصوص بابل میں جادہ کا بہت چرچا ہو گیا تھا حتی کہ اس کے عجیب آثار دیکھ کر جہلاء کو انبیاء علیہم السلام کے معجزات میں اور سحر میں اشتباہ ہونے لگا۔ کیونکہ سحر سے بھی بعض باتیں خرق عادت کے طور پر ظاہر ہو سکتی ہیں۔ حالانکہ سحر اور معجزہ بھی کھلا فرق ہے۔

ایک فرق تو یہی ہے کہ سحر میں اسباب طبعیہ کو خفیہ دخل ہوتا ہے اور زیادہ تر اس کا مدار تخیل پر ہوتا ہے بخلاف معجزہ کے کہ اس میں اسباب طبعیہ کو ذرا بھی دخل نہیں ہوتا۔ محض حق تعالیٰ کے حکم کے بدون اسباب کے خلاف عادت امور ظاہر ہو جاتے ہیں۔

دوسرے صاحب معجزہ کے اخلاق وعادات واطوار واعمال میں اور ساحر کی حالت میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ نبی کی صحبت سے خدا تعالیٰ کی محبت ومعرفت اور آخرت کی رغبت، دنیا سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ ان کے پاس بیٹھنے سے دل میں نور پیدا ہوتا ہے اور ساحر کی صحبت میں اس کے خلاف اثر ہوتا ہے لیکن اس فرق کو وہی دریافت کر سکتا ہے جس کی طبیعت سلیم ہو عقل صحیح ہو عوام اس فرق کو نہیں سمجھ سکتے۔ ان کے لئے تو نبوت کی دلیل معجزہ ہوتا ہے۔ اور ظاہر میں معجزہ اور سحر دونوں یکساں نظر آتے تھے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے اس اشتباہ کو دور کرنے کیلئے بابل میں دو فرشتے ہاروت ماروت نام نازل کئے تا کہ وہ لوگوں کو سحر کی حقیقت پر مطلع کر دیں کہ اس میں فلاں فلاں اسباب کو دخل ہے اس لئے یہ منجانب اللہ ساحر کی مقبولیت کی دلیل نہیں۔ ان اسباب کے ذریعہ سے ہر شخص وہ کام کر سکتا ہے جو ساحر کے ہاتھ سے ظاہر ہوتے ہیں۔

اس پر شبہ نہ کیا جائے کہ سحر تو حرام وکفر ہے۔ اس کی تعلیم کے لئے فرشتے کیوں نازل کئے گئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سحر پر عمل کرنا حرام اور کفر ہے باقی اس کا جاننا اور بضرورت شرعی سیکھنا جب کہ اس پر عمل مطلق نہ ہو حرام نہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے سور اور کتے کا گوشت کھانا حرام ہے لیکن اس کے گوشت کی خاصیت معلوم کر لینا اور اس کو بیان کر دینا یہ حرام نہیں کیونکہ خاصیت جاننے اور بتلانے کو گوشت کھانا نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح شراب پینا حرام ہے لیکن اگر طبی کتاب میں شراب کی خاصیتیں لکھی ہوئی ہوں تو ان کو پڑھنا اور پڑھانا حرام نہیں کیونکہ اس کو شراب پینا نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح کلمات کفریہ کا عمداً زبان سے نکالنا کفر ہے لیکن اگر کوئی شخص کلمات کفریہ سے بچنے کیلئے ان کو جاننا چاہے کہ کن کلمات سے ایمان جاتا رہتا ہے تا کہ میں ان سے بچتا رہوں یہ کفر نہیں بلکہ جائز ہے۔

چنانچہ فقہا نے کتابوں میں کلمات کفر کے لئے مستقل باب منعقد کیا ہے جس میں ایسی باتوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جن سے ایمان جاتا رہتا ہے ان کے جاننے اور پڑھنے کو کوئی حرام نہیں کہتا کیونکہ نقل کفر کفر نہیں۔ اسی طرح فلسفہ کے مسائل بہت سے کفر میں داخل ہیں لیکن لوگوں کو اس کی حقیقت پر مطلع کرنے کے لئے فلسفہ کی تعلیم دی جاتی ہے اور ساتھ میں

اس کا رد بھی کر دیا جاتا ہے جس سے مقصود صرف یہی ہے۔ فلسفہ کی حقیقت اور اس کا بطلان معلوم کر لینے کے بعد کوئی شخص ان کے دلائل سے متاثر نہ ہو اور ضرورت کے وقت ان کے دلائل کا جواب دے سکے۔ پس یہ اشتباہ جاتا رہا کہ تعلیم سحر کا اہتمام کیوں کیا گیا۔

رہا یہ اشکال کہ پھر اس کی تعلیم کیلئے فرشتے کیوں نازل ہوئے انبیاء علیہم السلام سے یہ کام کیوں نہ لیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے انبیاء علیہم السلام ہدایات محضہ کے لئے مبعوث ہوتے ہیں اور تعلیم سحر میں یہ بھی احتمال ہوتا ہے کہ کوئی شخص اس کو سیکھنے کے بعد اسی میں مشغول و مبتلا ہو جائے تو اس طرح انبیاء علیہم السلام ضلالت و گمراہی کا سبب بعید بن جاتے جو ان کی شان ہدایت محضہ کے منافی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے ان کو ضلالت کا سبب بعید بنانا بھی گوارا نہیں کیا۔ بخلاف فرشتوں کے کہ ان سے تشریع اور تکوین دونوں قسم کے کام لئے جاتے ہیں۔ اور تکوین میں جس طرح وہ مسلمانوں کی پرورش کرتے ہیں اسی طرح کفار کی بھی کرتے ہیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ رحم کے اندر نطفہ کی پرورش کے لئے ملائکہ مقرر ہیں تو وہ مسلمان اور کافر ہر شخص کی صورت رحم میں بناتے ہیں اور نشو و نما میں دونوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ اسی طرح ہر شخص کے ساتھ کچھ فرشتے اس کی نگہبانی کے لئے مقرر ہیں جو خبیث جنوں سے اس کو بچاتے ہیں اور موذی جانوروں سے اس کی حفاظت کرتے ہیں، جب تک کہ اس کے مقدر میں حفاظت ہے۔ اسی طرح لڑائی میں دشمن کے حملہ سے انسان کو بچاتے ہیں خواہ وہ کافر ہو یا مسلمان۔ ایسے ہی نباتات کی نشو و نما کے لئے کچھ ملائکہ مقرر ہیں جو کافروں اور مسلمانوں کے کھیتوں اور باغات کی نشو و نما کرتے ہیں۔ غرض امور تکوینیہ میں مسلمان اور کافر دونوں برابر ہیں اور فرشتے دونوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ حالانکہ شرعاً کافر کی امداد و اعانت اس طریقہ سے جائز نہیں۔ مگر ہمارے واسطے جائز ہے کیونکہ ان کے سپرد کئے گئے ہیں۔ وہ اسی پر مامور ہیں۔ اور یہی شان ہوتی ہے اقطاب اہل خدمت کی کہ امور تکوینیہ ان کے بھی سپرد ہوتے ہیں جس کی وجہ سے بعض دفعہ وہ کسی کافر سلطنت کی حمایت کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسلامی سلطنت مغلوب اور کافر سلطنت غالب ہو جاتی ہے۔

مجذوب اور سالک کا فرق

مگر ایسے اقطاب مجذوبین ہوتے ہیں۔ سالک ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ سالک شریعت کا مطلف ہے اور شرعاً کفار کی حمایت واعانت مسلمانوں کے مقابلہ میں بالکل حرام ہے۔ اور مجذوبین مکلّف نہیں ہوتے مگر رتبہ میں اول سالکین ہی ہیں۔

مجذوبوں کی مثال ایسی ہے جیسے سپاہی اور کوتوال کہ ان کے سپرد شہر کا انتظام ہوتا ہے شہر کے تمام حالات کی ان کو اطلاع ہوتی رہتی ہے۔ اور سالک کی مثال ایسی ہے جیسے بادشاہ کا محبوب کہ اسے شہر کے حالات کی کچھ خبر نہیں ہوتی کہ کیا ہو رہا ہے۔ ہاں بادشاہ کا مزاج شناس اس درجہ ہوتا ہے کہ کوتوال کو اس کی ہوا بھی نہیں لگتی۔

سلطان محمود کو ایاز سے خاص محبت تھی حالانکہ اس کی معلومات سلطنت کے متعلق ہرگز وزیر کے برابر نہ تھیں بلکہ نظام سلطنت کے متعلق ہزاروں آدمی اس سے زیادہ باخبر تھے۔ اسی لئے لوگوں کو حیرت تھی کہ سلطان ایاز کو اتنا کیوں چاہتے ہیں۔ مگر ایاز میں ایک ایسی بات تھی کہ وزیر کو اس کی ہوا بھی نہ لگی تھی وہ یہ کہ سلطان کا مزاج شناس تھا۔ اگر اس سے شہر کے حالات دریافت کرو تو اسے کچھ بھی علم نہ تھا۔ لیکن محمود کا مزاج پوچھو تو اس سے زیادہ اس کا جاننے والا کوئی نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بعض اوقات ایاز ہی محمود سے بات کر سکتا تھا اور کسی کی مجال نہ ہوتی تھی۔

اسی طرح سالکین خدا تعالیٰ کے گونہ مزاج شناس ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کا طریقہ جانتے ہیں۔ قرب حاصل کرنے کا راستہ بتلا سکتے ہیں۔ اور اگر ان سے یہ پوچھو کہ فلاں مقدمہ میں کیا نتیجہ ہوگا فلاں واقعہ کس طرح ہوگا تو اس کا جواب ان کے پاس یہ ہوتا ہے۔

ماقصہ سکندر ودارا نہ خواندہ ایم ☆ از ما بجز حکایت مہر ووفا مپرس

(ہم نے سکندر ودارا کے قصے نہیں پڑھے، ہم سے محبت وعشق کی باتوں کے سوا اور نہ پوچھ)

نہ ان کے یہاں کشف ہے نہ وہ خوابوں کی تعبیر جانتے ہیں نہ وہ عملیات اور تعویذ گنڈے کا شغل رکھتے ہیں۔ وہ صرف رضائے خدا اور وصول الی اللہ کا طریقہ جانتے ہیں اور اس کی تعلیم وتبلیغ کے لئے وہ ہر وقت حاضر ہیں۔ اگر کوئی ان سے خواب کی تعبیر پوچھتا تو وہ یہ جواب دیتے ہیں۔

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم ☆ چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

(نہ شب ہوں نہ شب پرست جو خواب کی تعبیر کروں، چونکہ آفتاب کا غلام ہوں اس لئے بیداری کی باتیں کرتا ہوں یعنی محبوب حقیقی کا غلام ہوں اس کی باتیں کرتا ہوں)

یہی وجہ ہے کہ عوام ان سالکین کے کم معتقد ہوتے ہیں کیونکہ ان کے یہاں ظاہری سامان کچھ نہیں ہوتا۔ نہ کشف ہے نہ کرامت، نہ رات دن الہام کا تذکرہ نہ ہائے اور ہو، نہ شور وغل، اور مجذوبین کے یہاں یہ سامان بہت ہوتا ہے۔ ہاں سالکین کے پاس محبت ومعرفت الٰہی کا ایک مخفی خزانہ ہوتا ہے۔ جس کو اہل بصیرت دیکھ لیتے ہیں۔ عوام کی نظر وہاں تک کم پہنچتی ہے۔ اسی طرح کاملین کی کیفیات ممتاز نہیں ہوتیں بلکہ ان میں ایسی شیرینی ہوتی ہے جیسی فرینی میں کہ نہایت لطیف مٹھاس ہوتی ہے۔ جس کو اگر کوئی دیہاتی چکھے تو بالکل پھیکا بتائے۔ اور مجذوبین کی کیفیات میں ایسی شیرینی ہوتی ہے، جیسی گڑ میں کہ دیہات کے لوگ اسی کو میٹھا سمجھتے ہیں۔ مگر نازک مزاج لطیف الطبع لوگ اس کی ایک ڈلی بھی نہیں کھا سکتے۔

مجھے فیرینی پر ایک حکایت یاد آئی کہ دیوبند میں ایک رئیس کے ہاں تقریب تھی جس میں زردہ پلاؤ اور فیرینی پکائی گئی تھی۔ گاؤں سے ان کی رعیت کے چمار بھی آگئے تو ان کو بھی انہوں نے یہی کھانا دلوایا۔ گاؤں والوں کی سمجھ میں یہ لطیف کھانے کیوں آنے لگے تھے۔ پلاؤ زردہ کو تو بہت ہی ناک منہ چڑھا کر انہوں نے کھایا مگر جب فیرینی کا نمبر آیا تو ان سے نہ رہا گیا۔ آخر ایک بول ہی اٹھا، اپنے ساتھی سے پوچھنے لگا کہ یہ تھوک سا کے ہے؟ (کیا ہے؟)۔

دیکھئے اتنی لطیف چیز جو دل ودماغ کو تفریح دیتی چلی جائے مگر اس چمار نے یہ قدر کی اس کو تھوک سے تشبیہ دی۔ اسی طرح جو لوگ دیہاتی طبیعت کے ہوتے ہیں ان کو سالکین کی لطیف کیفیات کی قدر نہیں ہوتی۔ ان کو تو اسی کی قدر ہوتی ہے کہ ذرا پھاند کود ہو۔ ہو حق ہو، کشف وکرامت ہو، تب اس کو بزرگ سمجھتے ہیں۔

کاملین کے کمالات

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ایک شخص آیا اور دس برس تک رہا۔ دس برس کے بعد کہنے لگا حضرت میں اتنے عرصہ سے آپ کی خدمت میں ہوں مگر میں نے کوئی کرامت

نہیں دیکھی ۔ واقعی یہ شخص بھی کوئی بڑا ہی کوڑ مغز تھا جس کو اتنے عرصہ میں حضرت جنیدؒ کے کمالات نظر نہ آئے ورنہ ان کمالات کے سامنے کرامت کی کیا حقیقت تھی ۔ حضرت جنیدؒ کو جوش آ گیا ۔ فرمایا کہ اے شخص! اس دس برس کے عرصہ میں تو نے کوئی کام خلاف سنت جنیدؒ سے ہوتا ہوا دیکھا ہے ۔ اس نے عرض کیا کہ حضرت خلاف سنت تو میں نے کوئی کام آپ کا نہیں دیکھا ۔ فرمایا کہ پھر اس سے زیادہ تو جنیدؒ کی کرامت اور کیا چاہتا ہے کہ دس برس اس سے ایک کام بھی خلاف سنت صادر نہیں ہوا ۔ اس پر اس شخص کی آنکھیں کھل گئیں ۔

واقعی یہ کرامت اتنی بڑی ہے کہ حسی کرامتیں اس کی باندیاں ہیں ۔ اور حضرت جنیدؒ کے اس دعوے کی وجہ یہ ہے کہ اہل اللہ تحدث بالنعمۃ کے طور پر یا سالکین کی اصلاح کے لئے اپنے بعض کمالات بیان کر دیا کرتے ہیں تاکہ ان کو شیخ کی حالت معلوم کر کے اعتقاد زیادہ ہو کیونکہ اس طریق میں شیخ پر اعتماد اور اعتقاد نہایت ضروری ہے کامیابی اسی پر موقوف ہوتی ہے ۔

اس واقعہ سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ کاملین کے کمالات کس قدر غامض ہوتے ہیں کہ معمولی آدمی کی نظر وہاں تک نہیں پہنچتی اور حضرات انبیاء علیہم السلام کے کمالات سالکین سے بھی زیادہ غامض ہوتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ کفار انبیاء علیہم السلام کی نسبت یہی کہتے تھے کہ ہمارے میں اور ان میں کیا فرق ہے ۔ یہ بھی آدمی ہیں ، کھاتے پیتے ہیں ، بازاروں میں پھرتے ہیں ۔ ہم بھی ایسے ہی آدمی ہیں ۔ اور مجذوبین کو عوام اہل اسلام کے علاوہ کفار نے بھی بہت مانا ہے ۔ کیونکہ ان کی حالت دوسروں سے کھلم کھلا ممتاز ہوتی ہے ۔ پس سالکین کی شان انبیاء علیہم السلام کے مشابہ ہوتی ہے اور مجذوبین ملائکہ سے زیادہ مشابہت رکھتے ہیں ۔ اسی لئے ان کے سپرد تکوینی امور زیادہ ہوتے ہیں اور سالکین کے سپرد تشریعی انتظام ہوتا ہے ۔

غرض ملائکہ تکوین کے کام بھی بہت کرتے ہیں ۔ اس لئے تعلیم سحر کی خدمت انہی کے سپرد ہوئی ۔ کہ اگر اس میں وہ ضلالت کا سبب بعید بن جائیں تو ان کی شان کے خلاف نہ ہوگا ۔ وہ تو اس سے زیادہ کام کر لیتے ہیں ۔ چنانچہ بعض دفعہ وہ لڑائی کے موقعہ میں کفار کی حفاظت بھی کرتے ہیں جس کی وجہ سے مسلمانوں پر کفار کا غلبہ ہو جاتا ہے ۔ اور حضرات انبیاء علیہم السلام ضلالت کا سبب بعید بھی نہیں بن سکتے ۔ ان کی یہاں تک حفاظت کی گئی ہے

کہ شیطان کو نبی کے ساتھ تمثل پر قدرت نہیں دی گئی یعنی شیطان کسی نبی کی صورت میں ظاہر نہیں ہوسکتا۔ حالانکہ جنات کو مختلف اشکال پر تشکل کی قدرت ہے مگر نبی کی صورت کوئی نہیں بنا سکتا کیونکہ اس میں دین کا کام مختل ہو جاتا۔ اور بیداری میں تو کیا شیطان خواب میں بھی کسی کو نبی کی شکل میں نظر نہیں آ سکتا بلکہ یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ وہ کسی شکل میں ظاہر ہو کر یہ دعوے کرے کہ میں نبی ہوں ہاں یہ ممکن ہے کہ خواب میں کسی کو نظر آئے اور یہ دعویٰ کرے کہ میں خدا ہوں۔ کیونکہ حق تعالیٰ کی شان یہ ہے:

يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ

(ترجمہ: وہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے ہدایت عطا کرتا ہے)

وہ ہدایت بھی کرتے ہیں اور گمراہ بھی کرتے ہیں یعنی گمراہی بھی انہی کی پیدا کی ہوئی ہے گو اس سے وہ راضی نہیں ہیں مگر جب کوئی غلط راستہ چلنا چاہتا ہے تو گمراہی کی صفت اس میں پیدا کر دیتے ہیں اور اس میں کچھ اشکال نہیں کیونکہ گمراہی کا ارتکاب نقص ہے اس کا پیدا کرنا عیب نہیں ہے بلکہ یہ تو عین کمال ہے جس سے خالق کی قدرت کا پتہ چلتا ہے کہ وہ ہر قسم کی صورت بنانے پر قادر ہے۔ انسان گناہ کرتا ہے کفر کرتا ہے یہ اس کے لئے عیب ہے کیونکہ اس کی نافرمانی میں کوئی حکمت نہیں ہے۔ اور خدا تعالیٰ نے گناہ اور کفر جو پیدا کیا ہے اس میں کوئی نقص نہیں کیونکہ اس پیدا کرنے میں ہزاروں حکمتیں ہیں۔

چنانچہ ایک حکمت تو یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ گناہ اور کفر کو پیدا نہ فرماتے تو کوئی شخص ان کا ارتکاب نہ کر سکتا۔ بلکہ سب کے سب ایمان اور اعمال صالحہ پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس صورت میں مخلوق کا امتحان نہ ہوسکتا۔ پس افعال سیہ اور کفر کے پیدا کرنے میں ایک حکمت تو یہی ہے کہ اس میں مخلوق کا امتحان ہے کہ دیکھیں کون اپنے اختیار سے ایمان اور اعمال صالحہ کا ارتکاب کرتا ہے اور کون گناہ اور کفر کا اختیار کرتا ہے۔ انسان جس قسم کے افعال کا قصد کرتا ہے۔ حق تعالیٰ سب کو پیدا کر دیتے ہیں۔

اور ایک حکمت جس کو صوفیائے کرام سمجھے ہیں یہ ہے کہ اس سے اسماء کا ظہور ہوتا ہے۔ ایمان اور اعمال صالحہ سے اسم ہادی کا ظہور ہوتا ہے اور کفر و اعمال سیہ سے اسم مضل کا ظہور ہوتا ہے اور حق تعالیٰ کی یہ دونوں صفتیں ہیں ہادی بھی اور مضل بھی۔ اب تو آپ کی سمجھ میں

آ گیا کہ خالق کفر و خالق سیئات ہونا نقص نہیں۔

صاحبو! آفتاب کے لئے یہ کمال ہے کہ وہ چاند کو بھی روشنی دیتا ہے اور آئینہ کو بھی اور گھورے (گندگی کا ڈھیر۔ اروڑی) کو بھی اس کی روشنی پہنچتی ہے۔ لیکن گھورے کی بدبو اور نجاست آفتاب تک نہیں پہنچتی۔ وہ اسی طرح پاکیزہ اور شفاف ہے۔ ناپاکی خود اسی کی ذات تک رہتی ہے آفتاب تک اس کا اثر نہیں جاتا۔ اسی طرح خدا نے گناہ اور کفر کو بھی وجود دیا ہے لیکن ان کی نجاست کا وہاں کوئی اثر نہیں پہنچتا۔ اس کے لئے یہ بھی کمال ہے کہ اس نے جہاں ایمان اور اعمال صالحہ کو پیدا کیا ہے وہاں کفر اور اعمال سیئہ کو بھی پیدا کر دیا ہے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

کفر ہم نسبت بخالق حکمت ست   ور بما نسبت کنی کفر آفت ست

(کفر کی نسبت خالق سے حکمت ہے، ورنہ کفر کی نسبت میں متعدد آفتیں ہیں)

عارف شیرازی فرماتے ہیں

در کارخانۂ عشق از کفر ناگزیر است ☆ آتش کرا بسوزد گر بولہب نباشد

(دنیا میں تکوینی حکمت سے) کفر کا وجود بھی لازم ہے، اگر ابولہب نہ ہو تو دوزخ کی آگ کس کو جلائے گی)

مطلب یہ ہے کہ اگر ابولہب وغیرہ نہ ہوں تو صفت قہر کا ظہور کس پر ہوتا۔ اور کارخانہ عشق سے مراد دنیا ہے کیونکہ منشا اس عالم کے ظہور کا عشق ہی ہے۔ جس کی طرف اس جملہ میں اشارہ ہے۔

کنت کنزا مخفیا فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق لاعرف.

(الدر المنتشرہ)

بعض لوگ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ عشق میں کفر کرنا بھی بعض دفعہ ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے بعض لوگ خلاف شرع کلمات کفر زبان سے نکال دیتے ہیں۔ اور محرمات کا ارتکاب کر لیتے ہیں۔ سو یہ مطلب بالکل غلط ہے۔ اور جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں ان کو طریق سے ذرا بھی مس نہیں بلکہ اس کا صحیح مطلب وہی ہے جو میں نے بیان کیا کہ کارخانہ عشق سے عالم مراد ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ عالم چونکہ اسمائے الٰہیہ کے ظہور کا محل ہے اور خدا کی ایک صفت قہارہ مضل بھی ہے۔ اس لئے عالم میں کفر کا وجود بھی ضروری ہے ورنہ

ظہور اسماء کامل طور پر نہ ہوگا۔ یہ حکمت تو صوفیاء سمجھے۔

اور ایک حکمت علماء ظاہر نے سمجھی ہے وہ یہ کہ **الاشیآء تعرف باضدادھا** ہر چیز کی حقیقت اس کی ضد کے مطالعہ سے زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ پس دنیا میں کفر وغیرہ کو اس لئے پیدا کیا گیا کہ اس کے ذریعہ سے ایمان کی حقیقت کامل طور پر منکشف ہو جائے۔

دیکھیئے جس شخص نے اندھے کو نہ دیکھا ہو وہ سُوانکھے کی حقیقت کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا۔ اسی طرح اگر کسی نے ظلمت اور اندھیرے کو نہ دیکھا ہو اور روشنی کی قدر نہیں جان سکتا۔ یہ تو وہ حکمتیں ہیں جو عارفین اور علماء نے بیان کر دی ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی حکمتیں ہوں گی، جو حق تعالیٰ ہی کو معلوم ہیں۔ غرض اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ تکوینا کفر و معاصی کی بھی ضرورت ہے۔

سحر کے اثرات

اس عالم کو پس تکوینا تعلیم سحر میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اس لئے اس کام کے لئے فرشتوں کو بھیجا گیا۔ چنانچہ انہوں نے دنیا میں آ کر سحر کی حقیقت ظاہر کی اور صلحا نے ان سے تعلیم حاصل کر کے سحر کے اترے پترے کھول دیئے جس سے ساحروں کی ساری بزرگی خاک میں مل گئی اور لوگوں کو معجزات اور سحر میں جو اشتباہ پیدا ہو گیا تھا وہ رفع ہو گیا پھر وہ فرشتے غالباً آسمان ہی پر چلے گئے، نہ وہ کسی کنوئیں میں ہیں، نہ کھائی میں!

اب آیت کا ترجمہ سنیئے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ (البقرة:۱۰۱) (یعنی یہود ایسے (یہ حاصل ہے نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ) بے عقل ہیں کہ کتاب اللہ کا اتباع تو کرتے نہیں)۔ اور ایسی چیز کا اتباع انہوں نے کر لیا جس کا چرچا کیا کرتے تھے۔ خبیث جن (حضرت) سلیمان علیہ السلام کے زمانہ سلطنت میں (یعنی سحر کا اتباع کرتے ہیں جو کہ خبیث جنوں سے متوارث چلا آرہا ہے) اور (بعضے بے وقوف یہودی حضرت سلیمانؑ کو نعوذ باللہ ساحر کہتے ہیں۔ یہ بالکل لغو اور جھوٹی بات ہے کیونکہ سحر تو اعتقاداً یا عملاً کفر ہے) اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے (نعوذ باللہ کبھی) کفر نہیں کیا مگر وہاں خبیث جن بے شک کفر (کی باتیں اور کفر کا کام یعنی سحر) کیا کرتے تھے اور حالت یہ تھی کہ (خود تو کرتے ہی تھے مگر دوسرے) آدمیوں کو بھی سحر کی تعلیم کیا کرتے

تھے (چنانچہ انہی سے وارثۃً یہ سحر چلا آ رہا ہے۔ جس کا یہود اتباع کرتے ہیں) اور اسی طرح اس سحر کا بھی (اتباع کرتے ہیں) جو نازل کیا گیا تھا ان دو فرشتوں پر بابل میں جن کا نام ہاروت و ماروت تھا اور وہ دونوں (سحر کی) تعلیم کسی کو نہیں دیتے تھے جب تک (احتیاطاً) پہلے یہ نہ کہہ دیتے کہ ہمارا وجود بھی مخلوق کے لئے ایک امتحان (وآزمائش) ہے (کہ ہماری زبان سے سحر پر مطلع ہو کر کون اسی میں پھنستا ہے اور کون سے اس سے بچتا ہے) سو تو (اس پر مطلع ہو کر) کہیں کافر مت بن جائیو (کہ سحر میں پھنس جائے) سو (بعضے) لوگ ان دونوں (فرشتوں) سے اس قسم کا سحر سیکھ لیتے تھے جس کے ذریعہ سے مرد اور بی بی میں تفریق پیدا کر دیتے تھے۔ آگے مسلمانوں کو تسلی ہے کہ وہ ساحروں سے خوف نہ کریں کیونکہ یہ بات یقینی ہے کہ یہ ساحر لوگ سحر کے ذریعہ سے کسی کو (ذرہ برابر) بھی ضرر بدون خدا تعالیٰ کی مشیت کے نہیں پہنچا سکتے۔ تو تم کو خدا پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ اگر کسی پر سحر کا اثر ہو جائے تو وہ یہ سمجھے کہ میرے لئے خدا تعالیٰ کی یہی مشیت تھی۔ ساحر نے کچھ نہیں کیا۔ بلکہ یہ کلفت دوست نے پہنچائی ہے۔ اور ہر چہ از دوست میرسد نیکوست۔

اب میں مقصود پر آ گیا۔ اس وقت تک جس قدر بیان ہوا وہ تمہید تھی۔ مگر تمہید میں خلاف امید بہت طول ہو گیا (پھر دریافت فرمایا کہ وقت کیا ہے معلوم ہوا کہ گیارہ بجے ہیں۔ فرمایا کہ بہت دیر ہو گئی ۱۲ جامع) اب میں مقصود کو مختصر طور پر بیان کروں گا۔ تاکہ زیادہ دیر نہ ہو (اس پر چاروں طرف سے آواز آئی کہ حضرت مختصر نہ کیجئے۔ جب تک چاہیں بیان کرتے رہیں ۱۲ جامع فرمایا کہ) لیکن میرا مطلب مختصر کرنے سے یہ ہے کہ تمہید کی نسبت آئندہ بیان مختصر ہوگا یہ مطلب نہیں کہ فی نفسہ بھی مختصر ہوگا۔

آسماں نسبت بعرش آمد فرود ☆ گرچہ بس عالی ست پیش خاک تود

آسماں عرش و کرسی کے سامنے چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ باقی زمین سے تو پھر بھی بہت بڑا ہے۔

علم محمود

غرض میں یہ چاہتا ہوں کہ اس وقت یہ بیان ایک مدرسہ میں ہو رہا ہے جو کہ بیت العلم ہے۔ اسلئے ضروری ہے کہ علم کے متعلق ایک منضبط بحث بیان کر دوں تاکہ طلبہ کو اس سے فائدہ ہو۔ نیز علماء اور عوام نے علم کے متعلق جو کچھ غلطیاں کی ہیں ان کو واضح کر کے اصلاح کا طریقہ بتلا دوں۔ چنانچہ

اگلی آیتوں میں میرا مقصود صراحتہً مذکور ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔ ویتعلمون مایضرھم

اگرچہ یہاں یہود کی حالت کا بیان ہورہا ہے کہ وہ ایسی چیز کی تعلیم حاصل کرتے ہیں جو ان کو مضر ہے۔ لیکن یہ قاعدہ ہے کہ خصوص سبب سے حکم خاص نہیں ہوا کرتا عموم الفاظ کا اعتبار ہوتا ہے۔ اس لئے یہ حکم جو اس جگہ مذکور ہوا ہے عام ہے۔ وہ یہ کہ علم مضر کو حاصل نہ کرنا چاہیے اس سے معلوم ہوا کہ ہر علم محمود نہیں بلکہ بعضے مضر بھی ہیں جن کے سیکھنے پر اس آیت میں ملامت کی گئی ہے۔ پھر مضر کی دو قسمیں ہیں۔ بعضے بالذات مضر ہیں اور بعضے بالغیر۔ مضر بالذات وہ علوم ہیں جو اصل ہیں ممنوع اور ناجائز ہیں۔ کیونکہ ان کے مضامین خلاف شریعت ہیں جیسے سحر اور نجوم وغیرہ۔

شاید کسی کو یہ اشکال ہو کہ پہلے تو سحر کی تعلیم کو اور اس کے سیکھنے کو جائز کہا تھا اور اب ناجائز کہہ دیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اوپر سحر سیکھنے اور سکھانے کو جائز نہیں کہا تھا بلکہ اس کی حقیقت جاننے اور بتلانے کو جائز کہا تھا اور اس میں بھی یہ شرط ہے کہ ضرورت شرعیہ کی وجہ سے اس کی حقیقت کو معلوم کیا جائے تو اس وقت چونکہ سحر اور معجزہ میں اشتباہ ہونے لگا تھا۔ اس لئے اس کا جاننا اور بتلانا جائز تھا۔ وہ بھی ان لوگوں کے لئے جن کو اپنے نفس پر اعتماد ہو کہ وہ اس کو جان کر اس میں مبتلا نہ ہوں گے۔ اور اب اس کی حقیقت جاننے کی ضرورت نہیں رہی۔ نیز مفسدہ کا اندیشہ غالب ہے۔ اس لئے بھی اس سے منع کیا جائے گا۔ رہا سحر کی سحر کے طور پر اور مقصود کر کے سیکھنا اور سکھانا۔ اس کو میں نے جائز نہیں کہا تھا خوب سمجھ لو۔

اور مضر بالغیر وہ علوم ہیں جو فی نفسہٖ جائز ہیں مگر کسی عارض کی وجہ سے ان کو ممنوع کیا گیا ہے جیسے علم مناظرہ کہ فی نفسہٖ جائزہ ہے لیکن بعض لوگ اس طرز سے اس کی تعلیم دیتے ہیں جو کہ مضر فی الدین ہے۔ اس لئے اس طرز سے تعلیم و تعلم کو ممنوع کہا جائے گا۔

جیسے بعض جگہ طلباء کو مناظرہ کی تعلیم اس طرح دی جاتی ہے کہ ایک جماعت فرضی عیسائی بنتی ہے اور ایک مسلمان۔ پھر وہ جماعت جو عیسائیوں کی طرف سے وکالت کرتی ہے۔ وہ بالکل اسی طرح گفتگو کرتی ہے جیسے سچ مچ کوئی عیسائی بول رہا ہے۔ مثلاً وہ اپنی مقابل جماعت سے اس طرح خطاب کرتے ہیں کہ آپ کے قرآن میں یہ لکھا ہے اس سے ہماری تائید ہوتی ہے اور ہماری انجیل میں یہ مسئلہ اس طرح یہ بیان کیا ہے اور اس کی

دلیل یہ ہے کہ ایک مدرسہ کے مہتمم نے مجھے طلباء کا مناظرہ دکھلایا تھا۔ وہاں میں نے یہ طرز دیکھا واللہ ان طلبہ کی اس گفتگو سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جب وہ مناظرہ ختم ہو گیا۔ تو مہتمم صاحب کہنے لگے کہ اس میں کوئی بات قابل اصلاح ہو تو فرما دیجئے۔ میں نے کہا۔

تن ہمہ دل داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم (سارا بدن داغ داغ ہے کپاس کا پھویا کہاں کہاں رکھیں)

مناظرے کی خرابیاں

یہ تو سر سے پاؤں تک ہی بگڑا ہوا ہے میں کس بات کی اصلاح کروں سو اس طرز میں ایک ضرر تو یہی ہے کہ مسلمان سے عیسائی بن گئے دوسرے یہ کہ مناظرے میں ہر فریق کو اپنی بات کا اونچا رہنا اور دوسرے فریق کی بات کا نیچا رکھنا مدنظر ہوتا ہے۔ تو یہ صورت مطلقاً بھی اور خصوص ایسے طور پر نہایت سخت ہے کہ ایک فریق اسلام کی جانب کو کمزور کرنے کی کوشش کرے جس سے بعض دفعہ سلب ایمان کا اندیشہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ آج کل طبائع میں سلامتی نہیں ہے نیتیں درست نہیں ہیں پس ایسے لوگ بہت کم ہیں جو اس طرز میں نیت کو درست رکھ سکیں۔ ممکن ہے کہ کسی وقت کوئی شخص محض اپنی بات کی پیچ کرنے لگے اور نفسانیت کی وجہ سے اسلام کی جانب کو کمزور کرنے لگے تاکہ سننے والے یہ کہیں کہ فلاں شخص نے بڑی زوردار تقریر کی اور اس کا انجام جو کچھ ہے ظاہر ہے۔

تیسرے یہ غضب ہے کہ اس قسم کے مناظرہ میں بعض دفعہ عوام بھی شریک ہو جاتے ہیں جس میں بڑا اندیشہ یہ ہے کہ کسی شخص کے ذہن میں فریق باطل کے دلائل بیٹھ جائیں اور اہل حق کی طرف سے جو اس کا جواب بیان کیا جائے وہ اس کی سمجھ میں نہ آوے یا جس طالب علم نے اہل سلام کی طرف سے جواب دیا ہے۔ اس کی تقریر اچھی نہ ہو تو اس عامی شخص کا ایمان اس صورت میں برباد ہو جائے گا۔ اس لئے میرے نزدیک یہ طرز بالکل قابل ترک ہے بلکہ میرے نزدیک تو مناظرہ کے لئے تعلیم و تعلیم کی ضرورت نہیں۔ فطرت سلیم ہو تو انسان ہر باطل مذہب کا رد بہت آسانی سے کر سکتا ہے۔

الہ آباد میں ایک رئیس تھے بالکل ان پڑھ جو اپنے دستخط بھی نہ کر سکتے تھے بس ایک مہر بنوالی تھی۔ جب دستخط کرنا چاہتے ہو مہر کر دیتے تھے۔ ایک دفعہ دو سواری پر سوار ہو کر جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک عیسائی کھڑا ہوا اپنے مذہب کی حقانیت بیان کر رہا تھا۔ اپنے حق پر ہونے کی ایک

دلیل اس نے بھی بیان کی کہ دنیا میں عیسائی سب سے زیادہ ہیں۔ انجیل کے ترجمے بہت زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اللہ کے نزدیک ہم زیادہ مقبول ہیں۔ جو ان کی اس قدر کثرت اور ترقی ہے۔ ان رئیس صاحب نے اپنی سواری روک کر پادری سے کہا کہ یہ تو کوئی دلیل حقانیت کی نہیں۔ آؤ ہم تم کو سٹیشن پر چل کر دکھائے دیتے ہیں کہ ریل گاڑی میں فسٹ کلاس کا درجہ ایک ہی ہوتا ہے اور تھرڈ کلاس بہت ہوتے ہیں۔ پس ہم مسلمان فسٹ کلاس ہیں اور تم عیسائی لوگ تھرڈ کلاس ہو۔ یہ جواب سن کر پادری مبہوت ہو گیا اور اس سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔

تو دیکھئے ایک ان پڑھ آدمی نے پادری کو خاموش کر دیا۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ مناظرہ کے لئے سیکھنے اور سکھانے کی ضرورت نہیں البتہ طبیعت سلیم ہونی چاہیے۔ پھر ہر اعتراض کا جواب دے لینا آسان ہے۔ پھر آج کل جس طرح مناظرہ کیا جاتا ہے سلف کا یہ طریقہ نہ تھا۔ قرآن میں جابجا کفار سے مناظرہ کیا گیا ہے مگر اس کا عجیب طرز ہے آج کل کی طرح تو تو میں میں نہیں ہے احادیث میں حضرات صحابہ کے مناظرے مذکور ہیں۔ ان کا طرز یہ تھا کہ ایک شخص اپنی بات کو بار بار دہرائے جاتا تھا۔ آخر دونوں میں سے ایک کہہ دیتا تھا کہ بس مجھے انشرح ہو گیا۔ اور میری سمجھ میں آگیا۔ دلائل اور رد وقدح زیادہ نہ ہوتے تھے اور یہی طرز قرآن کا ہے۔

آج کل کے مناظرہ میں ایک ضرر یہ بھی ہے کہ یہ لوگ مخالف کے جواب میں انبیاء کی توہین کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ ایک مناظرہ میں عیسائی نے یہ کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسلمانوں کے رسول (سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم) زیادہ زاہد تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے ایک بھی نکاح نہیں کیا۔ ساری عمر زہد کی حالت میں گزار دی۔ اور مسلمانوں کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چھوڑ نو شادیاں کیں۔ تو اس کے جواب میں ایک صاحب کیا فرماتے ہیں کہ پہلے یہ تو ثابت کر دو عیسیٰ علیہ السلام میں قوت رجولیت بھی تھی۔ لیجئے صحیح جواب کو چھوڑ کر ان حضرت نے ایسا جواب دیا جس میں نعوذ باللہ عیسیٰ علیہ السلام پر نامردی کا عیب لگا جاتا ہے۔ حالانکہ انبیاء علیہم السلام جس طرح باطنی کمالات کے جامع ہوتے ہیں اسی طرح ظاہری کمالات بھی ان میں کامل طور پر موجود ہوتے ہیں۔ ان کے قوی بشریہ بھی دوسروں سے زیادہ ہوتے ہیں۔

صحیح جواب یہ تھا کہ زاہد ہونا نکاح نہ کرنے پر موقوف نہیں ورنہ لازم آئے گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سوا جتنے پیغمبر ہیں وہ سب زاہد نہ تھے۔ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام

وابراہیم علیہ السلام اور داؤد علیہ السلام وسلیمان علیہ السلام سب کے سب صاحب اہل وعیال تھے بلکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے تو تین سو اور بعض روایات کے موافق ہزار بیبیاں تھیں۔

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ زہد کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ تعلقات سے یک سو ہو کر زاہد بنے۔ دوسرے یہ کہ تعلقات میں مشغول ہو کر زاہد رہے کہ بی بی اور بچے اور گھر بار سب کچھ ہو مگر دل کسی چیز میں نہ لگا ہوا ہو۔ بلکہ دل میں خدا ہی کے ساتھ لگاؤ ہو۔ دوسروں سے محض حقوق ادا کرنے کے واسطے تعلق ہو۔ سو عیسیٰ علیہ السلام کا زاہد پہلی قسم کا تھا اور دوسرے انبیاء میں دوسرے قسم کا زہد تھا۔ آج کل یہ مرض بہت پھیل گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ جس سے دوسرے انبیاء کی توہین ہو جاتی ہے۔

چنانچہ ایک سیرت نبویہ اس زمانہ میں بہت شائع ہو رہی ہے اور لوگ اس پر بہت فریفتہ ہیں۔ لیکن اس کی حالت یہ ہے کہ ایک جگہ رسول اللہ کے فضائل بیان کرتے ہوئے اس میں لکھا ہے کہ حضورؐ میں جو کمالات تھے وہ کسی نبی میں نہ تھے۔ چنانچہ نوح علیہ السلام میں شفقت ورحمت کا مادہ نہ تھا کیونکہ انہوں نے یہ دعا کی تھی۔

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا (سورہ نوح آیت نمبر ۲۶)

(ترجمہ: اے میرے پروردگار کافروں میں سے زمین پر ایک باشندہ بھی مت چھوڑ)

اور عیسیٰ علیہ السلام میں تمدن وسلطنت کا سلیقہ نہ تھا۔ استغفر اللہ دیکھئے! اس ظالم نے نوح علیہ السلام کو شفقت ورحمت سے اور عیسیٰ علیہ السلام کو تمدن وسلطنت کے سلیقہ سے خالی بتا دیا۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ نوح علیہ السلام کی دعوت کا حال جو سورۂ نوح مذکور ہے وہی ان کی شفقت ورحمت ثابت کرنے کیلئے کافی ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَهَارًا ۝ فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْٓ اِلَّا فِرَارًا ۝ (نوح: ۵-۶)

نوح علیہ السلام نے عرض کیا اے میرے پروردگار! میں نے اپنی قوم کو (دین حق کی طرف) رات کو بھی بلایا اور دن کو بھی۔ سو میرے بلانے پر وہ اور زیادہ بھاگتے رہے۔ آگے ارشاد ہے:

ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝ ثُمَّ اِنِّیْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۝ (نوح: ۸-۹)

یعنی پھر (بھی میں ان کو مختلف طریقوں سے نصیحت کرتا رہا چنانچہ) میں نے ان کو باواز بلند (حق کی طرف) بلایا (اس سے مراد خطاب عام ہے۔ وعظ کے طور پر) پھر میں

نے ان کو (خطاب خاص کے طور پر) علانیہ بھی سمجھایا اور بالکل خفیہ بھی سمجھایا (غرض جتنے طریقوں سے نفع کی امید ہو سکتی تھی سب ہی طرح سمجھایا)۔

تو اگر نوح علیہ السلام میں شفقت ورحمت نہ ہوتی تو اس کاوش کی انہیں کون سی ضرورت تھی۔ پھر یہ طرز کوئی ایک دو دن یا ایک دو مہینے تک نہیں رہا بلکہ ساڑھے نو سو برس تک اسی طرح سمجھاتے رہے اور قوم کی سرکشی کی یہ حالت تھی کہ اس عرصہ میں غالباً صرف اسّی (۸۰) آدمی ایمان لائے باقی سب اسی حالت پر رہے اور طرح طرح سے نوح علیہ السلام کو ستاتے رہے مگر وہ اس پر بھی مایوس نہ ہوئے۔ برابر دعوت کرتے رہے۔ حتیٰ کہ جب خود اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ سے ان کو اطلاع دی کہ اب کوئی ایمان نہ لائے گا۔ تب وہ مایوس ہوئے۔ جیسا کہ اس آیت میں ذکر ہے۔

وَاُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ

اور نوح علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی گئی کہ آپ کی قوم میں سے جتنے لوگ ایمان لا چکے ہیں ان کے سوا اب اور کوئی ہرگز ایمان نہ لائے گا۔ پس ان باتوں پر رنج نہ کیجئے جو وہ کیا کرتے تھے جب وحی سے ان کو معلوم ہوگیا کہ اب کسی کی قسمت میں ایمان نہیں ہے تب انہوں نے کفار کی ہلاکت کے لئے بددعا کی جس کی حکمت کو خود بھی انہوں نے ظاہر کر دیا ہے۔

اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ یُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا یَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا (سورہ نوح: ۲۷)

اگر (اب) آپ ان کو روئے زمین پر رہنے دیں گے تو یہ لوگ آپ کے بندوں کو گمراہ کریں گے اور (آگے بھی) ان کے محض فاجر اور کافر ہی اولاد پیدا ہوگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ نوح علیہ السلام کو وحی وغیرہ سے اس کی خبر بھی ہوگئی تھی کہ اگر یہ لوگ زندہ رہے تو ان کی اولاد میں بھی کوئی مسلمان نہ ہوگا۔

اب بتلایئے ایسی حالت میں ان کی بددعا خلاف شفقت کیوں کر تھی بلکہ یہ تو مسلمان کے حق میں عین رحمت تھی۔ ورنہ اگر وہ زندہ رہتے اور ان کی اولاد بھی کافر ہوتی تو دنیا میں مسلمانوں کا جینا محال ہو جاتا۔ پھر نوح علیہ السلام سے حق تعالیٰ نے یہ بھی فرما دیا تھا۔

وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ (سورہ ھود)

کہ ان ظالموں کی بابت تم مجھ سے (شفاعت کے طور پر) کچھ مت کہنا کیونکہ یہ سب غرق کئے جائیں گے۔ اس سے خود معلوم ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام میں شفقت و رحمت بہت زیادہ تھی۔ کہ اگر ان کو ممانعت نہ کی جاتی تو وہ شفاعت وغیرہ کرتے۔ چنانچہ اپنے لڑکے کے بارہ میں ان کو کچھ کہنے کا موقع مل گیا تو انہوں عرض کر ہی دیا کہ اے پروردگار آپ کا وعدہ تھا کہ تیرے اہل وعیال کو نجات دوں گا اور میرا لڑکا بھی تو میرے اہل وعیال میں داخل ہے وہ کیوں ہلاک ہو گیا وہاں سے ارشاد ہوا کہ وہ آپ کے اہل میں داخل نہیں کیونکہ اس کے اعمال اچھے نہ تھے۔

اور عیسیٰ علیہ السلام کی بابت حدیث میں آتا ہے کہ وہ آخر زمانہ میں نازل ہوں گے اور مسلمانوں کی سلطنت کا انتظام فرمادیں گے اور جزیہ کو موقوف کردیں گے۔ اگر ان میں سلیقہ سلطنت نہیں تو وہ آخر زمانہ میں جب کہ مسلمانوں کی سلطنت نہایت کمزور ہوگی اس کا انتظام کیسے کرلیں گے۔

الغرض انبیاء علیہم السلام میں تمام کمالات مجتمع ہوتے ہیں یہ اور بات ہے کہ ایک جوہر سے کسی وقت وہ کام نہ لیں لیکن کسی کمال سے ان کو خالی بتا دینا یہ سخت غلطی ہے حق تعالیٰ جس صفت سے کام لینے کا ان کو حکم فرماتے ہیں اس سے کام لیتے ہیں اور جس صفت سے جس وقت کام لینے کا حکم نہیں ہوتا اس سے کام نہیں لیتے۔ ان کی حالت یہ ہوتی ہے۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو ☆ دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(اگر آپ زندہ کریں تو یہ آپ کی عطا کریں اور اگر قتل کریں تو میں آپ پر فدا ہوں، میں دل سے آپ کا محب ہوں آپ جو کچھ کریں میں آپ سے خوش ہوں)

مولانا فرماتے ہیں۔

گر بعلم آئیم ما ایوان اوست ☆ وز بجہل آئیم ما زندان اوست
گر بخواب آئیم مستان وئیم ☆ ور بہ بیداری بدستان وئیم
من چو کلکم درمیان اصبعین ☆ نیستم در صفت طاعت بین بین
بنگر اے دل گر تو اجلال کیستی ☆ درمیان اصبعین کیستی!
رشتہ در گردنم افگندہ دوست ☆ می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

(اگر علم تک ہماری رسائی ہو جائے یہ ان کا ایوان ہے کہ تصرف حق سے علم کا درجہ حاصل ہوا

اور جہل میں مبتلا رہیں تو ان کا زندان ہے کہ حق تعالیٰ کا تصرف ہے کہ مجلس جہل سے نہیں نکلے، اگر سو رہیں تو انہی کے بے ہوش کیے ہوئے ہیں، اگر جاگ اٹھیں تب بھی ان انہی کی گفتگو میں ہیں، یعنی قوت بیانیہ بھی ان ہی کی عطا کی ہوئی ہے، میں قلم کی طرح انگلیوں میں ہوں صف طاعت میں بین بین نہیں ہوں، اے دل غور کر اگر تو اجلا نہیں ہے تو درمیان انگلیوں کے کیوں ہے، محبوب حقیقی نے یہ حرکات پیدا کر دیئے ہیں جس طرف چاہتے ہیں متحرک کر دیتے ہیں)

انبیاء علیہم السلام بدون حکم کے کچھ نہیں کرتے جس کو جو حکم ہوتا ہے وہی بجالاتے ہیں۔ اسی لئے ان کی شانیں مختلف ہوتی ہیں۔ مگر ہر شان محبوب ہے کیونکہ محبوب کی رضا کے موافق ہے۔ ایک عارف فرماتے ہیں۔

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خنداں است ☆ بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالاں است

(گل سے کیا کہہ دیا کہ خنداں ہو رہا ہے اور بلبل سے کیا فرما دیا کہ نالاں ہے)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل ہم کو وہی بیان کرنے چاہئیں جو احادیث میں مذکور ہیں۔ وہ کیا کچھ کم فضائل ہیں اور یہاں سے اس کی حکمت معلوم ہوتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فضائل خود کیوں بیان فرمائے وجہ یہ ہے کہ اگر خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیان نہ فرماتے تو امت اپنی طرف سے گھڑ گھڑ کر کمالات بیان کرتی۔ کیونکہ محبت واعتقاد اس پر مجبور کیا کرتا ہے کہ محبوب کے فضائل بیان کیے جائیں۔ اور ہمارے بیان کردہ فضائل میں یہ اندیشہ غالب تھا کہ دوسرے انبیاء کی تحقیر وتوہین لازم آجائے گا جیسا کہ مشاہدہ ہو رہا ہے۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سچے اور واقعی کمالات خود ہی بیان فرما دیئے تا کہ اگر کسی کو محبت وعشق کے غلبہ میں آپ کے فضائل بیان کرنے کا شوق ہو وہ ان صحیح فضائل کو بیان کر کے اپنا شوق پورا کرے اور ان فضائل کے بیان کرنے میں کسی نبی کی توہین کا شائبہ بھی نہیں۔

الغرض آج کل مناظرہ کی تعلیم جس طرز سے کی جاتی ہے وہ قابل ترک ہے چنانچہ اس شخص مذکور نے عیسیٰ علیہ السلام کو معاذ اللہ نامرد بتانا چاہا۔ یہ تو مہذب لوگوں کا مناظرہ ہے۔ اور گنواروں کا مناظرہ اس سے بھی زیادہ سخت ہوتا ہے۔

روڑی کی میں ایک عیسائی بیان کر رہا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں۔ ایک گنوار نے کہا کہ خدا کے اور بھی کوئی بیٹا ہے یا نہیں۔ پادری نے کہا نہیں۔ گنوار نے کہا، بس

تیرے خدا کے اتنے زمانہ میں ایک ہی بیٹا ہوا؟ میرے نکاح کو اتنا عرصہ ہوا ہے۔ اس وقت میرے گیارہ بیٹے ہیں اور بھی ہوں گے۔ تو تیرے خدا سے تو میں ہی اچھا رہا!

اس گنوار کا جواب اگرچہ فی نفسہٖ ایک معقول بات تھی۔ واقعی اگر خدا کے لئے بیٹا ہو ناممکن ہے تو پھر اس کی کیا وجہ کہ اس کے ایک ہی بیٹا ہو۔ حالانکہ اس کی مخلوق میں ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کے بہت اولاد ہوتی ہے لیکن طرز نہایت بیہودہ ہے۔ غرض جو علوم مضر ہوں ان کا سیکھنا حرام ہے۔ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے۔

مضر و نافع علوم

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب بعض علوم مضر ہیں تو کوئی نافع بھی ضرور ہے۔ تو اس سے دو حکم معلوم ہوئے۔ ایک یہ کہ علم مضر سے بچنا چاہئے۔ دوسرے یہ کہ علوم نافع کو سیکھنا چاہئے۔ رہا یہ کہ مضر کون ہے اور نافع کون ہے۔ اس کی تعیین خود اسی آیت میں موجود ہے۔

وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ اس سے معلوم ہوا کہ علم مضر وہ ہے جو آخرت میں کام نہ آوے تو اس کے مقابلہ میں نافع وہ ہوا جو آخرت میں کام آوے اور ان دونوں کے مجموعہ سے دو غلطیاں معلوم ہوئیں۔ ایک علماء کی ایک عوام کی۔ علماء کی غلطی تو یہ ہے کہ ان میں سے بعضے ساری عمر علوم غیر نافع ہی میں صرف کر دیتے ہیں یعنی صرف معقول ہی پڑھتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ معقول آخرت میں کام آنے والی نہیں البتہ اگر علم دین کے ساتھ معقول کو اس غرض سے پڑھا جاوے کہ اس سے فہم واستدلال میں سہولیت ہو جاتی ہے تو اس وقت اس کا وہی حکم ہے جو نحو صرف بلاغت وغیرہ کا حکم ہے کہ یہ سب علوم آلیہ ہیں۔ اگر ان سے علم دین میں مدد لی جائے تو تبعاً ان سے بھی ثواب مل جاتا ہے لیکن ساری عمر علوم آلیہ ہی میں گنوانا یہ سراسر حماقت ہے۔ اسکی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص ساری عمر ہتھیار کی درستی اور صفائی میں گزار دے اور ان سے کام ایک دن بھی نہ لے تو ہر شخص اس کو بیوقوف بتلائے گا۔

اور بعضے صرف معقول تو نہیں پڑھتے مگر علوم دینیہ پر اس کی تقدیم کرتے ہیں۔ یہ بھی غلطی ہے۔ اس میں ایک ضرر تو یہ ہے کہ اگر اس حالت میں موت آ گئی تو معقولیوں ہی میں اس کا حشر ہوگا۔ دوسرا ضرر یہ ہے کہ اس شخص کی عقل پر معقول رچ جاتی ہے۔ پھر یہ حدیث و قرآن کو معقول ہی کے طرز پر سمجھنا چاہتا ہے اور ہر جگہ اسی کو چلاتا ہے اس لیے حدیث و

www.alhaq.org

قرآن کا اثر اس کی طبیعت پر نہیں جمتا۔

گنگوہ میں حضرت مولانا قدس سرہ کے پاس ایک معقولی طالب علم حدیث پڑھنے آئے۔ ایک دن سبق میں یہ حدیث آئی۔

لا یقبل اللہ صلوٰۃ بغیر طہور ولا صدقۃ من غلول (سنن النسائی :١:٨٧)

یعنی نماز بدون طہارت (اور وضو) کے قبول نہیں ہوتی الخ۔ مولانا نے فرمایا کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ وضو کے بغیر نماز فاسد ہے معقولی صاحب نے اعتراض کیا کہ اس سے تو قبول نہ ہونا معلوم ہوتا ہے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ بغیر وضو کے نماز صحیح بھی نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ صحت تو بدون وضو کے بھی ہو جاتی ہو لیکن قبول بدون وضو کے نہ ہو۔ پس اگر کوئی بدون وضو کے نماز پڑھ لے پھر وضو کر لے تو احتمال ہے کہ اب قبول بھی ہو جاوے۔ اس پر سب کو ہنسی آ گئی سو معقول پہلے پڑھنے کا یہ ضرر رہتا ہے کہ حدیث کا ذوق اس شخص کو حاصل نہیں ہوتا۔

نماز کے بعد وضو کر لینے پر مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ ایک افیونی کا لوٹا کچھ ٹوٹا ہوا تھا۔ جب وہ پاخانہ جاتا اور وہاں دیر لگتی جیسا کہ افیونیوں کی عادت ہے کہ پاخانہ میں جا کر بہت دیر لگاتے ہیں۔ اس عرصہ میں لوٹا بالکل خالی ہو جاتا۔ ایک دن افیونی صاحب نے کہا کہ آج میں تیرا علاج کروں گا تو روز خالی ہو جاتا ہے۔ آپ نے کیا کیا کہ پاخانہ میں جا کر پہلے آب دست کر لی اور اپنے جی میں بڑے خوش ہوئے کہ ہم نے خوب تدبیر کی کہ لوٹا خالی نہ ہو سکا مگر اس کو خبر نہ ہو سکی کہ جس غرض سے پانی لائے تھے اس کا کہیں پتہ ہی نہیں۔ غرض وہ روز یہی حرکت کرتا کہ پہلے آب دست لیتا پھر پاخانہ پھرتا۔

مولانا محمد یعقوبؒ بڑے ظریف تھے۔ میں نے کہہ دیا کہ یہ بڑا بے وقوف تھا اول آب دست کرتا تھا پھر پائخانہ پھرتا۔ فرمایا نہیں تم سمجھے نہیں وہ آب دست گزشتہ دن کی پائخانہ کی کرتا تھا تو آبدست مؤخر ہی ہوئی البتہ صرف اول دن کی آب دست بیکار رہوئی۔ خیر یہ تو ایک لطیفہ تھا تو ان معقولی صاحب کا وضو بھی اسی کے مشابہ تھا۔

ان ہی طالب علم صاحب نے ایک اور اعتراض کیا تھا۔ حدیث میں آتا ہے کہ جنت میں ہر شخص اپنے اپنے درجہ میں خوش رہے گا۔ ادنی درجہ والوں کو بڑے مرتبہ کے لوگوں کو دیکھ کر رنج نہ ہوگا کیونکہ جنت میں رنج و غم کا نام بھی نہیں۔ ہر شخص اپنی حالت کو دوسرے سے اچھی سمجھے گا۔ وہ

معقولی صاحب بولے کہ اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ سب جنتی جہل مرکب میں مبتلا ہوں گے۔

غرض ان کو حدیث میں بھی وہی معقولی اصطلاحیں یاد آتی تھیں جہل مرکب اور جہل بسیط ہی میں رہے۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اپنی حالت پر خوش رہنا اور چیز ہے اور حالت کا نہ جاننا اور چیز ہے۔ ایک دوسرے کو مستلزم نہیں۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم یہ جانتے ہوں کہ ہمارا درجہ فلاں شخص سے کم ہے مگر پھر بھی ہم اپنی حالت پر خوش ہوں اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص کو ماش کی دال ایسی مرغوب ہے کہ مرغ کا گوشت بھی اس کے آگے پسند نہیں آتا۔ ہر ایک کی اپنی اپنی رغبت اور پسند ہے۔ اس صورت میں یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ شخص ماش کی دال ہی میں ایسا خوش ہے جیسا کہ دوسرا شخص مرغ کے گوشت میں۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کو دال اور گوشت میں فرق بھی نہ معلوم ہو دونوں میں فرق ہر ایک جانتا ہے۔ اسی طرح جنت میں ادنیٰ درجہ والوں کو اپنا درجہ ہی پسند ہوگا۔ وہ اسی میں خوش و خرم ہوں گے اگرچہ وہ یہ بھی جانیں گے کہ ہمارا درجہ فلاں شخص سے کم ہے۔ پس جہل مرکب ہونا کیوں کر لازم آیا۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ معقول کا علوم دینیہ پر مقدم کرنا مضر ہے۔

علماء کی غلطی

مگر بعض لوگ معقول کے ایسے فریفتہ ہوتے ہیں کہ پہلے اسی کو پڑھتے ہیں۔ بلکہ بعضے تو حدیث وغیرہ کے پڑھنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ حدیث کے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس میں کون سی مشکل بات ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ حدیث پڑھ لینے کے بعد بھی اگر سمجھ میں آجائے تو بسا غنیمت ہے اور بدون پڑھے ہوئے تو سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی۔

چنانچہ ایک معقولی صاحب کی حکایت ہے کہ انہوں نے حدیث پڑھی نہ تھی مگر پڑھانے کو تیار ہو گئے۔ ایک حدیث میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا قصہ آیا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بغیر اطلاع کئے نکاح کر لیا تھا۔ جب وہ شادی سے اگلے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان پر زردی کا اثر دیکھا۔ یہ دلہن کے زعفرانی کپڑوں کا نشان لگ گیا تھا۔ فرمایا مهيم هذه الصفرة ۔ (سنن أبي داؤد) انہوں نے کہا، تزوجت يارسول الله یعنی میں نے شادی کر لی ہے۔ آپ نے فرمایا اولم ولو بشاة (الصحيح للبخاری :۱:۱۳،۵) ولیمہ کرو اگرچہ ایک ہی بکری

کا ولیمہ ہو یہ تو حدیث تھی۔ کسی طالب علم نے سوال کیا کہ یہ زردی کیسی تھی؟

مدرس صاحب نے حدیث پڑھی تو تھی نہیں جو اس کی حقیقت سمجھتے۔ آپ نے اجتہاد کیا کہنے لگے کہ بات یہ ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوف جوان آدمی تھے۔ ایک زمانہ سے رکے ہوئے تھے۔ جب شادی ہوئی انہوں نے مقاربت میں کثرت کی اس لئے چہرہ پر زردی آگئی۔ ظالم نے کیا حدیث کا ناس مارا ہے۔ آپ نے رای علیہ اثر الصفرۃ کے یہ معنی سمجھے کہ چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ **لاحول ولاقوۃ!**

طالب علم بے چارہ یہ جواب سن کر خاموش ہو گیا۔ مگر اس کے دل کو یہ بات نہ لگی۔ اس نے ایک دوسرے عالم سے اس کا مطلب پوچھا انہوں نے صحیح مطلب بیان کر دیا کہ شادی کے دن دلہن کے کپڑوں کو خوشبو اور عطر لگایا جاتا ہے۔ عرب میں جو خوشبو اس وقت استعمال کی جاتی تھی اس میں زعفران وغیرہ پڑتی تھی۔ دلہن کے پاس جانے سے وہ رنگ عبدالرحمٰن بن عوف کے کپڑوں پر بھی لگ گیا چونکہ اس خوشبو کا استعمال مرد نہیں کرتے تھے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہو گیا کہ یہ رنگ دلہن کی خوشبو کا ہے۔ اس حقیقت کے معلوم ہو جانے پر طالب علم کا اطمینان ہو گیا۔

تو صاحبو! یہ فرق ہوتا ہے حدیث پڑھنے والے اور نہ پڑھنے والے میں حدیث میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا سمجھنا واقعات کے جاننے پر موقوف ہوتا ہے۔ ان میں معقول کچھ کام نہیں دے سکتی۔ اور اگر ان میں صرف عقل سے کام لیا جائے تو بس ایسے ہی مطلب بیان کئے جائیں گے جیسا کہ ان حضرت نے رای علیہ اثر الصفرۃ کا مطلب بیان کیا تھا۔ پس معقول کو علوم دینیہ کے بعد پڑھنا چاہیے ورنہ وہی عقل پرچ جائے گی اور حدیث میں وہی معقولی اشکالات جاری ہوں گے۔

ایک دفعہ میں بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ ایک معقولی صاحب پوچھنے لگے کیا لکھ رہے ہو؟ میں نے کہا کہ تصور شیخ کا مسئلہ لکھ رہا ہوں۔ کہنے لگے کہ شیخ بوعلی سینا؟ تو ان کے ذہن میں ہر وقت شیخ بوعلی سینا ہی جما ہوا تھا کہ تصور شیخ میں بھی وہی یاد آیا۔ گویا ان کے نزدیک بس وہی ایک شیخ رہ گیا ہے۔ یہ تو علماء کی غلطی تھی کہ علم مضر میں مشغول ہو گئے۔

عوام کی غلطی

عوام کی غلطی یہ ہے کہ وہ علم نافع کو بھی حاصل نہیں کرتے۔ وہ اگر معقول سے بچے ہوئے ہیں تو دینیات سے بھی بے خبر ہیں اور یہ غلطی جو عوام کرتے ہیں وہ بھی درحقیقت علماء ہی کی ذات مقدس سے نکلی ہے۔ کیونکہ ہر فتنہ ہمارے ہی سے نکلتا ہے۔ عوام کا فساد اکثر کسی عالم کے فساد سے پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ دنیا میں جس قدر بدعات و منکرات پھیلی ہیں کسی عالم کا ہاتھ ان میں پہلے شریک ہوا ہے بنا اس غلطی کی یہ ہے کہ عوام نے علم دین کو عربی ہی کے ساتھ مخصوص سمجھ لیا ہے۔ اور عربی پڑھنے کی ہر ایک کو فرصت نہ تھی تو اب انہوں نے اردو میں بھی مسائل نہ سیکھے۔ کیونکہ اردو میں مسائل پڑھ لینے کو وہ علم ہی نہیں سمجھتے۔ انہوں نے یہ خیال کیا کہ جب اردو میں پڑھ لینے کے بعد بھی ہم جاہل ہی رہیں گے تو اس کی بھی کیا ضرورت ہے۔ اور یہ غلطی ہماری پیدا کی ہوئی اس لئے ہے کہ آج کل واعظین جب علم کی فضیلت بیان کرتے ہیں اور جتنی حدیثیں پڑھتے ہیں ان کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ عربی پڑھنی چاہیے اور جتنے عربی مدارس ہیں ان کی امداد کرنی چاہئے۔ پس اگرچہ یہ لوگ صاف صاف یہ نہیں کہتے کہ علم دین عربی کے ساتھ مخصوص ہے مگر ان سب فضائل پر عربی کی تعلیم کو متفرع کرنا اور مدارس عربیہ کی امداد پر توجہ دلانا لازمی طور پر عوام کے دلوں میں یہ خیال پیدا کرتا ہے کہ بس جتنے فضائل علم کے بیان کئے گئے ہیں یہ سب عربی ہی کے ساتھ خاص ہیں۔ بدون عربی میں علم حاصل کئے یہ فضائل حاصل نہ ہوں گے۔ واعظوں کا مقصود تو محض مدارس کی امداد پر توجہ دلانا تھا مگر عوام اس سے یہ سمجھ گئے کہ یہ فضائل جب ہی حاصل ہوں گے جب کہ عربی میں اس علم کو حاصل کیا جائے۔ شاید یوں سمجھے ہوں کہ عربی خدا تعالیٰ کی بولی ہے اور اردو ہماری بولی۔ تو علم دین تو خدا تعالیٰ ہی کی بولی میں ہونا چاہیے۔ اور یہ مذاق صرف عوام ہی کا نہیں بگڑا بلکہ بعض طالب علم بھی اس غلطی میں مبتلا ہیں۔

جیسے ایک طالب علم مولوی مغیث الدین تھے۔ انہوں نے منیہ میں یہ مسئلہ پڑھا تھا کہ نماز کلام الناس سے باطل ہو جاتی ہے۔ وہ اس کا یہ مطلب سمجھے کہ اردو میں بات کرنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ ایک دفعہ وہ کسی امام کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے۔ امام نے مغرب کی دوسری رکعت میں اتنا لمبا قعدہ کیا کہ مقتدیوں کو شبہ ہو گیا کہ بس اب سلام پھیر دیں گے۔ تو مولوی

مغیث الدین نے پیچھے سے آواز دی قم یعنی کھڑے ہو جاؤ۔ امام کو یاد آ گیا کہ یہ رکعت دوسری ہے۔ وہ کھڑے ہو گئے۔ مولوی مغیث الدین اپنے دل میں بڑے خوش ہوئے کہ آج عربی نے بڑا کام دیا کہ ہم نے امام کی غلطی بھی دور کر دی اور ہماری نماز بھی فاسد نہیں ہوئی۔

امام نے سلام پھیر کر پوچھا کہ یہ قم کہنے والے کون صاحب تھے۔ آپ آگے بڑے کہ میں تھا؟ انہوں نے کہا کہ آپ اپنی نماز دہرا لیجئے۔ آپ کی نماز نہیں ہوئی کیونکہ کلام الناس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ تو آپ فرماتے ہیں کہ میں نے تو عربی میں کلام کیا تھا امام نے کہا، اچھا تو آپ کے نزدیک عربی کلام الناس نہیں ہے جاؤ نماز کا اعادہ کرو جب معلوم ہوا کہ عربی بھی بندوں کی زبان ہے۔

غرض اس غلطی میں لوگ بہت مبتلا ہیں۔ اسی واسطے اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نماز میں اردو یا فارسی میں دعا کرنے سے فاسد ہو جاتی ہے اگرچہ وہ اسی درجہ کا ترجمہ ہو جو عربی میں پڑھی جاتی ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ اگرچہ غیر عربی میں دعا پڑھنا نماز کے اندر حرام ہے۔ مگر حرمت سے فساد تو لازم نہیں آتا۔ پس اصل مدار مضمون پر ہے۔ جس مضمون کی دعا عربی میں پڑھنے سے نماز باطل نہیں ہوتی اسی مضمون کی دعا اردو فارسی میں پڑھنے سے بھی فاسد نہ ہو گی۔

صرف ممانعت ہو گی۔ وہ بھی اس وقت جب کہ قصداً ایسا کیا ہو اور اگر بھولے سے یا غلبہ حال میں ایسا ہو جائے کہ اردو یا فارسی کی دعا زبان سے نکل جائے تو کراہت بھی نہ ہو گی بشرطیکہ مضمون مفسد نہ ہو!

ہمارے حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے ایک خادم تھے جن کا نام مولوی تجمل حسین ہے۔ جب وہ مکہ معظمہ گئے تو ایک دن صبح کی نماز شافعی امام کے پیچھے پڑھ رہے تھے۔ شافعیہ صبح کی نماز میں قنوت پڑھتے ہیں۔ حنفیہ اس وقت خاموش رہتے مولوی تجمل حسین پر قنوت سننے سے ایک حالت طاری ہوئی کہ سب تو خدا سے مانگ رہے ہیں اور میں بت کی طرح خاموش کھڑا ہوں۔ ان سے نہ رہا گیا اور انہوں نے پند نامہ کے یہ اشعار شروع کر دیئے۔

پادشا ہا جرم ما را درگزار ☆ ما گنہگاریم و تو آمرز گار
تو نکو کاری وما بد کردہ ایم ☆ جرم بے اندازہ بیحد کردہ ایم
بردر آمد بندہ بگریختہ ☆ آبروئے خود بعصیاں ریختہ

(اے بادشاہ حقیقی ہمارے گناہوں کو معاف فرما، ہم گنہگار ہیں اور تو بخشنے والا ہے تو نے نیکی کا حکم دیا ہے اور ہم نے برائیاں کی ہیں ہم نے بے اندازہ بے حد گناہ کئے ہیں، بھاگا ہوا بندہ دروازہ پر حاضر ہوا، اپنی آبرو کو گناہوں سے کھوئے ہوئے)

انہوں نے یہ پوری نظم پڑھ ڈالی اور لوگ چاروں طرف سے متوحش ہو گئے۔ کہ نماز میں یہ کیا ہونے لگا۔ بعد نماز کے لوگوں نے کہا کہ ان کی نماز باطل ہو گئی۔ دوبارہ پڑھنی چاہیے۔ یہ خبر حضرت حاجی صاحبؒ کو پہنچی۔ حاجی صاحب پر نہ معلوم کیا کیا حالتیں گزری تھیں۔ وہ سمجھ گئے کہ انہوں نے غلبہ حال میں ایسا کیا ہے۔ فرمایا کہ نہیں نماز باطل نہیں ہوئی۔ واقعی صاحب حال کی حالت کو وہی سمجھ سکتا ہے۔ جس پر گزری ہو۔ اور جس پر یہ حالتیں نہ گزری ہوں وہ کیا سمجھ سکتا ہے۔

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست ☆ حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

(ارے تمہارے پاؤں میں تو کانٹا بھی نہیں چبھا تم ان لوگوں کی حالت کیا سمجھ سکتے ہو جن کے سروں پر بلا اور مصیبت کی تلواریں چل رہی ہیں)

عارف شیرازی فرماتے ہیں

شب تاریک وبیم موج گردابے چنیں حائل ☆ کجا دانند حال ما سبکساران ساحلہا

(اندھیری رات موجوں کا خوف اور ایسا بھنور حائل ہوا ہمارا حال کنارہ دریا پر آرام سے کھڑے ہونے والوں کو کیا معلوم ہو سکتا ہے)

یعنی جو شخص ساحل پر آرام سے کھڑا ہے وہ اس شخص کی حالت کو کیا جانے جو دریا میں غوطے لگا رہا ہے کہ اس کو کن کن مصائب کا سامنا ہو رہا ہے۔

اس شعر کے متعلق ایک لطیفہ ابھی قلب پر وارد ہوا ہے۔ وہ یہ کہ ساحل دو ہوتے ہیں۔ ایک ادھر کا ساحل اور ایک ادھر کا ساحل جس پر دریا کو عبور کر کے پہنچتے ہیں۔ تو اس شعر میں ادھر کا ساحل مراد ہے ادھر کا ساحل مراد نہیں۔ خلاصہ یہ کہ جو شخص ابھی تک ادھر کے ساحل ہی پر کھڑا ہے اور دریا میں اس نے قدم بھی نہیں رکھا اس کو دریا میں غوطہ لگانے والے کا حال کچھ معلوم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس کو اس پر اعتراض کا حق حاصل نہیں۔ اور جو شخص دریا میں گھس کر تیرتا ڈوبتا دوسرے ساحل پر پہنچ چکا ہو یعنی سلوک کو طے کر چکا ہو اس کو دریا میں چلنے والے کا حال معلوم ہو سکتا ہے کیونکہ اس پر ایک وقت ایسا گزرا ہے جب کہ وہ دریا میں تیرتا اور ڈوبتا ہوا چل رہا تھا۔

اگرچہ اس وقت دوسرے ساحل پر پہنچ جانے کی وجہ سے وہ چین میں ہے۔ پس اس کو سالکین پر اعتراض کا حق بھی حاصل ہے پس اہل ساحل دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو دریا میں گھسے ہی نہیں یہ تو دریا کی حالت سے بالکل ناواقف ہیں۔ دوسرا وہ جو دریا کو عبور کر کے ساحل پر پہنچا ہے۔ ظاہر میں اس کی حالت بھی اہل ساحل کے مشابہ ہے۔ دونوں چین میں نظر آتے ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ اس کو مصائب جھیلنے کے بعد چین نصیب ہوا ہے۔ اور پہلے ساحل والوں کو مصائب کا سامنا ہی نہیں ہوا۔ تو دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس لئے اس کو اعتراض کا حق ہے۔ مگر کورے اندھوں کو صاحب حال پر اعتراض کا کچھ حق نہیں۔

اسی واسطے حاجی صاحب اس شخص پر اگر اعتراض کرتے، ان کو اس کا حق حاصل تھا۔ مگر اس لئے اعتراض نہیں کیا کہ وہ اس حالت کی حقیقت سے واقف تھے۔ اور جنہوں نے اعتراض کیا ان کو یہ حق حاصل نہ تھا۔ غرض عام لوگ یہ سمجھے تھے کہ اس صورت میں نماز باطل ہوگئی کیونکہ فارسی و اردو میں مطلقاً کچھ پڑھنا عوام کے نزدیک مفسد صلوٰۃ ہے۔ تو اس غلطی کا منشاء ہی ہے یہ لوگ عربی کو تو خدا کی زبان سمجھتے ہیں اور اردو اور فارسی کو بندوں کی زبان۔ حالانکہ اگر کوئی مضمون فی نفسہٖ مفسد ہو تو اگرچہ وہ عربی ہی میں کیوں نہ ہو مفسد ہوگا۔ جیسے مولوی مغیث الدین نے قم کہا تھا اور اس سے نماز فاسد ہوگئی تھی۔

علماء کی کوتاہی

اس غلطی کا منشاء زیادہ تر علماء کی کوتاہی ہے کہ انہوں نے کبھی صاف صاف یہ نہیں کہا کہ اردو میں علم دین پڑھ لینے سے بھی وہ فضائل حاصل ہو سکتے ہیں جو احادیث و قرآن میں علم کے لئے وارد ہیں حالانکہ حدیث و قرآن میں کہیں عربی کی تخصیص نہیں۔ چنانچہ اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ علم مضر وہ ہے جو آخرت میں کام نہ آئے اور نافع وہ ہے جو آخرت میں کام آئے۔ اس میں کہیں یہ قید نہیں کہ وہ عربی میں ہونا چاہیے۔ مگر شاید علماء نے یہ بات صاف صاف اس لئے نہیں کہی کہ ان کو یہ اندیشہ ہوا کہ اگر ہم یہ کہہ دیں گے کہ اردو میں مسائل جان لینے سے بھی علم کی یہ فضیلتیں حاصل ہو سکتی ہیں تو پھر ہماری قدر نہ ہوگی۔ پھر تو سارے ہی عالم ہو جائیں گے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اس صورت میں بھی علماء کو نقصان ہوا بلکہ دو نقصان ہوئے ایک عوام کو ایک علماء کو۔ عوام کو تو یہ نقصان ہوا کہ انہوں نے جب علم کو عربی کے ساتھ مخصوص سمجھا

اور عربی پڑھنے کی سب کو فرصت یا ہمت نہ ہوئی اور اردو میں پڑھنے کو وہ علم ہی نہ سمجھے تو مسائل شریعت سے بالکل بے خبر رہ گئے اور علم ہی سے محروم ہو گئے۔ علماء کا یہ ضرر ہوا کہ جب عوام علم سے بالکل محروم ہو گئے تو وہ علماء کی قدر و منزلت سے بھی اندھے ہو گئے۔ کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ ہر چیز کی قدر وہی کر سکتا ہے۔ جس کو کچھ تو اس سے مناسبت ہو۔

دیکھو! اگر کوئی زمیندار ایک گاؤں کے اندر بہت بڑے حصہ کا مالک ہو تو اس کی قدر وعظمت وہی شخص کر سکتا ہے۔ جس کا کچھ تھوڑا بہت حصہ اس گاؤں میں ہو۔ وہ جان سکتا ہے کہ یہ بڑا ہے اور میں چھوٹا ہوں اور جس شخص کا اس گاؤں میں کچھ بھی حصہ نہ ہو، وہ اس زمیندار کی قدر پوری طرح نہیں جان سکتا۔ اسی طرح جوہر کی قدر وہی کر سکتا ہے جس نے عمر بھر میں کبھی جواہر کو پرکھا ہو۔ ناواقف کی نظر میں تو ایک معمولی لال پتھر اور یاقوت دونوں یکساں ہیں۔

قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری (جوہر کی قدر بادشاہ جانتا ہے یا جوہری جانتا ہے)

تو اے صاحبو! اگر تم عوام کو بادشاہ بنانا نہیں گوارا کرتے تو کم از کم ان کو جوہری تو بنا دیا ہوتا تاکہ ان کو اس جوہر کی قدر ہوتی جو آپ کے پاس ہے۔ اور اب جب کہ وہ دین سے بالکل ہی محروم ہو گئے۔ وہ جانتے ہی نہیں کہ عربی پڑھنے والے کے پاس کیا جوہر ہے۔ تو وہ آپ کی قدر کیا خاک سمجھیں گے۔ ہاں اگر وہ کچھ عقائد اور احکام اردو میں پڑھ لیتے پھر انہیں عقائد و احکام کی تحقیق آپ کی زبان سے سنتے اس وقت ان کو معلوم ہوتا کہ علماء کے پاس یہ جواہرات ہیں۔ اس وقت البتہ ان کو علماء کی قدر ہوتی۔

مگر خدا کے واسطے کوئی صاحب اسی نیت سے عوام کو تعلیم نہ دینے لگیں۔ یہ تو میں نے اس لئے بیان کر دیا ہے کہ اگر کسی اردو میں علم پڑھانے سے اس لئے رکاوٹ ہو کہ ہماری قدر کون کرے گا تو وہ یہ سمجھ لے کہ اردو میں اگر عوام کو دین کا علم حاصل ہو گیا تو وہ اس وقت سے زیادہ آپ کی قدر کریں گے۔ یعنی یہ میں بطور تنزل کے کہتا ہوں کہ بے قدری کا اندیشہ مت کرو۔ ورنہ حقیقت میں عوام کی قدر و بے قدری ہی کیا جس کی پروا کی جائے۔ عوام کی رضا اور اعتقاد ہے کیا چیز جس کا خیال کیا جائے۔ علماء کا مذاق تو یہ ہونا چاہیے۔

دلا رامے کہ داری دل درو بند ☆ وگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(محبوب سے ہمکنار اور محبوب کی تلاش جس سے تم نے دل لگا رکھا ہے، تو پھر تمام دنیا سے آنکھیں بند کر لو)

عوام قدر کرے تم کو کیا دیں گے۔ صرف دنیا کے چند ٹھیکرے تو اس کی اس کمال کے سامنے ہستی کیا ہے جو علم سے آپ کو حاصل ہے۔

خلیل آسا در ملک یقیں زن ☆ نوائے لا احب الافلین زن
زر و نقرہ چیست تا مجنوں شوی؟ ☆ چیست صورت تا چنیں مفتوں شوی؟

(حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مانند عزم و یقین کی دنیا میں قدم رکھتے ہوئے...... میں ڈوب جانے والوں کو دوست نہیں رکھتا بلند کر یہ سونا چاندی کیا ہے جس پر تو عاشق ہوا جاتا ہے اور یہ رنگ و خون کی صورتیں کیا حقیقت رکھتی ہیں جن پر تو پاگل ہوا جاتا ہے)

مگر افسوس آج کل علماء میں یہ مذاق بہت ہی کم رہ گیا ہے۔ آج کل اکثر لوگ علم کے بعد بھی عوام کی نظروں میں جاہ اور قدر و منزلت کے طالب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عوام کی خاطر وہ بعض دفعہ ایسے کاموں میں پڑ جاتے ہیں جن کو اندر سے ان کا دل قبول نہیں کرتا۔ بعض لوگ جب یہ دیکھتے ہیں کہ فلاں جگہ رہ کر عوام کی نظروں میں ہماری وقعت نہ ہوگی تو اس جگہ کو چھوڑنا چاہتے ہیں۔ اور ایسی جگہ کی تلاش میں رہتے ہیں جہاں ان کی وقعت زیادہ ہو۔

بعض لوگوں کو اس کا اہتمام ہوتا ہے کہ جب ہم بازار میں یا کسی اور جگہ جائیں تو دو چار آدمی ہمارے ساتھ چلنے والے ہوں۔ تنہا چلنا انہیں گوارا نہیں ہوتا۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ جب آپؐ کے ساتھ راستہ میں کچھ صحابہؓ ہو جاتے تو آپ بعض کو آگے کر دیتے اور بعض کو پیچھے۔ آپؐ سب کے آگے نہ چلتے تھے۔ اسی طرح مجلس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم جہاں جگہ پاتے وہیں بیٹھ جاتے آپؐ کی نشست کے لئے کوئی ممتاز جگہ نہ تھی۔ حتیٰ کہ باہر سے آنے والوں کو یہ بھی نہ معلوم ہوتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس مجمع میں کون سے ہیں۔ جب تک کہ وہ خود یہ سوال نہ کرتا من محمد فیکم کہ تم میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون سے ہیں؟ صحابہؓ اس کے جواب میں فرماتے ہذا الابیض المتکئی یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہیں گورے چٹے جو سہارا لگائے بیٹھے ہیں۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ پہنچے تو مدینہ والے شہر سے باہر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے استقبال کے لئے حاضر ہوئے اس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ اور حضرت ابوبکرؓ کی عمر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے

دواڑھائی برس ہی کم تھی مگران کے قویٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسے نہ تھے۔ اسی لئے وہ باوجود چھوٹے ہونے کے دیکھنے میں بڑے معلوم ہوتے تھے۔ کیونکہ ان کے بال زیادہ سفید ہوگئے تھے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قویٰ نہایت اچھے تھے۔ اس وقت آپ کا ایک بال بھی غالباً سفید نہ ہوگا۔ کیونکہ وصال کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چند گنتی کے بال سفید تھے۔ اور ہجرت کا واقعہ وصال سے دس برس پہلے کا ہے۔ تو اس وقت ایک بال بھی شاید آپ کا سفید نہ ہوگا۔ اس لئے اکثر لوگ حضرت ابوبکرؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سمجھے۔ پس سب لوگ حضرت ابوبکرؓ ہی سے آکر مصافحہ کرتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی مصافحہ نہ کرتا مگر اللہ رے تواضع کہ نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے خود یہ فرمایا کہ مجھ سے مصافحہ کرو۔ میں محمد رسول اللہ ہوں۔ اور حضرت ابوبکرؓ کی سادگی کہ انہوں نے مصافحہ سے انکار نہ کیا۔ جو کوئی ان سے مصافحہ کرتا بے تکلف ہاتھ بڑھا دیتے۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی راحت کا خیال کیا ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنی بھی تکلیف کیوں دیں۔ الغرض دیر تک لوگ حضرت ابوبکر ہی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سمجھتے رہے۔ تھوڑی دیر میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر دھوپ آنے لگی۔ اس وقت صدیق رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور اپنے چادرہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سایہ کرنے لگے۔ جب سب کو معلوم ہوا کہ یہ خادم ہیں۔ جن سے ہم نے مصافحہ کیا تھا۔ اور دوسرے مخدوم ہیں۔ بھلا کچھ حد ہے اس تواضع اور سادگی کی۔

مگر آج کل تو لوگ خود بڑا بننے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر کوئی کوشش بھی نہ کرے تو عوام کے مصافحہ اور ہاتھ پیر چومنے سے اس کو شبہ ہوتا ہے کہ میں ضرور کچھ ہوں جبھی تو یہ لوگ میری اس قدر تعظیم کرتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ انسان کو اپنے عیوب حالانکہ خوب معلوم ہوتے ہیں جن کو دوسرے نہیں جانتے۔ تو گویا دوسرے لوگ اس کے عیوب سے جاہل ہیں۔ مگر یہ شخص ان جاہلوں کی تعظیم وتکریم سے یہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں واقع میں اسی قابل ہوں۔ اور جو عیوب اسے یقیناً اپنے اندر معلوم ہوتے ہیں ان سے قطع نظر کر لیتا ہے بلکہ ان کو بھول جاتا ہے۔

جیسے حکایت ہے کہ ایک نائن نے ایک بی بی کو نتھ اتار کر منہ دھوتے دیکھا۔ نتھ اتارنے سے سمجھی کہ بیوہ ہوگئی۔ دوڑی ہوئی اپنے شوہر کے پاس آئی کہ کیا بیٹھا ہے، فلانے کے پاس (یعنی اس بی بی کے شوہر کے پاس) دوڑا اور خبر کر کہ تمہاری بی بی بیوہ ہوگئی۔ وہ نائی بھی

ایسا ہی احمق تھا پہنچا۔ پھر وہ شخص بھی بے وقوف ہی تھا۔ نائی سے پوچھا کہ گھر میں خیریت ہے؟ نائی نے کہا حضور اور تو سب خیریت ہے مگر آپ کی بیوی بیوہ ہوگئی۔ بس یہ خبر سن کر آپ نے رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ ایک دوست ان سے ملنے آئے ۔ پوچھا، خیر تو ہے یہ رونا پیٹنا کیوں ہو رہا ہے؟ کہنے لگے کہ میری بیوی بیوہ ہوگئی ہے۔ اس نے کہا، خدا کے بندے ہوش سے کام لے۔ جب تو زندہ سلامت موجود ہے تو بیوی کیوں کر بیوہ ہوگئی؟ تو آپ جواب میں کہتے ہیں کہ یہ تو میں بھی سمجھتا ہوں مگر گھر سے آیا ہے معتبر نائی۔

بس یہ حالت آج کل اکثر لوگوں کی ہو رہی ہے کہ وہ اپنے عیوب کو اچھی طرح جانتے ہیں اور خوب سمجھتے ہیں کہ ہم کسی قابل نہیں۔ مگر لوگوں کی تعظیم و تکریم سے یہ خیال کرتے ہیں کہ معتبر لوگ میرے معتقد ہیں۔ شاید ان لوگوں کو میری حالت مجھ سے زیادہ معلوم ہو اور میرے اندر وہ عیوب بھی شاید نہ ہوں جو مجھ کو معلوم ہوتے ہیں۔ بس وہی قصہ ہو رہا ہے کہ گھر سے آیا ہے معتبر نائی۔

ایک میاں جی لڑکوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ ایک دن لڑکوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ آج کسی طرح چھٹی لینی چاہیے۔ سب کے اتفاق سے یہ بات قرار پائی کہ جب میاں جی آئیں تو ایک لڑکا غمگین صورت بنا کر ان سے یہ کہے کہ حضور خیر تو ہے آج آپ کا چہرہ کچھ اترا ہوا ہے۔ پھر سب لڑکے ایک ایک کر کے یہی کہیں۔ چنانچہ میاں جی آئے اور ایک لڑکا منہ بنا کر ان کے پاس گیا اور کہا، حضور مزاج کیسا ہے؟ خیر تو ہے کچھ چہرہ اترا اترا معلوم ہوتا ہے۔ میاں جی نے اس کو ڈانٹ دیا کہ جا بیٹھ، کام میں لگ۔ میں تو اچھا خاصا ہوں ابھی پیٹ بھر کے کھانا کھا کر آیا ہوں۔ وہ تو بیٹھ گیا دوسرا پہنچا میاں جی نے اسے بھی دھتکار دیا۔ تیسرا پہنچا اب میاں جی کو وہم ہونا شروع ہوا۔ اسے بھی ٹال دیا مگر نرمی سے۔ اب وہ تیزی نہ رہی چوتھا پہنچا، اب تو میاں جی کو قوی شبہ ہوگیا کہ وقعی میرا چہرہ اتر رہا ہوگا۔ جبھی تو یہ سب کے سب مزاج پرسی کر رہے ہیں۔ اس کے بعد ایک اور آیا۔ بس اب تو ان کو خاصا بخار ہوگیا اور کپڑا اوڑھ کر گھر چل دیئے اور مکتب بند کر دیا۔ لڑکوں کو چھٹی مل گئی۔

اب ملا جی گھر میں پہنچے آہ آہ کرتے ہوئے۔ بیوی نے کہا کہ کیا ہوا۔ ابھی تو یہاں سے اچھے خاصے گئے تھے۔ ملا جی کہاں تھے ڈنڈا لے کر اس کے سر ہوگئے کہ تو تو یہی چاہتی ہے کہ میں مر جاؤں اور تو دوسرا نکاح کرے۔ یوں کہتی ہے کہ تم تو ابھی اچھے خاصے گئے تھے میں اچھا خاصا

گیا تھا؟ اسی وقت میرا چہرہ اترا ہوا تھا۔ لڑکوں کو معلوم ہو گیا اور مجھے نہ معلوم ہوا کہ میں بیمار ہوں۔

غرض اس قصہ میں آس پاس کے بھی آ گئے اور پوچھنے لگے کہ ملا جی کیوں غصہ ہو رہے ہو۔ ملا جی نے بیوی کی شکایت کی۔ جب ایک شخص نے کہا کہ میاں بھی تمہاری عقل کہاں ہے۔ یہ تو لڑکوں کی ایک شرارت تھی۔ وہ تم سے چھٹی لینا چاہتے تھے۔ اور وہ ابھی راستہ میں کہتے جا رہے تھے کہ آج ہم نے خوب چھٹی لی۔ تم بے وقوف تھے ان کے بہکانے میں آ گئے۔ تب ذرا ملا جی کے حواس درست ہوئے۔ صاحبو! اس حکایت میں تو ہر شخص اس ملا کو بے وقوف بتانے کو تیار ہو گا مگر اس کی خبر نہیں کہ اس بے وقوفی میں ہم سب مبتلا ہیں کہ جہاں چار آدمیوں نے ہمارے ہاتھ پیر چومنے شروع کئے اور ہم کو سچ مچ اپنی بزرگی کا وہم ہونے لگا۔ مولانا فرماتے ہیں۔

انیش گوید نے منم انباز تو ☆ انش گوید نے منم ہمراز تو
او چو بیند خلق را سرمست خویش ☆ از تکبر می رود از دست خویش
اشتہار خلق بند محکم است ☆ بند او از بند آہن کے کم ست
خویش را رنجور ساز و زار زار ☆ تا ترا بیروں کنند از اشتہار

(ایک کہہ رہا ہے کہ میں آپ کا ہمراز ہوں دوسرا کہتا ہے نہیں میں آپ کا شریک حال ہوں، وہ شخص جب ایک مخلوق کو اپنا سرمست اور عاشق دیکھتا ہے تکبر کی وجہ سے ہاتھوں سے نکل جاتا ہے، مخلوق کی شہرت اللہ اور ان کے بندے کے درمیان مضبوط بند ہے یہ بند لوہے کے بند سے کیا کم ہے۔ اپنے آپ کو رنجیدہ رکھ اور آہ و زاری کرتا کہ تجھے شہرت و اشتہار سے باہر نکالیں)

یہ تو باطنی ضرر ہے عوام کی تعظیم و تکریم اور ظاہری ضرر دنیا کا یہ ہوا کہ۔

خشمہاؤ چشمہاؤ رشکہا! ☆ بر سرت ریز چو آب از مشکہا!

(غصے اور آنکھیں اور اشک میرے سر پر اس طرح ٹپکتے ہیں جیسے مشکوں سے پانی ٹپکتا ہے)

کہ جہاں عوام نے کسی کی تعظیم و تکریم زیادہ شروع کی اور لوگوں کو اس کے ساتھ حسد ہوا اور بہت سے دشمن اس کے پیدا ہو جاتے ہیں جو اس تعظیم و تکریم کو آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے رات دن اسی کوشش میں رہتے ہیں کہ کسی طرح اس کو عوام کی نظروں سے گرا دیں۔ بس عافیت میں وہ لوگ ہیں جو گم نام ہیں جن کو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ نہ ان سے کسی کو حسد ہے نہ عداوت۔

آنانکہ بکنج عافیت بنشستند ☆ دندان سگ ودہان مردم بستند!
کاغذ بدرید ندو قلم بشکستند ☆ وزدست وزباں حرف گیراں رستند

(وہ لوگ جو گوشہ عافیت میں بیٹھے ہیں وہ کتوں کے دانتوں اور لوگوں کی زبانوں سے بچے ہوئے ہیں، انہوں نے کاغذ پھاڑ دیا اور قلم توڑ ڈالے اور معترضین کے ہاتھوں اور بانہوں کے شر سے رہائی پائی)

میں یہ کہہ رہا تھا کہ عوام کی قدر اور تعظیم وتکریم اور ان کی نظروں میں عزت وجاہ ایسی چیز نہیں ہے جس کی طلب کی جائے۔ ایسی تیسی عوام کی رضا کی، انسان کو خصوص عالم کو رضائے حق کا طالب ہونا چاہیے کیونکہ عوام کے اعتقاد کی مضرتیں میں آپ کو بتلا چکا ہوں کہ اس سے ظاہر وباطن دونوں کا ضرر ہوتا ہے الامن عصم اللہ۔

علماء کو ہدایت

پس علماء کو علم کی فضیلت عربی ہی کے ساتھ خاص نہ کرنا چاہیے اور نہ یہ خیال کرنا چاہیے کہ اگر اردو پڑھنے والا بھی عالم کی برابر فضیلت میں ہو گیا تو ہم کو کون پوچھے گا۔ میں کہتا ہوں کہ تم اس خیال کو دل سے نکال دو اور اپنے کو مٹا دو۔ دیکھو پھر تمہاری ہی قدر ہوگی۔ کچھ خاصیت ہے مٹانے میں کہ اس سے زیادہ شہرت ہوتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں جو لوگ طالب جاہ ہیں ان کو جاہ حاصل کرنے کا طریقہ ہی نہیں آتا۔ جاہ بھی ترک جاہ ہی سے حاصل ہوتی ہے طلب سے حاصل نہیں ہوتی۔ مگر نیت سے اگر کوئی ترک جاہ کرے تو وہ یاد رکھے کہ ثواب کچھ نہ ہوگا۔ تواضع اس نیت سے کرنا کہ ہم متواضع مشہور ہو جائیں گے تکبر ہی میں داخل ہے پس مٹانے میں یہ خاصیت ہے کہ اس سے شہرت ہو جاتی ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

اگر شہرت ہوس داری اسیر دام عزلت شو   کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نام عنقارا

(اگر تمہیں شہرت کی تمنا ہے تو گوشہ تنہائی کے دام میں اسیر ہو جاؤ کیونکہ گوشہ گیری کی وجہ سے عنقا تمام دنیا میں مشہور ہو گیا)

دوسری بات یہ ہے کہ اگر تم سارے عالم کو عالم بنا دو گے جب بھی بڑے تم ہی رہو گے کیونکہ تم پھر بھی استاد ہو گے اور سب لوگ تمہارے شاگرد ہوں گے شاگرد چاہے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو جائے آخر تو رتبہ استاد سے کم ہی ہے۔ گو ظاہر میں بڑا معلوم ہو۔ جیسے کوئی شخص

اپنے چھوٹے بھائی کو خوب دودھ گھی کھلاوے تاکہ موٹا تازہ ہو جائے اور چند سال میں ایسا تیار ہو جائے کہ بڑا بھائی اس سے چھوٹا معلوم ہونے لگے۔ تو کیا رتبہ میں بھی وہ چھوٹا ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں، بڑا بھائی پھر بھی بڑا رہے گا۔ اور جب لوگ تمہارے شاگرد ہو جائیں گے اس وقت تمہاری اس وقت سے زیادہ قدر ہوگی۔ کیونکہ وہ جانیں گے کہ ان کے پاس علمی جوہر ہے۔ میزان پڑھنے والا شرح ملا جامی پڑھنے والے کی اس لئے قدر کرتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ اس درجہ کا طالب علم ہے اور جس نے کچھ بھی نہ پڑھا ہو اس کے نزدیک میزان اور شرح جامی پڑھنے والا یکساں ہے۔

الغرض علماء کو چاہیئے کہ نصاب تعلیم کو وسیع کریں۔ پس ایک نصاب تو مکمل ہونا چاہیے۔ ان لوگوں کے لئے جن کو عربی پڑھنے کے لئے فراغت اور فرصت ہے۔ دوسرا نصاب عربی میں ان لوگوں کیلئے ہونا چاہیے جن کو عربی پڑھنے کا شوق ہے فرصت کم ہے۔ تیسرا نصاب اردو میں ان لوگوں کے لئے ہونا چاہیے جو عربی نہیں پڑھ سکتے۔ ان کو اردو میں ضروریات دین پڑھا کر عقائد و احکام معاملات سے آگاہ کر دینا چاہیے۔ اور ایک چوتھا نصاب ان بوڑھے طوطوں کے لئے مقرر ہونا چاہیے، جو اردو بھی نہیں پڑھ سکتے۔ کیونکہ ان بوڑھے آدمیوں کو اب مکتب میں جا کر پڑھنا دشوار ہے۔ ان کے لئے یہ تدبیر ہونی چاہیے کہ ایک عالم ہر ہفتہ میں کتاب ہاتھ میں لے کر ان کو مسائل سنا دیا کرے اور اچھی طرح سمجھا دیا کرے۔ اس طریقہ گاؤں والے بھی تعلیم یافتہ ہو سکتے ہیں۔ گاؤں والوں کو چاہیے کہ ایک عالم کو اپنے گاؤں میں رکھ لیا کریں۔ دس پندرہ روپے ماہوار میں ایسا عالم ان کو مل جائے گا جو ضروری مسائل ان کو بتلا دیا کرے گا۔ اور علماء کو بھی چاہیے کہ دیہات والوں کی تعلیم کی طرف توجہ کریں اس میں ایک فائدہ یہ ہے کہ اگر تم ان کو تعلیم یافتہ بنا دو گے تو وہ کسی کے دھوکا میں نہ آئیں گے ورنہ کوئی دوسرا جاہل واعظ ان کو بہکائے گا۔ پھر جو وقعت آج تمہاری گاؤں میں رہی ہے وہ سب جاتی رہے گی۔ چنانچہ ایسے قصے بہت پیش آتے ہیں۔

ایک شخص گاؤں میں گیا اس کو یہ فکر ہوئی کہ کسی طرح ان ملاؤں کو یہاں سے نکلوانا چاہیے۔ اس نے یہ تدبیر کی کہ ملاؤں کا امتحان لینا شروع کیا۔ سب سے یہ پوچھتا کہ نمی دانم کے کیا معنی ہیں۔ اگر اس کو معنی معلوم نہ ہوئے تب تو وہ ذلیل ہوتا ہی تھا اور اگر معنی

معلوم ہوئے تب بھی وہ یہی کہتا تھا کہ میں نہیں جانتا کیونکہ نمی دانم کے معنی یہی ہیں۔ اس پر وہ کہہ دیتا کہ دیکھو خود اقرار کرلیا کہ میں نہیں جانتا۔ اپنی جہالت کا خود معترف ہے۔ پس گاؤں والے سمجھ جاتے کہ واقعی یہ ملا جاہل ہے اس کو نکالنا چاہیے۔

ایک اور شخص گاؤں میں گیا اور وہاں کے ملا سے پوچھا کہ بتلاؤ ایمان نقطہ دار ہے یا بے نقطہ دار۔ ظاہر میں تو اس کے جواب یہی کہا جاتا کہ منقوط ہے کیونکہ ایمان میں ی اور نون منقوط ہے۔ مگر اس کا یہ مقصود ہی نہ تھا۔ وہ ملا بڑا ہوشیار تھا۔ اس نے کہا کہ ایمان غیر منقوط ہے۔ ممتحن نے پوچھا، کیسے؟ اس نے کہا، دیکھو، ایمان **لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ** کا نام ہے۔ اور اس کلمہ میں کسی حرف پر نقطہ نہیں، اس پر وہ ممتحن بولا کہ تم نے جواب تو صحیح دیا مگر وجہ غلط بیان کی۔ اس نے کہا، اچھا تم صحیح وجہ بتلاؤ۔ کہنے لگے کہ ایمان اس واسطے غیر منقوط ہے۔ کہ جب تم کسی سے پوچھتے ہو کہ تم مسلمان ہو تو وہ جواب میں کہتا ہے الحمدللہ اور دیکھو اس میں نقطہ نہیں۔ اس ملا کو فکر ہوئی کہ کسی طرح اس کی بات گاؤں والوں کے سامنے غلط کرنا چاہیے کہنے لگا یہ وجہ بالکل صحیح نہیں۔ کیونکہ لوگ اس سوال کے جواب میں الحمدللہ نہیں کہتے بلکہ یوں کہتے ہیں شکر الحمدللہ۔ اور اس کے جواب میں شین پر نقطے ہیں۔ اس لئے وجہ یہی صحیح ہے جو میں نے بیان کی۔ بس اتنی بات پر ملا جیت گیا اور گاؤں میں شہرت ہوگئی کہ ہمارا ملا بڑا پڑھا ہوا ہے۔

غرض گاؤں والوں کو پڑھا دینے میں یہ بھی نفع ہے کہ تم گاؤں میں جمے رہو گے۔ کوئی ان کو بہکا نہ سکے گا۔ یہ تو ہنسی کی بات تھی۔ اگر تم جم بھی نہ سکو تو تمہارا اجر خدا کے ذمہ ہے۔ ثواب تو کہیں نہیں گیا۔ یہ کیا تھوڑی بات ہے۔ اس لئے تم روٹیوں کی فکر نہ کرو خدا کو راضی رکھنے کا قصد کرو۔ عالم کو روزی کا فکر نہ کرنا چاہیے اس کی تو یہ شان ہونی چاہیے۔

اے دل آں بہ کہ خراب ازمی گلگوں باشی ☆ بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی
در رہ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں ☆ شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

(اے دل یہی بہتر ہے کہ محبوب حقیقی کی محبت میں مشغول رکھ، بے زر و مال وحشمت و دبدبہ میں قارون یعنی دنیا داروں سے بصد درجہ بڑھے رہو)

اور عالم کو اپنی فاقہ مستی پر نازاں ہونا چاہیے۔ مخلوق کے روپے پر نظر نہ کرنی چاہیے اور یہ کہنا چاہیے۔

اگر قلاش و گر دیوانہ ایم ☆ مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

(ہم اگر قلاش اور دیوانہ ہیں تو کیا غم ہے یہی دولت کیا کم ہے کہ اس ساقی و محبوب حقیقی اور اس کی شراب محبت سے مست ہیں)

اور ؎

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد ☆ مر عسس را دید و در خانہ نہ شد

(جو دیوانہ نہیں وہی دیوانہ ہے جو شخص کو توال کو دیکھتا ہے گھر میں چلا جاتا ہے اس طرح جب محبوب حقیقی کا عشق غالب ہوتا ہے عقل رفو چکر ہو جاتی ہے)

علم کی کیمیا

میں سچ کہتا ہوں کہ علم میں خود وہ لذت ہے جس کے سامنے تمام وہ لذتیں ہیچ ہیں۔ عالم ہو کر دنیا کی طمع ہو تعجب ہے۔ دنیا ہے کیا چیز؟ علم کے سامنے اس کی حقیقت ہی کیا ہے۔ رہا روٹی کپڑا سو اس سے بے فکر رہو۔ جس کے پاس علم ہو وہ بھوکا نہیں رہا کرتا اور اس سے زیادہ کی تم کو ضرورت نہیں۔ پس اہل علم کو استغنا کے ساتھ رہنا چاہیے کہ اہل دنیا کو ہرگز یہ وسوسہ بھی نہ آ سکے کہ علماء کو ہماری طرف سے احتیاج ہے۔

صاحبو! کیا تم کیمیا گر سے بھی گئے گزرے ہو گئے کہ وہ ذرا سی بے حقیقت چیز پر ایسا مستغنی ہو جاتا ہے کہ نوابوں اور بادشاہوں کی بھی اپنے سامنے کچھ حقیقت نہیں سمجھتا اور تمہارے پاس اتنی بڑی کیمیا ہے جس کے سامنے ہزار کیمیا گرد ہیں۔ یہ علم کی کیمیا وہ چیز ہے جس سے جنت اور رضائے حق نصیب ہوتی ہے۔ جس کے آگے واللہ ہفت اقلیم کی سلطنت بھی ہیچ ہے۔ پھر حیرت ہے کہ تم اتنے بڑے کیمیا گر ہو کر اہل دنیا کی خوشامد کرو ان کے روپے پیسے پر نظر کرو۔

پس تم کو اس کی فکر نہ کرنی چاہیے کہ سب لوگوں کو عالم بنانے کے بعد ہم کو کون پوچھے گا۔ میں کہتا ہوں کہ تم کو خدا پوچھے گا جس کے ہاتھ میں زمین و آسمان کے خزانے ہیں۔ اور جب تم کو خدا پوچھے گا تو وہ ہرگز تم کو بھوکا نہ مارے گا۔ پھر تم کو کیا فکر، لہٰذا علم دین کی تعلیم عام ہونی چاہیے جس کا طریقہ میں بتلا چکا ہوں۔

اب صرف عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ رہ گیا۔ سو عورتوں کو ان کے مرد پڑھا دیا کریں اور جب ایک عورت تعلیم یافتہ ہو جائے تو پھر وہ بہت سی عورتوں کو تعلیم یافتہ بنا سکتی ہے۔

نتیجہ میں نے ایسا طریقہ بتلادیا جس سے تھوڑے ہی عرصہ میں سب مسلمان عالم بن سکتے ہیں مگر اس طریقہ پر عمل کرنا شرط ہے اور وہ بھی استقلال کے ساتھ۔ مگر افسوس یہی ہے کہ مسلمانوں میں استقلال نہیں۔ کسی کام کو نباہ کر نہیں کرتے اور علم نباہنے کی چیز ہے کیونکہ اس کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ یہ تو ساری عمر کا کام ہے۔

اندریں رہ می تراش و می خراش ☆ تادم آخر دمے فارغ مباش
تادم آخر دمے آخر بود ☆ کہ عنایت با تو صاحب سر بود

(اس راہ سلوک میں ادھیڑبن میں لگے رہو یعنی خوب کوشش کرو آخر دم تک بے کار نہ رہو آخری وقت تو کوئی گھڑی ایسی ضرور ہوگی جس میں عنایت ربانی تمہاری ہمراز اور رفیق بن جائیگی)

جیسا کہ ایک ظریف بزرگ نے ایک لڑکے کی بابت پوچھا تھا کہ یہ کیا پڑھتا ہے۔ باپ نے کہا کہ حضرت قرآن حفظ کرتا ہے فرمایا ارے بھائی کیوں جنم روگ لگایا۔ انہوں نے قرآن حفظ کرنے کو جنم روگ کہا۔ کیونکہ واقعی قرآن کا حفظ کرنا تو ایک دو سال کا کام ہے مگر اس کی نگہداشت ساری عمر کا کام ہے۔ جہاں ذرا غفلت کی اور یہ ذہن سے نکلا۔ اس لئے ہر سال اس کا دور اور تکرار کرنا اور محراب سنانا اور روزانہ منزل پڑھتے رہنا ضروری ہے۔ اس لئے اس کو جنم روگ کہا۔ مگر ایسا روگ مبارک ہے جس سے خدا راضی ہو۔

اسی طرح سمجھ لو کہ یہ علم بھی جنم روگ ہے۔ اسکا سلسلہ ساری عمر باقی رکھنا چاہیے۔ حدیث میں ہے: منهو مان لا يشبعان طالب الدنيا و طالب العلم (کنز العمال: ۲۸۹۳۲)

یعنی دو حریص کبھی سیر نہیں ہوتے ایک طالب دنیا کہ دنیا سے اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ دوسرے طالب علم، جب علم کا چسکا اس کو لگ جاتا ہے تو پھر اس کو پیٹ بھی علم سے نہیں بھرتا اور وجہ یہ ہے کہ علم کا سلسلہ غیر متناہی ہے تو اس کی طلب بھی غیر متناہی ہوتی ہے۔

اے برادر بے نہایت درگہیست ☆ ہرچہ بردے میرسی بروے مایست

(اے بھائی بے انتہا درگاہ ہے جس درجہ پر پہنچو اس پر مت ٹھہرو، آگے ترقی کرو)

اگر آپ یہ کہیں کہ ساری عمر کا سلسلہ تو ہم سے نہیں ہوسکتا ایک دو دن کا کام ہو تو کرلیا جائے۔ میں کہتا ہوں کہ پھر کھانا بھی چھوڑ دیجئے اور کہہ دیجئے کہ ہم سے یہ دو وقت کی روٹی کا دھندا نہیں ہوسکتا۔ آکر اس دھندے کو ساری عمر کے لئے آپ نے کیوں کر گوارا کرلیا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ وہ

تو غذا ہے۔ جس پر زندگی موقوف ہے میں کہتا ہوں کہ وہ جسمانی غذا ہے اور علم روحانی غذا ہے۔

علم کی فضیلت

روحانی زندگی علم ہی پر موقوف ہے اور جس طرح روٹی کھانا آپ کو روزانہ سہل ہے اسی طرح آپ علم میں مشغول ہو کر دیکھیں پھر وہ بھی آپ کے لئے سہل ہو جائے گا۔ اور جب علم کا چسکہ لگ جائے گا تو پھر آپ کو اس کے بغیر چین نہ آئے گا۔ پھر اس میں ایک بڑا نفع یہ ہے کہ حق تعالیٰ رضا اس سے حاصل ہوتی ہے جو شخص طالب علم میں مرتا ہے اس کو شہید کا ثواب ملتا ہے۔

صاحبو! حق تعالیٰ اپنے بندوں سے راضی ہونے کے واسطے بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔

امام محمدؒ کو کسی نے انتقال کے بعد خواب میں دیکھا۔ پوچھا، کیا حال ہے؟

فرمایا، مجھ کو حق تعالیٰ کے سامنے پیش کیا گیا حکم ہوا کہ اے محمد! مانگو کیا مانگتے ہو میں نے عرض کیا کہ میری مغفرت کر دی جائے۔ ارشاد ہوا کہ اگر ہم تم کو عذاب کرنا چاہتے تو علم عطا نہ کرتے۔ تم کو ہم نے اپنا علم اس لیے عطا کیا تھا کہ ہم تم کو بخشنا چاہتے تھے۔ لہٰذا مغفرت تو ہے ہی کچھ اور مانگو۔ سبحان اللہ دیکھئے! علم دین کی کیسی فضیلت ہے۔ واقعی حق تعالیٰ بخشنے کے واسطے بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ایک جگہ خود ارشاد فرماتے ہیں:

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ○ (النساء: ۱۴۷)

یعنی اگر تم خدا کی نعمتوں کا شکر کرو جس کی تفسیر یہ ہے کہ ایمان لے آؤ۔ یہ واؤ عطف تفسیری کے لئے ہے، تو حق تعالیٰ تم کو عذاب کر کے کیا کریں گے۔ یعنی تمہارے عذاب کرنے میں خدا کا کون سا نفع ہے اور حق تعالیٰ بڑے قدردان ہیں۔ جاننے والے ہیں ان کو سب خبر ہے کہ کون ایماندار ہے اور کون نہیں اور وہ ہر مسلمان کے ایمان کی قدر فرمائیں گے۔

اس آیت میں کیسی بلاغت ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ اگر تم ایمان لے آؤ تو ہم تم کو عذاب نہ کریں گے بلکہ یہ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں ہم تم کو عذاب کر کے کیا کریں گے۔ اس عنوان میں جس قدر بلاغت ہے اہل لسان و اہل ذوق اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ واقعی حق تعالیٰ کا ہمارے عذاب میں کیا نفع ہے۔ وہ تو ہر وقت بخشنے کے لئے تیار ہیں۔ کوئی اپنے کو بخشوانا بھی چاہے۔

ایک بت پرست ہمیشہ بت کو پوجتا تھا اور نوے سال تک صنم صنم کا ورد کرتا رہا۔ ایک دن بھولے سے اس کی زبان سے بجائے صنم کے صمد نکل گیا۔ فوراً آواز آئی لبیک

یاعبدی **لبیک** کہ اے میرے بندے میں موجود ہوں ۔ اس آواز پر وہ رونے لگا اور بت کو اٹھا کر پھینک دیا کہ کمبخت تجھ کو نوے سال تک میں پکارتا رہا اور تو نے ایک دن بھی میری بات کا جواب نہ دیا۔ میں قربان جاؤں اس خدا کے جس سے نوے سال تک میں بے رخی کرتا رہا اور ایک بار بھولے سے اس کا نام زبان سے نکل گیا تو اس نے فوراً مجھ پر توجہ کی۔

صاحبو جب ایک بت پرست کے بھولے سے یاد کر لینے پر اتنی توجہ ہوتی ہے تو کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ خدا تعالیٰ مسلمانوں پر متوجہ نہ ہوں گے۔ اگر وہ خدا کو راضی کرنا چاہیں تو وہ ضرور متوجہ ہوں گے۔ ذرا آپ خدا کو راضی کرنے کا قصد تو کیجئے۔ وہ تو یوں فرماتے ہیں۔

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ ☆ گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست ☆ صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

(تو جیسا بھی گنہگار ہے اپنے گناہ سے باز آ جا اگرچہ تیرے گناہ کفر، آتش پرستی اور بت پرستی ہی کیوں نہ ہوں، ہمارا دربار مایوسی اور ناامیدی کا دربار نہیں، سو دفعہ بھی اگر تو نے توبہ توڑ ڈالی ہے تو توبہ کر لے)

تو علم میں یہ کتنا بڑا نفع ہے۔ کہ اس سے رضائے حق نصیب ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے سلسلہ کو بند نہ کرنا چاہیے۔ اور اگر کبھی سلسلہ ٹوٹ جائے تو اس کو پھر جوڑ لینا چاہیے۔ اگر کسی سے پابندی کے ساتھ نہ ہو سکے تو بدون پابندی ہی کے علم حاصل کرتا رہے۔ نہ ہونے سے ہونا پھر بھی غنیمت ہے۔ اسی طرح کرتے کرتے ان شاء اللہ ایک دن نظام بھی پیدا ہو جائے گا۔ مولانا فرماتے ہیں۔

دوست دارد دوست ایں آشفتگی ☆ کوشش بیہودہ بہ از خفتگی!

(محبوب حقیقی اس آشفتگی و بدنظمی کو دوست رکھتے ہیں کیونکہ ایسی کوشش بھی کچھ نہ کرنے سے بہتر ہے)

واقعی مولانا بڑے حکیم ہیں کسی حال میں بھی سالک کو مایوس نہیں کرتے فرماتے ہیں کہ اگر ذکر و شغل میں پابندی اور انتظام نہ ہو تو اسی طرح بغیر پابندی اور بے ڈھنگے پن ہی سے کرتے رہو۔ دوست کو یہ بھی محبوب ہے۔ آگے دلیل کیا عمدہ بیان فرمائی کہ بے ڈھنگی کوشش سو رہنے سے تو بہتر ہی ہے۔ کیونکہ یہ شخص کوشش تو کر رہا ہے اور جو بالکل ہی چھوڑ کر الگ ہو گیا تو وہ اتنی کوشش بھی نہیں کرتا۔

صحبت کا اثر

اگر کسی سے تعلیم و تعلم کا مشغلہ بالکل ہی نہ ہو سکے اس کو چاہئے کہ کم از کم علماء سے ملتا جلتا رہے اوران سے دین کے مسائل پوچھتا رہے اوران کی صحبت میں کچھ عرصہ تک مقیم رہے بلکہ یہ ایسی چیز ہے کہ علم میں مشغول ہونے کے ساتھ بھی اس کو اختیار کرنا چاہیے۔ فقط کتابیں پڑھ لینے پر کفایت نہ کرنی چاہیے۔ کیونکہ ایک چیز ایسی ہے جو بدون صحبت کے حاصل نہیں ہوتی وہ دین کی مناسبت ہے۔ دین کے ساتھ تعلق اور مناسبت بدون صحبت کے نہیں ہوتی۔ صحبت کا وہ اثر ہے جس کو شیخ سعدیؒ نے بیان فرمایا ہے۔

گلے خوشبوے درحمام روزے ☆ رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکے یا عبیرے ☆ کہ از بوئے دلآویز تو مستم
بگفتا من گل ناچیز بودم ☆ ولیکن مدتے با گل نشستم
جمال ہم نشیں درمن اثر کرد ☆ وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

(حمام خانہ کی خوشبودار مٹی ایک دن میرے محبوب کے ہاتھ سے مجھے ملی میں نے کہا کہ تو مشک ہے یا عنبر ہے کہ تیری خوشبو سے میں مست ہو رہا ہوں، اس نے کہا کہ میں ایک ناچیز مٹی ہوں لیکن کچھ مدت تک پھول کی صحبت میں رہی ہوں تیرے ہمنشین پھول نے میرے اندر اپنا اثر ڈال دیا ورنہ میں تو وہی مٹی اب بھی ہوں جو پہلے تھی)

دیکھئے گلاب کے پاس رہنے سے مٹی میں خوشبو پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اہل محبت کے پاس رہنے سے خدا کی محبت اور دین کے ساتھ مناسبت حاصل ہو جاتی ہے۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی فضیلت صحبت ہی کی وجہ سے ہوئی۔ کہ آج کوئی امام اور فقیہ اور کوئی بڑے سے بڑا ولی ادنیٰ صحابی کے رتبہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ حالانکہ وہ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے بلکہ بہت سے علوم تو صحابہ کے بعد پیدا ہوئے۔ ان کے زمانہ میں ان علوم کا پتہ بھی نہ تھا جو آج کل کثرت سے موجود ہیں۔ انکا یہی کمال تھا کہ وہ ان علوم میں مشغول نہ ہوئے تھے کیونکہ

دلفریبان نباتی ہمہ زیور بستند ☆ دلبر ماست کہ با حسن خداداد آمد
زیر باراند درختہا کہ ثمرہا دارند ☆ اے خوشا سرد کہ از بند غم آزار آمد

(خودرو پودے زیور سے آراستہ ہیں ہمارے محبوب میں خداداد حسن ہے پھل دار

درخت زیر بار ہیں سرو بہت اچھا ہے کہ ہر غم سے آزاد ہے)

پس صحابہ کا بڑا کمال یہ تھا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت ان کو نصیب تھی۔ پس یاد رکھو کہ صحبت بدون علم متعارف کے مفید ہو سکتی ہے۔ مگر علم متعارف بدون صحبت کے بہت کم مفید ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل بہت سے علماء نظر آتے ہیں مگر ان میں کام کے علماء دو چار ہی ہیں۔ جن کو کسی کامل کی صحبت نصیب ہوئی ہے۔

الغرض میں نے ثابت کر دیا کہ علم سے ہر شخص مستفید ہو سکتا ہے اور کسی کے پاس جاہل رہنے کیلئے کوئی عذر نہیں گو عربی میں اور درس کے طور پر نہ سہی۔

امراء کی کوتاہی

البتہ جو متمول مالداروں کا ہے جن کو خدا نے ہر طرح سے دنیا کی فراغت عطا کی ہے کہ نہ ان کو ملازمت کی ضرورت ہے نہ کھانے پینے کا فکر ہے۔ خدا کا دیا ہوا ان کے پاس سب کچھ ہے اور اتنا ہے کہ کئی پشتوں کیلئے کافی ہے۔ ان کے ذمہ ضرور یہ حق ہے کہ یہ لوگ متجر عالم بنیں۔ کیونکہ آج کل جو لوگ علم حاصل کرتے ہیں ان کو بہت جلد اہل وعیال کی نفقہ کی فکر ہو جاتی ہے اس لیے وہ کمال تجر حاصل نہیں کر سکتے مگر نہایت افسوس ہے کہ ان لوگوں کو کچھ بھی فکر نہیں۔ یہ تو اگر ساری عمر علم میں گزار دیں تو ان کو بہت آسان ہے مگر سب سے زیادہ بے توجہ یہی طبقہ ہے۔ اور اگر کچھ توجہ ہے تو انگریزی کی طرف۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ لوگ انگریزی نہ پڑھیں۔ نہیں، اپنی دنیوی ضروریات کیلئے ضرور پڑھیں مگر ان کو ڈگری حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے کیونکہ یہ لوگ ملازمت سے مستغنی ہیں۔ جب ان کو ملازمت کی ضرورت نہیں تو بقدر ضرورت اپنے گھر پر کسی ماسٹر کو ملازم رکھ کر انگریزی سیکھ لیں جس سے اپنی ریاست وتجارت کا کام چلا سکیں۔ اور بقدر ضرورت تو انگریزی بہت جلد آ سکتی ہے، زیادہ عرصہ تو ڈگری میں لگتا ہے۔

تو ان لوگوں کو انگریزی پڑھنے سے میں منع نہیں کرتا، ہاں یہ کہتا ہوں کہ بہت پاس نہ جائیں، دور رہیں اور اتنی انگریزی تو عربی سے فارغ ہونے کے بعد بھی یہ لوگ سیکھ سکتے ہیں مگر یہ لوگ تو زیادہ مال وجاہ کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اسی لئے انگریزی میں ڈگریاں حاصل کر کے ملازمت کرتے ہیں۔ اس حرص کی وجہ سے یہ طبقہ سب سے زیادہ دین سے محروم ہے حالانکہ ان کو تو مولانا نظامی کے قول پر عمل کرنا چاہئے تھا ؎

خوشا روزگارے کہ دارد کسے ☆ کہ بازار حرصش نباشد بسے
بقدر ضرورت یسارے بود ☆ کند کارے ار مرد کارے بود

(فراغت عجیب چیز ہے اگر کسی کو حاصل ہو زیادہ کی اس کو تمنا نہ ہو اور اس کے پاس مال بھی ہو تو اس کو کچھ کرنا چاہیے، اپنے اوقات کو ضائع نہ کرے)

ان لوگوں کو چاہئے تھا کہ جب خدا نے ان کو فراغت دی تھی تو بے فکر ہو کر دین کی خدمت میں لگتے اور ساری عمر اسی میں ختم کر دیتے۔ پھر آپ دیکھتے کہ علماء میں کیسے کیسے لوگ پیدا ہوتے ۔ میں سچ کہتا ہوں کہ علم میں مشغول ہو کر ان کو وہ لذت آتی کہ کبھی سیری نہ ہوتی۔ یہ تو خدا کا راستہ ہے کہ قطع کرنے سے بڑھتا ہی جاتا ہے۔ اس کی طلب کبھی کم نہیں ہوتی وہ حال ہو جاتا ہے ۔

نگویم کہ بر آب قادر نیند ☆ کہ بر ساحل نیل مستسقی اند

(میں نہیں کہتا کہ پانی پر قادر نہیں لب دریا ہوتے ہوئے جلندھر کے بیمار کی طرح ہیں)

علم کی قدر

بخدا! بعض دفعہ جو کوئی نیا علم قلب پر وارد ہوتا ہے تو اس کا لطف ایسا ہوتا ہے کہ اگر کوئی مجھے اس کے مقابلہ میں ہفت اقلیم کی سلطنت دینا چاہے تو میں ہرگز گوارا نہ کروں ۔ اگر قدر شناسی ہو تو ایک نکتہ کا علم ایسا ہوتا ہے جس کے سامنے ساری دنیا گرد ہے۔ چنانچہ شعراء جب کبھی عمدہ شعر کہتے ہیں تو کہا کرتے ہیں کہ یہ شعر ہزار روپے کا ہے لاکھ روپے کا ہے۔

ایک شاعر تھا۔ ایک لڑکا اس سے شعر سیکھتا تھا۔ اس نے بیاض بنا رکھی تھی جس میں استاد کا کلام جمع کرتا رہتا تھا۔ کبھی استاد اس سے یہ کہتا کہ یہ شعر پانچ سو روپیہ کا ہے۔ کبھی یہ کہتا کہ یہ شعر ہزار روپے کا ہے۔ وہ لڑکا خوش ہو کر سب شعروں کو لکھتا جاتا۔ ایک دن اس کی ماں نے کہا کہ تو کیا کرتا ہے، نہ کچھ کماتا نہ لاتا ہے۔ اس نے کہا کہ میرے پاس اس وقت لاکھوں روپیہ کے اشعار جمع ہیں۔ کوئی شعر پانچ سو روپیہ کا ہے کوئی ہزار کا ہے۔ اس کی ماں نے کہا کہ اچھا آج تو ہمیں ایک پیسہ کی ترکاری لا دے۔ اس نے کہا، بہت اچھا۔ آپ کنجڑن کے پاس گئے کہ مجھے ایک پیسہ کی ترکاری دے دے۔ اس نے کہا، لاؤ پیسہ تو آپ نے اس کو ایک شعر سنا دیا کہ ہمارے پاس پیسہ تو نہیں البتہ یہ شعر تم لے لو، یہ پانچ سو روپیہ کا ہے۔ اس نے کہا کہ مجھے ان پانچ سو روپیہ کی ضرورت نہیں، مجھے تو آپ ایک پیسہ لا دیجئے جب ترکاری ملے گی۔

لڑکے کو بہت غصہ آیا اور استاد سے جا کر کہا، لیجئے اپنی بیاض! آپ نے مجھے بہت دھوکا دیا۔ یہ اشعار تو ایک پیسہ کے بھی نہیں اور آپ کہا کرتے تھے کہ یہ ہزار روپے کا ہے یہ دو ہزار روپے کا ہے۔ اس نے پوچھا کہ صاحبزادے تم یہ اشعار کس کے پاس لے گئے تھے۔ کہا، میں نے ایک کنجڑن کو ایک شعر دینا چاہا تھا۔ اس نے ایک پیسہ کو بھی نہ لیا۔ استاد نے کہا، تم نے بڑی غلطی کی۔ ان جواہرات کے فروخت کرنے کیلئے وہ بازار نہ تھا جہاں تم ان کو لے گئے۔ ان کا بازار دوسرا ہے۔ وہاں ان کی قیمت معلوم ہوگی۔ اب تم ہمارا فلاں قصیدہ بادشاہ کے دربار میں جا کر پڑھو اور کہہ دینا کہ یہ قصیدہ میں نے خود لکھا ہے۔ پھر تم کو ان کی قدر معلوم ہوگی چنانچہ لڑکا بادشاہی دربار میں گیا اور وہاں جا کر وہی قصیدہ بادشاہ کو سنایا پھر تو ہزاروں روپے انعام میں ملے اور خلعت وغیرہ بھی دیا گیا۔ اس وقت میں لڑکے کو معلوم ہوا کہ واقع میں استاد سچا تھا۔ میں نے ہی غلطی کی کہ ان جواہرات کو دوسرے بازار میں لے گیا۔ اگر قدر نہ ہو تو واقعی علمی نکات اس پیسہ کے بھی نہیں۔ جیسے اس کنجڑن نے کہا تھا۔ اور اگر قدر ہو تو پھر ان کی قیمت بہت زیادہ ہے۔

دہلی میں ایک شاعر کی زبان سے بے ساختہ ایک مصرع نکل گیا۔

لختے برداز دل گزرد ہر کہ زپیشم

(میرے سامنے سے جو بھی حسین گزرتا ہے وہ ایک ٹکڑا دل کا لے جاتا ہے)

اب آگے دوسرا مصرع نہیں آتا تھا۔ بہت پریشان ہوا مگر اگلا مصرع ہی نہ آیا۔ ایک دن وہ اسی فکر میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک خربوزہ بیچنے والا گزرا جس نے کسی شاعر سے ایک مصرع بنوالیا تھا یا خود اسی نے بنالیا تھا اور وہی مصرع صدا کی بجائے کہتا جا رہا تھا یعنی۔

من قاش فروش دل صد پارۂ خویشم (میں اپنے دل صد پارہ کی ایک ایک پھانک بیچتا ہوں)

شاعر اس مصرع کو سنتے ہی پھڑک اٹھا اور دوڑا ہوا اس کنجڑہ کے پاس گیا کہ بھائی یہ مصرع تو تو مجھ کو دے دے اور جتنے روپے تو کہے، مجھ سے لے لے کیونکہ میرا ایک مصرع نا تمام پڑا ہوا ہے اس کا جوڑ یہی مصرع ہو سکتا ہے۔ غرض پانچ سو روپے میں یہ بات طے ہوئی اور یہ شاعر پانچ سو روپیہ میں ایک مصرع خرید لایا۔ اب اس کے پاس پورا شعر ہو گیا۔

لختے برداز دل گزرد ہر کہ زپیشم ☆ من قاش فروش دل صد پارۂ خویشم

(میرے سامنے سے جو (حسین) گزرتا ہے وہ ایک ٹکڑا دل کا لے جاتا ہے، میں اپنے صد پارہ دل کی ایک ایک قاش بیچتا ہوں)

شاید آپ کی سمجھ میں مصرع خریدنے کا مطلب نہ آیا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ مصرع تو میری طرف منسوب کر دیا کرنا، اپنی طرف منسوب مت کرنا۔ بس اتنی بات کے اس نے پانچ سو روپے دے دیئے تھے۔ سو وجہ کیا تھی وہی قدر دانی۔ کیونکہ شاعر ہی اس کی قدر جان سکتا ہے۔ تو صاحبو! قدر وہ چیز ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے ایک علمی نکتہ ہزار مال و دولت سے بہتر ہوتا ہے۔

اس پر مجھے ایک اور حکایت یاد آئی۔ دہلی میں احمد مرزا فوٹو گرافر ہیں۔ فوٹو اتارنے میں یہ اپنے فن میں ماہر ہیں مگر حضرت مولانا گنگوہیؒ سے بیعت ہونے کے بعد انہوں نے زندہ کی تصویر بنانے سے توبہ کر لی ہے۔ وہ اپنا قصہ بیان کرتے تھے کہ ایک جنٹلمین میرے پاس آیا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ آپ کے پاس مہدی علی خان کا فوٹو ہے یا نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ میں نے اس سے کہہ دیا کہ بھائی اب تو میں نے اس سے توبہ کر لی ہے اور سب فوٹو تلف کر دیئے ہیں۔ کہنے لگا شاید کوئی پڑا ہوا نکل آوے۔ انہوں نے کہا، تم اس ردی میں تلاش کر لو شاید اس میں ہو۔ اس نے ردی میں تلاش کیا تو وہ فوٹو مل گیا جو نہایت صحیح تھا۔ اس نے پوچھا اس کی قیمت کیا ہے؟ احمد مرزا نے کہہ دیا کہ اب تو کچھ بھی نہیں۔ اس نے کہا میں اس شخص کا فوٹو مفت نہیں لے سکتا۔ کیونکہ یہ اس شخص کی نہایت توہین ہے یہ ایسا شخص نہیں جس کا فوٹو بلا قیمت لیا جائے۔ احمد مرزا نے کہا کہ مجھے تو اس کی قیمت لینا جائز نہیں کیونکہ شرعاً یہ مال مقتوم نہیں۔ اس نے کہا، پھر میں تو مفت نہ لوں گا۔ آپ اس کی قیمت نہ سمجھیں، میری طرف سے ہدیہ سمجھ لیں اور یہ کہہ کر جیب میں ہاتھ ڈالا تو تیرہ روپے نکلے۔ اس نے وہ سب ان کو دے دیئے اور کہا افسوس ہے اس وقت میری جیب میں اتنے ہی روپے تھے ورنہ میری نیت پچاس روپے دینے کی تھی اس وقت تو آپ اسی رقم کو ہدیہ قبول کر لیجئے۔ غرض بہت اصرار سے وہ شخص تیرہ روپے ایسے مال کے دے گیا۔ جو مالک کے نزدیک ایک کوڑی کا بھی نہ تھا۔

غرض ہر فن کی قدر کرنے والے خوب جانتے ہیں کہ یہ کیسی قابل قدر چیز ہے پھر یہ تو دنیا کا علم تھا اور اس علم کا کیا پوچھنا جو کہ دین کا علم ہے جو کہ آخرت کا ساتھی اور رضائے حق کا وسیلہ ہے۔

علم چوں بر دل زنی یارے شود ☆ علم چوں برتن زنی مارے شود

(علم اگر دل پر اثر کرے تو وہ دوست (مُعین) بن جاتا ہے، اور اگر علم دل میں اثر نہ کرے تو سانپ بن جاتا ہے)

انتخاب طلباء

میں یہ بیان کر رہا تھا کہ سب سے زیادہ علم سے بے فکر بڑے طبقہ کے لوگ ہیں حالانکہ خدا نے جو ان کو نعمتیں دی ہیں، اس کا شکر یہی تھا کہ یہ لوگ فارغ ہو کر علم دین میں تبحر حاصل کرتے اور اپنی اولاد کو عربی پڑھاتے صاحبو! جس طرح مال میں زکوٰۃ ہے اسی طرح اولاد میں بھی زکوٰۃ ہے پس اولاد کی بھی زکوۃ نکالو مگر یہاں چالیس کا عدد نہیں ہے۔ آپ زکوٰۃ کا نام سن کر خوش ہوئے ہوں گے کہ پس چالیس لڑکے ہو جائیں گے اس وقت زکوٰۃ نکال دیں گے۔ نہیں، یہاں دو میں سے ایک کو زکوٰۃ میں نکالو۔ اسے عربی پڑھاؤ مگر نہایت التجا کے ساتھ عرض کیا جاتا ہے کہ خدا کے لئے چھانٹ چھانٹ کر بے وقوفوں کو عربی کے لئے انتخاب نہ کرنا آج کل رؤسا اول تو اپنی اولاد کو عربی پڑھاتے ہی نہیں اور جو کوئی پڑھاتا بھی ہے تو لڑکوں میں جو سب سے زیادہ نکما بے وقوف ہو اسے عربی کے لئے انتخاب کیا جاتا ہے اور ہوشیار لڑکوں کو انگریزی پڑھائی جاتی ہے۔ جب کوئی دوست ان کے گھر آتا ہے اور پوچھتا ہے کہ یہ بی، اے میں پڑھتا ہے۔ یہ انٹرنیس کے درجہ میں ہے۔ یہ مڈل پاس کرنے والا ہے۔ اخیر میں عربی پڑھنے والے کو پیش کیا جاتا ہے کہ یہ ذرا ملانی طبیعت کا احمق سا ہے اس کو عربی پڑھا دی ہے۔ سبحان اللہ! آپ نے دین کی خوب قدر کی۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم کی یہی قدر ہے۔ خدا تعالیٰ کے کلام کی یہی عظمت ہے بھلا خدا اور رسولؐ کے علم کو سمجھنے والے یہی بے وقوف ہو سکتے ہیں جن کو آپ انتخاب کرتے ہیں۔

اسی کا تو یہ نتیجہ ہے کہ علماء کے اندر وہ بات آج نہیں ہے۔ جو ان میں ہونی چاہئے تھی۔ پھر اس پر لوگ کہتے ہیں کہ آج کل غزالی اور رازی پیدا نہیں ہوتے۔ میں کہتا ہوں کہ تم یہ الزام کس کو دیتے ہو ان بے وقوفوں کو غزالی اور رازی کون بنا دے۔ تم اپنی اولاد میں سے ذہین لڑکوں کو عربی پڑھاؤ۔ دیکھو وہ غزالی اور رازی بنتے ہیں یا نہیں۔ خدا کی قسم غزالی اور رازی اب بھی ہو سکتے ہیں۔ کیا مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ غزالی اور رازی سے کچھ کم تھے۔ واللہ بعض تحقیقات میں یہ حضرات ان سے بھی

www.alhaqq.org

بڑھے ہوئے تھے مگر جب تم احمقوں کو دین کے واسطے منتخب کرو گے تو ظاہر ہے کہ تمہارے مقتدا یہی احمق بنیں گے۔ ان میں عقل ہم کہاں سے پیدا کر دیں۔

شمشیر نیک ز آہن بد چوں کند کسے ☆ ناکس بتربیت نشود اے حکیم کس

(عمدہ تلوار برے لوہے سے کوئی کیونکر بنائے، نااہل کی تربیت سے آدمی عقل مند نہیں ہوسکتا)

علم دین کی برکت

مگر ان احمقوں کو تو ان کی حماقت ہی مبارک ہو گئی۔ اگر وہ احمق نہ ہوتے تو ان کو بھی انگریزی میں ٹھونس کر آپ جہنم کا کندہ بنا دیتے۔ اب وہ دین میں لگ گئے۔ خدا کو راضی کرنے کا طریقہ ان کو معلوم ہو گیا اور ان شاء اللہ وہ جنت کے مالک ہوں گے۔ قیامت کے دن ان کی حماقت ان کے کام آئے گی۔ اور دنیا میں بھی وہ علم دین کی برکت سے تمہارے مقتدا ہو گئے۔

اس حماقت کے مبارک ہونے پر مجھے عارف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ یاد آ گیا۔ وہ یہ کہ بالہام غیبی حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ کو حافظؒ کی تربیت کا حکم کیا گیا اور حکم بتلا دیا گیا کہ حافظ فلاں رئیس شخص کے بیٹے فلاں جگہ کے رہنے والے اور ایسے ایسے ہیں چنانچہ حضرت شیخ منازل طے کرتے ہوئے شیراز پہنچے۔ اور حافظ صاحب کے والد کے یہاں مہمان ہوئے۔ انہوں نے بہت تعظیم اور خاطر داری کی اور پوچھا کہ حضرت نے کیسے تکلیف فرمائی۔ فرمایا کہ ہم تمہارے بیٹوں کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ تم اپنی اولاد کو ہمارے سامنے پیش کرو۔ انہوں نے اپنے لڑکوں کو پیش کر دیا جو متعدد تھے۔ شیخ نجم الدین کبریٰ نے سب لڑکوں کو دیکھا مگر جس کی تلاش تھی وہ ان میں نہ ملا۔ فرمایا تمہارے اور کوئی لڑکا نہیں؟ انہوں نے کہا کوئی نہیں۔ وہ حافظ کو کالعدم سمجھتے تھے۔ شیخ نے فرمایا کہ ضرور ہے۔ حضرت حافظ صاحب کے والد نے کہا کہ ہاں حضور ایک لڑکا دیوانہ سا ہے۔ میں نے اس کو اسی لئے پیش نہیں کیا کہ وہ تو پاگل ہے۔ اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ دیکھئے! انہوں نے حضرت حافظ صاحب کو ایسا کالعدم سمجھا کہ ایک بار تو انکار ہی کر دیا کہ میرے اور لڑکا ہی نہیں۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ مجھے اسی دیوانہ کی ضرورت ہے اسی کو بلاؤ۔ حافظ صاحبؒ کے والد نے نوکر سے کہا کہ ارے اس کو ذرا تلاش کر لا۔ کہیں جنگل میں مارا مارا پھر رہا ہوگا۔ چنانچہ نوکر گیا تو واقعی وہ جنگل میں پھر رہے تھے اور اس حلیہ سے تشریف لائے کہ پنڈلیوں تک کیچڑ لگا ہوا تھا۔ بال کھلے ہوئے تھے۔ لباس

بھی خراب وخستہ۔ جونہی حضرت حافظ نے قدم رکھا اور شیخ نجم الدین کبریٰؒ پر نظر پڑی تو فوراً پہچان گئے کہ یہ شیخ کامل اور میرے مربی ہیں۔ اسی وقت بے ساختہ یہ شعر پڑھا ؎

آنانکہ خاک رابنظر کیمیا کنند ☆ آیا بود کہ گوشہ چشمے بما کنند

(وہ لوگ جو نظر سے خاک کو کیمیا بنا دیتے ہیں کیا وہ ہم پر ایک نظر کریں گے)

حضرت نجم الدین کبریٰ نے کھڑے ہو کر حافظ کو سینہ سے لگالیا اور فرمایا، بتو نظر کردم، بتو نظر کردم۔ اور جو کچھ ان کو دنیا تھا اسی وقت عطا فرما دیا اور تشریف لے گئے۔

تو حضرت بعضے احمق ایسے بھی ہوتے ہیں کہ بڑے بڑے عقلمندوں سے اچھے پڑ رہتے ہیں، غرض ان لوگوں کو تو ان کی حماقت مبارک ہوگئی مگر تم نے اس خیر خواہی کا قصد نہ کیا تھا۔ تم تو ان کو عربی میں نکما اور ناکارہ سمجھ کر ہی ڈالتے ہو۔ سو یہ کس قدر بے ہودہ بات ہے۔ تم کو چاہیے کہ علم دین کے واسطے ذہین ذہین لڑکوں کو انتخاب کرو اور جب خدا نے تم کو فراغت دی ہے تو بے فکری کے ساتھ ان کو مکمل نصاب کی تعلیم دو اور اگر پوری تعلیم نہیں دے سکتے تو عربی کا مختصر نصاب ہی ان کو ضرور پڑھا دو کہ بقدر ضرورت وہ بھی کافی ہے۔ اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کم از کم اردو میں تو ضرور ان کو آگاہ کردو اور چند روز کے لئے کسی کامل کی صحبت میں ان کو چھوڑ دو تاکہ وہ مسلمان تو بن جائیں۔

شاید تم یہ کہو کہ جب اردو میں مسائل معلوم ہو سکتے ہیں اور اس طرح بھی دین سے واقف ہو سکتے ہیں تو پھر عربی پڑھانے کی ہی کیا ضرورت ہے۔ سو خوب سمجھ لو کہ تعلیم دین عام ہونے سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عربی کی ضرورت ہی نہیں۔ عربی تعلیم سے استغناء بھی نہیں ہو سکتا۔ میرا مطلب صرف اتنا ہے کہ اگر تم عربی نہ پڑھانا چاہو تو کم از کم اردو ہی میں دین سے سے واقف کردو۔ باقی اردو پڑھنے والے عربی پڑھنے والے کے برابر کبھی نہیں ہو سکتا!

اس کی وجہ ایک بچہ نے بتلائی۔ واقعی غضب ہی کر دیا کہ اس نے ذرا سی عمر میں ایسی گہری بات کہی۔ میرا ایک عزیز ہے۔ اس کے والد نے بچپن ہی سے اس کو انگریزی تعلیم میں ڈال دیا تھا۔ ایک مرتبہ وہ شوخی کرتا پھرتا تھا۔ میں نے بلایا کہ ادھر آؤ باتیں کریں۔ وہ آیا، میں نے کہا، کہ بتلا عربی اچھی ہے یا انگریزی؟ بے ساختہ بولا کہ عربی۔ میں نے پوچھا کیوں؟ کہنے لگا کلام اللہ عربی میں ہے۔ عربی پڑھنے سے کلام اللہ خوب سمجھ میں آتا

ہے۔ مجھے اس کے اس جواب سے حیرت ہوگئی۔

پھر میں نے کہا کہ یہ تو صحیح ہے مگر اس سے دنیا نہیں ملتی نہ اس سے بڑی بڑی نوکریاں ملتی ہیں اور انگریزی پڑھنے سے بڑے بڑے عہدے ملتے ہیں تو عربی پڑھ کر کھائے کہاں سے؟ اس کا جواب بھی کس قدر گہرا دیا۔ کہنے لگا کہ جب آدمی عربی پڑھتا ہے تو وہ اللہ کا ہو جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں ڈالتے ہیں کہ اس کی خدمت کرو۔ لوگ اس کی خدمت کرتے ہیں۔ اس لئے وہ پریشان نہیں ہوتا۔ میں نے کہا کہ یہ بھی ٹھیک ہے مگر یہ ذلت کی صورت ہے کہ لوگوں کے نذرانوں پر پڑا رہتا ہے۔ کہنے لگا کہ ذلت تو خود مانگنے میں ہے اور اس میں کیا ذلت ہے کہ لوگ اس کو خوشامد کر کے دیں۔ میں نے کہا کہ واقعی تم خوب سمجھے۔

پھر میں نے کہا کہ تم کیوں انگریزی پڑھتے ہو؟ کہنے لگا ہم کیا کریں ابا یہی پڑھواتے ہیں۔ میں نے اس کے والد سے کہا کہ تم نے ناحق اس لڑکے کو انگریزی میں ڈالا۔ اس کو تو عربی ہی سے مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ پھر یہ واقعہ میں نے ان کو سنایا۔ وہ بھی آخر اسی کے باپ تھے۔ کہنے لگے کہ اس کو عربی سے تو خود ہی مناسبت ہے۔ اس لئے اس کو تو وہ خود حاصل کر لے گا۔ اور انگریزی سے اس کو مناسبت ہے نہیں وہ وہ میں نے پڑھا دی۔ کیونکہ اس کو وہ خود حاصل نہ کرتا اور آج کل اس کی بھی ضرورت ہے۔ میں نے کہا کہ اس کو عربی سے آج تو مناسبت ہے مگر مدت تک انگریزی پڑھنے کے بعد یہ حالت نہیں رہے گی۔ مگر انہوں نے اس کو انگریزی ہی میں رکھا۔ چنانچہ اب تک وہ انگریزی پڑھ رہا ہے۔ لیکن اب بھی اس میں ایک رگ ملانوں کی ہے جس سے امید ہے کہ ان شاء اللہ ایک دن وہ ادھر ہی کھنچے گا۔

تو صاحبو! عربی پڑھنے میں یہ بات ہے جو اس بچے نے بتلائی۔ کہ قرآن و حدیث کی پوری سمجھ عربی کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ہم ترجمے دیکھ کر سب سمجھ لیں گے۔ سو یاد رکھو کہ ترجموں سے کلام کی حقیقت سمجھ میں نہیں آسکتی۔

رفع اشکالات

علم ذوق کا نام ہے اور ذوق جبھی حاصل ہوگا جب کہ قرآن و حدیث کی زبان میں اس کو پڑھا جائے۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ اہل علم کو جو لطف قرآن میں آتا ہے وہ ترجمہ دیکھنے والے کو نہیں آسکتا اور قاعدہ یہی ہے کہ جو کتاب جس زبان کی ہو اس کا لطف جبھی آسکتا ہے جب کہ

اس زبان کو آپ جانتے ہوں۔ بہت سے اشکالات ترجمہ دیکھنے سے قرآن میں پیدا ہوجاتے ہیں جس کا جواب ذوق لسان ہی سے ہوسکتا ہے۔ بہت سے اشکالات نحو وصرف کے نہ جاننے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے ان علوم آلیہ کی بھی ضرورت ہے۔ بلکہ کچھ منطق وکلام کی بھی ضرورت ہے۔ کیونکہ بعض اشکالات ان ہی علوم کے جاننے سے رفع ہوجاتے ہیں بعض اشکالات سے ان علوم کے بغیر نجات نہیں ہوسکتی۔ اور اس کے نظائر بہت ہیں مگر میں نمونہ کے لئے چند مثالیں بیان کرتا ہوں جو طالب علموں کے سمجھنے کی باتیں ہیں۔

ایک صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مجھ کو کچھ پوچھنا ہے۔ مگر اول اس آیت کا ترجمہ کردو۔ **ووجدک ضالا فھدی** میں سمجھ گیا اور میں نے ترجمہ اس طرح کیا کہ پایا آپ کو ناواقف پس واقف بنادیا۔ یہ ترجمہ سن کر وہ میرے منہ کو تکنے لگے۔ میں نے کہا کہ اب پوچھو کیا پوچھتے ہو۔ کہنے لگا کہ اب تو وہ اشکال ہی نہ رہا۔ میں نے کہا تو کیا آپ کا یہ خیال تھا کہ میں اس جگہ ضالا کا ترجمہ گمراہ سے کروں گا اور وہ ترجمہ بھی غلط نہیں ہے مگر غلط فہمی زبان نہ جاننے سے ہوتی ہے وجہ یہ ہے کہ اردو میں تو گمراہ کا مفہوم یہی ہے کہ باوجود وضوح حق کے اس کو قبول نہ کرے۔ اور عربی میں ضلال اور فارسی میں گمراہی کا اطلاق عام ہے اس معنے کو بھی اور عدم وضوح کو بھی۔ پس ضال کے معنی گمراہ کے بھی ہیں اور بے خبری اور ناواقفی کے بھی ہیں۔

ایک اشکال ترجمہ پڑھنے والوں کو اس آیت پر ہوتا ہے

وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا

اور ہرگز نہیں دیں گے حق تعالیٰ مسلمانوں پر کوئی راہ یعنی غلبہ۔

اشکال یہ ہوتا ہے کہ ہم تو بارہا مشاہدہ کرتے ہیں کہ کفار مسلمانوں پر غالب ہوجاتے ہیں۔ اس کے بہت سے جواب علماء نے دیئے ہیں۔ لیکن اگر قرآن کے ساتھ ذوق ومناسبت ہو تو وہ ضرور یہ سمجھے گا کہ کلام اللہ غیر مرتبط نہیں ہے۔ پھر جب اس کو مرتبط سمجھے گا تو ہر مقام پر سیاق وسباق کو بھی دیکھے گا۔ چنانچہ اس آیت پر اشکال اس لئے ہوا کہ لوگوں نے لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا کے سباق کو نہ دیکھا اس میں یہ حکم آخرت کے ساتھ مخصوص ہے۔ چنانچہ اس سے پہلے یہ ارشاد ہے فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ، حق تعالیٰ قیامت کے دن تمہارے درمیان فیصلہ کریں گے۔ یعنی قیامت میں کفار

و مسلمین کا فیصلہ ہو جائے گا کہ کون حق پر تھا کون ناحق پر۔ اس کے بعد فرماتے ہیں وَلَنْ یَّجْعَلَ اللّٰہُ لِلْکٰفِرِیْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا اور اللہ تعالیٰ کفا کو مسلمانوں پر ہرگز غلبہ نہ دیں گے یعنی اس فیصلہ میں جو آخرت میں ہوگا۔ اب کوئی اشکال نہ رہا۔

بعض دفعہ قاعدہ صرف کے نہ جاننے سے اشکال ہوتا ہے چنانچہ ایک مرتبہ اخباروں میں یہ خبر مشہور ہوئی تھی کہ امریکہ میں ایک شخص کے دو دل ہیں۔ اس سے بعض لوگوں کو اشکال ہوا کہ یہ تو قرآن کے منافی ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

مَاجَعَلَ اللّٰہُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَیْنِ فِیْ جَوْفِہٖ یعنی خدا تعالیٰ نے کسی آدمی کے اندر دو دل نہیں بنائے۔

اس کا جواب ایک تو یہی ہے کہ اہل اخبار کی خبر کا اعتبار ہی کیا۔ کسی نے اس کے پیٹ کو چیر کر تو نہیں دیکھا۔ محض قیاس اور گمان سے یہ حکم لگا دیا ہے کہ اس شخص کے دو دل ہیں۔ سو ممکن ہے کہ اس شخص کا دل بہت قوی ہو۔ اس لئے دو دل ہونے کا شبہ ہو گیا ہو۔ یہ جواب تو بطور منع کے ہے۔ اور بعد تسلیم کے جواب یہ ہے کہ قرآن میں ماجعل صیغہ ماضی کا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ نزول قرآن کے وقت تک خدا نے کسی کے دو دل نہیں بنائے۔ اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ آئندہ بھی کسی کے دو دل نہ بنائیں گے پس اگر یہ واقعہ صحیح بھی ہو تب بھی قرآن پر کوئی اشکال نہیں۔

اور بعض اشکالات کا جواب نحوی قاعدہ سے دیا جاتا ہے چنانچہ میرے پاس ایک ملاجی آئے اور کہنے لگے کہ وضو میں پاؤں دھونا جو فرض ہے اس کی دلیل کیا ہے۔ قرآن میں تو پیروں کے مسح کا حکم ہے۔ میں نے کہا کہ قرآن میں کہاں ہے۔ کہنے لگے کہ شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ سے معلوم ہوتا ہے۔ پھر وہ مترجم قرآن میرے پاس لائے اور یہ آیت دکھائی۔

فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِکُمْ
وَاَرْجُلَکُمْ اِلَی الْکَعْبَیْنِ

ترجمہ یہ لکھا ہوا تھا۔ پس دھوؤ اپنے مونہوں کو اور ہاتھوں کو کہنیوں تک اور ملو اپنے سروں کو اور پیروں کو دو ٹخنوں تک۔ شاہ صاحب نے یہاں فعل مقدر کو ظاہر نہ کیا تھا اور مسح کا ترجمہ محاوروں کے موافق کر دیا۔ ورنہ بعضے تراجم میں تقدیر فعل کو ظاہر کر کے اس طرح ترجمہ کیا ہے اور دھوؤ اپنے پیروں کو دو ٹخنوں تک اور بعض ترجموں میں مسح کا ترجمہ مسح ہی سے کیا ہے۔ اس طرح کہ مسح کرو اپنے سروں کا۔ تو اس میں لفظ کو نہیں آیا۔ اس ترجمہ پر کچھ اشکال نہیں ہو سکتا

www.alhaqq.org

مگر شاہ صاحب کے ترجمہ میں ملاجی کو یہ شبہ ہوا کہ پیروں کے لئے بھی مسح کا حکم ہے۔

میں بہت پریشان ہوا کہ اس اشکال کا جواب تو نحوی قاعدہ پر موقوف ٹھہرا۔ اب اگر میں ان کو نحوی قاعدہ سے جواب دوں، تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ان کے سامنے عطف اور تقدیر کی تحقیق بیان کروں جس کو یہ سمجھ ہی نہیں سکتے آخر میں ان سے کہا کہ جس کلام کا یہ ترجمہ ہے یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ کلام اللہ ہے۔ بولے کہ علماء کے کہنے سے معلوم ہوا۔ میں نے کہا افسوس یا تو علماء اتنے ایمان دار ہیں کہ وہ ایک عربی عبارت کو کلام اللہ کہہ دیں تو سچے اور یا اتنے بے ایمان ہیں کہ اگر وہ ایک فعل کو مرض کہیں تو جھوٹے۔ اس پر چپ ہوئے میں نے کہا، خبردار جو تم نے کبھی ترجمہ دیکھا۔ ایسوں کو ترجمہ دیکھنا بے شک ناجائز ہے۔

اسی طرح بہت سے اشکالات ہیں جن کے جواب علوم آلیہ پر موقوف ہیں۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ عوام کو ترجمہ خود نہ دیکھنا چاہیئے۔ بلکہ اگر شوق ہو تو کسی عالم سے سبقاً سبقاً پڑھنا چاہیے۔

غرض اس اشکال کا جواب یہ تھا کہ یہاں ارجلکم کا عطف وجوھکم پر ہے۔ خیر یہ اشکال تو کچھ نہیں، بڑا اشکال اس جگہ یہ ہوتا ہے کہ ایک قرأت متواترہ میں وارجلکم بالجر بھی آیا ہے اور اس صورت میں بظاہر اس کا عطف رؤسکم کے اوپر اور فامسحوا کے تحت میں ہے اس کا جواب علماء نے یہ دیا ہے کہ اس میں جر جوار ہے ورنہ حقیقت میں اس کا عطف فاغسلوا کے تحت میں ہے۔ اور گر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ اس کا عطف فامسحوا کے تحت میں ہے۔ جب بھی پیروں کے لئے مسح کا حکم لازم نہیں آتا کیونکہ محاورات میں بعض دفعہ دو ایسی چیزوں کو جن کے ساتھ دو فعل متعلق ہوتے ہیں اختصار کے لئے ایک ہی فعل کے تحت میں بیان کر دیتے ہیں۔

مثلاً دعوت کے موقعہ پر کہا کرتے ہیں کہ کچھ دانا پانی ہمارے یہاں بھی کھا لیجئے گا۔ حالانکہ پانی تو پینے کی چیز ہے کھانے کی چیز نہیں اصل کلام اسی طرح تھا کہ کچھ دانا کھا لیجئے گا پانی پی لیجئے گا مگر اختصار کے لئے ایک فعل کو حذف کر کے دونوں چیزوں کو ایک فعل کے تحت میں ذکر کر دیتے ہیں۔

اسی طرح اگر کوئی پوچھے (یعنی ایسے مقام پر جہاں دودھ پینا بولا جاتا ہے دودھ کھانا نہ بولا جائے۔ ۱۲ منہ) کہ تم نے دعوت میں کیا کھایا تھا، تو جواب میں کہا کرتے ہیں پلاؤ، زردہ، دودھ، دہی، گوشت کھایا تھا حالانکہ دودھ پینے کی چیز ہے۔ یوں کہنا چاہئے تھا کہ دودھ پیا تھا باقی چیزیں کھائی تھیں۔

جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اب سمجھو کہ ارجلکم کا عطف اگر فامسحوا کے تحت میں بھی مان لیا جائے تو یہ لازم نہیں آتا کہ پیروں کے لئے مسح کا حکم ہے بلکہ یہ کہا جائے گا کہ روٴس وارجل کا تعلق اصل میں دو فعلوں سے تھا۔ ایجازاً ایک فعل کو حذف کر دیا گیا اور ظاہر میں دونوں کو فامسحوا کے متعلق کر دیا گیا اور مطلب وہی ہے کہ سر کا مسح کرو اور پیروں کو دھوؤ۔ عربی میں اس کی نظیر یہ کلام ہے علفتہا تبنا وماء اباردا۔ اور اگر وامسحوا کے حکم کو بھی ارجلکم کے متعلق مان لیا جائے تب بھی کچھ اشکال نہیں۔ کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ دو قرأتیں بمنزلہ دو آیتوں کے ہوا کرتی ہیں۔ جس طرح دو آیتیں اپنے اپنے حکم کو مستقلاً ثابت کرتی ہیں اور دونوں پر عمل ضروری ہے اسی طرح دو قرأتیں بھی معمول بہا ہوتی ہیں۔ پس ارجلکم میں قرأت بالجر ہونے سے یہ معلوم ہوا کہ پیروں کے لئے مسح کا بھی حکم ہے۔

رہا یہ کہ غسل کا حکم نہیں ہے۔ یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کیونکہ قرات نصب غسل کو لازم کر رہی ہے۔ تو مجموع قرأتین سے یہ ثابت ہوا کہ پیروں کیلئے مسح اور غسل دونوں کا حکم ہے۔ اس طرح کہ قراءت جر بحالت لبس خف ہے اور قرات نصب بحالت عدم خف ہے۔ یہ تاویل بھی بہت عمدہ ہے۔

اور ایک توجیہ میرے ذہن میں ایک سوال کے وقت آئی۔ وہ یہ کہ مسح کے معنے ملنے کے ہیں خواہ بدون غسل کے یا مع غسل کے۔ پس دھونا تو ایک قرأت سے اور حدیث متواتر سے فرض ہوا اور ملنا جر سے مامور بہ ہوا بمعنے مستحب جس کی وجہ یہ ہے کہ پیروں کی کھال سخت ہوتی ہے تو عادۃً اکثر اس پر پانی بہانا کافی نہیں ہوتا۔ ملنے سے پانی پہنچتا ہے۔ چنانچہ فقہا نے اسی اہتمام کے لیے اس کو بھی مندوب کہا ہے کہ وضو کے قبل پاؤں کو تر کر لیا جاوے۔ پھر آخر وضو میں دھویا جاوے۔ غرض آپ نے معلوم کر لیا کہ نحو کی کس قدر ضرورت ہے کیونکہ بعض اشکالات اسی سے رفع ہوتے ہیں۔

چنانچہ ایک نیچری مفسر نے دعویٰ کیا تھا کہ قرآن میں غلامی کے مسئلہ کا ثبوت نہیں ہے بلکہ ایک آیت سے تو اس کی نفی ہوتی ہے اور وہ آیت یہ ہے:

فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَآءً

اس سے پہلے جہاد کا ذکر ہے ارشاد فرماتے ہیں:

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ

پس جب تم کفار کے مقابل ہو تو ان کی گردنیں مارو (یعنی قتل کرو) یہاں تک کہ جب تم ان کی خوب خونریزی کر چکو تو (تم کو دو اختیار ہیں) یا تو بلا معاوضہ چھوڑ دینا جو کہ احسان ہے یا معاوضہ لے کر چھوڑ دینا اس سے اس نئے مفسر نے یہ استدلال کیا کہ اس آیت میں بطور حصر کے دو باتیں مذکور ہیں جس سے یہ لازم آتا ہے کہ تیسری صورت (یعنی غلام بنانا) جائز نہیں۔

اس تقریر سے ایک عالم کو شبہ پڑ گیا۔ اس کا جواب ایک دوسرے عالم نے ان کو یہ دیا کہ پہلے آپ یہ بتلائیں کہ یہ قضیہ کون سا ہے حملیہ یا شرطیہ اور شرطیہ ہے تو متصلہ یا منفصلہ اور منفصلہ ہے تو حقیقیہ یا مانعۃ الجمع یا مانعۃ الخلو۔ بس اتنی بات میں سارے اشکال کو درہم برہم کر دیا۔ کیونکہ حاصل جواب کا یہ ہوا کہ قضیہ ممکن ہے کہ مانعۃ الجمع ہو۔ یعنی ان دونوں کا جمع کرنا ممتنع ہے لیکن یہ ممکن ہے کہ یہ دونوں صورتیں مرتفع ہوں اور تیسری کوئی صورت ہو کیونکہ مانعۃ الجمع کا حکم بھی ہے کہ ان کا اجتماع جائز نہیں ہوتا۔ اور دونوں کا ارتفاع ممکن ہے۔

مثلاً دور سے کسی چیز کو دیکھ کر ہم یہ کہیں کہ یہ چیز یا تو درخت ہے یا آدمی ہے۔ اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ان دونوں کا اجتماع تو ناممکن ہے ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ نہ درخت ہو نہ آدمی ہو بلکہ کوئی تیسری چیز ہو گھوڑا بیل وغیرہ۔ اسی طرح اس آیت کا بھی یہی مطلب ہے کہ من وفدا دونوں کا جمع کر ممتنع ہے۔ البتہ دونوں سے خلو ممکن ہے۔ تو اب اس سے غلامی کی نفی کیونکر ہوئی۔ سو دیکھیے جو شخص مانعۃ الجمع و مانعۃ الخلو کی حقیقت نہ جانتا ہو وہ نہ اس اشکال کو دور کر سکتا ہے اور نہ جواب کو سمجھ سکتا ہے۔

اسی طرح ایک اور آیت میں دوسرا اشکال ہے۔ آیت یہ ہے:

وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَّأَسْمَعَهُمْ ۚ وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوا وَّهُم مُّعْرِضُونَ

بظاہر اس آیت میں شکل اول کی صورت معلوم ہوتی ہے۔ ترجمہ یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ ان (کفار) میں کچھ بھلائی اور خیر دیکھتے تو ان کو (دین کی باتیں) سنا دیتے۔ اور اگر ان کو سنا دیتے تو وہ اعتراض کرتے ہوئے پیٹھ موڑ دیتے۔ شکل اول کے قاعدہ پر اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے لو علم اللہ فیھم خیرا لتولوا یعنی اگر حق تعالیٰ ان میں بھلائی دیکھتے تو وہ پیٹھ موڑ دیتے۔ حالانکہ یہ نتیجہ محال کو مستلزم ہے کیونکہ جس صورت میں حق تعالیٰ کو ان کے اندر بھلائی معلوم ہوتی اس صورت میں تو وہ حق بات کو قبول کرتے۔ اس حالت میں اعراض

کیونکر ممکن تھا۔ کیونکہ اعراض تو شر ہے خیر کے ساتھ۔ اس کا اجتماع نہیں ہوسکتا ورنہ لازم آئے گا کہ ان میں خیر ہی نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں شکل اول ہی نہیں کیونکہ یہاں حد اوسط مکرر نہیں۔ **لاسمعهم** اول سے مراد تو یہ ہے **لاسمعهم فی حالة علم الخیر فیهم** اور ثانی سے مراد یہ ہے کہ **لو اسمعهم فی حال عدم علم الله فیهم خیرا**۔ حاصل آیت کا یہ ہوا کہ اگر خدا تعالیٰ کو ان میں بھلائی کا ہونا معلوم ہوتا تو وہ ضرور ان کو دین کی باتیں سنا دیتے اور وہ ان کو قبول بھی کر لیتے۔ اور اگر اس حالت میں کہ خدا کو معلوم ہے کہ ان میں بھلائی نہیں ہے سرسری طور پر ان کو دین کی باتیں سنا دی جائیں تو وہ اعراض ہی کریں گے۔ اب وہ اشکال رفع ہو گیا۔ اس سے آپ کو منطق کی ضرورت معلوم ہو گئی ہوگی۔

اسی طرح علم کلام کی بھی ضرورت ہے کیونکہ قرآن میں بعض مضامین ایسے مذکور ہیں جن کا ظاہری مضمون جو عام طور پر سمجھ میں آتا ہے، مراد نہیں مثلاً

فثم وجه الله یداه مبسوطتان ، علی العرش استوی والسموت مطویت بیمینه

یعنی کسی جگہ کہا گیا ہے کہ جدھر تم منہ کرو خدا کا رخ ادھر ہی ہے کہیں فرمایا ہے کہ خدا کے دونوں ہاتھ کشادہ ہیں۔ کہیں فرمایا ہے کہ خدا عرش پر مستوی ہے کہیں فرمایا ہے کہ آسمان خدا کے ہاتھ میں لپیٹے ہوئے ہوں گے۔ تو اس سے بعض جاہلوں کو یہ شبہ ہوگا کہ خدا کے بھی ہماری طرح منہ اور ہاتھ اور پیر ہیں۔ مگر علم کلام کے دلائل سے معلوم ہوگا کہ خدا تعالیٰ جوارح اور مکان وزیان سے پاک ہے اس کے لئے ان چیزوں کا ثابت ہونا حقیقۃً ممکن نہیں۔ ہاں مجازاً کوئی دوسرے معنی مراد لئے جائیں تو ممکن ہے۔ چنانچہ علماء نے ان آیات کے معانی خدا کی شان کے لائق بیان بھی کئے ہیں اور سلف کا طرز اس بارہ میں سکوت ہے۔ تو علم کلام سے معلوم ہوگا کہ خدا تعالیٰ کیلئے کس صفت کا ثابت ہونا ضروری ہے اور کن کن باتوں سے اس کا پاک ہونا ضروری ہے۔

مفید علم

اس لئے دوسری علوم کی بھی ضرورت ہے اور وہ علوم عربی میں مدون ہیں۔ لہٰذا عربی کی سخت ضرورت ہے۔ شریعت، کا علم کامل بغیر علوم عربیہ کے حاصل نہیں ہوسکتا۔ لیکن اگر کسی

کو علم کامل کی فرصت نہ ہو وہ ناقص سے تو محروم نہ رہے۔

مالایدرک کلہ لا یترک کلہ

پس عوام نے یہ غلطی کی کہ انہوں نے اردو میں بھی علم نہ سیکھا اور علماء نے یہ غلطی کی کہ عربی تو سیکھی مگر بعضے علم غیر نافعہ میں مشغول ہو گئے ان دونوں غلطیوں پر اس آیت میں تنبیہ ہے۔

وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۭ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ڜ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ

اس آیت میں ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ حق تعالیٰ یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہودیوں کو معلوم ہے کہ جو شخص علم مضر کو اختیار کرے۔ آخرت میں اس کے لئے (اس علم کی وجہ سے) کچھ حصہ نہیں۔ آگے فرماتے ہیں۔ لو کانوا یعلمون۔ کاش وہ جاننے والے ہوتے۔ اس پر اشکال یہ ہوتا ہے کہ جب وہ جانتے تھے تو پھر اس کا کیا مطلب کہ کاش وہ جانتے ہوتے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس پر تنبیہ فرمایا ہے کہ جس علم پر عمل نہ ہو وہ بمنزلہ جہل کے ہے۔ اس لئے یہودیوں کا وہ جاننا تو نہ جاننے کے برابر ہو گیا۔ اب آئندہ کی نسبت فرماتے ہیں کہ کاش اب بھی جان لیں یعنی اپنے علم پر عمل کرنے لگیں۔

اور یہاں سے میں ایک اور غلطی پر آپ کو متنبہ کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ اس آیت سے یہ معلوم ہو گیا کہ علوم نافعہ وہ ہیں جو آخرت میں کام آئیں مطلق علوم مراد نہیں۔ اب آج کل بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ علم کی فضیلت میں آیات و احادیث لکھتے ہیں اور اس پر زور دیتے ہیں کہ شریعت میں علم حاصل کرنے کی بہت تاکید ہے۔ اور اس کے بعد ان تمام فضائل کو انگریزی تعلیم پر چسپاں کرتے ہیں۔ اس تمام تمہید کے بعد وہ انگریزی پڑھنے کی ضرورت ثابت کرتے اور اس کی ترغیب دیتے ہیں۔ جس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ گویا انگریزی پڑھنے سے یہ تمام فضائل حاصل ہو جائیں گے۔

سو خوب سمجھ لو کہ یہ لوگ سخت دھوکا دیتے ہیں۔ شریعت میں جتنے فضائل علم کے مذکور ہیں ان سے مراد وہ علم ہے جو آخرت میں مفید ہو یعنی علم شرائع و احکام، انگریزی تعلیم اس سے مراد نہیں۔ ہاں اگر انگریزی میں دینی مسائل کا ترجمہ ہو جائے تو پھر ان انگریزی کتابوں کا پڑھنا بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ اردو میں دینی رسائل کا پڑھنا مگر شرط یہ ہے کہ ترجمہ کرنے

والا محض انگریزی داں نہ ہو بلکہ محقق عالم ہو یا کسی انگریزی داں محقق عالم نے اس کی اصلاح اور تصدیق کر دی ہو۔ ایسا ترجمہ نہ ہو جیسا کہ ایک صاحب نے انگریزی میں شرع محمدی کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ جس میں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ تعجب کی حالت میں طلاق نہیں پڑتی۔ مجھے اس کی خبر اس طرح ہوئی کہ ایک مقام پر ایک واقعہ طلاق کا پیش آیا تھا۔ اس میں طلاق دینے والے کے بعض خیر خواہوں کو فکر ہوئی کہ کسی طرح کچھ گنجائش نکل آئے تو چھپا چھپی کر دیں۔ چنانچہ مختلف کتابیں دیکھی گئیں۔ ان میں وہ شرع محمدی بھی نکالی گئی۔ اس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ تعجب کی صورت میں طلاق نہیں ہوئی جس میں یہ صورت بھی داخل ہے کہ مثلاً کسی کی بیوی نے خلاف عادت ایک دن خوب زینت و آرائش کی۔ شوہر کو یہ حالت دیکھ کر تعجب پیدا ہوا۔ اس نے تعجب میں کہہ دیا کہ تجھے میں تین طلاق اب یہ انگریزی مفتی فرماتے ہیں کہ طلاق نہیں ہوئی کیونکہ تعجب میں دی گئی۔ **لاحول ولاقوۃ الا باللہ!**

جب میرے پاس یہ کتاب لائی گئی۔ میں نے کہا کہ یہ مسئلہ تو بالکل غلط ہے اس کی کچھ بھی اصل نہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ مدہوش کی طلاق نہیں ہوتی۔ مدہوش عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں ''از عقل رفتہ'' بعضے غصہ وغیرہ میں اگر کوئی شخص حواس باختہ ہو جائے کہ اس سے مجنونانہ حرکتیں صادر ہونے لگیں۔ مثلاً دیوار میں سر مارنے لگے یا اپنے ہاتھ میں کاٹنے لگے۔ غرض ایسا بے تاب ہو کہ عقل زائل ہو جائے تو اس کی طلاق نہیں ہوتی۔

ان حضرت نے لفظ تو عربی دیکھا اور ترجمہ کیا اردو میں محاورہ کے موافق اردو میں۔ مدہوش حیرت زدہ کو بھی کہتے ہیں۔ پس شاید مدہوش کا ترجمہ متحیر کا کیا ہوگا۔ پھر متحیر کا ترجمہ متعجب کر دیا ہوگا۔ یا نہ معلوم انہوں نے انگریزی کا کون سا لفظ مدہوش کے ترجمہ میں اختیار کیا ہوگا۔ پھر اس کا ترجمہ اردو میں ہوا تو وہ کچھ سے کچھ ہو گیا یعنی ٹیڑھی کھیر ہو گئی۔

ٹیڑھی کھیر کی حکایت شاید آپ نے نہ سنی ہوگی۔ ایک لڑکے نے اپنے اندھے میاں جی سے کہا کہ آج آپ کی ہمارے یہاں دعوت ہے۔ کہا، کیا کھلائے گا؟ اس نے کہا، کھیر۔ کہنے لگے کہ کھیر کیا ہوتی ہے؟ لڑکے نے کہا کہ چاولوں میں مٹھائی ڈال کر پکاتے ہیں۔ حافظ جی نے پوچھا کہ وہ کیسی ہوتی ہے؟ اس نے کہا کہ سفید ہوتی ہے۔ اندھے میاں جی سیاہ سفید کیوں دیکھا تھا۔ کہنے لگے سفید کیسا ہوتا ہے؟ لڑکے نے کہا جیسے بگلا۔ انہوں نے

بگلا بھی نہ دیکھا تھا۔ بولے کہ بگلا کیسا ہوتا ہے۔ لڑکے نے بگلے کی صورت اپنے ہاتھ پر بنا کر اس پر حافظ جی کا ہاتھ پھیرا کر بگلا ایسا ہوتا ہے۔ تو وہ یہ سمجھے کہ بس کھیر بھی اسی شکل کی ہوتی ہوگی۔ کہنے لگے کہ یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے گلے سے بھی نہ اترے گی۔

تو دیکھئے بات کیا تھی اور کہاں پہنچ گئی۔ اسی طرح مدہوش کا مسئلہ ترجمہ در ترجمہ ہونے سے یہاں تک پہنچ گیا کہ تعجب میں طلاق نہیں پڑتی۔ پھر غضب یہ ہے کہ وہ کتاب قانون میں داخل ہے اسی کے موافق فیصلے ہوتے ہوں گے۔ نہ معلوم کس کس کو اس مسئلہ کے موافق طلاق سے بری کر دیا گیا ہوگا۔ بس یہ مترجم رہ گئے ہیں اور ان کی کتابیں قانون میں داخل ہیں جن کو شریعت سے ذرا بھی مس نہیں۔ بس وہی حال ہو رہا ہے ؎

گربہ میر و سگ وزیر و موش را دیواں کنند ☆ ایں چنیں ارکان دولت ملک را ویراں کنند

اذا کان الغراب دلیل قوم ☆ لیھم طریق الھا لکلینا

(بلّی حاکم، کتا وزیر اور چوہا دیوان ہوا ایسے اراکین سلطنت ملک کو ویران کر دیں گے یعنی نا اہلوں سے ملک برباد ہو جاتا ہے، جب کسی قوم کا لیڈر کوّا ہو تو ظاہر ہے کہ وہ انہیں ہلاکت کی راہ پر لے جائے گا)

کام کی باتیں

صاحبو! اس کے متعلق گورنمنٹ سے درخواست کرنے کی سخت ضرورت ہے کہ اس غلطی کی بہت جلد اصلاح کی جائے۔ یہ مسئلہ بالکل غلط ہے اور جس قدر ترجمے قانون میں داخل ہیں ان کو دو چار محقق عالموں کو دکھا کر پاس کیا جائے۔ محض ایک شخص کے ترجمے کر دینے سے اس کے موافق فیصلے نہ کئے جائیں۔ دیکھئے یہ کام کرنے کا ہے مگر مسلمان ایسے کام نہیں کرتے جن کی دینی اعتبار سے فوری ضرورت ہے کہ نہ معلوم اس غلط مسئلہ کی وجہ سے کتنی بدکاریاں مسلمانون میں ہوتی ہوں گی اور یہ بات ایسی ہے کہ اگر مسلمان گورنمنٹ سے اس کی اصلاح کی درخواست کریں تو وہ فوراً اس پر توجہ کرے گی۔ مگر آج کل لوگوں کی یہ حالت ہے کہ جو کام ہو سکتا ہو، جس کی تدابیر ان کے اختیار میں ہوں جس میں کامیابی کی پوری امید ہو، وہ کام تو کرتے نہیں اور جو کام اختیار سے باہر ہو، جو ان سے نہ ہو سکے، اس کے پیچھے پڑتے ہیں۔ جیسا کہ مشاہدہ ہو رہا ہے۔ میں کہتا ہوں ؎

آرزو می خواہ لیک بر اندازہ خواہ ☆ بر نہ تابد کوہ را یک برگ کاہ

(آرزو کی خواہش کرو لیکن اپنے اندازہ کے موافق خواہش کرو، ایک گھاس کا پتہ پہاڑ کو نہیں اٹھا سکتا)

اور یہ مذاق بھی اسی جہالت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اگر لوگ دین سے واقف ہوتے تو الاہم فالاہم پر عمل کرتے۔ غرض ہر کام کے لئے علم دین کی سخت ضرورت ہے۔ علم دین کے بغیر یہی نہیں معلوم ہوتا کہ ضروری کون سی چیز ہے اور غیر ضروری کون سی چیز ہے۔

پس اگر انگریزی میں کسی محقق نے دینی مسائل لکھ دیئے ہوں تو پھر ان انگریزی کتابوں کا پڑھنا بھی ثواب میں داخل ہے۔ باقی عام لوگوں کی انگریزی کتابیں خواہ وہ دین ہی کی طرف منسوب ہوں، قابل اعتبار نہیں اور جن میں دین کا نام بھی نہ ہو وہ تو محض دنیا ہے۔ ایسی تعلیم و تعلم پر علمی فضیلت کی احادیث و آیات کو منطبق کرنا تو نری جہالت ہے۔

اب میں بیان کو ختم کرنا چاہتا ہوں کیونکہ بہت دیر ہوگئی ہے نماز ظہر کا بھی وقت آ گیا ہے۔ بس میں خلاصہ وعظ کا بیان کر کے ختم کرتا ہوں۔

خلاصہ یہ ہوا کہ تعلیم علم دین کو وسیع کرنا چاہیے۔ علم دین کو عربی ہی کے ساتھ مخصوص نہ کرنا چاہیے۔ اور اس کے ضمن میں میں نے ہر طبقہ کی تعلیم کا طریقہ بھی بتلا دیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ عربی کو فضول نہ سمجھیں۔ جو لوگ معاش سے فارغ ہوں ان پر عربی پڑھنا اور اولاد کو پڑھانا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ لیکن معلمین کو بھی میں ہدایت کرتا ہوں کہ وہ اپنا طرز تعلیم بدلیں۔ طالب علم کی حیثیت کے موافق تقریر کیا کریں۔ میزان الصرف میں شرح ملا جامی نہ پڑھایا کریں۔

میں نے ایک مدرس کو دیکھا کہ وہ اللہ کے بندے میزان میں یہ بیان کر رہے تھے کہ الحمد میں جو الف لام ہے یہ استغراق کا ہے۔ الف لام کی چار قسمیں ہیں۔ ایک جنسی، ایک عہد خارجی، ایک عہد ذہنی، ایک استغراقی۔ بھلا یہ مضامین میزان میں بیان کرنے کے ہیں۔ بس وہ مدرس صاحب بیان کر رہے تھے اور طالب علم ان کا منہ تک رہا تھا۔ میں نے کہا کہ اس بے چارہ کے نزدیک تو الف لام استغراق ہی کا ہوتا ہے اور کہیں کا نہیں ہوتا کیونکہ اس الف لام نے اس کو تو مستغرق بنا دیا ہے۔

اسی طرح مدرسوں کا چاہئے کہ ہر طالب علم کو پوری عربی پڑھانا ضروری نہ سمجھیں۔

جس کے اندر مناسبت دیکھیں اور فہم سلیم پائیں۔ اس کو سب کتابیں پڑھا دیں اور جس کو مناسبت نہ ہو یا جس کی فہم سلیم نہ ہو اس کو بقدر ضرورت مسائل پڑھا کر کہہ دیں کہ جاؤ دنیا کے دھندے میں لگو۔ تجارت و حرفت کرو۔ کیونکہ ہر شخص مقتدا بننے کے لائق نہیں ہوتا۔ بعضے نالائق بھی ہوتے ہیں۔ ایسوں کو فارغ التحصیل بنا کر مقتدا بنا دینا خیانت ہے۔

بدگہر را علم و فن آموختن ☆ دادن تیغ ست دست راہزن

(نا اہل کو علم و فن سکھانا ڈاکو کے ہاتھ میں تلوار دینا ہے)

مگر آج کل مدرسین اس کا بالکل خیال نہیں کرتے۔ کیا جتنے طلباء ان کے مدرسہ میں داخل ہوتے ہیں سبھی کو علم سے پوری مناسبت ہوتی ہے اور سبھی کی فہم سلیم ہوتی ہے۔ ہرگز نہیں! پھر کیا وجہ ہے کہ وہ طلباء کا انتخاب نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کیلئے ایک مقدار معین کر لینا چاہیے کہ اس سے آگے ان کو نہ پڑھایا جائے اور وہ مقدار ایسی موجود ہو جو دین کے ضروری ضروری مسائل جاننے کے لئے کافی ہو اور عام لوگوں کے واسطے اردو کا نصاب مقرر کرنا چاہیے۔

الحمد للہ کہ ضرورت کے موافق علم کے متعلق اس وقت کافی بیان ہو گیا۔ اب حجت ختم ہو گئی ہے۔ اب بھی اگر کوئی علم دین حاصل نہ کرے تو اس کے پاس کوئی عذر نہیں۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو عمل کی توفیق دیں۔

وصلی اللہ علیٰ سیدنا ومولانا محمدٌ وعلیٰ الہ واصحابہ وسلم وشرف وکرم امین والحمدللہ رب العلمین.

کوثر العلوم

آج کل لوگوں نے کثرت معلومات کو علم سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ علم اور چیز ہے اور معلومات اور چیز ہیں۔ ہماری معلومات زیادہ ہیں۔ مگر بصیرت قلب زیادہ نہیں۔ بصیرت علم سے حاصل ہوتی ہے اور علم یہ ہے کہ ادراک سلیم اور قوی ہو جس سے نتائج صحیحہ تک جلد وصول ہو جاتا ہو!

زیادت فی العلم و تقسیم علم کے متعلق یہ وعظ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں شب جمعہ ۷ محرم الحرام ۱۳۴۰ھ کو کھڑے ہو کر فرمایا جو ۲ گھنٹے ۳۰ منٹ میں ختم ہوا۔ ۲۰۰ کے قریب حاضری تھی۔ اسے مولانا ظفر احمدؒ صاحب عثمانی نے قلمبند فرمایا۔

خطبۂ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الحمد لله نحمده، ونستعينهٗ ونستغفرهٗ ونومن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرورانفسنا و من سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له، ومن يضلله فلاهادى له ونشهد ان لااله الاالله وحدهٗ لاشريک له ونشهد ان سيدنا ومولانا محمدًا عبدهٗ ورسوله صلى الله تعالىٰ عليه وعلىٰ اٰله واصحابه وبارک وسلم

اما بعد فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم. بسم الله الرحمن الرحيم.

الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَارَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۙ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (البقرہ: ١ تا ٥)

ترجمہ: آلمّ (ان حروف کے معانی کی عوام کو اطلاع نہیں دی گئی) یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں۔ راہ بتلانے والی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو، وہ خدا سے ڈرنے والے لوگ ایسے ہیں کہ یقین لاتے ہیں چھپی ہوئی چیزوں پر اور قائم رکھتے ہیں نماز کو اور جو کچھ دیا ہے ہم نے ان کو اسی پر خرچ کرتے ہیں اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ یقین رکھتے ہیں اس کتاب پر بھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اتاری گئی ہے اور ان کتابوں پر بھی جو آپؐ سے پہلے اتاری جا چکی ہیں اور آخرت پر بھی وہ لوگ یقین رکھتے ہیں۔ یہ لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو ان کے پروردگار کی طرف سے ملی ہے اور یہ لوگ پورے کامیاب ہیں)

ضروریات کا علم

میں اس وقت ان آیتوں سے ایک ضروری مضمون کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں جس

کا تعلق خصوصیت کے ساتھ اہل علم سے ہے بالخصوص طلباء کو اس کی زیادہ ضرورت ہے۔ چونکہ داعی اس وقت طلباء ہی ہیں اس لئے ان کے مناسب مضمون بیان کرنا ضروری ہے اگرچہ ایک درجہ میں وہ مضمون عام بھی ہے اور سب مسلمانوں کی ضرورت کا ہے۔ کیونکہ ہر مسلمان ہر وقت مسلمان ہونے کی حیثیت سے طالب علم ہے کیونکہ ایک درجہ طلب علم کا ہر مسلمان پر فرض ہے اور وہ ضروریات کا علم ہے۔ یعنی بقدر ضرورت عقائد کا اور احکام صلوٰۃ وصوم واحکام معاملات ومعاشرت کا علم ہر مسلمان پر لازم ہے۔ (**طلب العلم فریضه علی کل مسلم الحدیث ۱۲ ظ**) نیز اس کی بھی ضرورت ہے کہ دین اور علم دین سے مناسبت پیدا کرے اور دین کی سمجھ حاصل کرے اور فہم کو بڑھائے اور اسی کا نام طالب علمی ہے (**الحکمة ضالة المؤمن فیحث وجدها فهو احق بها الحدیث ۱۲ ظ**)۔ (**تفسیر ابن کثیر ۶: ۳۵**)

پس جب یہ مضمون طلباء کی ضرورت کا ہے تو گویا ہر مسلمان کی ضرورت کا ہے کیونکہ ثابت ہو چکا کہ ہر مسلمان طالب علم ہے مگر کلی مشکک کی طرح اس وصف کا صدق بعض پر زیادہ ہے اور بعض پر کم۔ جو لوگ سارے مشاغل کو چھوڑ کر طلب علم ہی میں مشغول ہیں ان پر یہ وصف صادق آتا ہے اور اسی وجہ سے عرفاً طالب علم کے لفظ سے متبادر الی الذہن وہی ہوتے ہیں۔ باقی مطلق طالب علم سے کوئی مسلمان بھی خالی نہیں۔ پس اس درجہ میں یہ مضمون سب کے مناسب ہے۔ یہ میں نے اس لئے عرض کر دیا کہ جو لوگ عرفی طلباء نہیں ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ مضمون ہماری ضرورت کا نہیں ہے۔ کیونکہ اس سمجھنے کے دو اثر ہوتے۔ جو لوگ ان میں سے طالب ہوتے وہ تو حسرت کرتے اور جو غیر طالب ہوتے وہ آزاد ہو جاتے کہ بس ہم کو بے فکر ہو کر بیٹھنا چاہیے۔ ہم اس بیان کے مخاطب ہی نہیں مختلف طبائع پر اس خیال کا مختلف اثر ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے کہہ دیا کہ فی نفسہ یہ مضمون سب کی ضرورت کا ہے البتہ طلباء کے ساتھ زیادہ تعلق ہے اور ان کو اس کی طرف زیادہ متوجہ ہونے کی ضرورت ہے۔

ایک تو اس لئے کہ طالب علم کا صدق ان پر دوسروں سے زیادہ ہے۔ دوسرے اس لئے کہ یہ مقتداء بننے والے ہیں۔ ان کو اپنے فرائض منصبی کے جاننے کی زیادہ ضرورت ہے۔ اگر ان میں خدانخواستہ کمی رہ گئی تو دوسروں کو ضرر ہوگا۔ کیونکہ یہی مبلغ احکام ہوں گے۔

دوسرے لوگ جب کسی حکم کے متعلق ان میں کمی دیکھیں گے تو ان کا یہ اعتقاد ہو جائے گا کہ جب مبلغ ہی کو اس کا اہتمام نہیں تو یہ کوئی ضروری چیز نہیں ہوگی۔ بعض کا تو سچ مچ یہ اعتقاد ہی ہو جاتا ہے۔ وہ احکام سے جان چرانے کے لئے بہانہ نہیں کرتے اور جو بہانہ باز ہیں ان کو علماء کے عدم اہتمام سے گو اعتقادی ضرر نہ ہو کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ حکم سب کے لئے عام ہے مگر الزام سے بچنے کے لئے ان کو موقع ہاتھ آ جاتا ہے۔ اب کوئی ان کو امر بالمعروف کرے تو وہ دلیری سے جواب دیتے ہیں کہ میاں اس میں تو مولوی بھی کوتاہی کرتے ہیں اور ہم تو پہلے ہی سے دنیادار ہیں۔ اب وہ پہلے سے زیادہ کوتاہی کرنے لگتے ہیں جس کا سبب یہ عالم اور مبلغ بنتا ہے۔ اس لئے طلباء کو اس مضمون کے ساتھ زیادہ تعلق ہے۔ ان کو اس طرف زیادہ توجہ کرنا چاہیے۔ غرض اس مضمون کا تعلق طلباء سے اولاً و بالائی ہے اور دوسروں سے ثانیاً اور بعد کے درجہ میں ہے۔ اس مضمون کی تعیین کرتا ہوں پھر اس کی تفصیل کر دی جائے گی۔

زیادت فی العلم

وہ مضمون یہ ہے کہ زیادت فی العلم مطلوب ہے یعنی علم تو مطلوب ہے ہی چنانچہ آیات و احادیث میں بکثرت اس کی تصریح ہے جس کو اہل علم جانتے ہیں۔ اس وقت مجھے ان کے بیان کی ضرورت نہیں۔ اس وقت میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ جس طرح مطلق علم مطلوب ہے اسی طرح کی ترقی اور زیادت بھی مطلوب ہے شاید بعض لوگوں کو یہ خیال ہوگا کہ اس کے بیان کی کیا ضرورت ہے۔ اس پر تو ہمارا پہلے سے خود ہی عمل ہے کیونکہ ہم کتابیں پڑھتے چلے جاتے ہیں اور ہر فن میں ایک دو نہیں بلکہ متعدد کتابیں پڑھتے ہیں۔ تو ہم زیادت فی العلم پر خود ہی عامل اور اس کو مطلوب بھی سمجھتے ہیں۔ مطلوب یہ سمجھتے تو عمل کیوں کرتے۔

اس کا اصلی جواب تو یہ ہے کہ زیادت علم کی دو قسمیں ہیں ایک زیادت صورت علم کے متعلق ہے ایک حقیقت علم کے متعلق۔ اور جس زیادت پر آپ کا عمل ہے وہ صورت علم کی ترقی ہے حقیقت علم کی ترقی نہیں ہے کیونکہ کتابیں زیادہ پڑھنے سے حقیقت علم کی زیادت حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے دوسرے اسباب ہیں جو آئندہ معلوم ہوں گے جن سے آپ کو بے توجہی ہے۔ اس لیے یہ سوال متوجہ ہی نہیں ہوتا لیکن میں تبرعاً سوال کو وارد مان کر

جواب دیتا ہوں کہ جس چیز کو آپ زیادت فی العلم سمجھے ہوئے ہیں۔ وہ زیادت نہیں ہے کیونکہ آپ نے زیادت فی العلم سمجھے ہوئے ہیں۔ وہ زیادت نہیں ہے کیونکہ آپ نے زیادت فی العلم کو ایک مقدار محدود میں منحصر کرلیا ہے حالانکہ زیادت کے لئے کوئی حد نہیں بلکہ وہ ایک غیر متناہی چیز ہے نہ بمعنی غیر متناہی بالفعل جس کا وجود محال ہو بلکہ بمعنی لاتقف عند حد۔

اب غور کیجئے کہ کتابیں پڑھنے پڑھانے سے آپ کو کون سی زیادت مطلوب ہے۔ ظاہر ہے کہ نصاب کی حد تک ترقی مطلوب ہے۔ اس کے بعد اکثر لوگ بے فکر ہی نہیں بلکہ اپنے کو صاحب کمال اور مستغنی عن الطلب سمجھنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد زیادت فی العلم میں کون مشغول ہوتا ہے درسیات سے فارغ ہونے کے بعد حالت یہ ہے کہ جن کی استعداد خراب ہے وہ تو پڑھنا پڑھانا ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ پھر بعض تو ذکر و شغل میں مشغول ہوجاتے ہیں اور بعض وعظ گوئی اختیار کرلیتے ہیں۔

حظ نفس کے اقسام

کیونکہ ان میں حظ نفس ہے۔ ایک میں حظ نفسانی بواسطہ جسمانی کے ہے اور ایک میں حظ نفسانی بلاواسطہ حظ جسمانی کے ہے۔ وعظ میں تو حظ نفسانی بواسطہ جسمانی کے ہے لوگ واعظ کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔ اور جسمانی اور مالی خدمت کرتے ہیں۔ عمدہ عمدہ غذائیں کھانے کو ملتی ہیں اور قیمتی سواری ملتی ہے۔ کہیں فٹن کہیں فسٹ کلاس کا درجہ۔ اور ذکر و شغل میں حظ نفسانی بلاواسطہ جسمانی کے ہے۔ کیونکہ بعض لوگ ذکر و شغل میں اس لئے مشغول ہوتے ہیں کہ ان کو جاہ مطلوب ہے کہ صوفی اور بزرگ بن کر ملک القلوب حاصل ہوجائے۔ یہ تو حظ نفس ہے اور حظ جسمانی کا واسطہ اس میں اس لئے نہیں ہے کہ ذکر و شغل میں مشغول ہونے کے ساتھ ان کو مجاہدات کرنا پڑتے ہیں۔ تقلیل طعام و تقلیل منام کرنا پڑتی ہے۔ بلکہ بعض تو جاہ حاصل کرنے کے لئے بہت زیادہ تکالیف جسمانیہ برداشت کرتے ہیں کہ ایک ہی وقت کھانا کھاتے اور موٹا کپڑا پہنتے ہیں تا کہ لوگ ان کو تارک اور زاہد سمجھیں۔ یہ تو غیر مخلصین کا حال ہے اور جو مخلص ہیں وہ حظ نفس کے طالب تو نہیں مگر حظ نفس سے خالی وہ بھی نہیں ہیں۔ کیونکہ ذکر و شغل میں بعض ایسی چیزوں کو مقصود

سمجھے ہوئے ہیں جو واقع میں مقصود نہیں بلکہ حظوظ نفس میں داخل ہیں گو یہ مخلصین ان کو حظوظ نفس نہیں سمجھتے۔ مگر چونکہ واقع میں وہ حظوظ نفس ہیں اور یہ ان کے طالب ہیں اس لئے من حیث لا یدری یہ بھی طالب حظ نفس ہو جاتے ہیں۔

مثلاً ذکر و شغل میں جو لذت آتی ہے اکثر ذاکرین اس لذت کے طالب ہیں اور اس کو لذت روحانی سمجھ کر مقصود سمجھے ہوئے ہیں۔ حالانکہ وہ لذت اکثر نفسانی ہوتی ہے اور گو یہ لذت بھی مضر نہ ہو بلکہ کسی درجہ میں محمود ہی سہی مگر مقصود بھی نہیں۔ کیونکہ محمود ہونا مقصود ہونے کو مستلزم نہیں۔ اور اکثر ذاکر اس کو مطلوب سمجھے ہوئے ہیں۔ ان کو محض رضاء اور ذکر حق بہت کم مطلوب ہوتا ہے۔ بلکہ زیادہ تر یہ حظ نفس مطلوب ہے۔ چنانچہ یہ حظوظ نفسانیہ اگر مقصود نہ ہوتے تو سالکین و ذاکرین وہ شکائتیں نہ کرتے جو شیوخ سے آج کل کی جاتی ہیں اگر ان کو محض رضا و ذکر حق مطلوب ہوتا تو یہ تو ان کو عدم لذت کی حالت میں بھی حاصل ہے۔ پھر شکایت کس چیز کی ہے۔ آخر لذت کے نہ ہونے سے مقصود میں کیا کمی آ گئی جو اس کی شکایت کی جاتی ہے۔ کیا کسی نص سے یہ ثابت ہے کہ عدم لذت منقص اجر ہے ظاہر ہے کہ کسی نص سے یہ بات ثابت ہے کہ عدم لذت منقص اجر ہے۔ ظاہر ہے کہ کس نص سے یہ بات ثابت نہیں۔ پھر اس کے نہ ہونے سے رنج و ملال اور شیخ سے شکوہ و شکایت کیوں؟ معلوم ہوا کہ یہ لوگ مقصود بالغیر کو مقصود بالذات اور مقصود بالذات کو مقصود بالغیر سمجھتے ہیں جبھی تو لذت کی کمی سے کام میں کمی کر دیتے ہیں۔

لذات کا فرق

اب میں لذت روحانیہ و لذت نفسانیہ میں فرق بتلاتا ہوں تا کہ ذاکرین دھوکا سے بچتے رہیں اور حظوظ نفس کے طالب نہ ہوں۔ یاد رکھو ذکر و شغل اور نماز وغیرہ سے جو روح کو کیفیات حاصل ہوتی ہیں وہ نہایت لطیف ہوتی ہیں۔ کہ لطافت کی وجہ سے ان کو کیفیت کہنا بھی مشکل ہے۔ وہ غلبہ کے ساتھ وارد نہیں ہوتیں اور ان کی علامت یہ ہے کہ یوماً فیوماً ان میں ترقی ہوتی رہتی ہے اور کیفیات نفسانیہ کا ورود و غلبہ سے ہوتا ہے جن میں بعض دفعہ حدود شرعیہ سے بھی انسان نکل جاتا ہے گو یہ اس میں مجبور و معذور ہو مگر یہ کیفیت مطلوب و مقصود نہیں اور نہ ان کے لئے بقاء ہے بلکہ کچھ عرصہ کے بعد یہ غلبہ جاتا رہتا ہے۔ کیفیت روحانیہ اور لذت روحانیہ کی

حقیقت وہ ہے جس کو ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے:

جعلت قرة عینی فی الصلوٰة (فتح الباری لابن حجر ١١: ٣٤٥)

(کہ میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے ١٢) اس کی حقیقت تو وہی جانتا ہے جس کو یہ ٹھنڈک حاصل ہوتی ہے مگر اس کی علامت یہ ہے کہ نماز سکون واطمینان سے ادا کرے جلدی نہ کرے ۔ اور کوئی چیز اس کو نماز سے مشغول نہ کرے یعنی نماز سے روکنے والی کوئی چیز نہ ہو اور بدون نماز کے قلب کو چین نہ ملے۔ وقت آتے ہی نماز کے لئے دل بے چین ہو جائے۔ اسی کو خلوص اور احسان کہتے ہیں۔ یہ ہیں کیفیات روحانیہ بخلاف ان کیفیات کے جو سالکین کو وسط میں پیش آتی ہیں جیسے محویت اور استغراق وغیرہ۔ ان کا بعض اوقات ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ حدود سے بھی نکل جاتا ہے۔ سو یہ کیفیات مقصود نہیں۔ اور جس کو خلوص حاصل ہو جو کہ کیفیت روحانیہ ہے گو اس کو کتنے وساوس آتے ہوں اس حالت میں بھی اس کا طالب لذت ومحویت ہونا ایسا ہے جیسا مولانا فرماتے ہیں۔

دست بوسی چوں رسید از دست شاہ ☆ پائے بوسی اندراں دم شد گناہ

(یعنی جس کو بادشاہ نے اپنے ہاتھ چومنے کا موقعہ دے دیا ہو اس کا یہ کہنا کہ نہیں حضور! میں تو پیر ہی چوموں گا خطا ہے اور گناہ ہے ١٢) یہ لذت اور محویت تو پائے بوسی کے مثل ہے اور خلوص واحسان دست بوسی کے مثل ہے۔ پھر افضل کو چھوڑ کر مفضول کا طالب ہونا غلطی ہے یا نہیں؟

خشوع کی حقیقت

محویت واستغراق کے غیر مقصود ہونے کی دلیل یہ ہے کہ نصوص میں اس کی فضیلت کہیں وارد نہیں ہوئی بلکہ حدیث میں تو خشوع کی یہ حقیقت بتلائی گئی ہے۔

من توضاء فاحسن الوضؤ ثم صلی رکعتین مقبلا علیهما بقلبه لایحدث فیهما نفسه غفرله ماتقدم من ذنبه او کما قال

(المعجم الکبیر للطبرانی ٥: ٢٨٦)

(جس نے وضو کیا اور اچھی طرح کیا پھر دو رکعت اس طرح پڑھے کہ دل سے ان پر متوجہ ہو اور ان میں اپنے نفس سے باتیں نہ کرے، وہ جنت میں داخل ہو گا ١٢) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا **لاتتحدث فیهما نفسه** (کہ اس کا دل بھی باتیں نہ کرے) بلکہ

لایحدث فیھما نفسہ فرمایا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اختیار سے وساوس نہ لائے گو خود آجائیں اس کا مضائقہ نہیں۔ اور جب وساوس کا آنا مذموم نہیں تو اس کا نہ آنا مطلوب بھی نہیں۔ ہاں وسوسہ کا از خود لانا مطلوب ہے۔ پس جو خود وسوسہ نہ لاتا ہو اس کو مطلوب حاصل ہے اب اس کو یہ چاہنا کہ بلا قصد بھی وساوس نہ آیا کریں غیر مقصود کی طلب ہے۔

احادیث میں حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا وسوسہ کی شکایت کرنا وارد ہے۔ جس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کوئی ایسا وظیفہ نہیں بتلایا جس سے وساوس کا آنا بند ہو جائے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عدم التفات کا امر فرمایا ہے:

بقولہ ذالک صریح الایمان وبقولہ فلیستعذ باللہ ولینتہ

(الصحیح لمسلم ، سنن أبی داؤد)

جس کا حاصل یہ ہے کہ اپنے کو ذکر کی طرف متوجہ کر دے اور وسوسہ کی طرف التفات نہ کرے یعنی از خود اس طرف متوجہ نہ ہو یہی مفہوم ہے لیفتہ کا نہ یہ کہ اس کی نفی کی طرف متوجہ ہو۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ وساوس کا نہ آنا مطلوب نہیں ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی مطلوبیت کو ظاہر فرماتے۔

شاید اس پر کوئی یہ شبہ کرے کہ گویا احادیث سے وسوسہ پر مواخذہ نہ ہونا معلوم ہوتا ہو مگر قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ وسوسہ پر بھی مواخذہ ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ

(اور ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے جی میں جو خیالات آتے ہیں ہم ان کو جانتے ہیں)

اس سے ظاہر میں شبہ ہوتا ہے کہ وسوسہ پر مواخذہ ہے چنانچہ بہت آیتوں میں یَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ وغیرہ عنوانات کی دلالت اس پر متفق علیہ ہے۔ مگر اس شبہ کا منشاء عدم تدبیر ہے۔ اور قرآن میں اکثر اشکالات جو پیش آتے ہیں وہ سیاق وسباق میں غور نہ کرنے ہی سے وارد ہوتے ہیں ورنہ قرآن کے مضامین پر کوئی اشکال وارد نہیں ہو سکتا۔ واقعی بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ ہے مگر کس کے لئے، تدبیر کرنیوالوں کیلیے۔ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ اب سنیئے کہ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ سے یہ اشکال کیوں پیدا ہوا۔

منشا اشکال کا یہ ہے کہ لوگوں نے اس کو عتاب پر محمول کیا ہے کہ گویا حق تعالیٰ یوں فرما رہے ہیں کہ ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم اس کے وساوس قلبیہ کو خوب جانتے ہیں۔ اس لئے لوگ یہ نہ سمجھیں کہ ان وساوس کی کسی کو خبر نہیں۔ جیسے **نحن اعلم بما یصفون** اور **نحن اعلم بمایقولون** وغیرہ میں عتاب ہے مگر سیاق وسباق میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جملہ کو عتاب سے کوئی تعلق نہیں۔

خالصیت وعالمیت

یہاں خالصیت وعالمیت پر استدلال کرنا مقصود ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ بھی ایک آیت میں خالصیت سے عالمیت پر استدلال فرمایا ہے: **الایعلم من خلق وھو اللطیف الخبیر** (کیا جس نے پیدا کیا ہے وہ بھی اپنی مخلوق کو نہ جانے گا حالانکہ وہ بہت باریک بین اور صاحب علم ہے)۔ یہی مضمون یہاں مذکور ہے۔ چنانچہ سیاق وسباق میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ سباق میں تو ابتدائے سورت سے تامل کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حق تعالیٰ اس مقام پر منکرین معاد پر رد کرنے کے لئے معاد کو ثابت فرما رہے ہیں۔ اور معاد کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک تو قدرت کاملہ کی جس سے نیست کو ہست کرنے پر خدا تعالیٰ قادر ہوں۔ دوسرے علم کامل کی جس سے موت اجسام کے بعد اس کے اجزاء متفرقہ کا جمع کرنا ممکن ہو۔ چنانچہ اول حق تعالیٰ نے منکرین معاد کا قول نقل فرمایا کہ وہ مرنے کے بعد زندہ ہونے کو عجیب اور بعید سمجھتے ہیں ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ اس کے بعد اس تعجب اور بعد کو دفع کرنے کیلئے اپنے لئے علم کامل کا دعویٰ کیا۔

قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ

جس کا حاصل یہ ہے کہ ہمارے علم کی تو یہ شان ہے کہ ہم ان کے ان اجزاء کو جانتے ہیں جن کو مٹی (کھاتی اور) کم کرتی ہے اور (یہی نہیں کہ ہم آج سے جانتے ہیں بلکہ ہمارا علم قدیم ہے حتیٰ کہ ہم نے قبل وقوع ہی سب اشیاء کے تمام تر حالات اپنے علم قدیم سے ایک کتاب میں جو لوح محفوظ کہلاتی ہے لکھ دیئے تھے اور اب تک ہمارے پاس (وہ) کتاب محفوظ (موجود) ہے جس میں ان اجزاء مستحیلہ کی وضع اور کیفیت اور مکان اور مقدار وغیرہ سب کچھ ہے۔

اس کے بعد اپنی قدرت کاملہ ثابت کرنے کیلئے آسمان وزمین کی پیدائش اور بارش وغیرہ کا تذکرہ فرمایا کہ ہم نے کس طرح خوبصورت اور مضبوطی کے ساتھ آسمان کو بنایا ہے جس میں باوجود امتداد زمانہ کے کوئی رخنہ نہیں۔ اور زمین کو کیسا بچھایا ہے اور اس میں پہاڑوں کو جمایا اور ہر قسم کی خوش نما چیزیں اگائیں۔ اور آسمان سے برکت کا پانی نازل کیا جس سے باغ اگائے اور غلہ اور کھجور کے درخت پیدا کئے جس سے مردہ زمین میں جان پڑ جاتی ہے۔ بس سمجھ لو کہ اسی طرح مردہ اجسام بھی زندہ ہوسکتے ہیں۔

پھر فرماتے ہیں اَفَعَیِیْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ کیا ہم پہلی بار کے پیدا کرنے میں تھک گئے (جو دوبارہ زندہ نہ کرسکیں) یہ بھی غلط ہے کیونکہ تعب تو نقص قدرت کی وجہ سے ہوتا ہے اور حق تعالیٰ کی قدرت ناقص نہیں بلکہ غایت درجہ کامل ہے جس پر مخلوقات خود شاہد ہیں تو وہ تعب سے بھی بری ہیں۔ یہاں تک تو قدرت کا اثبات ہوا۔ آگے علم کامل پر (جس کا اول دعویٰ کیا گیا تھا) خالقیت سے استدلال فرماتے ہیں۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ یعنی ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے (جو غایت درجہ علم وحکمت اور قدرت کی دلیل ہے کیونکہ انسان تمام مخلوق میں سب سے زیادہ عاقل اور ہوشیار اور ذی علم ہے۔ تو سمجھ لو کہ اس کا پیدا کرنے والا کیسا ذی علم ہوگا)۔ اور ہم ان باتوں کو بھی جانتے ہیں جو اس کے نفس میں بطور وسوسہ کے گزرتی ہیں (کیونکہ اس کا منشا حرکت قلب ہے۔ اور اس حرکت کو بھی ہم ہی پیدا کرتے ہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ انسان کے قبضہ میں یہ وساوس نہیں۔ تو جو وساوس کو بھی جانتا ہے جن کا قیام بھی قلب میں نہیں ہوتا وہ انسان کے ارادہ اور عزم کو کیوں نہ جانے گا جس کو قلب میں قیام ہوتا ہے اور اس سے بڑھ کر اعمال جوارح واقوال لسان کو کیوں نہ جانے گا جو سب کو محسوس ہوتے ہیں گو بوجہ عرض ہونے کے ان کو خود قیام نہیں مگر پھر بھی تبعاً للذات ان کا ادراک مخلوق کو بھی ہوتا ہے تو خالق کو کیوں نہ ہوگا۔ اور جب وہ وساوس قلب اور ارادہ وعزم اور افعال واقوال کو جانتا ہے تو اجزاء مستحیلہ متفرقہ کو جو جواہر واعیان ہیں کیوں نہ جانے گا۔

یہ تو سباق کی دلالت تھی۔ اس استدلال پر آگے سیاق تو بہت ہی صریح ہے۔ فرماتے ہیں:

ونحن اقرب الیہ من حبل الورید

کہ ہم باعتبار علم کے اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہیں (رگ سے مراد یہاں پر وہ رگ ہے جس کا اتصال شرط حیات ہے اور حیات کا مدار نفس وروح ہے۔ مقصود یہ ہے کہ ہم انسان کے نفس وروح سے بھی زیادہ اس کے احوال کو جانتے ہیں کیونکہ ہمارا علم قدیم ہے اور حضور اور انسان کے نفس روح کا علم حادث ہے خواہ حضوری ہو یا حصولی۔ اور حصولی تو فی نفسہٖ بھی ناقص ہے ۱۲)

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ یہاں اقربیت سے اقربیت بالعلم مراد ہے۔ پس وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ یہاں ایسا ہے جیسا اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ کے بعد وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ تھا۔ حاصل دونوں کا ایک ہے کہ خالقیت سے عالمیت پر استدلال کیا گیا ہے اور علم الٰہی کا کمال ثابت کیا گیا ہے۔ جس سے امکان معاد کو ثابت کر کے استبعاد کو رفع کرنا مقصود ہے۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ ان وساوس پر مواخذہ ہوگا یا نہیں بلکہ صرف علم وساوس سے کمال علم کو ثابت کرنا مقصود ہے۔ خوب سمجھ لو پس اس آیت سے وساوس پر مواخذہ کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔ اور جس آیت سے اول نظر میں وساوس پر مواخذہ کا شبہ ہو سکتا تھا حق تعالیٰ نے اس کو بہت صاف اور صریح طور پر دفع فرما دیا ہے اور وہ آیت یہ ہے:

وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ
وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

(اور اگر تم ظاہر کرو ان باتوں کو جو تمہارے دلوں میں ہیں یا چھپاؤ بہر حال اللہ تعالیٰ تم سے ان کا محاسبہ فرمائیں گے۔ پھر جس کو چاہیں گے معاف کر دیں گے اور جس کو چاہیں گے عذاب دیں گے اور اللہ تعالیٰ کو ہر بات پر قدرت ہے)۔ یہاں بظاہر لفظ ما عام ہے وساوس غیر اختیاریہ اور خیالات اختیاریہ سب کو۔ اور عموم ہی کی وجہ سے صحابہؓ کو اشکال ہوا تھا مگر اس کا منشاء عدم علم نہ تھا۔ صحابہؓ جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ امور غیر اختیاریہ پر مواخذہ نہیں فرمائیں گے کیونکہ یہ مسئلہ عقلیہ بھی ہے۔ بلکہ غلبہ خشیت سے ان کو عموم کا شبہ ہوا کیونکہ لفظ بظاہر عام تھا اور خشیت وہ چیز ہے کہ جب اس کا غلبہ ہوتا ہے اس وقت علم پر نظر نہیں رہتی بلکہ علم مغلوب ہو جاتا ہے۔

خشیت کی حد

قربان جایئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپؐ نے خشیت کی بھی ایک اور بیان فرمادی۔ حضورؐ کے سوا اس کو کوئی نہیں بیان کر سکتا تھا۔ ہم تو خشیت کے ہر درجہ کو مطلوب سمجھتے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ سے ڈرنا محمود اور مقصود ہے اور مقصود کا ہر درجہ ظاہراً مقصود ہوتا ہے ہم کو تو ظاہر میں یہی معلوم ہوتا ہے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علم عظیم کو ظاہر فرمایا ہے کہ مقصود کے لئے بھی یہ ضرور نہیں کہ اس کا ہر درجہ مقصود ہو بلکہ مقاصد بھی ایک خاص حد تک مطلوب ہیں۔ چنانچہ خشیت کے بارہ میں آپ فرماتے ہیں۔

واسئلک من خشیتک ماتحول بہ بینی و بین معاصیک

اے اللہ! میں آپ کا خوف اتنا چاہتا ہوں جس سے مجھ میں اور معاصی میں رکاوٹ ہو جائے۔ اس سے زیادہ خشیت کو آپؐ نے طلب نہیں کیا۔ معلوم ہوا کہ اس کا زیادہ غلبہ مقصود نہیں وجہ یہ ہے کہ غلبہ خشیت بعض دفعہ جسمانی تکالیف کھڑی ہوجاتی ہیں۔ جسم حزن وغم سے گھلنے لگتا ہے۔ نیز بعض دفعہ حدود سے تجاوز ہوجاتا ہے۔ جیسے کسی غلام پر آقا کا خوف بہت غالب ہو ہوتو اس کے سامنے جاتے ہی اس کے ہاتھ پیر بھول جاتے ہیں۔ پھر چاہتا کچھ ہے کرتا کچھ ہے۔ زبان سے بھی بے تکی باتیں نکلتی ہیں۔ کہنا کچھ چاہتا ہے اور زبان سے کچھ کا کچھ نکلتا ہے نیز بعض دفعہ اس غلبہ خشیت سے مایوسی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اس لئے ایسا غلبہ کمال نہیں اور اس لئے کاملین پر ایسا غلبہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام غالب علی الکیفیات ہوتے تھے مغلوب نہ ہوتے تھے ہاں گاہے کاملین پر بھی غلبہ ہوتا ہے مگر وہ زیادہ دیر تک نہیں رہتا۔ تھوڑی دیر کو ہوتا ہے پھر حق تعالیٰ جلدی ہی خود سنبھال لیتے ہیں اور واقعی ناقص کی سنبھال تو کاملین کے ذریعہ سے ہوجاتی ہے۔ کاملین کی سنبھال کون کرے سوا خدا تعالیٰ کے پس ان کو خود ہی سنبھالتے ہیں۔

اوبدلہا ہم نماید خویش را ☆ اوبد وزد خرقۂ درویش را

یعنی حق تعالیٰ ہی خود اپنے کو عشاق کے سامنے ظاہر بھی فرماتے ہیں اور خود ہی ان کے نقص کو بھی کمال سے مبدل فرماتے ہیں۔

غرض صحابہؓ کو غلبہ خشیت کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ وساوس پر بھی مواخذہ ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہؓ نے اس شبہ کو عرض کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی آیت کی تفسیر خود نہیں فرمائی کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر غلبہ ادب تھا۔ ادھر وحی قطعی سے رفع اشتباہ کی امید تھی۔ احکام کے مدارج مختلف ہیں بعض کی تفسیر تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمادی ہے اور بعض کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم وحی قطعی کے منتظر ہوا کرتے تھے اور ان مدارج کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی جانتے تھے۔ غرض آپ نے خود تفسیر نہ کی کہ مَافِیْٓ اَنْفُسِکُمْ سے امور اختیاریہ قلبیہ مراد ہیں بلکہ فرمایا: **قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ** (البقرۃ آیت)

یعنی سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہو اور جو کچھ بھی حکم نازل ہو اس کو قبول کرو۔ چنانچہ صحابہ نے ایسا ہی کیا اور عموم پر بھی راضی ہوگئے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کی مدح میں آیات نازل ہوئیں۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (البقرہ آیت نمبر ۲۸۵)

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کا احکام منزلہ من اللہ پر بڑا کامل ایمان ہے کہ ہر حکم پر دل سے راضی ہوجاتے ہیں۔ اور سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہتے ہیں اس کے بعد آیت سابقہ کی تفسیر فرمائی۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا کَسَبَتْ وَعَلَیْهَا مَا اکْتَسَبَتْ (البقرہ:۲۸۶)

یعنی حق تعالیٰ وسعت سے زیادہ کا مکلف نہیں بناتے اور وساوس غیر اختیاری ہیں تو ان پر مواخذہ نہ ہوگا۔ اس آیت سے پہلی آیت کی تفسیر ہوگئی کہ اس میں مَافِیْٓ اَنْفُسِکُمْ سے عزم وارادہ مراد ہے جو مَا کَسَبَتْ وَاکْتَسَبَتْ میں داخل ہے نہ کہ وسوسہ۔

رہا یہ کہ احادیث میں تو یہ آتا ہے کہ دوسری آیت نے پہلی آیت کو منسوخ کردیا اور تمہاری تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیان تبدیل نہیں بلکہ بیان تفسیر ہے۔ اس کا جواب قاضی ثناء اللہ صاحب نے خوب دیا ہے کہ سلف کی اصطلاح میں نسخ عام ہے۔ وہ بیان تفسیر کی بھی نسخ ہی سے تعبیر کردیتے ہیں۔ واقعی بہت قیمتی تحقیق ہے اور جو شخص احادیث میں غور کرے گا اس کو اس کی قدر معلوم ہوگی اور تتبع سے اس تحقیق کی صحت معلوم ہوجائے گی۔

اب بحمد اللہ سب اشکالات رفع ہو گئے اور اگر کسی کو یہ شبہ ہوا کہ ممکن ہے آیت وَنَعْلَمُ مَاتُوَسْوِسُ بِہٖ نَفْسُہٗ نزولاً موخر ہو اور لَایُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا مقدم ہو تو موخر مقدم کے لئے ناسخ ہو جائے گا۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ تاریخ دیکھو۔ علماء مفسرین نے تصریح کی ہے کہ سورہ ق پوری مکی ہے اور سورۂ بقر مدنی ہے۔ دوسرے سورۂ ق کی یہ آیت مواخذہ علی الوساوس پر دلالت کرنے میں صریح نہیں بلکہ اس میں محض علم بالوساوس کا ذکر ہے اور سورۂ بقر کی آیت عدم مواخذہ میں صریح ہے غیر صریح صریح کیلئے ناسخ نہیں ہو سکتا کلام بہت بڑھ گیا۔

لذت ومحویت

میں یہ کہہ رہا تھا کہ نماز میں اگر خود بخود وساوس آئیں تو وہ ذرا مضر نہیں۔ ہاں ارادہ سے لانا برا ہے اور بلا ارادہ کے آئیں تو آئیں۔ تم پروا نہ کرو۔ اب جس شخص کو یہ مطلوب حاصل ہو اس کا پھر یہ شکایت کرنا کہ ہائے مجھے وساوس بہت آتے ہیں اس کی دلیل ہے کہ وہ مقصود کا طالب نہیں کسی اور چیز کا طالب ہے اور وہ وہی ہے حظ نفس۔ کیونکہ اگر وساوس بالکل نہ آئیں اور محویت کی سی حالت ہو جائے تو اس میں لذت خوب آتی ہے اور نفس کو کشاکشی سے نجات رہتی ہے۔ اس حظ نفس کی وجہ سے یہ شخص لذت ومحویت کا طالب ہے گو اس کو نہ دنیا مقصود ہے نہ جاہ وغیرہ لیکن ایک غیر مقصود کا تو طالب ہے اور اب تک حظوظ میں پڑا ہوا ہے۔

اور میں اسی کو بیان کر رہا تھا کہ جو طلبہ درسیات سے فارغ ہونے کے بعد ذکر و شغل میں مشغول ہوتے ہیں ان میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ بعض تو غیر مخلص ہیں جو جاہ وغیرہ کے طالب ہیں اور بعض مخلص ہیں مگر مخلصین بھی حظوظ میں مبتلا ہیں۔ گو وہ حظوظ دنیویہ نہ ہوں لیکن ہیں غیر مقصود اور جو طلباء غیر مخلص ہیں یہ ان کو تو پوچھنا کیا۔ یہ تو ان کا ذکر تھا جو خوش استعداد نہیں کہ وہ زیادہ تر اپنی بد استعدادی ہی کی وجہ سے سے ذکر و شغل میں مشغول ہوتے ہیں اور زیادت فی العلم سے کنارہ کشی کر لیتے ہیں اور جو خوش استعداد ہیں ان کی انتہا یہ ہے کہ وہ پڑھنے پڑھانے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اسی کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کی زیادت اسی میں منحصر ہے کہ درسیات ہی ساری عمر پڑھاتے رہیں۔ پھر ان میں بھی بعض کا مقصود تو محض تنخواہ ہے اور بعض کا مقصود یہ ہے کہ ہم کو تعلیم علم کا ثواب ملے اور اس کے ساتھ تنخواہ بھی ملتی رہے کیونکہ ہر تنخواہ

اجرت نہیں بلکہ بعض تنخواہ حق احتباس بھی ہوتی ہے جیسے بیوی کا نفقہ اور رزق القاضی وغیرہ۔

اجرت و نفقہ میں فرق

ہاں اجرت اور نفقہ میں ایک فرق ہے وہ یہ کہ تنخواہ میں تعین ہوتا ہے اور نفقہ میں تعین نہیں ہوتا بلکہ اس میں قدر ضرورت کا استحقاق ہوتا ہے زیادہ کا استحقاق نہیں ہوتا مگر کبھی نفقہ زوجہ میں بھی فرض جائز ہے تاکہ نزاع نہ ہو اور جانبین کے مصالح محفوظ رہیں۔ اس تعین سے وہ نفقہ ہونے سے نہیں نکل جاتا۔ چنانچہ نفقہ زوجہ فرض قاضی کے بعد بھی نفقہ ہی رہتا ہے۔ اسی طرح اگر مدرسین کی تنخواہ معین ہو تو محض تعلیم سے وہ تنخواہ اجرت تعلیم نہ ہوگی بلکہ حق احتباس اور نفقہ میں داخل رہے گی۔ مگر اب دیکھنا یہ ہے کہ کس کی تنخواہ تو اجرت ہے اور کس کی تنخواہ نفقہ ہے۔ کیونکہ محض الفاظ کو سن کر دعویٰ کر لینا اپنی تنخواہ کو نفقہ میں داخل کر لینا، تو آسان ہے مگر حقیقت کا مصداق بننا آسان نہیں ؎

وجائزة دعوی المحبة فی الھویٰ ولکن لا یخفی کلام المنافق

زبان سے تو دعویٰ محبت ہر ایک کو آسان ہے مگر سچ مچ عاشق ہونا بہت مشکل ہے۔

خوب کہا ہے ؎

وقوم یدعون وصال لیلیٰ ولیلیٰ لاتقرب لھم بذاک

بہت لوگ لیلیٰ کے وصال کا دعوی کرتے ہیں مگر لیلیٰ ان کو منہ بھی نہیں لگاتی۔ اسی طرح بہت لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم واصل ہیں اور مقرب خداوندی ہیں اور خدا تعالیٰ ان کو پوچھتے بھی نہیں (کہ یہ کس کھیت کے بھتوے ہیں ۱۲) بہت لوگ اپنے کو صاحب نسبت سمجھتے ہیں حالانکہ وہ دھوکا ہیں۔ وہ محض ملکہ یادداشت کو نسبت سمجھتے ہیں۔ کہ حق تعالیٰ کی یاد سے کسی وقت ذہول نہ ہو۔ مگر یہ غلط ہے۔ ذہول نہ ہونا تو مشق پر موقوف ہے۔ ایک فاسق بھی اگر دو سال خدا کے نام کی مشق کر لے تو اس کو یادداشت حاصل ہو سکتی ہے۔ تو کیا وہ صاحب نسبت ہو جائے گا ہرگز نہیں کیونکہ فسق کے ساتھ نسبت خاصہ کا اجتماع نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھو یادداشت عین نسبت نہیں بلکہ معین نسبت ہے کہ اطاعت و امتثال اوامر کے ساتھ یادداشت بھی جمع ہو جائے تو بہت جلد نسبت قلب میں فائض ہو جاتی ہے۔

نسبت کی حقیقت

اب نسبت کی حقیقت کو سمجھو۔ اس کی حقیقت وہی ہے جو آپ نے درسی کتابوں میں پڑھی ہے یعنی علاقہ معنویہ بین الطرفین۔ نسبت ایک لگاؤ اور تعلق کا نام ہے۔ جو دونوں طرف سے ہوتا ہے بندہ کو خدا تعالیٰ سے تعلق ہو۔

اور خدا تعالیٰ کو بندہ سے تعلق ہو۔ اب ان صوفی صاحب کی نسبت کا جو کہ محض بلکہ یادداشت کو نسبت سمجھتے ہیں، یہ حال ہے کہ ان کو تو خدا تعالیٰ سے ذکر کا تعلق ہے مگر خدا کو ان سے تعلق نہیں ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص نے کسی طالب علم سے پوچھا تھا۔ کہ آج کل کس شغل میں ہو۔ کہا شہزادی سے نکاح کی فکر میں ہوں پوچھا کیا کچھ اس کا سامان ہو گیا۔ کہا ہاں آدھا سامان تو ہو گیا آدھا باقی ہے۔ پوچھا یہ کیوں کر؟ کہا نکاح طرفین سے ہوتا ہے تو میں تو راضی ہوں مگر وہ راضی نہیں۔ اس لئے آدھا سامان ہے۔

اس حکایت پر سب ہنستے ہیں اور اس طالب علم کو احمق بناتے ہیں کہ بیہودہ آدمی یہ بھی کوئی سامان ہے کہ میں راضی ہوں مگر اس سے زیادہ ان صوفی صاحب کی حالت پر محقق کو ہنسی آتی ہے کیونکہ طالب علم نے تو اپنی رضا کو آدھا ہی کہا تھا اور یہ حضرت اپنی یادداشت کو پورا سامان سمجھتے ہیں اور اسی پر اکتفا کر کے نازاں ہیں کہ ہم صاحب نسبت ہیں ان کی تو مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص محض اپنی رضا سے یہ سمجھنے لگے کہ میرا نکاح ہو گیا اور میں بیوی والا ہوں۔

یاد رکھو! خدا تعالیٰ کو بندہ سے تعلق جس کی حقیقت رضا ہے محض ذکر کی مشق سے نہیں ہوتا۔ بلکہ ذکر و طاعت دونوں کے مجتمع ہونے سے ان کو وہ تعلق ہوتا ہے۔ اور اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ حق تعالیٰ کو ذکر ہی سے بندہ کے ساتھ تعلق ہو جاتا ہے تو پھر یہ تسلیم نہیں کہ ذکر محض اس کا نام ہے کہ زبان سے اللہ اللہ کر لیا جائے یا اشغال و مراقبات کر لیے جائیں۔ بلکہ ذکر نام ہے اطاعت کا۔ جس میں یہ ذکر لسانی بھی داخل ہے کیونکہ **فاذکرونی** کا ایک فرد یہ بھی ہے۔ اس لئے حصین حصین میں ہے **کل مطیع اللہ فھو ذاکر** کہ ذکر تسبیح و تحمید و تہلیل ہی میں منحصر نہیں بلکہ جو شخص جس کام میں بھی حق تعالیٰ کی اطاعت بجالا رہا ہو وہ اس وقت ذاکر ہی ہے۔ اور اس لئے مفسرین نے **فاذکرونی اذکرکم** (پس تم مجھے یاد کرو میں اپنی عنایت سے

تمہیں یاد کروں گا) کی تفسیر میں فرمایا ہے ۔ اذکرونی بالطاعة اذکرکم بالاجر والرحمة. (تم مجھے اپنی طاعت سے یاد کرو میں تمہیں اجر ورحمت سے یاد کروں گا)

جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اب میں کہتا ہوں کہ جو شخص ملکہ یادداشت کر کے احکام واوامر میں کوتاہی کرتا ہے اس نے ذکر کی بھی تکمیل نہیں کی کیونکہ ذکر نام ہے طاعت کا اور یہ مطیع نہیں اور اگر اسی کو ذکر تکمیل کہا جائے جیسا کہ آج کل کی اصطلاح ہے تو پھر میں یہ کہوں گا کہ محض تکمیل ذکر سے حق تعالیٰ کو بندہ کے ساتھ تعلق نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے اطاعت کی بھی ضرورت ہے جو یہاں مفقود ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ کو اس سے تعلق نہیں اور جب ان کو تعلق نہیں تو نسبت بھی حاصل نہیں کیونکہ وہ تعلق من الطرفین کا نام ہے!

تو جیسے اپنے کو واصل کہہ دینا زبان سے تو آسان ہے مگر حقیقت میں واصل ہونا بڑی دشوار ونادر چیز ہے۔ اسی طرح زبان سے یہ کہہ دینا تو آسان ہے کہ ہم تنخواہ نہیں لیتے بلکہ نفقہ لیتے ہیں مگر اس کی حقیقت کا مصداق بننا آسان نہیں۔ اس کے لئے کسی حقیقت شناس کو اپنی نبض دکھاؤ۔ اگر وہ کہہ دے کہ واقعی تمہاری تنخواہ نفقہ ہے تو پھر آپ کی حالت مبارک ہے۔ اسی طرح ملکہ یادداشت والوں کو چاہیے کہ کسی محقق کے سامنے اپنی حالت پیش کریں اگر وہ کہہ دے کہ تم واصل ہو گئے ہو تو پھر اس نعمت کا شکر کرو ورنہ محض اپنے علم پر اعتماد نہ کرو اور نہ دو چار جاہلوں کے بزرگ سمجھنے اور بزرگ کہنے سے دھوکا کھاؤ۔ صائب نے خوب کہا ہے

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خودرا ☆ عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرِ چند

(اپنے گوہر کو کسی صاحب نظر کے سامنے پیش کرو کہ یہ واقعی گوہر ہے یا کانچ کا ٹکڑا ہے کیونکہ چند گدھوں کے کہنے سے تم عیسیٰ نہیں بن سکتے ۱۲)۔

فرق اُجرت ونفقہ

تنخواہ تعلیم کے متعلق ایک معیار میرے ذہن میں ہے اس کو عرض کرتا ہوں۔ اگر کسی کے ذہن میں کوئی اور معیار ہو تو بہت اچھا وہ اپنے معیار سے اُجرت اور نفقہ میں فرق کر لیں ۔ خدا تعالیٰ سے معامل ہے اس میں گفتگو اور بحث فضول ہے۔ میرے نزدیک اجرت اور نفقہ میں فرق کا معیار یہ ہے کہ جو مدرس تنخواہ لے کر پڑھا رہا ہے وہ یہ سوچ کہ اگر کسی جگہ

سے زیادہ تنخواہ آجائے مثلاً یہاں پچیس روپے مل رہے ہیں دوسری جگہ سے پچاس پر ان کو بلایا جائے اور پچیس روپے میں بھی ان کا کام چل رہا ہے۔ مگر کام چلنے کے یہ معنی نہیں کہ دس چھٹانک گھی روزانہ کھا سکتے ہوں اور دو روپے گز کا کپڑا پہن سکتے ہوں بلکہ مطلب یہ ہے کہ پچیس روپے میں تالم نہ ہو گو تنعم بھی نہ ہو نیز دوسری جگہ دین کا نفع بھی یہاں سے زیادہ نہ ہو۔ پھر دیکھنا چاہیے کہ اس حالت میں دوسری جگہ دونی تنخواہ پر جاتا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں جاتا ہے تو واقعی اس کی تنخواہ نفقہ ہے اور اگر چلا گیا تو اس کی تنخواہ اجرت ہے اور یہ کرایہ کا ٹٹو ہے گو گناہ اس میں بھی نہیں کیونکہ متاخرین کا فتویٰ جواز پر ہو چکا ہے مگر اس کو تعلیم وتدریس میں ثواب بھی کچھ نہیں کیونکہ اس کا مقصود محض تنخواہ ہے اس حالت میں یہ تعلیم طاعت نہیں غایت مافی الباب ایک عمل مباح ہے جس پر اجرت لینا متاخرین کے فتویٰ میں جائز ہے گو فی نفسہ تعلیم دین طاعت تھی مگر چونکہ اس کی نیت تعلیم دین کی نہیں بلکہ مقصود اجرت ہے اس لئے **لکل امرئ مانوی** کے قاعدہ سے یہ ثواب کا مستحق نہیں۔

البتہ اگر ایک جگہ تنخواہ اس درجہ قلیل ہو جس میں تنگی اور کلفت سے گزر ہوتا ہو یا گزر تو ہو جاتا ہے مگر وہاں کوئی دوسری قسم کی تکلیف ہے جیسے باہمی رقابت اور تحاسد و تباغض وغیرہ یا اسی کے مثل کوئی اور کلفت ہو اس صورت میں دوسری جگہ چلا جانا مذموم نہیں کیونکہ اس کا مقصود زیادہ تنخواہ نہیں بلکہ رفع تالم مقصود ہے۔ یا ایک جگہ تنخواہ بھی قلیل ہے اور دین کا کام بھی اس کے ہاتھ سے یہاں کم ہو رہا ہے اور دوسری جگہ تنخواہ بھی زیادہ ہے اور دین کا کام بھی وہاں اس کے ہاتھ سے زیادہ ہوگا اس صورت میں بھی دوسری جگہ جانے کا مضائقہ نہیں، جب کہ مقصود یہ ہو کہ میں وہاں جا کر دین کا کام زیادہ کروں گا۔ خدا تعالیٰ سے معاملہ ہے اس میں اپنی نیت کو دیکھ کر خود فیصلہ کر لینا چاہیے۔ لوگوں کے سامنے توجیہیں کر کے اگر آپ نے یہ ثابت کر دیا کہ ہماری تنخواہ نفقہ ہے اجرت نہیں تو خدا کے یہاں یہ توجیہیں کام نہ دیں گی۔

حقیقت علم

میں یہ کہہ رہا تھا کہ جو لوگ خوش استعداد ہیں اور وہ درسیات سے فارغ ہونے کے

بعد تعلیم وتدریس ہی میں لگے رہتے ہیں ان میں بھی سب کا مقصود زیادت فی العلم نہیں بلکہ بعض کو تو محض تنخواہ ہی مطلوب ہوتی ہے اور بعض کا مقصود طلباء میں شہرت ہے کہ تعلیم وتدریس میں نام ہو جائے اور عالم متبحر اور لائق مدرس مشہور ہو جائیں اور گو بعض اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں جن کا مقصود علمی ترقی اور زیادت فی العلم ہے۔ مگر ایسا شخص ایک ہی نکلے گا دس جماعتوں میں سے، اور نادر کالعدم ہوتا ہے اس لئے میرا مضمون پھر بھی قابل اہتمام رہا۔ جس میں شکایت کر رہا ہوں کہ ہم لوگ زیادت فی العلم کو مطلوب نہیں سمجھتے۔ اس لئے اس کے طالب بہت تھوڑے ہیں اور پھر یہ قلیل افراد بھی طالب زیادت فی العلم محض صورت کے اعتبار سے ہیں۔ یعنی صورت علم میں زیادت کے طالب ہیں، حقیقت علم میں زیادت کے طالب یہ بھی نہیں۔ کیونکہ حقیقت علم سے تو عموماً اذہان ہی خالی ہیں پھر اس کے طالب کیوں کر ہوں۔

اب میں حقیقت علم اول تعین کر دوں پھر آیت کو اس پر منطبق کر دوں گا کہ اس سے حقیقت علم میں زیادت کا مطلوب ہونا کس طرح مفہوم ہوتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے میں اجمالاً زیادت فی العلم کے مقصود ہونے کی دلیل بیان رکھتا ہوں۔ حق تعالیٰ سورۂ طہ میں فرماتے ہیں۔ **وقل رب زدنی علما۔** (اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیں کہ اے اللہ میرے علم میں ترقی عطا فرما) اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امر ہے کہ آپ زیادت فی العلم کے لئے ہم سے دعا کیجئے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے لئے دعا کا امر ہے تو اس سے زیادت فی العلم کا مطلوب ہونا یقیناً ثابت ہو گیا۔ اور ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا علم سب سے بڑھا ہوا ہے۔ جب آپ کو بھی طلب زیادت کا امر ہے تو ہم جیسوں کو تو کیوں نہ ہوگا جن کا علم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم سے کچھ بھی نسبت نہیں رکھتا۔

اب میں ان آیات سے بھی جن کی میں نے تلاوت کی ہے اس مضمون کو ثابت کرنا چاہتا ہوں مگر پہلے ایک مقدمہ سمجھنا چاہیے کہ ہدایت اور علم میں کیا تعلق ہے۔ آیا جو حقیقت علم کی ہے وہی ہدایت کی ہے یا علم ہدایت کا غیر ہے۔ ہدایت کے معنی طلباء کو خوب معلوم ہیں کہ اس کے معنی اراءۃ طریق ہیں اور بعض نے اس کو اراءۃ ایصال الی المطلوب میں مشترک نہیں بلکہ ایصال بھی اراءۃ ہی کا ایک فرد ہے۔ پس یوں کہنا چاہیے کہ ہدایت کے

معنی تو اراءۃ طریق ہی ہیں مگر اراءۃ کی دو صورتیں ہیں۔ ایک ارادۃ من بعید دوسرے اراءۃ من قریب اور اراءۃ من قریب کو ایصال کہتے ہیں۔ اس کے بعد سمجھئے کہ اراءۃ افعال ہے رویت کا اور طلباء کو معلوم ہے کہ رویت کی دو قسمیں ہیں۔ رویت بصر اور رویت قلب۔ اگر ہدایت حسی ہے تو اراۃ سے رویت بصر مراد ہے اور ہدایت معنوی ہے تو رویت قلب مراد ہے اور رویت قلب علم ہے۔ پس ہدایت کا حاصل علم کے قریب ہے۔ کیونکہ ہدایت معنوی علم کو مستلزم ہے اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی ہدایت اور اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور قرآن کی ہدایت حسی نہیں بلکہ معنوی ہے۔ پس یہ ہدایت تو یقیناً علم سے متوافق اور متقارب ہے۔ تو اگر قرآن میں کسی جگہ سے زیادت فی الہدیٰ کا مطلوب ہونا معلوم ہوگا اس سے زیادت فی العلم کا مطلوب ہونا بھی ثابت ہوگیا۔

اب سمجھئے کہ ان آیات میں زیادت فی الہدیٰ کی مطلوبیت کا ذکر ہے حق تعالیٰ قرآن کی صفت میں فرماتے ہیں هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ اس پر یہ اشکال مشہور ہے کہ متقین تو خود ہی ہدایت یافتہ ہیں، ان کے لئے ہدایت ہونے کا کیا مطلب ہے؟

اس کے دو جواب ہیں۔ ایک تو یہ کہ متقین میں تاویل کرو کہ اس سے مراد متقی بالفعل نہیں بلکہ صائرین الی التقویٰ مراد ہیں جن کو باعتبار مایول الیہ کے متقی کہہ دیا گیا۔ مگر حقیقت ممکن ہوتے ہوئے مجاز لینا خلاف اصل ہے۔ اس لئے راجح توجیہ یہ ہے کہ لفظ متقین اپنے معنے پر رہے اور ہدیٰ میں درجات نکالے جائیں کہ ہدایت کے لئے مدارج مختلفہ ہیں۔ جن میں سے بعض مدارج کا حصول ان لوگوں کو بھی نہیں ہے جو بالفعل متقی ہیں۔ قرآن ان مدارج کی طرف متقیوں کو پہنچاتا ہے۔ اس سے تو یہ ثابت ہوا کہ ہدایت کے مدارج بہت ہیں! رہا یہ کہ زیادت فی الہدیٰ مطلوب ہے۔ اس کی دلیل سورۂ فاتحہ کی آیت اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (ہمیں سیدھا راستہ دکھا) ہے جس میں طلب ہدایت کا امر ہے اور سورۂ بقرہ کو سورۂ فاتحہ سے ربط بھی ہے کہ اس میں دعائے ہدایت بھی ہے اور اس میں اجابت دعا ہے کہ لو یہ کتاب ہدایت ہے۔ اس پر چلو۔ اور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ پر بھی یہی اشکال عود کرتا ہے کہ وہ لوگ تو پہلے ہی سے ہدایت یافتہ ہیں جن کو یہ دعا تعلیم کی گئی ہے۔ اس کا بھی یہی جواب ہے

کہ مراد زیادت فی الہدیٰ کی طلب ہے۔ اب هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (ہدایت ہے متقیوں کے لئے) پر کوئی اشکال نہ رہا۔ کیونکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ اور کتابیں تو ان پڑھوں کو پڑھاتی ہیں اور یہ کتاب پڑھے ہوؤں کو پڑھانے والی ہے۔ یہ ہدایت یافتوں کے لئے ہدایت ہے۔ اور یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ ہدایت اور عمل متقارب ہیں اور یہاں سے زیادت فی الہدیٰ کا مطلوب ہونا ثابت ہے تو زیادت فی العلم کا مطلوب ہونا بھی ثابت ہو گیا۔

یہ مضمون میں دوسری آیات سے بھی بیان کر سکتا تھا مگر مجھے زیادت فی العلم کے اسباب بھی بیان کرنا ہیں جس سے طلباء غافل ہیں ورنہ وہ ان اسباب کو ضرور اختیار کرتے۔ نیز مجھے علم اور زیادت فی العلم کی حقیقت بھی بتلانا ہے یہ مضامین آیات میں مجتمعاً مذکور ہیں۔ اس لئے ان کو تلاوت میں اختیار کیا۔

چونکہ مخاطب اہل علم ہیں اس لئے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ ان کے لئے اختصار بھی کافی ہے۔ پس میں مختصر طور پر حقیقت علم اور حقیقت زیادت فی العلم اور اس کے اسباب کو عرض کرتا ہوں اور اس کے لئے شروع سے آیات کا ترجمہ کرتا ہوں۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں آلم۔ اس کے معنی اللہ تعالیٰ کو معلوم ہیں کسی اور کو معلوم نہیں۔ شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلا دیئے گئے ہوں ان معانی میں تفتیش نہ کرنا چاہیے۔ شاید تم یہ کہو کہ یہ تو زیادت علم کے منافی ہے جس کی تم ترغیب دے رہے ہو پس اول ان کے معنی بتلاؤ پھر زیادت فی العلم کو ترغیب دینا خصوصاً جب کہ تم کو اسباب زیادت علم بھی معلوم ہیں جن کو اس وقت بتلانے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اور اگر باوجود علم اسباب کے بھی تم کو ان کے معنی معلوم نہیں تو امام مقتدی دونوں برابر ہیں کہ دونوں زیادت فی العلم میں کوتاہی کر رہے ہیں۔

اس شبہ کا جواب دینے میں چونکہ اپنے لئے زیادت فی العلم کا اثبات ہے اس لئے بہتر تو یہ تھا کہ میں جواب سے جی چراتا۔ لیکن جواب نہ دینے میں یہ احتمال ہے کہ شاید کوئی یہ سمجھے کہ ان کے معنی معلوم تو ہیں مگر کسی مصلحت سے بیان نہیں کرتا اس واسطے میں جواب دینے پر مجبور ہوں اور صاف کہتا ہوں کہ مجھے بھی ان کے معنی معلوم نہیں اور اس میں میں اور آپ دونوں برابر ہیں۔ رہا یہ شبہ کہ معلوم نہیں تو تلاش کرو اور تلاش نہ کرنا زیادت فی العلم

کے منافی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ زیادت فی العلم میں ایک تفصیل ہے۔ جس کی طرف اسی جزو میں اشارہ ہے اس کو یاد رکھئے۔ آگے چل کر ان شاء اللہ وہ تفصیل معلوم ہو جائے گی۔

ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ (یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں)

اس کی تفصیل مجھے مقصود نہیں۔ اس جملہ میں قرآن کی مدح ہے کہ یہ کتاب کامل ہے۔

اس میں کوئی بات موجب خلجان نہیں (یہ سوال و جواب مسودہ میں مذکور نہیں صرف اجمالی اشارہ ہے جس کی دلالت اس تفصیل پر واضح نہیں اور تھا ضروری، اسلئے مقوس کر دیا ۱۲) رہا یہ شبہ کہ کفار تو اس میں بہت شبہات نکالتے ہیں۔ اس کا جواب ایک تو مشہور ہے کہ قرآن میں کوئی بات فی نفسہٖ موجب خلجان نہیں ہے اور شبہ نکالنے والوں کو جو شبہات پیش آتے ہیں اس کا منشا قرآن کے مضامین نہیں بلکہ ان کا قصور فہم ہے اور اگر کسی اندھے کو دن میں طلوع آفتاب میں شک ہو تو اس کے شک سے طلوع آفتاب مشکوک نہیں ہو جاتا۔ اور دوسرے جواب کی طرف هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ میں اشارہ ہے۔ حاصل اس جواب کا یہ ہے کہ اگر کسی کو قرآن میں کوئی شک و شبہ پیش آتا ہے تو وہ شبہ اسی وقت ہے جب تک قرآن کی تعلیم پر عمل نہ کیا جائے اور اگر قرآن کی تعلیم پر پوری طرح عمل کیا جائے تو سب شبہات خود بخود زائل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ قرآن متقین کے لئے ہدایت ہے۔ پس اہل شبہات کو چاہئے کہ وہ تعلیم قرآن پر عمل کرنا شروع کریں۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب (سورج نکلا یا اپنے وجود کی خود دلیل ہے)

عمل کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ حقیقت میں قرآن سر تا پا ہدایت ہی ہدایت ہے۔ اس میں کوئی امر موجب خلجان نہیں ۱۲ جامع)

هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ اس سے میرا مقصود متعلق ہے۔ جس کی تقریر اوپر مذکور ہو چکی اور میں ثابت کر چکا ہوں کہ اس آیت سے زیادت فی الهدی مفہوم ہوتی ہے اور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (ہمیں سیدھا راستہ بتلا دیجئے) کو اس کے ساتھ ملانے سے اس زیادت کا مطلوب ہونا ثابت ہے۔ اب اسباب زیادت علم اور حقیقت علم کا بیان رہ گیا۔ سو هدی للمتقین ہی میں اس کی طرف بھی اشارہ ہے کیونکہ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ قرآن

ہدایت ہے متقیوں کیلئے اور یہ ابھی معلوم ہو چکا کہ یہاں نفس ہدایت مراد نہیں کیونکہ نفس ہدایت تو متقین کو پہلے سے حاصل ہے بلکہ زیادت ہدایت مراد ہے تو معلوم ہو گیا کہ زیادت فی الھدیٰ اور زیادت فی العلم کس کو حاصل ہوتی ہے متقیوں کو حاصل ہوتی ہے اور اسی سے سبب زیادت بھی معلوم ہو گیا کہ وہ تقویٰ ہے (کیونکہ بلاغت کا قاعدہ ہیکہ جب کسی حکم کو کسی معنی وصفی کے ساتھ متعلق کیا جائے تو اس معنی وصفی کو حکم میں دخل ہوتا ہے جیسے اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا (چور مرد چور عورت پس ان دونوں کے ہاتھ کاٹ دو) اور جیسے اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ای اعدت لھم لکفرھم ۱۲ جامع) (تیار کی گئی ہے کافروں کے واسطے بوجہ ان کے کفر کے) نیز اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حقیقت علم کیا ہے حقیقت میں علم وہ ہے جو تقویٰ سے بڑھتا ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ تقویٰ سے صورت علم میں تو زیادت نہیں ہوتی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ تقویٰ سے مدارک اور بیضاوی ختم ہو جائے۔ معلوم ہوا کہ وہ کوئی اور چیز ہے جو صورت علم کے علاوہ ہے جو تقویٰ ہی سے بڑھتی ہے کتابوں سے حاصل نہیں ہوتی۔ یہاں سے ان لوگوں کی غلطی ظاہر ہو گئی جو محض صورت علم میں زیادت کے طالب ہیں۔ اور حقیقت علم سے غافل ہیں۔

www.alhaqq.org

فہم قرآن

اب رہا یہ کہ وہ حقیقت علم ہے کیا چیز؟ اس کی تعیین کرنا چاہئے تو جن لوگوں کی نظر حدیثوں پر ہے وہ اس کو جانتے ہیں۔

بخاری میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے بعض لوگوں نے ان کے زمانے میں یہ مشہور کر دیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو کچھ خاص علوم عطا فرمائے تھے جو دوسروں کو نہیں بتلائے گئے۔ غضب یہ کہ تصوف کی بعض کتابوں میں بھی لکھ دیا ہے کہ شب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نوے ہزار علوم عطا کئے گئے تھے۔ تیس ہزار تو عام کر دیئے گئے تھے اور تیس ہزار خواص کو بتلائے گئے تھے اور تیس ہزار خاص حضرت علی کو عطا ہوئے۔ اور اس کے متعلق ایک لمبا قصہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اول حضرت ابو بکرؓ سے پوچھا کہ اگر ہم تم کو وہ خاص علوم بتلا دیں تو تم کیا کرو گے؟ انہوں نے کہا یا رسول اللہ میں خوب عبادت

کروں گا اور جہاد میں کوشش کروں گا۔ آپؐ نے فرمایا تم ان کے اہل نہیں (نعوذ باللہ) پھر حضرت عمرؓ سے پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ میں دوسروں کو ہدایت کروں گا اور کفار پر سختی کروں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم بھی اس کے اہل نہیں۔ پھر حضرت عثمانؓ سے پوچھا اور انہوں نے بھی کچھ ایسا ہی جواب دیا۔ وہ بھی اہل نہ نکلے پھر حضرت علیؓ سے پوچھا۔ انہوں نے کہا، میں مخلوق کی ستاری کروں گا۔ حضورؐ نے فرمایا، ہاں تم اہل ہو پھر ان کو وہ تیس ہزار علوم عطا ہوئے کسی نے خوب فرصت میں بیٹھ کر گھڑی ہے۔ بھلا ان سے پوچھے کہ معراج میں جو باتیں حضورؐ سے ہوئی تھیں کیا تم ان کو سن رہے تھے جو تم کو ان کی تعداد بھی معلوم بھی ہوگئی۔

ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ معراج میں حضورؐ سے حق تعالیٰ نے کیا باتیں کی تھیں۔ انہوں نے خوب جواب دیا ؎

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں ☆ بلبل گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد

(اب کس کا حوصلہ اور ہمت ہے کہ باغبان سے یہ پوچھے بلبل نے کیا کہا، پھول نے کیا سنا اور صبا نے کیا کہا)

غرض حضرت علیؓ کے متعلق لوگوں کا یہ خیال ان کی حیات ہی میں ہوگیا تھا کہ ان کو کچھ خاص علوم عطا ہوئے ہیں جس کی وجہ یہ تھی کہ معارف وحکم حضرت علیؓ کی زبان سے بہت ظاہر ہوتے تھے۔ اس سے لوگوں کو یہ خیال ہوا۔ پھر بعض نے خود حضرت علیؓ سے اس کو دریافت کیا۔ **هل خصكم رسول الله صلى الله عليه وسلم بشئى دون الناس**۔ کیا حضورؐ نے آپ کو دوسرے مسلمانوں سے الگ کوئی خاص چیز عطا فرمائی ہے؟ آپ نے دو جواب دیئے۔ ایک جواب **قال لا الا ما فی هذه الصحيفة**۔ فرمایا ہرگز نہیں مگر صرف وہ احکام جو اس صحیفہ میں لکھے ہوئے ہیں (اس میں صدقات اور دیت کے احکام تھے جن کا خاص نہ ہونا سب کو معلوم ہے)

دوسرا جواب **قال ما خصنا رسول الله صلى الله عليه وسلم الا فهما او تيه الرجل فی القران** یعنی ہم کو خاص چیز عطا نہیں ہوئی مگر ایک فہم جو حق تعالیٰ کسی بندہ کو قرآن میں عطا فرماویں۔ حاصل جواب کا یہ تھا کہ جو علوم مجھ سے ظاہر ہوتے ہیں ان کا منشاء

یہ نہیں کہ حضورؐ نے مجھے کچھ خاص علوم دوسرے مسلمانوں سے الگ بتلائے ہیں بلکہ اس کا منشاء خاص فہم ہے جو حق تعالیٰ نے قرآن یعنی دین میں مجھے عطا فرمائی ہے۔

یہی ہے حقیقت علم جو تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے اور یہی ہے وہ فقہ جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ **فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد.** (سنن الترمذی: ۲۶۸۱، سنن ابن ماجة:۲۲۲)

کہ ایک فقیہ شیطان پر ہزاروں عابدوں سے زیادہ گراں ہے اس سے درسی فقہ مراد نہیں۔ کیونکہ محض کتابیں پڑھنے سے شیطان کی چالیں سمجھ میں نہیں آتیں بلکہ وہ معرفت ہے جو تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے۔ جس سے عارف کو دین کی سمجھ بوجھ ایسی کامل ہو جاتی ہے کہ شیطان کے تمام تار و پود کو توڑ دیتا ہے۔ شیطان بعض دفعہ دنیا کو دین کی صورت میں ظاہر کرتا ہے۔ عارف اس دھوکا کو سمجھ کر لوگوں پر ظاہر کر دیتا ہے جس سے لوگ دھوکا سے بچ جاتے ہیں اس لیے وہ شیطان پر گراں ہے۔

اسی علم کی فضیلت میں یہ حدیث وارد ہے۔

من یرد الله به خیر ایفقهه فی الدین (جس کے لئے اللہ تعالیٰ بہتری کا ارادہ کرتے ہیں اس کو دین کی سمجھ عطا فرما دیتے ہیں) (الصحیح للبخاری ۱:۲۷،۴:۱۰۳،۹)

یہ علم حقیقی کتابیں پڑھنے سے حاصل نہیں ہوتا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو صحابہ کے ان پڑھ ہونے پر فخر فرماتے ہیں امة **لا نکتب ولا نحسب** (مسند الإمام أحمد بن حنبل ۲:۱۲۲) بتلایئے صحابہ نے کیا لکھا پڑھا تھا کچھ بھی نہیں بلکہ بعضے تو ان میں دستخط بھی نہ کر سکتے تھے۔ اور بعض صحابہ فتاویٰ کو تابعین کے حوالے کر دیتے تھے۔ مگر باینہمہ علوم میں وہ سب سے افضل تھے۔ چنانچہ عبداللہ بن مسعود صحابہ کی شان میں فرماتے ہیں **اعمقهم علما** کہ امت میں سب سے بڑھ کر صحابہ کا علم عمیق ہے۔ آخر وہ کونسا علم تھا کیا درسی اور کتابی علم تھا۔ ہرگز نہیں بلکہ یہ علم وہی فہم قرآن تھا جو حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت سے ان کو عطا فرمایا تھا جس میں ان کے تقویٰ سے ترقی ہوتی رہتی تھی اور یہی وہ علم ہے جس کے متعلق امام شافعیؒ کا قول ہے۔

شكوت الىٰ وكيع سوء حفظي   فا وصاني الىٰ ترك المعا صي

(میں نے حضرت وکیعؒ سے اپنے سوء حافظہ کی شکایت کی تو انہوں نے مجھے گناہوں سے بچنے کی وصیت کی)

آخر وہ کون سا علم ہے۔ جس میں معاصی حائل ہیں۔ کیا وہ کتابی علم ہے ہرگز نہیں۔ کتابی علم تو جس کا حافظہ قوی ہوگا اس کو زیادہ یاد رہے گا۔ ایک فاسق فاجر کو بڑے سے بڑے متقی سے زیادہ قرآن حفظ ہو سکتا ہے بلکہ کافر کو بھی ممکن ہے کہ ہم سے زیادہ مسائل واحادیث یاد ہو جائیں۔ چنانچہ بیروت میں بعضے عیسائی ہماری حدیث اور فقہ کو بڑے جاننے والے ہیں۔ اور جرمن کے ایک مدرسہ کا حال ایک شخص نے کسی سیاح سے نقل کیا ہے کہ وہاں علوم اسلامیہ کی تعلیم ہوتی ہے۔ کسی کمرہ کا نام دارالفقہ ہے کسی کا نام دارالحدیث ہے اور وہاں بخاری ہدایہ سب کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور پڑھنے والے پڑھانے والے سب عیسائی کافر ہیں۔ اور وہ لوگ اختلافیات کو بہت شرح وبسط کے ساتھ بیان کرتے ہیں کیونکہ جرمن میں کتب خانہ بڑا ہے اس میں ہماری نایاب کتابیں اس قدر ہیں کہ ہم نے ان کتابوں کا نام بھی نہیں سنا۔

تو امام شافعیؒ کی مراد کتابی علم میں سوء حفظ کی شکایت نہیں۔ امام وکیع کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسرے علم میں قلت حفظ کی شکایت کر رہے تھے۔ جس میں معاصی میں دخل تھا یہی ہے حقیقت علم اور یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے مجتہدین مجتہد ہوئے ہیں ورنہ وسعت نظر اور کثرت معلومات میں تو ممکن ہے کہ بعض مقلدین مجتہدین سے بڑھے ہوئے ہوں۔ خوب کہا ہے ؎

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند ☆ نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند
ہزار نکتہ باریک تر زمو ایں جاست ☆ نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

(جو شخص بھی چہرہ آراستہ کرے یہ لازم نہیں کہ وہ دلبری بھی جانتا ہو جیسے جو شخص آئینہ بناتا ہو یہ لازم نہیں کہ سکندری بھی جانتا ہوں، اس جگہ ہزاروں باریکیاں بال سے زیادہ باریک ہیں جو شخص سر بھی منڈائے ضروری نہیں کہ قلندری بھی جانتا ہو)

بس اس سے زیادہ پتہ میں اس حقیقت کا نہیں بتلا سکتا ظاہر میں تو چھوٹا سا لفظ ہے فهما اوتيه الرجل في القران مگر یہ کہ وہ فہم کیا چیز ہے اور کس درجہ کی ہوتی ہے اس کے

بیان سے الفاظ قاصر ہیں۔ بس اس کے طریقہ یہی ہے کہ تقویٰ اختیار کر کے دیکھ لو۔ الفاظ سے کمالات حقیقیہ کی تعبیر نہیں ہوسکتی ۔

پرسید کسے کہ عاشقی چیست ☆ گفت کہ چو ما شوی بدانی
(کسی نے دریافت کیا کہ عاشقی کی حقیقت کیا ہے میں نے جواب دیا
ہماری طرح ہو جاؤ گے تب جان لو گے)

امور ذوقیہ

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرماتے تھے کہ امور ذوقیہ کی حقیقت بیان سے سمجھ میں نہیں آسکتی۔ دیکھو اگر کسی نے آم نہ کھایا ہو اور تم اس سے آم کی تعریف کرو کہ ایسا لزیذ اور میٹھا ہوتا ہے تو وہ کہے گا کہ گڑ جیسا ہوتا ہے۔ تم کہو گے نہیں۔ وہ کہے گا شکر جیسا یا انگور وانار جیسا۔ تم کہو گے نہیں۔ پھر وہ اصرار کرے گا کہ بتلاؤ کیسا ہوتا ہے تم یہی کہو گے کہ بھائی ہم کو اس کے بیان پر قدرت نہیں ایک دفعہ کھا کر دیکھ لو خود معلوم ہو جائے گا۔ اس وقت اس شخص کو تعجب ہوگا اور اس بات کا یقین نہ کرے گا کہ بیان پر قدرت نہیں مگر جب کھالے گا تو اب وہ بھی بیان پر قادر نہ ہوگا۔

یہ بات کچھ کمالات حقیقیہ ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ محسوسات میں بھی جس چیز کا ذوق سے تعلق ہے وہ الفاظ سے بیان نہیں ہوسکتی۔

ایک ترکی امیر کا قصہ ہے کہ اس کی مجلس میں مطرب ایک غزل پڑھ رہا تھا جس کے اشعار میں نمی دانم نمی دانم بار بار آتا تھا۔ مثلاً

گلی یا سوسنی یا سرو یا ماہی نمیدانم ☆ ازیں آشفتہ بیدل چہ می خواہی نمیدانم
(تو پھول ہے یا سوسن ہے یا چاند؟ میں نہیں جانتا اس پریشان عاشق سے کیا
چاہتا ہے میں نہیں جانتا)

وہ ترک شراب پیئے ہوئے تھا۔ ایک دو شعر تو اس نے سنے، جب اسنے بار بار اسی نمیدانم نمیدانم کا اعادہ کیا، تو اس نے ایک گھونسہ مارا کہ ایں نمیدانی چہ گوئی آنچہ می دانی بگو۔ یعنی جس بات کو نہیں جانتا اس کو بار بار کیوں دہراتا ہے جو جانتا ہے وہ کہہ۔ یہ قدر کی اس نے شعر کی۔ تو بات کیا تھی کہ اس کو شعر کا ذوق نہ تھا۔ اگر ہوتا تو مست ہو جاتا۔ لیکن جس کو

شعر میں مزہ آتا ہے اس سے ذرا پوچھئے تو کہ شعر میں کتنا مزہ ہے۔

بس یہی کہے گا کہ بیان پر قدرت نہیں۔ ذوق حاصل ہونے سے پہلے تو آپ کو یقین نہ آئے گا مگر ذوق حاصل ہونے کے بعد آپ بھی یہی کہیں گے۔

جیسے ایک بزرگ کا قصہ ہے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ سارے ولی مرتے جاتے ہیں مگر برزخ کی خبر کوئی نہیں دیتا کہ وہ عالم کیسا ہے حالانکہ بعض اولیاء اس درجہ کے بھی ہیں جو مرنے کے بعد خبر دے سکتے تھے۔ اچھا ہم ضرور بتلا دیں گے۔ جب ہم کو دفن کیا جائے تو ہماری قبر میں قلم دوات اور کاغذ رکھ دیا جائے۔ ہم وہاں کے حالات لکھ کر دیں گے۔ تیسرے دن ہماری قبر نا۔ کاغذ وغیرہ قبر کے اوپر ملے گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ تیسرے دن حسبِ وعدہ کاغذ قلم دوات باہر رکھا ہوا تھا اور یہ لکھا ہوا تھا کہ حقیقت تو بغیر گزرے معلوم نہیں ہو سکتی اور پتہ اس سے زیادہ کوئی نہیں دے سکتا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں بیان فرما دیا ہے سچ ہے

آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد (جس کو اس کی خبر ہوگئی پھر اس کی خبر نہ آئی)

اور اگر کوئی کمالات حقیقیہ کو الفاظ سے سمجھنا اور سمجھانا بھی چاہے تو وہ ٹیڑھی کھیر کا قصہ ہوگا کہ ایک لڑکا ایک مادرزاد اندھے حافظ جی کے پاس آیا اور کہا حافظ جی دعوت ہے۔ کہنے لگے کیا کھلاوے گا۔ اس نے کہا کھیر۔ پوچھا کھیر کیسی ہوتی ہے! کہا سفید ہوتی ہے۔ حافظ جی نے سفید سیاہ کو کب دیکھا تھا۔ پوچھا سفید کسے کہتے ہیں! لڑکے نے کہا جیسے بگلا۔ پوچھا بگلا کیسا ہوتا ہے! لڑکے نے ہاتھ کو موڑ کر دکھلایا کہ ایسا ہوتا ہے۔ حافظ نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ پھیرا اور کہا بھائی یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ جا میں دعوت نہیں کھاتا۔ یہ تو میرے گلے میں اٹک جاوے گی۔

دیکھئے چونکہ کھیر کے اوصاف ذوقی چیز تھی۔ اس لئے الفاظ سے سمجھ میں نہ آ سکی۔ اور کہاں سے کہاں نوبت پہنچ گئی۔ بس اس کا سیدھا جواب یہ تھا کہ حافظ جی ایک لقمہ منہ میں لے کر دیکھو خود معلوم ہو جائے گا کہ کیسی ہوتی ہے۔ بس میں یہی کہتا ہوں کہ حقیقتِ علم جو تقوے سی حاصل ہوتی ہے الفاظ سے آپ اس کی حقیقت نہیں سمجھ سکتے۔ پس تقویٰ اختیار کر کے دیکھ لو۔

وہبی علوم

ہاں پتہ بتلانے کے لیے اتنا کہتا ہوں کہ حقیقت علم جس کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کے

قلب پر غیب سے وہ علوم وارد ہوتے ہیں جو کتابوں میں نہیں مل سکتے۔ مولانا فرماتے ہیں ۔

علم چوں برتن زنی مارے شود ☆ علم چوں بر دل زنی یارے شود
بینی اندر خود علوم انبیاء ☆ بے کتاب و بے معید واوستا

(یعنی علم اگر تن پر اثر کرے تو سانپ (ہلاک کرنے والا) ہے اور علم اگر دل پر اثر کرے وہی معاون و مددگار رہے، یعنی اپنے اندر بغیر کتاب بغیر معین واستاد کے انبیاء جیسے علوم پاؤ گے)

اس سے معلوم ہوا کہ وہ علوم وہبی ہیں کسبی نہیں ہیں۔ اس کے متعلق ایک روایت میں آیا **من عمل بما علم به علمه الله مالم یعلم**۔ (الدر المنثور ۱:۳۷۲) آج کل لوگوں نے کثرت معلومات کو علم سمجھ لیا ہے حالانکہ علم اور چیز ہے اور معلومات اور چیز ہیں۔

مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے علم اور معلومات کا عجیب فرق منقول ہے۔ ایک مرتبہ مولانا نے فرمایا کہ لوگ تو حاجی صاحب کے معتقد ہوئے زہد وتقوے سے یا کثرت عبادت سے یا کرامات سے اور میں معتقد ہوا علم سے۔

اس پر لوگوں کو حیرت ہوئی کہ حاجی صاحب سے مولانا کا علم بڑھا ہوا تھا۔ حاجی صاحب نے تو کافیہ ہی تک پڑھا تھا مگر علم کی حالت یہ تھی کہ کافیہ پڑھنے ہی کے زمانے میں حاجی صاحب مشکوٰۃ شریف کے درس میں بھی بیٹھ جایا کرتے تھے جو مولوی قلندر صاحب جلال آبادی کے یہاں ہوتی تھی۔ درس کے بعد جب طلبا میں کسی حدیث کے متعلق اختلاف ہوتا تو حاجی صاحب اس کا مطلب بیان فرماتے۔ بعض دفعہ طلباء حاجی صاحب سے الجھتے کہ نہیں یہ مطلب نہیں ہے اور تقریر میں آپ کو دبا لیتے۔ کیونکہ حضرت حاجی صاحب کی عادت مناظرہ کی نہیں تھی۔ مگر جب مولوی محمد قلندر صاحب کو اس اختلاف کی خبر ہوئی تو ہمیشہ حاجی صاحب کی بات کو صحیح بتاتے تھے اسی طرح ایک دفعہ مولانا شیخ محمد صاحب سے مثنوی کے ایک شعر میں اختلاف ہوا۔ حاجی صاحب کے بیان کئے ہوئے کو اس وقت تو مولانا شیخ محمد صاحب نے نہ مانا مگر ایک بار مثنوی کے درس میں وہ شعر آیا تو مولانا نے وہی مطلب بیان فرمایا۔ حاجی صاحب حجرہ میں تھے باہر نکل کر سلام کیا۔ مولانا نے اقرار کیا کہ واقعی میں غلطی پر تھا۔ آخر یہ کیا بات تھی یہ وہی علمِ حقیقی تھا جو حاجی صاحب کو تقوے کی بدولت عطا ہوا تھا۔

اسی کو مولانا محمد قاسم صاحب فرماتے تھے کہ میں علم کی وجہ سے حاجی صاحب کا معتقد ہوا ہوں۔ لوگوں نے اس کا راز پوچھا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ علم اور چیز ہے اور معلومات اور چیز ہیں۔ اور یہ فرق بیان فرمایا کہ دیکھو ایک تو ابصار ہے اور ایک مبصرات ہیں۔ ان دونوں میں فرق ہے یعنی ایک تو وہ شخص ہے جس نے سیاحت بہت کی ہے مگر اس کی نگاہ بہت کمزور ہے اور ایک شخص نے سیاحت تو بہت کم کی ہے مگر نگاہ بہت تیز ہے۔ تو جس کی نگاہ کمزور ہے اور اس نے سیاحت بہت کی ہے، اس کی مبصرات تو زیادہ ہیں مگر کسی مبصر کی پوری حقیقت سے آگاہ نہیں کیونکہ اس نے کسی چیز کو اچھی طرح دیکھا ہی نہیں۔ ہر چیز کو سرسری طور پر یوں ہی دیکھا ہے۔ اور جس کی نگاہ تیز ہے اور سیاحت زیادہ نہیں کی، اس کے مبصرات گو کم ہیں مگر جس چیز کو بھی دیکھتا ہے اس کی پوری حقیقت پر مطلع ہو جاتا ہے بس یہی فرق ہے ہمارے میں اور حاجی صاحب میں کہ ہماری معلومات تو زیادہ ہیں مگر بصیرت قلب زیادہ نہیں حاجی صاحب کے معلومات گو قلیل ہیں مگر بصیرت بہت زیادہ ہے۔ اس لیے ان کے جتنے علوم ہیں سب صحیح ہیں۔ وہ ہر معلوم کی حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں اور ہم حقیقت تک نہیں پہنچتے۔

اسی فرق کو ایک دن یوں بیان فرمایا کہ ہمارے ذہن میں تو اوّل مقدمات آتے ہیں پھر ان سے نتیجہ خود نکالتے ہیں جو کبھی صحیح ہوتا ہے کبھی غلط اور حاجی صاحب کے قلب میں اوّل نتائج صحیح وارد ہوتے ہیں اور مقدمات اس کے تابع ہوتے ہیں۔ غرض جیسے کثرت مبصرات کا نام ابصار نہیں اسی طرح کثرت معلومات، کا نام علم نہیں۔ بلکہ یہ ہے کہ ادراک سلیم اور قوی ہو جس سے نتائج صحیح تک جلد وصول ہو جاتا ہو۔ یہی ہے حقیقت علم جو فقط پڑھانے سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے اور اسباب ہیں۔

حقیقتِ تقویٰ

منجملہ ان کے ایک سبب تو دعا ہے جو اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ (ہم کو سیدھا راستہ بتلا دیجئے) میں مذکور ہے۔ دوسرا سبب تقویٰ ہے جو ھُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ (متقین کے لئے ہدایت کرنے والی ہے) میں مذکور ہے۔ اور تقویٰ سے یہ مراد نہیں کہ ذکر و شغل اور مراقبات کیا کرو یہ تو زینت تقویٰ ہیں۔ تقویٰ کی حقیقت اور ہے جس کو خدا تعالیٰ ہی سے پوچھ لو۔ حق تعالیٰ نے اسی مقام پر تقویٰ کی حقیقت بھی بیان فرمائی ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ
يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۗ

(وہ لوگ یقین لاتے ہیں چھپی ہوئی چیزوں پر اور قائم رکھتے ہیں نماز کو اور جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں وہ لوگ یقین رکھتے ہیں اس کتاب پر بھی جو آپ پر اتاری گئی ہے اور ان کتابو پر بھی جو آپ سے پہلے اتاری جا چکی ہیں اور آخرت پر بھی وہ لوگ یقین رکھتے ہیں)

اس جگہ حق تعالیٰ نے عقائد اور عبادات بدنیہ و مالیہ ﴿ ور معاملات (کتب سابقہ کے ساتھ ایمان کا تذکرہ کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ مسلمانوں کو معاندہ اور ہٹ دھرم نہ ہونا چاہیے کہ صرف اسی چیز کو مانے جس کا تعلق اپنے سے ہے اور جس چیز کا تعلق غیر سے ہو اس کو نہ مانے بلکہ مسلمان کو منصف اور عادل ہونا چاہیئے کہ جتنی بات جس کی بھی سچی ہو اس کو مانے۔ پس انجیل و توارت کا گو ہم سے عمل کے طور پر تعلق نہیں مگر اتنی بات تو سچی ہے کہ یہود و نصاریٰ پر یہ کتابیں خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی تھیں۔ پس اس کا انکار نہ کرنا چاہئے اور ان کو بھی منزل من اللہ ماننا چاہئے۔ ہاں یہود وغیرہ نے جو ان میں تحریف کی ہے اس کا انکار ضرور کیا جائے اس تعلیم میں مسلمانوں کو عدل و انصاف کی تاکید ہے کہ مخالفت میں بھی حد سے نہ بڑھیں اور یہی اصل الاصول ہے تمام تر معاملات کا فافہم ۱۲ ظ) ﴾ کے اصول بیان فرما دیئے ہیں۔ پس حاصل یہ ہوا کہ متقی وہ لوگ ہیں جو دین میں کامل ہوں کہ ان کے عقائد بھی صحیح ہوں اور عبادات بدنیہ و مالیہ (اور معاملات) میں بھی کوتاہی نہ کرتے ہوں اور یہی خلاصہ ہے کمال فی الدین کا۔ مگر یہ تفسیر اس پر موقوف ہے کہ اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ الخ صفت کاشفہ ہو اور اگر صفت کاشفہ نہ بھی ہو، جب بھی میرا مدعیٰ حاصل ہے۔ کیونکہ میرا مقصود یہ ہے کہ تقویٰ زیادت علم کا سبب ہے۔ اب چاہے وہ تقویٰ اس مجموعہ کا نام ہو جو مجموعہ آیات میں مذکور ہے یا اس میں مجموعہ سے جو حالت بسیط پیدا ہوتی ہے اس کا نام ہو جو للمتقین کا مدلول ہے اس میں بحث کرنے کی مجھے ضرورت نہیں۔ باقی یہ ظاہر ہے کہ تقویٰ کے لیے تمام معاصی سے اجتناب ضروری ہے اور وہ جبھی ہو سکتا ہے کہ مامورات کو بھی بجا لایا جائے۔ کیونکہ ترک مامور بہ بھی معصیت ہے۔ اس کا ترک بھی تقویٰ کے لئے ضروری ہے۔ اب چاہے تقویٰ کو مرکب مانو یا بسیط، وجودی مانو یا عدمی اس کے لیے عقائد و اعمال و معاملات کی درستگی

بہر حال ضروری ہے خواہ شرطاً ہو یا شطراً۔ مگر ایک دوسری آیت سے یہی راجح معلوم ہوتا ہے کہ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ الخ صفت کاشفہ ہی ہے اور یہ سب اعمال حقیقت تقویٰ میں داخل ہیں، گو لغۃً تقویٰ مفہوم عدمی ہو مگر شرعاً مفہوم عدمی نہیں ہے بلکہ شرعاً تقویٰ کی حقیقت کمال فی الدین ہے۔ جس پر ہو دوسری آیت وال ہے وہ دوسری آیت یہ ہے۔

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ
بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ

(کچھ سارا کمال اسی میں نہیں آ گیا کہ تم اپنا منہ مشرق کو کر لو یا مغرب کو لیکن اصل کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور سب کتاب سماویہ پر اور پیغمبروں پر)

یہاں تک تو عقائد کا ذکر ہے اور مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہاں البر سے مراد کامل ہے۔ تو بر کامل کا ایک جزو تو تصحیح عقائد ہے آگے فرماتے ہیں۔

وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ

(اور مال دنیا ہو اللہ تعالیٰ کی محبت میں رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور فقیروں کو اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور گردن چھڑانے والوں کو)

یہ حقوق مالیہ کا اور حسن معاشرت کا ذکر ہے۔ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ (اور نماز کی پابندی بھی رکھتا ہو اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو) اس میں عبادات بدنیہ و مالیہ کا ذکر ہے۔ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عٰھَدُوْا وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ (اور اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہوں جب عہد کریں وہ لوگ مستقل رہنے والے ہوں، تنگدستی میں اور بیماری میں اور قتال میں) اس میں اصول اخلاق کا ذکر ہے۔ غرض اعمال ظاہرہ اور طاعت مالیہ و بدنیہ اور اعمال قلبیہ وغیرہ سب اس آیت میں موجود ہیں۔ ان سب کو بیان فرما کر ارشاد ہوتا ہے۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ (یہ لوگ ہیں جنہوں نے سچ بولا اور یہی لوگ ہیں اور پہنچے اور جو سچے اور متقی کہے جا سکتے ہیں)

اس سے صاف معلوم ہوا کہ تقویٰ کی حقیقت کمال فی الدین ہے اور تصحیح عقائد و ادائے طاعات بدنیہ و مالیہ و اصلاح معاملات اور معاشرت سب اس کے اجزا ہیں۔ اب

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ الخ کا صفت کاشفہ ہونا بالکل صحیح ہے۔ پس تقویٰ محض ذکر و شغل کا نام نہیں۔ یہ تو اس کی زینت ہے بلکہ تقویٰ ان اعمال کے بجالانے کا نام ہے جو اس آیت میں مذکور ہیں۔ جس کا خلاصہ یہ کہ دین میں کامل ہونے کا نام تقویٰ ہے۔ پس ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کا حاصل یہ ہوا کہ زیادت ہدی اور زیادت علم کا سبب کمال فی الدین ہے۔ اس کا طلباء کو بالکل اہتمام نہیں۔ اور اس میں وہ بے حد کوتاہیاں کرتے ہیں۔ ان کوتاہیوں کی تفصیل میں کہاں تک کروں اور کس کس بات کو بتاؤں۔ ذرا کوئی شخص دو ہفتے کسی محقق کے پاس رہے اور اس سے اپنی اصلاح کی درخواست کرے۔ اور وہ محقق بھی ایسا ہو جو بے تکلف روک ٹوک کرتا ہو تب ان کو اپنی کوتاہیوں کی حقیقت معلوم ہو۔ تقویٰ کی حقیقت معلوم ہو۔

تقویٰ کی مثال

تقویٰ کی ایک ادنیٰ نظیر بتلاتا ہوں کہ لکھنؤ میں ایک بیرنگ کارڈ میرے نام آیا۔ میں موجود نہ تھا۔ میرے رفیقوں نے اسے واپس کر دیا کہ مکتوب الیہ شاید نہ لے۔ ڈاکیے نے ان سے کہا کہ اگر آپ چاہیں تو اس کو پڑھ سکتے ہیں اور مکتوب الیہ کو اطلاع کر سکتے ہیں۔ تو اس کو پڑھ کر واپس کر دیجئے۔ میرے رفیقوں نے کہا یہ تو جائز نہیں۔ کیونکہ جب ہم نے پڑھ لیا تو اس سے انتفاع ہو گیا۔ انتفاع کے بعد واپس کرنے کا کیا حق ہے۔

بتلایئے اس وقت کارڈ کے پڑھنے سے کون سی چیز مانع ہوئی جبکہ ڈاکیہ خود اجازت دے رہا تھا۔ صرف خوفِ خدا مانع تھا۔ اور تقویٰ خوف خدا ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ طلباء میں جو تقویٰ کی کمی ہے اس کا سبب یہی ہے کہ خدا تعالیٰ سے خوف نہیں ہے۔ اب تو یہ حالت ہے کہ جس کام کو کرنا چاہتے ہیں اس کو گھیر گھار کر جائز کر لیتے ہیں۔ گو دل میں جانتے ہیں کہ ناجائز ہے۔ بعضے یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے مشائخ اور اساتذہ بہت نیک کام کرتے ہیں۔ ہم بھی ان کے ساتھ بخشے جائیں گے قیامت میں وہ ہم کو بخشوالیں گے۔ یہ تو وہی حالت ہے۔

وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰی نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ

(اور یہود و نصاریٰ نے یوں کہا کے ہم اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں)

ان کو بھی اپنے بنی زادے اور صاحب علم ہونے پر ناز تھا مگر حق تعالیٰ نے اس گھمنڈ کو

باطل کر دیا۔ کیا تم نے یہ حدیث نہیں سنی۔

و۔ لمن لا يعلم ولو شاء الله لعلمه واحد من الويل وويل لمن يعلم ولا يعمل سبع من الويل (اقتضاء القول العمل للخطيب: ٦٤)(ص عن جبلة مرسلا ای رواه سعيد بن منصور فی سنة كذا فی العذيزی ص۴۱۷ ج ۳)

(یعنی جاہل کے لیے ایک ہلاکی ہے اور عالم کے لیے سات گونہ ہلاکت ہے ۱۲)

آخر اس حدیث پر عمل کرنے کے لیے کیا کوئی دوسری مخلوق پیدا ہوگی؟ کیا یہ تعلیمات ہمارے واسطے نہیں ہیں؟

طلباء کی کوتاہیاں

ایک کوتاہی طلباء میں یہ ہے کہ امارد کی طرف نظر کرنے اور ان کے ساتھ اختلاط کرنے سے نہیں بچتے حالانکہ یہ تقوی کے لیے سم قاتل ہے۔ آخرت کا مواخذہ تو شدید ہے ہی، اس سے دنیا میں بھی اہل علم کی سخت بدنامی ہوتی ہے۔ علم دین پڑھنے والوں کو اس باب میں سخت احتیاط کرنا چاہیئے۔

ایک کوتاہی یہ ہے کہ چندہ میں احتیاط نہیں کرتے۔ اہل وجاہت کے دباؤ سے چندے وصول کرتے ہیں۔

ایک کوتاہی یہ ہے کہ طلباء میں استادوں کا ادب نہیں ہے۔ اور جن استادوں کا ادب کرتے ہیں وہ استادی کی وجہ سے نہیں کرتے بلکہ بندگی اور شہرت کی وجہ سے ہے۔ استادی کا ادب ہوتا تو جو مشہور بزرگ اور مقتدا نہیں ہیں ان کا بھی ادب کیا جاتا۔ کیونکہ استادی کا حق تو ان کو بھی حاصل ہے۔

کانپور میں ایک مدرسہ کے ایک طالب نے مجھ سے خود بیان کیا کہ اس سال استاد نے تصریح پڑھنے کی رائے دی تھی مگر میری زبان سے شرح چغمینی کا نام نکل گیا تھا۔ بس مجھے اس کی ضد ہوگئی اور وہی شروع کر کے چھوڑ دی۔

اسی طرح مدرسہ میں کسی کتاب کے ختم پر طلباء اور استاد کی تو یہ رائے ہوئی کہ شمس بازغہ ہونا چاہیے۔ خیر شمس بازغہ ہی منظور ہو گیا تو آپ شب کو استاد کے پاس پہنچے۔ ان کو مکان سے باہر بلا کر کہتے ہیں کہ مولوی صاحب خیریت اسی میں ہے کہ صدرا ہو۔ انا للہ وانا الیہ راجعون.

بھلا اس حالت میں ان کم بختوں کو کیا علم حاصل ہوگا۔ بس کتابیں ختم کر لیں گے مگر علم جس کا نام ہے اس کی ہوا بھی نہیں لگے گی۔ پھر حیرت یہ ہے کہ جو استاد گھر پر پڑھاتے ہیں ان کی تو کچھ قدر بھی ہوتی ہے لڑکوں کو بھی اور ماں باپ کو بھی، حالانکہ ان کو خود تنخواہ دیتے ہیں اور ان مدارس کے استادوں کی تو ذرا بھی قدر نہیں، حالانکہ ان کو طلباء یا طلباء کے والدین تنخواہ بھی نہیں دیتے جس کا زور ہو۔ بلکہ مدرسہ سے تنخواہ ملتی ہے مگر طلباء ان کی نافرمانی زیادہ کرتے ہیں اور مدرسین ان کو کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ اندیشہ بھاگ جانے کا ہے اور طلباء کے بھاگ جانے سے چندہ کم ہو جائے گا۔ معلوم ہوا کہ اہل مدارس کو چندہ مقصود ہے۔ اس لیے طلباء کو فراہم رکھا جاتا ہے۔ لیکن چندہ کی غایت پوچھی جائے تو طلباء کی امداد و اعانت کا نام لیا جاتا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ دور کیسا ہے کہ چندہ سے مقصود طلباء میں اور طلباء سے مقصود چندہ ہے۔ اسی لیے وہ جس طرح چاہیں استادوں کو نچاتے ہیں۔ مگر یاد رکھو اس طرح علم حاصل نہیں ہوگا۔ یہ دولت ادب سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سے کسی نے مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے تفوق علمی کا سبب پوچھا تھا تو میرے سامنے فرمایا کہ مولانا کے اس تفوق علوم کے بہت سے اسباب ہیں۔ منجملہ ان کے ایک سبب یہ بھی فرمایا تھا کہ وہ اپنے استادوں کا ادب بہت کرتے تھے آھ۔

چنانچہ ایک مرتبہ بھون کا ایک گندھی مولانا سے ملنے گیا اور کہا میں تھانہ بھون کا رہنے والا ہوں۔ بس یہ سن کر مولانا پر بے حد اثر ہوا۔ اس کی خاطر و مدارت میں بچھے جاتے تھے۔ محض اس لئے کہ وہ تھانہ بھون کا رہنے والا تھا جو وطن ہے اپنے مرشد کا۔ افسوس ہے کہ یہ حضرت تو اپنے اکابر کے جاہل ہم وطنوں کا اتنا ادب کرتے تھے اور آج کل خود اکابر کا بھی ادب نہیں کیا جاتا۔

علماء کا ادب

صاحبو! علماء کا ادب نہایت ضروری ہے۔ حدیث میں ہے۔

من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا (ولم یبجل عالمنا) فلیس منا. (سنن أبی داؤد کتاب الأدب باب: ٦٥)

یعنی جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور بڑے کی تعظیم نہ کرے (اور عالم کا ادب نہ کرے) وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ یہ کس قدر سخت وعید ہے۔ مگر افسوس طلباء اس پر عمل نہیں کرتے۔ پھر علاوہ اس کے یہ اساتذہ عالم ہیں اور بڑے ہیں۔ ان کا ادب اس لیے بھی ضروری ہے کہ وہ وارثان رسولؐ ہیں اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اور وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ
كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ اور لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ
الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا اور ارشاد ہے
وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰۤى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ

یعنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش قدمی نہ کرو اور آپؐ کے سامنے زور سے (چلا چلا کر) باتیں نہ کرو اور رسولؐ کو اس طرح نہ پکارو جیسا کہ آپس میں ایک دوسرے کو پکارا کرتے ہو۔ (بلکہ ادب سے بات کرو) اور جب آپؐ کے پاس مجمع میں بیٹھے ہوئے ہوں تو بدون اجازت کے وہاں سے نہ اٹھو۔ ان آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو حقوق بیان کیے گئے ہیں حضور کے بعد آپ کے خلفاء اور وارثان علم کے بھی وہی حقوق ہیں کیونکہ تخصیص کی کوئی دلیل نہیں بلکہ جس حدیث میں تبجیل علماء کی تاکید ہے، وہ ان احکام کے عموم پر دال ہے وارثان رسولؐ کے لیے۔ اسی واسطے سلف نے وارثان رسولؐ کا وہی ادب کیا ہے۔ جو ان آیات میں حضورؐ کے لیے مذکور ہے۔ بہرحال استادوں کا ادب بھی تقویٰ میں داخل ہے جو اس میں کوتاہی کرے گا وہ متقی نہ ہوگا۔ اور اس میں کوتاہی کا بڑا سبب یہی ہے کہ طلباء کو تقویٰ کا اہتمام نہیں۔ میں تقوے کے متعلق آپ کو ایک اگر بتلاتا ہوں، اس کو یاد رکھئے۔ وہ یہ کہ گو نوافل اور ذکر و شغل زیادہ نہ ہو، مگر ورع یعنی ترک معاصی و مناہی کا زیادہ اہتمام کرو۔ حدیث میں ہے لاتعدل بالرعة (ورع کی برابر کسی چیز کو نہ کرو)

انوار و اسرار

اب میں اس وعدہ کو پورا کرتا ہوں جو اثناء بیان میں کیا تھا کہ زیادت فی العلم میں

تفصیل ہے۔ وہ یہ کہ زیادت فی العلم ان علوم میں مقصود ہے جن کا اظہار کیا گیا ہے اور جن علوم کا اظہار نہیں کیا گیا ان میں یہ زیادت مقصود نہیں۔

حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ صحابہؓ نے قدر میں کلام کیا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت ناراض ہوئے اور فرمایا۔

الھذا خلقتم ام بھذا امر تم ام بھذا ارسلت الیکم لقد ھلک من کان قبلکم حین تنازعو ا فی القدر عزمت علیکم عزمت علیکم ان لا تنازعو ا فیہ (کنز لاعمال :۱۶۶۱)

(ترجمہ: کیا تم اس کے لئے پیدا کئے گئے ہو یا اس کا تم کو حکم کیا گیا ہے میں تمہاری طرف اس لئے بھیجا گیا ہوں تم سے پیشتر جن لوگوں نے قضا وقدر کے بارے میں جھگڑا کیا ہلاک ہو گئے، میں نے تم پر عزم کر لیا ہے کہ قدر کے باب میں جھگڑا مت کرو) (رواہ الترمذی وابن ماجہ مشکوٰۃ)

اب میں اس کی تعیین کرتا ہوں کہ کن علوم کا اظہار کیا گیا ہے اور کن علوم کا اظہار نہیں کیا گیا۔ اس کا معیار یہ ہے کہ بعض علوم تو وہ ہیں جن کو قرب وبُعد میں دخل ہے جیسے مامورات و منہیات، ان کو تو شریعت نے ظاہر کیا ہے۔ صحابہ کو انہی میں زیارت کا اہتمام تھا۔ حضرت حذیفہ فرماتے ہیں۔ **کانو یسئلون النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الخیر و کنت اسئلہ عن الشر محافظۃ ان اقع فیہ** (اوکما قال)

کہ صحابہ تو حضورؐ سے خیر کی باتیں زیادہ پوچھتے تھے (جن کو قرب میں دخل تھا) اور میں آپؐ سے شر کے متعلق بہت سوال کرتا تھا تا کہ اس میں مبتلا نہ ہو جاؤں جس سے بعد ہو جاوے۔ اسی کو کسی نے کہا ہے؟

عرفت الشر لا للشر لکن لتو قیہ   ومن لا یعر ف الشر من الخیر یقع فیہ

(میں نے شر کو پہنچانا نہ شر کی وجہ سے لیکن اس سے بچنے کی وجہ سے لیکن جو شخص شر کو خیر سے نہیں پہنچاتا تو وہ شر میں واقع ہو جاتا ہے)

ان علوم میں تو زیادت مطلوب ہے۔ دوسرے وہ علوم ہیں جن کو قرب و بُعد میں دخل

نہیں۔ جیسے قدر کی حقیقت معلوم کرنا پل صراط کی حقیقت معلوم کرنا اور یہ جاننا کہ نماز پنجوقتہ کیوں مقرر ہوئی ہے کم وبیش کیوں نہ ہوئی۔ اس کی کچھ ضرورت نہیں نہ اس کے جاننے سے کچھ قرب میں ترقی ہے نہ عدم علم سے کچھ بُعد ہے۔ ان علوم کو اسرار کہا جاتا ہے اور اس کے مقابل ان علوم کو جنہیں قرب وبعد میں دخل ہے انوار کہنا چاہیے۔ یہ لقب ان کے واسطے اس لیے مناسب ہے کہ نور کی شان ظاہر فی نفسہ مظہر لغیرہ اور یہ علوم بھی ایسے ہی ہیں کہ فی نفسہ خود ظاہر ہیں اور ان پر عمل کرنے سے اسرار بھی منکشف ہونے لگتے ہیں گو ان کا جاننا مقصود نہیں۔ مگر ان کے حصول کا طریقہ یہ نہیں کہ اسرار کو بلاواسطہ طلب کیا جائے بلکہ طریقہ یہ ہے کہ علوم انوار کو حاصل کرو اور تقویٰ کے ساتھ ان پر عمل کرو۔ پھر حق تعالیٰ خود ہی اسرار بھی قلب پر القاء کردیں گے۔ اور ان علوم کو انوار سے ملقب کرنے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ کہ حق تعالیٰ اپنے نور کی طرف جس کو چاہیں ہدایت کردیتے ہیں اور دوسری جگہ ارشاد ہے۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ کہ قرآن سیدھے راستہ کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ (لام معنی الیٰ ہے) اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی ہدایت وہی ہے جو قرآن کی ہدایت ہے تو جن امور کی طرف قرآن نے ہدایت کی ہے۔ یعنی جن علوم کو ظاہر کردیا ہے ان کا نور ثابت ہوگیا۔

پس الٓمّٓ میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ اے سامعین جن علوم کی زیادت مطلوب ہے وہ یہ ہیں جو ظاہر کردیئے گئے ہیں تم ان میں زیادت طلب کرو اور اسرار کے درپے نہ ہو۔ جس کا نمونہ یہ الٓمّٓ ہے۔ اس مضمون کو سورہ آل عمران میں زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ

وہ (اللہ تعالیٰ) ایسا ہے جس نے نازل کیا تم پر کتاب کو جس میں اس کا ایک حصہ وہ آئتیں ہیں جو کہ اشتباہ مراد سے محفوظ ہیں۔ (یعنی ان کا مطلب ظاہر ہے) اور یہی آئتیں اصلی مدار ہیں اس کتاب کا (مطلب یہ ہے کہ غیر ظاہر المعنیٰ کو بھی انھی ظاہر المعنیٰ کے موافق بنایا جاتا ہے) اور دوسری آئتیں ایسی ہیں جو مشتبہ المراد ہیں (کہ ان کا مطلب خفی ہے) سو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ تو قرآن کے اسی حصہ کے پیچھے ہو لیتے ہیں جو مشتبہ المراد ہے (دین میں) شورش ڈھونڈنے کی غرض سے اور اس کے (غلط) مطلب ڈھونڈنے کی غرض سے (تاکہ اپنے غلط عقیدہ میں اس سے مدد حاصل کریں) حالانکہ اس کا (صحیح) مطلب بجز حق تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا اور (اسی واسطے) جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں وہ (ایسی آیتوں کے متعلق) یوں کہتے ہیں کہ ہم اس پر (اجمالاً) یقین رکھتے ہیں۔ سب آئتیں ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں (ظاہر المعنیٰ بھی خفی المعنیٰ بھی۔ پس ان کے جو کچھ معنیٰ اور مراد واقع میں ہیں وہ حق ہیں) اور نصیحت (کی بات کو) وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو اہل عقل ہیں۔ (یعنی عقل کا مقتضا بھی یہی ہے کہ) مفید اور ضروری بات میں مشغول ہو مضر اور فضول قصہ میں نہ لگے۔ (بیان القرآن)

اس آیت میں علوم کی تقسیم کردی گئی۔ ایک علم محکم ایک علم متشابہ اور یہ بھی بتلا دیا گیا ہے کہ علوم محکمہ اصل مقصود ہیں اور علوم متشابہ کا در پے ہونا مذموم ہے۔ پس اب زیادت فی العلم کی تفصیل بخوبی واضح ہوگئی کہ زیادت ہر علم میں مقصود نہیں۔ بلکہ صرف محکمات میں مقصود ہے۔

افسوس ہے کہ لوگ آج کل انھی علوم کے در پے ہیں جن کے در پے ہونے سے روک دیا گیا ہے۔ کوئی پوچھتا ہے نماز میں کیا حکمت ہے کوئی کہتا ہے جماعت میں کیا فلاسفی ہے۔ کوئی روزہ اور حج کی علت کے در پے ہے حالانکہ شریعت نے علل احکام کے جاننے کا امر نہیں کیا۔ اور جن علل کو بیان بھی کیا ہے جیسے سورہ ھرہ کے باب میں فرمایا ہے۔

انها من الطوافين عليكم والطوافات (وہ پھرنے والے اور پھرنے والیوں میں ہے) (مسند الإمام أحمد ۵: ۲۹۶)

وہ علتیں بھی اہل استنباط کے لیے بیان فرمائی ہیں۔ تاکہ حکم کا تعدیہ کرسکیں عوام کو ان کے

جاننے کی بھی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ان میں صلاحیت اجتہاد تو کیا ہوتی بعض ملل کے سمجھنے کی بھی لیاقت نہیں۔ بس ان اسرار کا حق یہ ہے کہ کل من عند ربنا (ہر چیز ہمارے رب کی جانب سے ہے) کہہ کر اجمالاً اس پر ایمان لے آؤ کہ حق تعالیٰ کے احکام میں ضرور حکمتیں ہیں گو ہم کو معلوم نہ ہوں اور آیات متشابہات کے ضرور کچھ معنیٰ ہیں گو ہم نہ جانتے ہوں اور جو اس کی مراد ہے ہم اس کو حق مانتے ہیں یہی معاملہ حروف مقطعات قرآنیہ کے ساتھ کرنا چاہیئے۔

بس اب میں ختم کرتا ہوں گو مضامین تو اور بھی قلب پر آرہے ہیں مگر اب رات کے بارہ بج چکے ہیں۔ سامعین بھی سونے لگے ہیں۔ میں بھی تھک گیا ہوں۔ خلاصہ بیان کا یہ ہے کہ سب مسلمانوں کو اور خصوصاً طلباء کو زیارت فی العلم اور نور علم کی تحصیل کا امر ہے اس کا اہتمام کرنا چاہیئے۔ جس کے دو طریقے ہیں ایک دُعا دوسرے تقویٰ عن المعاصی۔

اس مضمون سے چونکہ بہت اذہان خالی تھے اور تھا بہت ضروری۔ اسلیئے آج میں نے اسی کو بیان کے لیے اختیار کیا۔ گو تفصیل زیادہ نہ ہوسکی مگر مخاطب زیادہ تو اہل علم ہیں۔ امید ہے۔ ان کو اختصار بھی کافی ہو گیا ہوگا۔

اب دعا کیجیے کہ حق تعالیٰ شانہ، ہم کو اس کی توفیق عطا فرماویں آمین۔

و صلی اللہ تعالیٰ وسلم علی خیر خلقه سیدنا ومولانا محمد و علیٰ اله واصحابه اجمعین واخر دعونا ان الحمد لله رب العلمین

توضیحات

بعض مضامین تقریر کے وسط میں حاضر فی الذہن تھے مگر اخیر میں ذہن سے نکل گئے۔ اور ایک مضمون بعد ہی میں ذہن میں آیا ان سب کو مفید ہونے کے سبب لکھا جاتا ہے۔

اول (اور یہ بعد میں ذہن میں آیا) یہ علم موہوب جو تقویٰ سے مسبب ہے وہ ہے جس کی نسبت حدیث میں ارشاد ہے۔

من اوتی زهدا فی الدنیا و قلة منطق فا قتر بوا منه فانه یلقی الحکمة

ثانی (اور یہ اور اس کا مابعد تقریر کے وسط میں ذہن میں حاضر تھا) یہاں ایک سوال ہے وہ یہ کہ اس تقریر کی بناء پر ھدًی للمتقین سے معلوم ہوتا ہے کہ تقویٰ سبب ہے ھدیٰ

مفر بزیادت فی العلم اور آیت وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰهُمْ تَقْوٰىهُمْ (اور جولوگ راہ پر ہیں اللہ تعالیٰ ان کو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے اور ان کو تقویٰ کی توفیق بھی دیتا ہے) سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدیٰ سے درجہ علیا ہے تقویٰ کا جو کہ موہوب ہے تو حاصل مجموعہ نصین کا یہ ہوا کہ بندہ اول نفس تقویٰ جب بکسب اختیار کرتا ہے اس پر ہدیٰ مرتب ہوتا ہے پھر اس ہدیٰ پر ثابت رہنے سے خود اس میں بھی ترقی ہوتی ہے اور تقویٰ کا درجہ علیا موہوبہ بھی اس سے عطا ہوتا ہے اور قرینہ اس ارادۂ موہبت کا لفظ اٰتا ھم ہے اور قرینہ اس کے علیا ہونے پر اضافت ہے تقویٰ کی ضمیر مھتدین کی طرف جو اس کے کمال پر دال ہے جیسے وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا ای السعی المناسب لہا۔ اسی طرح یہاں مراد ہے ای التقویٰ المناسب لشانھم وھم الکاملون فالتقوی المناسب للکاملین ھوا لکامل منه. (یعنی وہ تقویٰ جو اس کی شان کے مناسب ہو اور وہ کامل ہیں پس جو تقویٰ کاملین کے مناسب ہو وہی تقویٰ کامل ہے)

ثالث: اس وعظ کا نام کوثر العلوم تجویز کیا جاتا ہے اسلیئے کہ اسمیں زیادت فی العلم مفر بحکمت کا ذکر ہے اور حکمت کو حق تعالےٰ نے خیر کثیر فرمایا ہے وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (جس شخص کو حکمت عطا کی گئی اس کو خیر کثیر عطا کی گئی) اور کوثر کی تفسیر بھی خیر کثیر سے کی گئی ہے اور اسی بناء پر نہر خاص کو بھی کوثر کہا گیا ہے کہ وہ خیر کثیر ہے بلکہ اہل معانی نے تو خود اس نہر کی حقیقت بھی علم وحکمت ہی بتلائی ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ محققین نے تصریح کی ہے کہ تمام معانی کی کچھ مثالی صورتیں بمناسبت اوصاف کے حق تعالیٰ نے عالم برزخ و عالم آخرت میں پیدا کی ہیں۔ چنانچہ احادیث میں بھی بعض کا ذکر ہے۔ سورۂ بقرہ و سورۂ آل عمران کی بشکل دو بدلیوں کے ظاہر ہونا اور درمیان میں جو بسم اللہ ہے اس کا بشکل ایک چمک کے ظاہر ہونا و نحو ذالک وارد ہے۔

اسی طرح شریعت کی صورت پل صراط کو کہا ہے اور علم وحکمت کی صورت حوضِ کوثر کو کہا ہے اور اسی مناسبت سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں جو دودھ دیکھا تھا اس کی تعبیر علم سے فرمائی کیونکہ دونوں کے منافع کثیر ہیں اور حوض کوثر کا پانی بشکل دودھ کے منقول ہوا ہے۔ واللہ اعلم۔

العلم والخشیۃ

فضیلت علم اور خشیت خداوندی کے متعلق یہ وعظ ۲۰ شعبان ۱۳۲۱ھ بروز یک شنبہ بوقت صبح مدرسہ عبدالرب دہلی میں کھڑے ہوکر فرمایا جو تین گھنٹوں میں ختم ہوا۔ سات سو کے قریب حاضری تھی۔ اسے حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ نے قلم بند فرمایا۔

علم وہی ہے جو خدا کا راستہ دکھائے۔ دل سے گمراہی کا زنگ دور کرے اور حرص و ہوا سے چھڑا کر دل میں خوف و خشیت پیدا کردے۔ نیز علم عمل کے لیے مقصود ہے۔ خواہ عمل بالجوارح ہو یا بالقلب۔ اور کوئی طریق بدوں ترتب مقصود کے کامل نہیں ہوتا۔ پس بدوں عمل کے علم بھی کامل نہ ہوگا ناقص ہوگا۔

خطبۂ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره و نومن به و نتوكل عليه ونعو ذ بالله من شر و ر انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له ونشهد ان لا ا له الا الله وحده لا شريک له ونشهد ان سيدنا و مو لنا محمدا عبده ورسوله صلى الله تعالىٰ عليه وعلى اٰله وا صحابه و بارک وسلم. اما بعد فاعو ذ بالله من الشيطان الر جيم بسم الله الرحمن الرحيم

إِنَّمَا يَخۡشَى اللّٰهَ مِنۡ عِبَادِهِ الۡعُلَمٰٓؤُا ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ غَفُوۡرٌ (فاطر:۲۸)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ سے اس کے بندوں میں سے علماء ہی ڈرا کرتے ہیں۔ بلاشک اللہ تعالیٰ زبردست بہت بخشنے والا ہیں۔

ضرورت بیان

یہ ایک آیت کا ٹکڑا ہے۔ علم وخشیت کا باہمی تعلق کچھ مخفی نہیں بلکہ ایسا ظاہر تعلق ہے کہ عام زبانوں پر اولاً اس کا دعوی بھی آتا ہے۔ پھر استدلال میں یہی آیت پڑھ بھی دی جاتی ہے۔ جس کو قرآن وحدیث سے کچھ بھی مناسبت ہے وہ اس تعلق سے غافل نہیں اس کا مقتضا یہ تھا کہ پھر اس کو بیان ہی نہ کیا جاتا اور شاید اس وقت کے بیان کو تحصیل حاصل ہی سمجھا جاوے کہ یہ تو ظاہر مضمون ہے جو سب کو معلوم ہے مگر میں اس کی ضرورت ابھی واضح کئے دیتا ہوں۔

اول تو اگر فرض کرلیا کہ یہ تعلق معلوم ہے تب بھی بیان کو تحصیل حاصل نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ ممکن ہے کہ بیان سے تاکید اور زیادت استحضار مقصود ہو اور تاکید بھی خود مستقل جدید

سے ہے لیکن ابھی تو اسی میں کلام ہے کہ اس تعلق کا جیسا علم ہونا چاہیئے وہ ہے بھی یا نہیں۔

سو بات یہ ہے کہ عام طور پر اس تعلق کا پورے طور سے علم ہی نہیں۔ اور گو کہنا ہے تو بے ادبی مگر چونکہ اس وقت معاملہ کی گفتگو ہے اسلیئے صاف صاف کہا جاتا ہے کہ عوام تو عوام ہم جیسے لکھے پڑھے بھی جو اہل علم کہلاتے ہیں ان کو بھی اس تعلق کا پورا علم نہیں اور علم ہے بھی تو اس کے مقتضا پر عمل نہیں۔ جب عمل ہی نہیں تو علم بھی ناقص ہوا۔

کیونکہ علم عمل ہی کے لیے مقصود ہے خواہ عمل بالجوارح ہو یا بالقلب اور کوئی طریق بدوں ترتب مقصود کے کامل نہیں ہوتا۔ پس بدوں عمل کے علم بھی کامل نہیں ہوگا پس اگر علم کو ایک حیثیت سے یعنی حصول کی حیثیت سے کامل بھی مان لیا جائے تو وہ اس دوسری حیثیت سے ناقص ہے کہ اس پر عمل جو کہ مقصود نہیں ہے۔

یہاں سے ایک شبہ بھی رفع ہو گیا جو اس تقریر کے بعض اجزاء پر ابتداً وارد ہوا ہوگا۔ وہ یہ کہ میں نے کہا ہے کہ علم عمل کے لیے مقصود ہے۔ اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ بعض اجزاء اخیرہ سے یہ شبہ رفع ہو گیا۔

حاصل جواب کا یہ ہے کہ علم کو عام رکھا جائے تو بے شک بعض علوم فی نفسہا مقصود ہیں اور اگر علم سے مراد کامل علم مقصود ہو تو اب کوئی علم محض درجہ علم میں مطلوب نہیں۔ بلکہ ہر علم سے عمل بھی مطلوب ہے اور میرے کلام میں عمل سے معنیٰ عام مراد ہیں خواہ عمل جوارح ہو یا عمل قلب۔ تو اب اس دعوے پر کوئی شبہ نہیں کیونکہ علم نام ہے اعتقاد جازم کا۔ اور تجربہ ہے کہ جزم جس درجہ کا شرع میں مقصود ہے بدوں عمل بامقتضی کے نہیں حاصل ہوتا۔ اگر تم ایک علم حاصل کرو اور اس کا اجراء نہ کرو۔ اس پر عملی ممارست نہ کرو تو یقیناً علم ناقص رہے گا۔ (جیسے طبیب طب پڑھ کر مطب نہ کرے یا باورچی کھانے کی ترکیبیں معلوم کر کے پکانے میں مشغول نہ ہو تو یہ علم کسی کام کا نہ رہے گا۔ اسی طرح اور بہت سی مثالیں ہیں ۱۲)

حتی کہ عقائد محضہ توحید وغیرہ بھی جب تک کہ ان کے مقتضاء پر عمل نہ ہو درجہ حال میں نہیں پہنچتے اور درجہ کمال اعتقاد کا وہی حال کا درجہ ہے۔

پس جو لوگ اپنے کو علم سے متصف سمجھتے ہیں وہ بھی اس کوتاہی میں مبتلا ہیں کہ انہوں نے اپنے علم کے مقتضا پر عمل نہیں کیا تو وہ بھی اس تعلق سے غافل ہیں۔ مگر سب ایسے نہیں ہیں۔ بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے کو خاص سمجھتے ہیں اور واقع میں وہ خاص نہیں ہیں (بلکہ بمعنیٰ دیگر خواص

ہیں) کیونکہ عامی اور خاصی امور اضافیہ ہیں۔ جو اپنے کو خاص سمجھتے ہیں خاص کامل کے اعتبار سے وہ بھی عامی ہی ہیں۔ پس اس وقت کے بیان میں تحصیل غیر حاصل ہے مگر ترکیب توصیفی کے ساتھ نہیں بلکہ ترکیب اضافت کے ساتھ۔ بہر حال اس بیان کی ضرورت ثابت ہوگئی۔

طریق اصلاح

رہا یہ کہ جو لوگ واقع میں خواص ہیں ان کی نسبت سے تو یہ بیان تحصیل حاصل ہی رہا۔ اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ وہ میرے مخاطب نہیں ہیں بلکہ میں خود ان کا محتاج ہوں کہ وہ مجھے طریقۂ اصلاح ارشاد کریں۔ باقی جن کے لیے یہ بیان ہو رہا ہے جو میرے مخاطب ہیں ان کے لیے تو یہ تحصیل غیر حاصل ہے جن میں میں خود بھی داخل ہوں۔ میں اپنے کو بھی اس بیان کا مخاطب کرتا ہوں جیسے قرآن میں ایک مومن کے قول کی حکایت کی گئی ہے۔

وَمَالِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (یٰسین: ۲۲)

یعنی اور میرے پاس کون سا عذر ہے کہ میں اس کی عبادت نہ کروں جس نے مجھ کو پیدا کیا ہے اور تم سب کو اس کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔

جس میں اس نے امر توحید کا اپنے کو بھی مخاطب کیا ہے وہ یہ بھی رفع ہوگیا کہ اپنے کو مخاطب کرنا کیسا کیونکہ اس کی نظیر قرآن میں موجود ہے۔

دوسرے اس کی بابت میں ایک حقیقت بیان کرتا ہوں جب مجھے کسی عمل میں کم ہمتی ہوتی ہے تو میں اس کے متعلق مجمع عام میں ایک عام مضمون بیان کر دیتا ہوں۔ اس سے خود میری ہمت بھی قوی ہو جاتی ہے اس میں راز یہ ہے کہ جس عمل کے متعلق عام بیان ہوتا ہے تو قاعدہ ہے کہ بیان میں اس کا پورا اہتمام و اعتناء ہوتا ہے۔ مخاطبین پر اچھی طرح اس کی ضرورت ظاہر کی جاتی ہے تو طبعاً۔ متکلم کے دل میں اس سے یہ اثر پیدا ہوتا ہے کہ جس بات کا ہم دوسروں کو تاکید کے ساتھ امر کر رہے ہیں۔ سب سے پہلے خود بھی اس پر عمل کرنا چاہیئے اس سے فی الجملہ ہمت بڑھتی ہے۔ پھر مخاطبین میں کوئی بزرگ اور نیک آدمی بھی ہوتا ہے۔ اگر بیان سے اس کا دل خوش ہوگیا اور اس نے دل سے دعا دے دی اور وہ قبول ہوگئی یا کسی کو اس بیان سے نفع ہوگیا۔ اور اس طور پر بیان کرنے والا ہدایت کا سبب ہوگیا جو ایک بڑی طاعت ہے تو اس پر خدا تعالیٰ متکلم کے ساتھ بھی رحمت کا معاملہ فرما دیتے ہیں کہ اس

نے ہمارے بندوں کو ہماری طرف متوجہ کیا ہے تو اس کو بھی محروم نہ رکھا جائے یہ سب اسباب خود واعظ کو نفع حاصل ہو جانے کے ہو جاتے ہیں۔

غرض: میں تو بیان کر دینے کو اپنے لیے بھی ایک مفید طریق اصلاح سمجھتا ہوں۔ اس سے مجھے خود بھی بہت نفع ہوتا ہے اسی لیے میں نے کہا ہے کہ میں اپنے کو بھی اس بیان کا خطاب کرتا ہوں۔ یہ بات میں نے اسلیئے بیان کر دی تاکہ دوسرے بھی اس طریق اصلاح سے کام لیں کہ جس عمل کی ان کو ہمت نہ ہوتی ہو اس کے متعلق مجمع عام میں کچھ بیان کر دیا کریں تجربہ کر کے دیکھیں انشاء اللہ ضرور ہمت پیدا ہو جائے گی۔

غرض تحصیل حاصل کا شبہ جاتا رہا اور ضرورت بیان متحقق ہوگئی گو سب مخاطبین کے لیے نہ ہو۔ بعض ہی کے اعتبار سے ہو اور اگر فرضاً کسی کو بھی ضرورت نہ ہو تو میں خود اپنی اصلاح کے لیے اس کی ضرورت سمجھتا ہوں۔

تعلق علم وخشیت

اب سنیئے کہ یوں تو خشیت اور علم میں تعلق سبھی جانتے ہیں چنانچہ اکثر مواقع میں لوگ اس آیت کو خشیت وعلم میں تعلق ظاہر کرنے کے لیے پڑھ دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک موقعہ تو اس کے پڑھنے کا یہ ہوتا ہے کہ کسی کو علم کی فضیلت وتاکید کا بیان کرنا مقصود ہے اور لوگوں کو تحصیل علم کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ وہاں اس آیت سے علم کی ضرورت وفضیلت کی اس طرح تقریر کرتے ہیں کہ علم وہ شے ہے جس سے خشیت خداوندی حاصل ہوتی ہے اور خشیت ضروری ہے کیونکہ جابجا قرآن میں اس کا امر ہے۔

اِتَّقُوا اللّٰهَ (اللہ تعالیٰ سے ڈرو) اور فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِیْ (پس نہ ڈرو تم ان سے اور مجھ سے ڈرو)۔ نیز خوف وخشیت کا شرط ایمان ہونا احادیث میں مذکور ہے کہ الا یمان بین الرجاء والخوف اور ضروری کے اسباب ضروری ہوتے ہیں تو علم کا حاصل کرنا ضروری ہوا۔

دوسرا موقعہ یہ ہوتا ہے کہ کسی نے کوئی کام بے باکی کا کیا ہو تو اس وقت پڑھ دیتے ہیں اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا کہ بھائی خدا سے تو اہل علم ہی ڈرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص علم سے محروم تھا۔ اسلیئے اس نے یہ کام کیا۔ اگر اس کو علم ہوتا تو کبھی ایسی بے باکی اور جراءت نہ کرتا۔

صورت اول میں مدلول بعبارۃ النص ضرورت وفضیلت علم کی ہے اور صورت ثانیہ میں مدلول بعبارۃ النص بے باکی اور جراءت علی المعاصی کی لم بیان کرتا ہے مگر دلالۃً اس سے علم کی فضیلت بھی لازم آ گئی۔ کیونکہ جب عدم علم کو جراءت علی المعاصی کی لم کہا تو علم کو ترک معاصی کا سبب مان لیا۔ اور ترک معصیت ضروری ہے تو اس کا سبب بھی ضروری ہوا۔ اور ضرورت شرعی میں فضیلت لازم ہے جس درجہ کی ضرورت ہوگی اسی درجہ کی فضیلت بھی ضروری ہوگی مثلاً فرض واجب سے زیادہ ضروری ہے تو وہ واجب سے افضل۔

اسی طرح واجب سنت سے اور سنت مستحب سے افضل ہے تو جب علم کا ضروری ہونا تسلیم کر لیا گیا کیونکہ اس کا نہ ہونا جرات و بے باکی کا سبب ہے تو اس کی فضیلت بھی تسلیم ہو گئی۔ بہر حال دونوں موقعوں میں اس آیت کے پڑھنے سے فضیلت علم کی ثابت کی جاتی ہے ایک جگہ صراحۃً اور ایک جگہ دلالۃً۔

غرض علم اور خشیت کے تعلق کا علم تو سب کو ہے مگر جیسا علم ہونا چاہیئے ویسا نہیں ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ اس علم با تعلق کے ثمرات لازمہ ظاہر نہیں ہوتے بلکہ برعکس ثمرات ظاہر ہو رہے ہیں اور شے کا تحقق وعدم تحقق اس کے خواص لازمہ سے ظاہر ہوا کرتا ہے۔ اگر ایک جگہ کسی شے کے خواص لازمہ موجود نہ ہوں تو شے کے عدم تحقق کا حکم کیا جائے گا۔ اسی قاعدہ سے یہاں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے اندر اس علم کے خواص وثمرات لازمہ موجود نہیں ہیں بلکہ برعکس ثمرات موجود ہیں۔

مفسدہ اہلِ علم

چنانچہ علم وخشیت میں تعلق معلوم کر کے آج کل دو مفسدے پیدا ہوئے ایک اہل علم میں، دوسرا اس فرقہ میں جو علماء پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔

اہل علم میں تو یہ مفسدہ پیدا ہوا کہ وہ اس آیت سے علم کی فضیلت ثابت کر کے رہ جاتے ہیں کہ دیکھو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے علماء کی تعریف فرمائی ہے تو علم کی بڑی فضیلت ہے اور ہم کو علم حاصل ہے اسلیے ہم بھی صاحب فضیلت ہوئے مگر جو اصل منشاء اس فضیلت کا تھا یعنی خشیت اس کو بیان نہیں کرتے نہ تو دوسروں کو اس کا امر کرتے ہیں کہ خشیت حاصل کرو اور نہ خود اس کا اہتمام کرتے ہیں۔ بلکہ اسکی جڑیں کھوکھلی کرتے ہیں۔

چنانچہ بکثرت اہل ظاہر علم باطن کو جس سے خشیت حاصل ہوتی ہے فضول اور لغو سمجھتے ہیں اور جو لوگ اس کی تعلیم و تعلم میں مشغول ہیں ان پر اعتراض کرتے ہیں بلکہ ستم یہ ہے کہ بعض تو عدم خشیت کی تعلیم دیتے ہیں گو اس کا عنوان دوسرا ہو مگر معنون یہی ہوتا ہے۔

چنانچہ ایک زمانہ میں کفار کے ساتھ اتحاد کر کے جب مسلمانوں نے کفریات و معاصی کا ارتکاب کیا اور بعض لوگوں نے اس پر تنبیہ کی تو یہ جواب دیا گیا کہ یہ وقت مسائل حلال و حرام بیان کرنے کا نہیں ہے یہ وقت کام کرنے کا ہے۔ نہ معلوم۔ مسلمانوں کا کون سا کام ہے جس میں ان کو حلال و حرام معلوم کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس جواب میں گویا ان لوگوں نے قریب بصراحت مسلمانوں کو عدم خشیت کی تعلیم دی ہے تو جو چیز فضیلت علم کا منشا ہے یہ اسی کی جڑ کاٹتے ہیں بس وہ مثال ہوگئی ؎

یکے بر سر شاخ و بن مے برید ☆ خداوند بستاں نگاہ کرد و دید

(یعنی ایک شخص شاخ کے تنہ پر بیٹھا ہوا اس کی جڑ کاٹ رہا تھا۔ مالک باغ نے نگاہ ڈالی اور دیکھا۔

خشیت کے ساتھ تو یہ معاملہ اور پھر بھی یہ خوش ہیں کہ ہم اہل علم ہیں جن کی بابت اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (سورۂ فاطر)

(یعنی اللہ تعالیٰ سے اس کے بندوں میں سے علماء ہی ڈرا کرتے ہیں)

فرمایا ہے۔ بلکہ بعض نے اس کے ساتھ ایک مقدمہ اور ملا دیا ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ (یہ اس شخص کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے) جس کا حاصل یہ ہوا کہ علماء صاحب خشیت ہیں اور صاحب خشیت کے لیے جنت و رضاء حق حاصل ہوتی ہے تو علم سے جنت و رضاء حاصل ہوتی ہے اب اس کی فضیلت کا کیا پوچھنا؟

صاحبو! یہ حساب تو واقعی درست ہے مگر پہلے اس حد اوسط کا تحقق تو ہونا چاہیئے جس سے مل کر یہ قیاس بنا ہے اور اگر یہ حد اوسط محض باتوں ہی باتوں میں ہے تو نتیجہ بھی باتوں میں ہی ہوگا واقع میں کچھ نہ ہوگا۔ اور اس صورت میں یہ ایسا اوسط ہوگا جیسا ایک بنیئے نے اوسط نکالا تھا کہ وہ ایک بیل گاڑی میں سوار ہو کر کنبہ سمیت جا رہا تھا۔ راستہ میں ندی آئی جس میں پانی بہت تھا۔ گاڑی بان نے اس میں گاڑی ڈالنے سے توقف کیا۔ تو بنیئے نے کہا

اچھا میں بانس سے پانی ناپتا ہوں چنانچہ ندی کے کنارے پر دیکھا مثلاً ایک ہاتھ۔ پھر آگے دیکھا اور زیادہ ہے آگے ڈوبان ہے آپ نے سب کاغذ پر لکھ کر اوسط نکالا تو اوسط کمر تک نکلا آپ نے گاڑی بان کو حکم دیا کہ بس گاڑی ڈال دو ہم نے اوسط نکال لیا ہے گاڑی ڈوب نہیں سکتی۔ جب بیچ میں پہنچی اور گاڑی مع بیلوں کے ڈوبنے لگی تو بنیئے نے حساب کا کاغذ پھر دیکھا تو حساب صحیح تھا اب وہ کہتا ہے کہ لیکھا جوں کا توں کنبہ ڈوبا کیوں۔

اس بے وقوف سے کوئی پوچھے کہ تو نے جو بیچ کی گہرائی کو تمام اطراف میں تقسیم کر دیا تو کیا اس سے واقع میں بھی وہ تقسیم ہوگئی ہر گز نہیں۔ یہ تقسیم محض کاغذی تھی اور واقع میں جہاں جتنی گہرائی تھی وہ اپنے حال پر تھی۔ تمہارے اوسط نکالنے سے کیا ہوتا ہے۔ اسی طرح یہاں سمجھیے کہ آپ نے جو اس حد اوسط سے نتیجہ نکالا ہے کہ علم سے خشیت حاصل ہوتی ہے اور خشیت سے جنت تو ہم جنتی ہوئے۔ تو یہ اوسط محض باتوں ہی میں ہے تو نتیجہ بھی باتوں میں ہوگا واقع میں نہ ہوگا۔

جیسے آپ کسی سے کہیں ان کنت امراءۃ کنت حاملاً و اذا کنت حاملاً تلدین۔ تو کیا اس قیاس سے واقع میں بچہ پیدا ہو جائے گا۔ ہر گز نہیں۔ کیونکہ حد اوسط کا تحقق واقع میں نہیں ہوا۔

پس اس قیاس سے نتیجہ نکالنا ایسا ہی ہے جیسے ایک بنیئے کا نائب (جس کو عرف میں منیب منیم جی کہتے ہیں) دکان پر بیٹھا ہوا حساب کر رہا تھا کہ سو میں سے ساٹھ گئے ہاتھ لگے چالیس اور ہزار میں سے سات سو گئے ہاتھ لگے تین سو۔ ایک فقیر بھی کھڑا ہوا یہ سن رہا تھا جب وہ حساب کر چکا تو فقیر نے سوال کیا اس نے کہا سائیں! میرے پاس کہاں۔ جب لالہ جی آویں گے ان سے مانگنا۔ فقیر نے کہا تم غلط کہتے ہو میں تو گھنٹہ بھر سے تمہیں بار بار یہ کہتے ہوئے سن رہا ہوں کہ ہاتھ لگے اتنے اور ہاتھ لگے اتنے۔ میں ان سب کو جوڑتا رہا تو تمہارے ہاتھ ہزاروں لگے ہیں پھر یہ کیسے کہتے ہو کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ منیب نے کہا، سائیں! یہ کاغذی ہاتھ تھا میرے ہاتھ تو ایک پیسہ بھی نہیں لگا۔

اسی طرح یہاں سمجھئے کہ جب تک حامل کا تحقق واقع میں نہ ہوگا اس وقت تک بچہ کا تحقق محض تصور کے درجہ میں ہوگا۔ یوں ہی جب تک خشیت کا تحقق نہ ہوگا ان مقدمات سے فضیلت علم محض باتوں ہی باتوں میں ہوگی۔

صاحبو! یہ حد اوسط پہلے متحقق ہونا چاہیئے یعنی واقع میں بھی تو خشیت ہو تب آپ کو واقع میں جنت مل سکتی ہے۔ ورنہ محض باتوں سے کیا ہوتا ہے کہیں باتوں سے بھی خشیت پیدا ہوئی ہے۔

وجائزۃ دعوی المحبۃ فی الھوی ولکن لا یخفی کلام المنافق

عشق میں محبت کا دعویٰ جائز ہے لیکن منافق کا کلام پوشیدہ نہیں رہتا۔

فرق آمد و آورد

اگر کسی نے واقع میں شراب نہ پی ہو اور وہ دعوی کرے کہ میں نے بڑی قیمتی شراب پی ہے تو اس کی حالت خود اس کی تکذیب کر دیگی۔ بلکہ اگر وہ جھوٹ موٹ جھومنے بھی لگے جب بھی جاننے والے سمجھ جائیں گے کہ محض مکر ہے گو ناواقف دھوکا میں آ جائے جیسے ایک مولوی صاحب دھوکا میں آ گئے تھے۔

رڑکی میں ایک مولوی صاحب واعظ آئے ہوئے تھے ایک سوداگر ان کو اپنی دکان پر لے گیا۔ اس زمانہ میں سوڈاواٹر کی بوتلیں نئی نئی چلی تھیں اور پہلے پہلے اس کی ڈاٹ اندر نہ ہوتی تھی۔ بلکہ بڑے زور سے باہر نکلا کرتی تھی۔ اس سوداگر نے مولوی صاحب کے سامنے ایک بوتل کھول کر پی۔ بوتل کھلتے ہی اس میں جوش ہوا اور ڈاٹ نکل کر دور جا پڑی۔ مولوی صاحب شراب سمجھے اور اس کو برا بھلا کہنا شروع کیا کہ تم شراب پیتے ہو۔ سوداگر نے کہا یہ شراب نہیں ہے بلکہ سوڈاواٹر ہے جو کہ لیموں وغیرہ سے بنتا ہے۔ بہت عمدہ چیز ہے اس سے کھانا خوب ہضم ہوتا ہے۔ غرض بہت سی تعریفیں کر کے مولوی صاحب سے کہا کہ ایک بوتل آپ بھی پئیں۔ اول تو ان کو یقین نہیں آیا اور انکار کرتے رہے مگر اس کے قسم کھا کر اطمینان دلانے سے ایک بوتل پی لی۔

اب سوداگر نے یہ حرکت کی کہ جب مولوی صاحب بوتل پی چکے تو اس نے جھومنا شروع کیا۔ مولوی صاحب بڑے گھبرائے کہ یہ ضرور شراب ہے اس کو نشہ ہونے لگا ہے تھوڑی دیر بعد میں میرا بھی یہی حال ہوگا۔ اس کم بخت نے مجھے بھی فضیحت کیا۔ لوگ کیا کہیں گے کہ رات کو مولوی صاحب وعظ کر رہے تھے اور آج شراب پی رہے ہیں۔ اس سوداگر سے کہا کہ للہ مجھے کوٹھڑی میں بند کر دے تا کہ میرے نشہ کو کوئی دیکھ نہ سکے اور خدا کے لیے مجھے رسوا نہ کرنا میں تو پہلے ہی انکار کرتا تھا مگر تم نے دھوکا دیکر مجھے شراب پلا دی۔

جب بہت پریشان ہوئے۔ تب اس نے تسلی کی اور کہا کہ یہ تو مذاق تھا۔

سو اس قصہ میں جو مولوی صاحب کو دھوکا ہوا تو وجہ یہ تھی کہ مولوی صاحب نے کسی شرابی کو کبھی دیکھا نہ تھا ورنہ سوداگر کے جھومنے سے ان کو ہرگز دھوکا نہ ہوتا کیونکہ اس کا نشہ آورد سے تھا اور شراب کا نشہ آمد سے ہوتا ہے اور آورد و آمد میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ دونوں کی صورت ہی بتلا دیتی ہے کہ اس نے شراب پی ہے اور یہ مکر کر رہا ہے۔

کلام کا اثر

دیکھئے اگر کوئی شخص دعوی کرے کہ میں روز گھی دودھ اور مرغن کھانے اور مقویات کھایا کرتا ہوں مگر صورت پر مردنی چھائی رہی ہو تو کیا اس کے دعوے کو کوئی تسلیم کر سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ ہر شخص کہے گا کہ صورت تو یہ بتلا رہی ہے کہ شاید میاں کو دونوں وقت پیٹ بھر کر روکھی روٹی بھی نہیں ملتی۔

اسی طرح اگر کسی شخص کے پاس اطلاع آئی ہو کہ تم پر فوجداری کا مقدمہ قائم ہو گیا ہے جس میں چار سال کی قید بامشقت ہوگی اور وہ دوستوں میں بیٹھ کر سنے اور اس خبر کو ان سے مخفی رکھ کر دعوی کرے کہ میرے پاس بڑی مسرت انگیز خبر آئی ہے مگر حالت یہ ہے کہ زبان خشک ہے۔ ہونٹوں پر پپڑی جم رہی ہے صورت پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں تو کون مان لے گا کہ اس کے پاس خوشی کی خبر آئی ہے۔

www.alhaqq.org

یوں ہی سمجھ لو کہ محض دعوے خشیت سے خشیت کا ثبوت نہیں ہو سکتا بلکہ مدعی کی قلعی اس کی حالت سے خود ہی کھل ہی جاتی ہے۔ صاحب خشیت کی حالت ہی اور ہوتی ہے اس کے پاس بیٹھنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے دل میں خشیت ہے۔ گو وہ ظاہر میں کیسا ہی ہنس رہا ہو جیسا کہ مقدمہ فوجداری والا۔ گو کتنا ہی تکلف کر کے دل کی حالت کو چھپانا چاہے مگر چھپ نہیں سکتی۔

کہ عشق و مشک را نتواں نہفتن (کہ عشق اور مشک کو نہیں چھپا سکتے)

می تواں داشت نہاں عشق ز مردم لیکن ☆ زردی رنگ رخ و خشکی لب را چہ علاج
(عشق تو لوگوں سے چھپا سکتے ہیں چہرہ کے رنگ زرد ہونے اور ہونٹ کی خشکی کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔)

حضرت غوث اعظمؒ کے صاحب زادے جب علوم ظاہرہ کی تکمیل کر کے وطن واپس آئے تو حضرت نے ان کا وعظ کہلوایا انہوں نے بڑے بڑے مضامین ترہیب و ترغیب کے

بیان کئے۔ مگر مجمع پر خاک اثر نہ ہوا۔ جب وہ بیان ختم کر چکے تو حضرت غوث اعظمؒ ممبر پر تشریف لے گئے اور اپنا ایک معمولی قصہ اسی رات کا بیان فرمایا کہ رات ہم نے روزہ کی نیت کی تھی اور سحری کے لیے کچھ دودھ رکھا تھا ایک بلی آئی اور دودھ پی گئی۔ بس! اتنا کہ کہنے پائے تھے کہ مجمع کی حالت دگرگوں ہوگئی۔ کوئی روتا تھا کوئی چیختا تھا۔ کسی نے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ صاحب زادے کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ بھی کوئی مضمون تھا جس پر لوگ اتنے متاثر ہوئے۔ حضرت غوث اعظمؒ نے فرمایا کہ صاحب زادے ابھی تمہارا علم زبان ہی تک ہے اس کو دل میں پہنچاؤ۔ تو پھر تمہاری ادنیٰ بات بھی دلوں میں گھر کر جائے گی۔

صاحبو۔ میں سچ کہتا ہوں کہ بد دین آدمی اگر دین کی باتیں بھی کرتا ہے تو ان میں ظلمت ملی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کی تحریر کے نقوش میں ایک گونہ ظلمت لپٹی ہوئی ہوتی ہے اور دین دار دنیا کی باتیں کرے تو ان میں نور رہتا ہے کیونکہ کلام دراصل قلب سے ناشی ہوتا ہے تو قلب کی حالت کا اثر اس میں ضرور رہتا ہوگا۔

ان الکلام لفی الفؤاد و انما جعل اللسان علی الفؤاد دلیلا

(یعنی بلاشک کلام دل میں ہوتا ہے زبان کو دل پر دلیل ٹھہرایا گیا)

اور کلام تو کلام لباس تک میں قلب کا اثر سرایت کرتا ہے چنانچہ بزرگوں کے لباس میں بھی نور ہوتا ہے جس کو مشاہدہ کرنے والے مشاہدہ کرتے ہی۔ بلکہ ان کی بیٹھنے کی جگہ میں بھی نور رہتا ہے۔

میرے استاد علیہ الرحمۃ ایک بار کسی اسٹیشن پر پہنچ کر ایک جگہ بیٹھ گئے پھر معاً فرمایا کہ یہاں بیٹھتے ہی قلب انوار سے معمور ہوگیا۔ کیا بات ہے یہاں یہ انوار کیسے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ایک بزرگ وہاں آ کر تھوڑی دیر بیٹھے تھے وہ چلے بھی گئے مگر پتھر ان کی صحبت سے الماس ہوگیا یہی تو اصل ہے تبرکات کی:۔

اسی طرح میں کہتا ہوں کہ بے دینوں کی کتابوں میں ظلمت کی آمیزش ہوتی ہے گو اس میں مضامین اچھے ہی لکھے ہوں اور اس کا مشاہدہ بھی اہل قلب کو ہوتا ہے چنانچہ ایک شخص مولانا غلام علی صاحب کی مجلس میں آیا تو فرمایا کہ اس کے آتے ہی مجلس میں ظلمت چھا گئی ہے۔ تلاش کرو اس کے پاس کیا ہے۔ دیکھا تو شیخ بوعلی سینا کی کوئی کتاب اس کی بغل میں تھی۔

صاحبو! متکلم کا اثر اس کے کلام میں اور مصنف کے قلب کا اثر تصنیف میں ضرور رہتا

ہے۔ اسلیئے بے دینوں کی کتابوں کا مطالعہ ہرگز نہ کرنا چاہیئے کیونکہ مطالعہ کتب مثل صحبت مصنف کے ہے جو اثر بے دین کی صحبت کا ہوتا ہے وہی اس کی کتاب کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ مگر آج کل مسلمانوں کو اس کی ذرا پروا نہیں ہر شخص جو کتاب چاہتا ہے دیکھنے لگتا ہے۔

مطالعہ میں احتیاط

صاحبو! اللہ کے واسطے، رسول کے واسطے بے دینوں کی خصوصاً مخالفین اسلام کی کتابیں ہرگز مت دیکھو۔ طلباء بھی ایسی کتابیں نہ دیکھا کریں جواب دینے اور رد کرنے کے لیے بھی نہ دیکھیں۔

الا ان یامرہ واحدمن ا لکاملین بضرورۃ .

(مگر یہ کوئی کاملین میں سے ضرورت کی وجہ سے اس کا حکم دیدے)

حدیث میں آیا ہے کہ دجال کی خبر سن کر اس سے دور بھاگو پاس نہ جاؤ۔ مناظرہ اور رد کے واسطے بھی نہ جاؤ کیونکہ بعض لوگ مناظرہ کے واسطے جائیں گے اور معتقد ہو جائیں گے تو طلباء کو چونکہ ان کا علم بھی ناقص ہے مناظرہ کے قصد سے بھی مخالفین کی کتابیں نہ دیکھنا چاہئیں کیونکہ پہلوان اگر کسی سے کشتی کرنا چاہے تو اس کو پہلے یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ مقابل اپنے سے کمزور ہے یا زبردست اگر کمزور ہے تو مقابلہ کرے ورنہ اس سے دور ہی رہے۔ ایسے شخص کا مقابلہ وہ کرے جو اس سے بھی زیادہ زبردست ہو۔ پس محقق کے سوا کسی کو اجازت نہیں کہ مخالفین کی رد کے درپے ہو کیونکہ غیر محقق پر اندیشہ ہے کبھی خود ہی کسی شک میں نہ پڑ جائے آج کل مخالفین کی کتابوں میں بہت گندے مضامین ہوتے ہیں۔ جن کو دیکھ کر اول دہلہ میں ناقص کو پریشانی ہوتی ہے تو ایسی کتابیں ہرگز نہ دیکھنی چاہئیں۔

تقسیم موئے مبارک

میں نے اسی سفر میں ریل کے اندر ایک آریہ کی کتاب دیکھی جو ایک مسافر نے مجھے دکھلائی۔ اس میں کم بخت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ تقسیم موئے مبارک پر اعتراض کیا ہے کہ نعوذ باللہ آپ نے انسان پرستی کی تعلیم فرمائی ہے آپؐ نے اپنے بال حج وداع میں صحابہؓ کو تقسیم فرمائے تھے۔ اس پر یہ شخص انسان پرستی کی تعلیم کا اعتراض کرتا ہے۔ ارے تو عشق کے آثار کو کیا سمجھے۔ کافر کو عشق سے کیا تعلق؟ بات یہ ہے کہ حضرات صحابہؓ حضور صلی اللہ

علیہ وسلم کے عاشق تھے اور آپؐ جانتے تھے کہ میرے بعد یہ میری صورت کو ترس جائیں گے جس سے ان کو بہت بے چینی ہوگی۔ اس لیے آپؐ نے اپنے بال تقسیم فرمادیئے تاکہ ان کو دیکھ کر کسی قدر تسلی ہوجایا کرے۔ جس نے عشق کا چرکہ کھایا ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ محبوب کے بعد اس کی نشانیوں کو دیکھ کر کس قدر تسلی ہوتی ہے عشاق کی تو یہ حالت ہے کہ وہ اس خبر ہی سے مسرور ہیں کہ دنیا میں آپؐ کی زلف کا موئے مبارک موجود ہے گو ہم نے دیکھا بھی نہیں۔

مرا زلف تو موئے بسند ست ☆ ہوس را رہ مدہ بوئے بسند ست

(یعنی تیری زلف کا ایک بال بھی مجھے بہت ہے نہیں بلکہ اس کی خوشبو ہی کافی ہے)

یہ شعر اسی موقع پر شیخ عبدالحق دہلویؒ نے لکھا ہے کہ ہم نے گو موئے مبارک کی زیارت نہیں کی مگر خبر تو ملی ہے کہ ہاں دنیا میں موجود ہے بس ہم کو تسلی کے لیے کافی ہے۔

تو بتلایئے عشاق کی تسلی کرنا یہ کون سی انسان پرستی ہے اس کو پرستش سے کیا تعلق۔ آخر ایک دوست سفر میں جاتے ہوئے جو اپنے دوست سے انگوٹھی یا اور کوئی نشانی مانگتا ہے اور وہ نشانی دے دیتا ہے تو کیا وہ اس کی پرستش کرتا ہے ہرگز نہیں۔ پس اسی قبیل سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل تھا۔ اس پر اعتراض کیوں ہے۔

یہ تو جواب عاشقانہ مذاق پر ہے اور دوسرا جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ میں اتفاق کو سنبھالا تھا کیونکہ صحابہؓ آپؐ کے ایسے عاشق تھے کہ وضو کے پانی پر بھی گرتے تھے اور ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ آپ کا چھینٹا میرے اوپر گرے۔ تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں کو کب چھوڑتے جو کہ اجزاء جسم تھے۔ اگر آپؐ تقسیم نہ فرماتے تو عجب نہ تھا کہ تقابل کی نوبت آجاتی اسلیئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی تقسیم فرمادیئے یہ جواب اس معترض کے مذاق پر ہے کیونکہ یہ لوگ اتحاد واتفاق کو دین وایمان سمجھتے تھے (گو اس کی توفیق کبھی نہ ہوا ۱۲)

بھلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ انسان پرستی کی تعلیم دیتے۔ حالانکہ دنیا کو توحید کا علم ہی آپؐ کے ذریعے سے ہوا۔ آپ کی بعثت سے پہلے تمام اہل ادیان شرک میں مبتلا تھے کوئی توحید کو جانتا بھی نہ تھا۔

پھر اس معترض نے ایک واقعہ کو تو دیکھ لیا اور دوسرے واقعات نہ دیکھے جن سے اس واقعہ کی حقیقت واضح ہوجاتی۔

قبر پرستی

ایک بار صحابہؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اہل فارس اپنے بادشاہ کو سجدہ کرتے ہیں تو کیا ہم آپ کو سجدہ نہ کریں کہ آپؐ ان سے زیادہ اس کے مستحق ہیں۔ آپؐ نے فرمایا توبہ کرو توبہ۔ سجدہ خدا کے سوا کسی کو نہ کرنا چاہیئے۔ پھر فرمایا۔

ارءیت لو مررت علي قبری اکنت تسجد له

بتلاؤ تو اگر تم میری قبر پر کبھی گزرو تو کیا قبر کو بھی سجدہ کرو گے۔ صحابی نے کہا نہیں۔

سبحان اللہ! صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی طبائع کیسی سلیم تھیں اور جبھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے یہ سوال فرمایا کیونکہ آپ کو یقین تھا کہ صحابہ کی طبائع میں یہ بات جمی ہے کہ قبر سجدہ کے قابل نہیں۔

مگر اب تو یہ مذاق ہے کہ اگر آج کل کے مسلمانوں سے یہ سوال ہوتا تو بہت سے یوں کہتے کہ جی ہاں۔ ہم تو آپ کی قبر کو بھی سجدہ کریں گے۔ کیونکہ آجکل قبر پرستی بہت ہو رہی ہے بزرگوں کے مزارات پر سجدے ہوتے ہیں بلکہ بعض جگہ اولیاء بھی مدفون نہیں ہوتے کہیں ان کا تولیہ دفن ہوتا ہے کہیں کتا دفن ہے۔ کہیں چارپائی دفن ہے اور ان پر نذریں چڑھتی ہیں۔

ایک صاحب کہتے تھے کہ آج کل کسی کو ولی بنا دینا طوائف کے قبضہ میں ہے بس جہاں کسی کی قبر پر ایک بار مجرا ہو گیا، وہ ولی مشہور ہو گئے مگر صحابہ کا مذاق نہایت صحیح تھا۔ انھوں نے جواب دیا کہ نہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبر کو تو سجدہ نہ کریں گے حالانکہ انبیاء علیہم السلام کی ایک خاص حیات بعد وفات کے بھی مسلم ہے۔ صحابہ بھی اس سے واقف تھے گو وہ حیات اس حیات کے مثل نہیں بلکہ حیات برزخیہ ہے لیکن انبیاء کی حیات برزخیہ ایسی قوی ہوتی ہے جس کے بعض آثار احکام دنیا میں بھی ظاہر ہوتے ہیں مثلاً ان کی بیبیوں سے کسی کو نکاح جائز نہیں ہوتا گو یہ امر منصوص تو آپؐ ہی کے لیے ہے مگر ظاہراً عام معلوم ہوتا ہے اور ان کی میراث تقسیم نہیں ہوتی۔ یہ حکم نص میں عام ہی وارد ہوا ہے۔

نحن معاشر الانبیاء لا نورث ماترکناه صدقة (فتح الباری لابن حجر ۱۲:۸)

ہم انبیاء کے گروہ کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہم ترکہ چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہے۔

اور ان کے اجساد کو زمین نہیں کھا سکتی۔ یہ اثر شہداء کے لیے بھی منصوص ہے بہر حال انبیاء قبر میں زندہ ہوتے ہیں۔ مگر با ایں ہمہ صحابہ کا مذاق سلیم دیکھئے کہ اس پر بھی یہی جواب دیا کہ قبر کو تو سجدہ نہ کریں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر ابھی کیوں کرتے ہو (اس میں یہ بتلا دیا کہ جو چیز ایک وقت میں موت کی وجہ سے قابل سجدہ نہیں رہتی وہ کسی وقت بھی سجدہ کے قابل نہیں ۱۲) بس سجدہ خدا کے سوا کسی کو جائز نہیں۔ حالانکہ سجدہ مطلقاً عبادت بھی نہیں ہے بلکہ بہ نیت عبادت ہو تو عبادت ہے ورنہ سجدہ تحیت شرائع سابقہ میں جائز تھا۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے واسطے اس کو بھی گوارا نہ فرمایا اور غیر اللہ کے لیے سجدہ کو مطلقاً حرام کر دیا۔ تو جس ذات نے اپنے لیے ایک خاص طرز کی تحیت کو بھی پسند نہ کیا ہو کیا نعوذ باللہ آپؐ ایسے ہوتے تو پھر صحابہ کو جب کہ وہ خود سجدہ کرنا چاہ رہے تھے کیوں کر منع کر دیتے۔ جو شخص اپنی پرستش کرانا چاہتا ہے وہ تو ایسے موقع کو غنیمت سمجھتا ہے کہ مجھے کہنے کی بھی ضرورت نہ پڑی معتقدین خود ہی درخواست کر رہے ہیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ زندگی میں اس کی اجازت دی نہ بعد وفات کے اجازت دی۔ چنانچہ عین وصال کے قریب ارشاد فرمایا۔

لعن الله اليهود والنصارى اتخذوا قبور انبياءهم مساجد

(الصحيح للبخاري ۱: ۶۱۱، ۲)

خدا تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کریں جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔ اس میں صحابہ کو تنبیہ تھی کہ تم اپنے نبی کی قبر سے ایسا معاملہ نہ کرنا۔ نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ سے بھی دعا کی ہے۔

اللهم لا تجعل قبري وثنا يعبد (مسند الإمام أحمد: ۲: ۲۴۶)

(اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بنایا جائے جس کی پرستش ہو ف۱۲)

تو اس معترض کم بخت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تعلیم نہ دیکھی جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مذاق عبدیت کا پتہ چلتا ہے۔ بس ایک تقسیم شعر کا واقعہ دیکھ لیا۔ اور اپنی طرف سے اس کی وجہ تراش لی کہ اس سے انسان پرستی کی تعلیم مقصود تھی۔

ارے ظالم! جس شخص کا یہ مذاق ہوتا ہے اس کے دوسرے احوال واقوال اسکے معارض نہیں ہوا کرتے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام احوال واقوال اس قصد کے صریح معارض

ہیں۔ پھر یہ کہنا کیوں کر صحیح ہے کہ آپ کا یہ قصد تھا کہ کیا اس فعل کی وجہ کچھ اور نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ میں نے بتلا دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل میں سیاسی مصلحت بھی تھی۔ اور عاشقانہ مصلحت بھی تھی۔ انسان پرستی سے اس کو کچھ بھی تعلق نہیں یہ گفتگو درمیان میں آ گئی تھی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ قلب کا اثر انسان کے کلام اور لباس تک میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل اللہ کے تبرکات میں اثر ہوتا ہے اور صحبت میں اس سے زیادہ اثر ہوتا ہے۔

یک زمانہ صحبت با اولیاء ☆ بہتر از صد سالہ طاعت بے یار

(یعنی اللہ والوں کی تھوڑی دیر کی صحبت بھی سو سال کی بے ریا عبادت و طاعت سے بہتر ہے) یہ تو صحبت کا ذکر تھا اور دیدار کے متعلق فرماتے ہیں۔

اے لقائے تو جواب ہر سال ☆ مشکل از تو حل شود بے قیل وقال

(آپ ایسے بابرکت ہیں کہ آپ کی ملاقات ہی ہر سوال کا جواب ہے بلا شبہ آپ سے ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے)

ہم نے مشاہدہ کیا ہے کہ بزرگوں کی صورت دیکھتے ہی اشکالات رفع ہو گئے بعض دفعہ بزرگوں کے پاس اس قصد سے گئے کہ ان سے اس اشکال کا جواب پوچھیں گے مگر چہرے پر نظر پڑتے ہی اشکال خود بخود حل ہو گیا۔ بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ بزرگوں کے تصور سے بھی نفع ہوتا ہے چنانچہ یہی اصل ہے مسئلہ تصور شیخ کی جو صوفیاء کرام بتلایا کرتے تھے مگر لوگوں نے بعد میں اس کے اندر غلو کر لیا۔ اسی لیے مولانا شہیدؒ نے اس سے منع فرمایا۔ مگر وہ مطلق تصور کو منع نہیں کرتے بلکہ اس خاص تصور کو منع کرتے ہیں جو عوام میں اس وقت رائج تھا۔ اور اگر کہیں ان کے کلام میں اطلاق ہو تو وہ اطلاق ایسا ہو گا جیسے آج کل ہم کہہ دیتے ہیں کہ رہن رکھنا حرام ہے حالانکہ اس کا جواز فَرِهٰنٌ مَّقْبُوضَةٌ (سو اطمینان کا ذریعہ) رہن رکھنے کی چیزیں ہیں۔ جو صاحب حق کے قبضہ میں دے دی جائیں گی) میں منصوص ہے مگر مراد یہ ہے کہ رہن متعارف حرام ہے جس میں انتفاع بالمرہون کی شرط ہوتی ہے۔ ایسے ہی مولانا شہید کے کلام میں مطلق تصور سے وہ خاص تصور مراد ہے جو اہل غلو میں اس وقت رائج تھا۔ بعض لوگ واقعی اس میں حد سے بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔

چنانچہ ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کہ تصور شیخ کیسا ہے؟ میں نے جواب دینے سے

پہلے پوچھا کہ تم تصور شیخ کا مطلب کیا سمجھے ہو کہا خدا تعالیٰ کو پیر کی صورت میں سمجھنا۔ میں نے کہا یہ تو صریح شرک ہے۔ اسی تصور کو مولانا شہیدؒ نے منع فرمایا ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے اس کے ابطال میں اس آیت سے تمسک کیا ہے

مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ

(یہ کیا واہیات مورتیں ہیں جن کی عبادت پر تم جمے بیٹھے ہو۔) اور یہ آیت مشرکین ہی کے متعلق ہے باقی مطلق تصور کو وہ حرام نہیں کہتے ورنہ وہ شاہ ولی اللہ صاحب کا بھی صراحۃً رد کرتے۔ کیونکہ شاہ صاحب نے القول الجمیل میں تصور شیخ کا مسئلہ لکھا ہے اور جن کا نام مولوی اسمٰعیل شہید ہے وہ کسی کی للو پتو کرنے والے نہ تھے بڑے صاف تھے۔ اگر وہ مطلق تصور کو سمجھتے تو اس کی پرواہ نہ کرتے کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے اس کو جائز لکھا ہے۔ بلکہ بے دھڑک ان کا بھی رد کر دیتے کہ اس مسئلہ میں ان سے تسامح یا غلطی ہوئی ہے مگر ان حضرات کا انھوں نے بالکل رد نہیں کیا۔ معلوم ہوا کہ نفس تصور کو وہ بھی جائز سمجھتے تھے ہاں غلو کو حرام کہتے تھے۔

پس اس مسئلہ میں آج کل دو قسم کی کوتاہیاں ہو رہی ہیں۔ ایک تو یہ کہ بعض نے ابو جہل کی وجہ اس میں غلو کر لیا۔ جیسا کہ میں نے ابھی ایک شخص کا قصہ بیان کیا ہے کہ وہ خدا کو پیر کی صورت میں سمجھنے کو تصور شیخ جانتا تھا۔ اور اگر محض تصور کا مرتبہ ہو تو اس میں دوسرے لوگوں نے غلو کیا ہے جو علماء ظاہر کہلاتے ہیں۔ انھوں نے اس کو بھی حرام کہہ دیا۔ حالانکہ اس میں خرابی ہی کیا ہے۔ بلکہ یہ تو ازالہء خطرات بمعنی اضمحلال میں مفید ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ عقلی مسئلہ ہے۔

النفس لا تتوجه الى شيئين فى آن واحد

نفس کو ایک وقت میں دو چیزوں کی طرف توجہ نہیں ہو سکتی۔ پس خطرات اسی وقت تک آئیں گے جب تک قلب کو کسی خاص چیز سے تعلق نہیں اور اگر کسی شے سے قلب کو تعلق ہو جائے تو پھر خطرات نہ آئیں گے۔ اسلیئے ازالہء خطرات کے واسطے قلب کو کسی دوسری طرف متوجہ کر دینا مفید ہے اگر حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم ہو جائے تو اس سے بہتر کیا ہے۔ یہ تو اصل مقصود ہے۔ لیکن مبتدی کے قلب کو ابتداء میں حق تعالیٰ کے ساتھ ایسا تعلق قوی دشوار ہے کہ اس کے ساتھ اور کسی شے کا تصور نہ آوے کیونکہ حق تعالیٰ محسوس و مشاہد نہیں غائب از نظر ہیں اور مبتدی کا تصور غائب کے ساتھ نہیں جمتا۔ اسلیئے ضرورت اس کی ہے کہ

کسی محسوس چیز کا تصور کیا جائے جو آسانی کے ساتھ دل میں قائم ہو جائے۔ گو اس کے لیئے بیوی کا تصور بھی کافی ہے۔ مگر صوفیہ نے شیخ کو اس لئے تجویز کر لیا کہ وہ محسوس ہونے کے ساتھ معین فی الدین (دین کا مددگار) بھی ہے۔ اس کی محبت تعلق سے مانع نہیں بلکہ اس کو بڑھانے والی ہے اور بیوی کا یا اور کسی چیز کا تصور کیا گیا اور ان کی محبت دل میں جم گئی تو بعد ازالہ خطرات کے پھر اس محبت کو بھی نکالنا پڑے گا۔ مشقت دوہری ہو جائے گی۔ اور تصور شیخ سے اگر شیخ کی محبت دل میں جم گئی تو اس کے نکالنے کی ضرورت نہ ہوگی بلکہ وہ تو جتنی بھی زیادہ ہو تعلق مع اللہ میں اسی قدر نافع ہوگی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اور چیزوں کی محبت تو کسی نفسانی غرض سے ہوتی ہے اور شیخ کے ساتھ محبت کسی نفسانی غرض سے نہیں ہوتی بلکہ محض خدا تعالیٰ کے علاقہ سے ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ کے علاقہ سے کسی کے ساتھ محبت کرنا یہ درحقیقت خدا ہی کے ساتھ محبت ہے۔ دیکھو اگر ہماری وجہ سے کوئی ہماری اولاد یا متعلقین کے ساتھ محبت کرے تو اس کو ہم اپنی ہی محبت سمجھتے ہیں۔ اسی طرح شیخ سے چونکہ خدا تعالیٰ کے علاقہ سے محبت ہوتی ہے تو وہ حضرت حق ہی کی محبت ہے جو تعلق مع اللہ میں حاجب نہ ہوگی بلکہ معین ہوگی۔

اسلیئے صوفیاء نے ازالہ خطرات کے واسطے تصور شیخ کو تجویز کیا ہے اور یہاں سے معلوم ہوگیا کہ لا الہ الا اللہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) میں جو غیر اللہ کی نفی کی جاتی ہے تو یہاں نفی غیر سے منطقی مراد نہیں تا کہ نفی محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شبہ ہو۔ بلکہ عرفی غیر مراد ہے اور عرف میں غیر کہتے ہیں اجنبی کو۔ چنانچہ کہا کرتے ہیں کہ بھائی تم غیر نہیں ہو۔ تو کیا وہ منطقی عین ہے اور کیا اس پر احکام بھی عین کے جاری ہوں گے کہ دونوں کی بیویاں ایک دوسرے کے لیے حلال ہو جائیں۔ ہرگز نہیں۔

اسی طرح یہاں پر غیر سے مراد اجنبی ہے جس کا تعلق حق تعالیٰ سے مانع ہو۔ اس معنی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور شیخ کی محبت غیر محبت حق نہیں تو ان کی نفی بھی مقصود نہیں مگر صوفیا نے نا اہلوں سے اخفاء کرنے کے لیے منطقی و عرفی اصطلاحات میں خلط کر رکھا ہے تا کہ ان کو راز کا پتہ نہ چلے چنانچہ کہتے ہیں۔

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی ☆ بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

(مدعی سے عشق و مستی کے راز بیان مت کرو ان کو رنج اور خود پرستی میں مرنے دو)

اور فرماتے ہیں ۔ اصطلاحے ہست مر ابدال را

(ابدال کی ایک اصطلاح ہے) ان کی اصطلاحیں سب سے الگ ہیں۔ اس لیے پہلے ان کی اصطلاحیں معلوم کرنا چاہئیں۔ پھر اعتراض کرنا چاہیئے۔ جب غیر کے متعلق ان کی اصطلاح معلوم ہوگئی تو اب اس شعر پر کیا اعتراض ہے ۔

ہر چہ بینم در جہاں غیر تو نیست ☆ یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

(یعنی چیزیں جہاں میں آپ کی مامور ہیں۔ ہر ایک سے آپ ہی کا جلوہ نظر آرہا ہے)

مطلب یہ ہے کہ تمام عالم آپ کی صفات کا مظہر ہے۔ ہر چیز کو آپ سے تعلق ہے اس لیئے غیر کا وجود ہی نہیں۔ ہر جگہ آپ ہی کا ظہور ہے۔ مگر عنوان ایسا ہے جس سے جاہلوں کو عینیت کا دھوکا ہوسکتا ہے۔ پس اس معنی کو محبت شیخ بھی غیر محبت حق نہیں کیونکہ وہ وصول الی اللہ میں معین ہے۔ یہ اصل ہے تصور شیخ کی۔

مگر اس کی یہ صورت اس شرط سے جائز ہے کہ اسی کو لے کر نہ بیٹھے کہ اس کا وظیفہ خاص مقرر کرے کہ اس وقت اگر خدا تعالیٰ کا تصور آجائے تو قصداً اس کو بھی دفع کردے۔ اسی سے منع کیا ہے مولانا شہیدؒ نے۔ تو بزرگوں کی صحبت و زیارت تو بڑی چیز ہے۔ ان کا بھی نافع ہے۔

یہی اصل ہے تبرکات کی کیونکہ ان کی چیزوں کو دیکھ کر ان کی یاد تازہ ہوتی ہے اور ان کی یاد سے دل میں نور آتا ہے حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا ہوتا ہے مگر اس سے بزرگوں کی تصویر رکھنے کی اجازت نہ سمجھ لی جائے۔ کہ اس سے بھی یاد تازہ ہوتی ہے کیونکہ لباس اور تصویر میں فرق ہے۔ لباس کی مذکریت اور قسم کی ہے اس میں عبادت کا اندیشہ نہیں اور تصویر رکھنے میں عبادت کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ دنیا میں بت پرستی اسی تصویر کے رکھنے سے پھیلی ہے۔

غرض جب یہ بات محقق ہوگئی کہ قلبی کیفیات کا اثر کلام اور لباس تک میں ظاہر ہوتا ہے تو اب بے دینوں کی کتابوں اور ان کے لباسوں سے احتراز کرنا چاہیئے کیونکہ ان کے قلب میں ظلمت ہی پیدا ہوتی ہے گو وہ کیسا ہی تقدس کا دعوٰی کریں اور عمدہ عمدہ مضامین بیان کریں۔ مگر ان کے دعووں کی یہ حالت ہوگی ۔

وقوم یدعون وصال لیلی و لیلی لا تقر لهم بذاک

(لوگ (لیلی) محبوب حقیقی کے وصال کا دعوٰی کرتے ہیں اور محبوب ان کے لئے اس کا اقرار نہیں کرتا)

اور دینداروں کی باتیں دنیوی معاملات کے متعلق بھی نور سے خالی نہ ہوں گی۔ تجربہ کر کے دیکھ لو۔ یہ بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔ ہاں یہ شرط ہے کہ امتحان کرنے والا سلیم الطبع ہو۔

صاحبو! اگر دو بھائی ایک شب میں اپنی بیویوں کے پاس جائیں جن میں ایک مرد ہے اور ایک نامرد ہے۔ تو صبح کو دونوں کی صورت اور بات چیت سے تاڑنے والے تاڑ جائیں گے کہ کس کو تو وصال نصیب ہوا ہے اور کون محروم رہا۔

خشیت کا اثر

خدا کے بندو! اتنی اتنی باتیں تو چھپتی نہیں ہیں اور خدا کی خشیت جس سے پہاڑ ہل جاتے ہیں چھپی رہ جائے گی۔ کہ آپ کے دل میں خشیت ہو اور اعمال میں اس کا ظہور نہ ہو۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مگر بعض لوگ دھوکا میں ہیں۔ اپنے آپ کو صاحب نسبت اور صاحب خشیت سمجھتے ہیں حالانکہ وہاں پتہ بھی نہیں۔ شاید انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ تصور میں حصول اشیاء بانفسہا فی الذہن ہوتا ہے۔ اور نسبت وخشیت کا تصور ہمیں حاصل ہے تو ہم واقعی صاحب خشیت وصاحب نسبت ہو گئے اگر یہی حصول اشیاء بانفسہا ہے۔ تو جو شخص پہاڑ کا تصور کرتا ہے چاہئے کہ اس کے ذہن میں پہاڑ بعینہ موجود ہو۔ پھر اس تصور سے اس کا ذہن منشق کیوں نہیں ہوا اتنی بڑی چیز ذرا سی ذہن میں کیوں کر سما گئی۔ یہ تو اہل ظاہر کی کوتاہی تھی کہ وہ محض تصور خشیت کو حصول خشیت سمجھے ہوئے ہیں۔

اب میں مشائخ کے اترے پترے کھولتا ہوں۔ ان میں بھی بہت لوگ دھوکا میں ہیں۔ کہ ایک شخص کو مقامات کا ذوق حاصل تھا اس نے حالات وکیفیات بھی دیکھے تھے مگر ابھی رسوخ نہ ہوا تھا کہ شیخ بن کر بیٹھ گئے۔ تربیت کا طریق بھی جانتے ہیں اور لوگ ان کے ہاتھ سے کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ مگر اب کچھ دنوں کے بعد وہ مقامات واحوال سے خالی ہیں۔ آخر وہ اثر کہاں گیا۔ اگر ان کے اندر خشیت موجود ہے تو معاصی سے اجتناب کیوں نہیں ہوتا۔ اگر تواضع موجود ہے تو دوسروں کے کہنے سننے سے مرچیں کیوں لگتی ہیں۔

تو بات یہ ہے کہ اس نے ہر چیز کا مزا چکھا تھا اس سے پیٹ نہیں بھرا تھا مزا چکھ کر بے فکر ہو گیا کہ جب چاہوں گا خشیت وتواضع کا حال غالب کر لوں گا مگر محض چاہنے سے کیا ہوتا ہے جب تک اس کا تحقق نہ ہو۔ چاہنے کو تو کفار نے بھی کہا تھا۔

لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ کہ اگر ہم چاہیں گے تو قرآن جیسا کلام بنا دیں گے۔ مگر کبھی کر کے تو نہ دکھایا۔ بس ایسا ہی اس شخص کا چاہنا ہے کہ جب چاہوں گا خشیت و تواضع حاصل کر لوں گا مگر حاصل ایک دن بھی نہ کی۔ پھر اس حالت میں اس کا شیخ بن جانا ایسا ہے جسے ایک شخص میں قوت نکاح موجود ہو اور وہ کہے کہ میں جب چاہوں گا نکاح کر کے بچہ جنوا لوں گا۔ اس لیے تم مجھے اب ہی باپ کہو۔ تو بھلا اس کو ابھی سے باپ کیوں کر کہا جائے اس کو چاہیئے اول نکاح کرے پھر بیوی کے پاس جائے جب حمل قرار پا کر بچہ پیدا ہو جائے گا اس دن خود ہی باپ ہو جائے گا کسی کے کہنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔

پس اے سالکین! محض مقامات کا مزا چکھ کر بے فکر نہ ہو جاؤ بلکہ ان میں رسوخ حاصل کرو۔ محض چاہنے کے اوپر نہ رہو کہ طریقہ تو معلوم ہو ہی گیا ہے جب چاہیں گے تکمیل کر لیں گے۔ یاد رکھو اس طرح تکمیل نہ ہوگی اور تکمیل سے پہلے شیخ بن گئے تو پھر کبھی اس کی توفیق ہی نہ ہوگی۔ اور تکمیل کا صحیح تو یہ ہے

اے بے خبر بکوش کہ صاحب خبر شوی ☆ تا راہ بیں نہ باشی کے راہبر شوی

(اے بے خبر کوشش کر کہ تو خبردار ہو جائے جب تک تو راہ بیں (راستہ کا دیکھنے والا) نہ ہو گا رہبر نہیں بن سکتا۔

در مکتب حقائق پیش ادیب عشق ☆ ہاں اے پسر بکوش کہ روزے پدر شوی

(ادیب عشق کے سامنے حقائق کے مدرسہ میں ہاں اے لڑکے کوشش کر کسی دن باپ (شیخ) بھی بن جائے گا) کہ شیخ بننے سے پہلے کسی کی جوتیاں سیدھی کرو اور باپ بننے سے پہلے بیٹا بننے کوشش کرو۔ ورنہ یاد رکھو چند روز میں اس شخصیت کا قلعی کھل جائے گی۔

کیونکہ آپ کی حالت یہ ہے کہ فرض کرو اگر کوئی ان کی تعریف کرنے لگے تو تواضع سے باتیں بناتے ہیں کہ میں تو کسی قابل نہیں۔ میں تو اپنے کو سب سے زیادہ نالائق سمجھتا ہوں۔ پھر اگر کوئی یوں کہہ دے کہ ہاں مجھ سے غلطی ہوئی۔ واقعی آپ تو نالائق ہی ہیں تو پھر دیکھئے کیسے اچھلتے کودتے ہیں۔

اگر آپ یہ تاویل کریں کہ صاحب ہم اگر نالائق ہیں تو وہ نالائق کیوں کہے۔ اس سے تو انسان کو طبعاً ناگواری ہوتی ہے۔ دیکھو اندھا باوجود اپنے کو اندھا سمجھتا ہے مگر دوسرا کوئی اسے

اندھا کہے تو برا لگتا ہی ہے کیونکہ اس نے طعن سے کہا ہے۔ اسی طرح ہمارا اچھلنا کودنا اس وجہ سے نہیں کہ ہم اپنے کو لائق سمجھتے ہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ اس نے طعن کے ساتھ نالائق کہا۔

بہت اچھا ہم نہایت متانت وشفقت سے کہتے ہیں کہ افسوس تم کسی لائق نہیں۔ تم اب تک الو کے پٹھے ہی رہے (یہ جملہ نہایت متانت سے فرمایا تھا۔ اسلیئے سارا مجمع لوٹ گیا ۱۲)

دیکھیں اس سے آپ کو ناگواری کس طرح نہیں ہوتی۔ حضرت جب تک حقیقی تواضع حاصل نہ ہوگی اس وقت تک چاہے کوئی طعن سے کہے یا شفقت سے ضرور ناگواری ہوگی۔ تو یہ بناوٹ چل نہیں سکتی ضرور ایک دن کھل کر رہے گی۔

اس لیے مقامات میں رسوخ حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ محض مزا چکھنے پر قناعت نہ کرو ہانڈی کا مزہ چکھنے سے پیٹ نہیں بھرتا۔ بلکہ پہلے سے زیادہ بھوک لگ جاتی اور پیٹ خالی ہو جاتا ہے اس طریق میں اس قسم کے وسوسے اور دھوکے بہت ہیں کہ بعض دفعہ ذوق مقام سے حصول کا شبہ ہو جاتا ہے اسی لیے عارف فرماتے ہیں ؎

در راہ وسوسۂ اہرمن بسے ست ☆ ہشدار و گوش را بہ پیام سروش دار

(یعنی طریق باطن میں شیطان کے وساوس اور خطرات ہیں ان سے بچنا چاہتے ہو تو ہوشیار رہو اور شریعت کا اتباع کرو)

پیام سروش سے مراد وحی ہے اور وحی میں قرآن و حدیث وفقہ وتصوف سب داخل ہیں۔ قرآن وحدیث تو وحی بلا واسطہ ہے اور فقہ میں اگرچہ قیاس کا واسطہ ہے مگر یہ مسئلہ ثابت ہو چکا ہے کہ **القیاس مظہر لا مثبت** قیاس مراد کو ظاہر کرتا ہے۔ کوئی نیا حکم ثابت نہیں کرتا جو اہل بصیرت ہیں وہ فقہ وتصوف میں وحی کا رنگ دیکھتے ہیں اور یوں کہتے ہیں۔ ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش ☆ من انداز قدت را می شناسم

(خواہ کسی ہی رنگ کا لباس پہن لو میں قد کے انداز سے پہچان لوں گا)

خشیت کی علامت

پس خشیت کے متعلق بھی حدیث وقرآن سے معلوم کرنا چاہیئے کہ شریعت نے حصول خشیت کی علامت کیا بتلائی ہے۔ سنیئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

اسئلک من خشیتک ماتحول به بینی و بین معاصیک

(میں تجھ سے اتنے خوف کی درخواست کرتا ہوں جو میرے اور میرے معاصی کے درمیان حائل ہو جائے)

اس سے معلوم ہوا کہ خشیت مطلوبہ وہ ہے جس سے گناہوں میں حیلولت ہو جائے۔

پس جس کو یہ حیلولت حاصل نہیں اسے خشیت مطلوبہ حاصل نہیں اور جب خشیت نہیں تو اس کے پاس علم حاصل ہونے کی بھی کوئی دلیل نہیں جس پر وہ علم کا دعوی کر سکے۔ یعنی علم مطلوب گو کتابی علم حاصل ہو مگر شریعت میں جو علم مطلوب ہے وہ یہ کتابی محض نہیں ہے بلکہ علم مطلوب وہ ہے جو دل میں اتر جائے اور اس علم کے لیے خشیت لازم ہے۔

گو اس آیت کا اول نظر میں یہ مدلول نہیں بلکہ اس کا مدلول تو عکس ہے یعنی خشیت کے لیے علم لازم ہے کیونکہ وہ خشیت کا موقوف علیہ ہے اور وجود موقوف علیہ کو تو اس آیت سے علم خشیت کے لیے مستلزم ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ لیکن ایک عمیق تحقیق سے جو کہ ختم بیان کے قریب مذکور ہوگی۔ خود آیت سے بھی اور قطع نظر اس تحقیق کے دوسرے دلائل سے یہ استلزام ثابت ہے کہ اگر خشیت حائلہ بین العاصی و بین المعاصی (گنہ گار اور گناہوں کے درمیان حائل ہونے والی) حاصل نہ ہو تو اسے علم مطلوب بھی حاصل نہیں چنانچہ حدیث:

لا یذنی الذانی وھو موء من (الصحیح للبخاری ۱۷۸:۳)

(کوئی زنا نہیں کرتا اس حال میں کہ وہ مومن ہو) اس کی دلیل ہے اس طرح سے زنا علامت ہے عدم خشیت کی۔ اور اس سے ایمان کی نفی فرمائی اور ایمان بمعنی تصدیق ایک علم ہے۔ تو جب خشیت کی نفی سے ایمان کی نفی فرمائی تو خشیت کا لازم ہونا اور علم کا ملزوم ہونا ثابت ہو گیا۔ باقی ہر ایک کی نفی سے دوسرے کی جو نفی کا حکم ہے اس کی ذات کی نفی کا حکم نہیں بلکہ اس کے کمال اور درجہ مطلوب اور اس کے بعض آثار کی نفی کا حکم ہے مثلاً اس حدیث ہی میں یہ مراد ہے کہ: لا یذنی وفیہ اثر الایمان المطلوب مطلب یہ ہے کہ مومن میں جب تک ایمان کا اثر مطلوب موجود رہے اس وقت تک وہ زنا نہیں کر سکتا اور جس وقت زنا کرے گا اس وقت اس میں یہ اثر مطلوب نہ ہوگا۔ گو نفس ایمان باقی ہے پس اس سے ایمان کی نفی مراد نہیں بلکہ اثر ایمان کی نفی مراد ہے یا بلفظ دیگر جس میں خشیت نہ ہو اس سے مطلق علم کی نفی نہیں کی جاتی بلکہ اثر علم کی نفی کی جاتی ہے اور مطلب شرعی وہی علم ہے جو اپنے اثر کے

ساتھ ہو (جیسے تلوار وہی مطلوب ہے جس میں صفت قطع بھی ہو ورنہ برائے نام تلوار ہوگی ۱۲) تو اس اثر کے انتقاء سے علم مطلوب کی نفی صحیح ہے خوب سمجھ لو۔ اسی کو کہتے ہیں ؎

علم چہ بود آنکہ رہ بنمایدت ☆ زنگ گمراہی زدل بزدایدت

(یعنی علم وہی ہے جو تم کو خدا کا راستہ دکھائے اور دل سے گمراہی کا زنگ دور کرے)

ایں ہوسہا از سرت بیروں کند ☆ خوف وخشیت در دلت افزوں کند

(یعنی حرص وہوا سے چھڑا کر تمہارے دل میں خوف وخشیت پیدا کردے)

تو ندانی جز یجوز ولا یجوز ☆ خود ندانی کہ تو حوری یا عجوز

(یعنی تم کو سوائے اس کے کہ یہ چیز جائز ہے اور یہ ناجائز ہے اپنی خبر نہیں کہ تم مقبول ہو یا مردود) اور جب تمہارے علم کی یہ حالت ہے کہ سوائے یجوز ولا یجوز کے کچھ خبر نہیں اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں تو پھر اسی پر اس خطاب کو بے تکلف مرتب کر سکتے ہیں ؎

ایها القوم الذی فی المدرسه　　کل ما حصلتموه سوسه

(صاحبو! جو کچھ مدرسہ میں علم لفظی حاصل کیا وہ وسوسہ تھا)

علم نبود غیر علم عاشقی　　مابقی تلبیس ابلیس شقی

(علم عاشقی کے علاوہ جو علم بھی ہے وہ بدبخت شیطان کی تلبیس ہے) مگر ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ علم عاشقی سے کیا مراد ہے ؎

علم دیں فقہ ست وتفسیر وحدیث ☆ ہر کہ خواند غیر ازیں گردد خبیث

(علم دین فقہ، تفسیر حدیث ہے جو شخص ان کے علاوہ مقصود بالذات حاصل کرے وہ خبیث ہے)

علم اور عشق

یہ اس واسطے کہہ دیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ علم عاشقی سے مراد علم دین ہے کیونکہ ایمان ہی عشق ہے۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ اور جب ایمان عشق ہے تو اسی کا علم علم عاشقی ہے۔ یہ میں نے اسلیئے کہہ دیا کہ کوئی صاحب علم عاشقی سے مخلوق کا عشق نہ سمجھ جائیں گو وہ بھی اگر حدود کے اندر ہو جس کا حاصل دو امر ہیں ایک بے اختیاری دوسری عفت تو مذموم نہیں بلکہ ایک درجہ میں مفید ہے جس میں تعلیم شیخ کی ضرورت ہے مگر یہاں وہ مراد نہیں

کیونکہ یہ عشق مخلوق مطلوب و مقصود نہیں ہے اور یہاں مقصود کا ذکر ہو رہا ہے۔ باقی مطلق عشق کے متعلق ایک حدیث بھی مشہور ہے۔

من عشق فکتم وعف فمات فھو شھید (إتحاف السادة المتقين ۷:۴۳۹)

(جو عشق میں مبتلا ہو اور اس کو چھپایا اور عفت اختیار کیا پس وہ مر گیا وہ شہید ہے) مگر محدثین نے اس میں کلام کیا ہے بعض نے اس کو موضوع بھی کہا ہے مگر صاحب مقاصد کی رائے وضع کی نہیں۔ لیکن وضع کی دلیل میں جو یہ کہا ہے کہ لفظ عشق قرآن و حدیث میں کہیں نہیں آیا اسلیئے یہ موضوع ہے یہ وجہ تو صحیح نہیں کہ اس لیے کہ حدیث میں نہ آنا اس شخص کو کہاں مسلم ہے جو اس کو حدیث کہتا ہے۔

دوسرے ممکن ہے کہ اس میں روایت بالمعنی ہوگئی ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں لفظ عشق نہ ہو۔ راوی نے معنی سمجھ کر اس کو بالمعنی نقل کر دیا اور روایت بالمعنیٰ جائز ہے۔ ہاں اگر سند میں کلام ہو تو اور بات ہے۔ یا کسی کا ذوق اسے موضوع بتلاتا ہو گو اس کا ذوق دوسروں پر حجت نہ ہوگا۔ مگر ہم اس سے نزاع نہ کریں گے کیونکہ ذوقیات محل نزاع نہیں ہیں لیکن قواعد سے اس کا مضمون بے اصل نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ اس میں عشق سے مراد وہ عشق عمد نہیں ہے جس کو از خود اپنے سر لگایا جائے جیسا کہ سعدی فرماتے ہیں۔

سوم باب عشق ست و مستی شور ☆ نہ عشقے کہ بندند بر خود بزور

(تیسرے باب میں عشق اور مستی و شور کا بیان ہے نہ وہ عشق کہ لوگ اپنے
اوپر زبردستی مسلط کرتے ہیں)

بلکہ عشق غیر اختیاری مراد ہے جس کا حدوث بھی بے اختیار ہو اور بقاء میں بھی اختیار سے کام نہ لیا گیا ہو اور اس کے ساتھ عفت بھی ہو۔ یعنی نہ قصداً اسے دیکھے نہ قصداً اس کے پاس جائے کیونکہ اس روایت میں **فعف** (عفت اختیار کی) تحید صراحۃً موجود ہے اور یہ افعال قصدیہ خلاف عفت ہیں۔ تو اب صرف عشق قلبی غیر اختیاری کا درجہ رہ گیا۔

اور ظاہر ہے کہ یہ ایک مرض ہے جیسا کہ دق ایک مرض ہے اور حمّی میں شہادت کا وعدہ منصوص ہے (**نقلہ الشامی عن السیوطی فی رد المختار** (شامی نے اس کو سیوطی سے رد المختار میں نقل کیا ہے) تو عشق کے لیے بھی اگر شہادت کا وعدہ ہو تو کیا بعید ہے۔

کیونکہ واقعی عشق کا الم دق کے الم سے بہت زیادہ ہے اس میں اگر عفت و کتمان سے کام لیا جاوے تو واقعی یہ بڑی ہمت و جوانمردی کا کام ہے اس میں تلوار کی ضرب سے زیادہ ضربیں لگتی ہیں۔ یہ سب کلام تھا عشق مخلوق میں۔

علم مطلوب

لیکن ہر حال میں یہاں علم عاشقی سے یہ عشق مراد نہیں کیونکہ اس عشق کا کوئی علم خاص تھوڑا ہی ہے جس کو حاصل کیا جائے۔ یہ تو امر غیر اختیاری ہے جو اختیار سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور اگر اختیار سے حاصل کیا جائے تو مذموم ہے ہاں عشق خدا کا علم مراد ہے جو حدیث و قرآن و فقہ میں موجود ہے اس کے غیر کو کہتے ہیں کہ۔ مابقی تلبیس ابلیس شقی

(جو باقی رہا وہ بد بخت شیطان کی تلبیس ہے)

مابقی میں کیا رہا۔ شاید آپ کہیں گے کہ یہ منطق وغیرہ ہوگی۔ نہیں صاحب! اگر علوم خادمہ کو بحیثیت خادم کے رکھا جائے تو التابع فی حکم المتبوع (تابع متبوع کے حکم میں ہوتا ہے) کے قاعدے سے وہ بھی علوم دینیہ ہی میں داخل ہیں۔ جیسے بادشاہ کا خادم و غلام اگر اس کے ساتھ ہو تو وہ بھی متبوع کے حکم میں ہوتا ہے کہ جیسے بادشاہ کی خاطر کی جاتی ہے ایسے ہی اس کے تعلق سے غلام کی بھی کی جاتی ہے بشرطیکہ وہ خادم ہو باغی نہیں۔

پس معقول سے اگر اثبات دین و فہم شرع میں کام لیا جائے تو یہ بھی دین ہے اور ابطال شرع کا کام لیا جائے تو پھر باغی ہے اور تلبیس ابلیس شقی میں داخل ہے۔

نیز دیکھئے اگر کوئی پوچھے کہ اس کھانے میں کتنی لاگت لگی ہے تو جہاں آٹا اور گھی اور دال کو شمار کرتے ہیں وہیں کھانے کی میزان میں لکڑیاں اپلے بھی شمار ہوتے ہیں۔ چنانچہ حساب میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ لکڑیاں چار آنے کی اور اپلے دو آنے کے۔ تو کیا اب کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ صاحب اپلے کیا کھائے جاتے ہیں جو ان کو کھانے کے حساب میں شمار کیا گیا۔ ہرگز نہیں۔ اور اگر کوئی کہے تو ہر عاقل اس کو یہی جواب دے گا کہ اپلے کھائے تو نہیں جاتے مگر کھانے کی خدمت کرتے ہیں۔

اسی طرح معقول و فلسفہ کو سمجھو کہ اگر ان کو دین کے کام میں صرف کیا جائے تو ان کا وہی حال ہے جو کھانا پکانے میں اپلوں کا حال ہے کہ وہ بھی دین کے ساتھ شمار ہوں گے۔

جیسے اپلے کھانے کے حساب میں شمار ہوتے ہیں اور اگر ان کو دین کے کام میں نہ لگایا جائے بلکہ انھی کو مقصود بنالیا جائے تو اس کی ایسی مثال ہوگی جیسے کوئی اپلے کھانے لگے۔

بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ علم مطلوب وہ ہے جس کے ساتھ دل میں اثر بھی ہو اسی کو کہتے ہیں

علم چوں بر دل زنی یارے شود ☆ علم چوں برتن زنی مارے شود

(علم اگر دل میں اثر کرے وہ معین ہوتا ہے اور علم اگر جسم پر اثر انداز ہو تو وہ سانپ یعنی مہلک ہوتا ہے۔)

فخر و فضیلت

تو بتلایئے کہ ہمیں جو اپنے علم پر ناز ہے اور خشیت سے خالی ہیں تو یہ ناز بجا ہے یا بے جا۔ صاحب! پہلے خشیت تو پیدا کرو شاید تم یہ کہو کہ اچھا تو کیا بعد خشیت کے ہم ناز کر سکتے ہیں؟ اس کا جواب بھی یہی ہے کہ نہیں۔ اسوقت وہ خشیت آپ کے ناز کو مٹا دے گی۔ اب شاید تم یہ کہو گے کہ یہ تو عجیب چکر ہے۔ حصول خشیت سے پہلے تو علم پر اس لئے ناز نہ کر سکے کہ ابھی علم مطلوب حاصل نہیں ہوا اور حصول خشیت کے بعد اسلیئے ناز نہ کر سکے کہ خشیت نے اس کو مٹا دیا تو اس کے تو معنیٰ یہ ہوئے کہ علم ناز کی چیز ہی نہ رہی۔

نہیں صاحب! حصول خشیت کے بعد علم بہت بڑے ناز کی چیز ہے مگر خود صاحب علم کے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے۔ یعنی اس وقت تم ناز نہیں کرو گے بلکہ اس وقت ہم تم پر ناز کریں گے۔

دیکھو ہمارے مدارس میں ایسے ایسے علماء ہوتے ہیں اس وقت ہم تم پر ناز کریں گے۔ اور صاحب ہم تو کیا ناز کرتے اس وقت بڑے بڑے حضرات تم پر ناز کریں گے یعنی انبیاء علیہم السلام۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے۔

تناکحو توالدو فانی اباھی بکم الا مم. (الأسرار المرفوعة لعلی القاری: ۱۶۷)

(یعنی نکاح کرو بچے پیدا کرو۔ اسلیئے میں تمہاری (کثرت کی) وجہ سے دوسری امتوں کے مقابلہ میں فخر کروں گا)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ پر فخر ہوگا کہ میری امت میں ایسے ایسے لوگ ہیں تو کیا تھوڑی بات ہے۔ اب تمہیں بتلاؤ کہ تم خود ناز کرو یہ اچھا ہے یا انبیاء و اولیاء تم پر ناز کریں یہ اچھا ہے۔ یقیناً دوسری ہی صورت ارفع ہے تو اب تو یہ شبہ جاتا رہا کہ علم ناز کی چیز ہی نہ رہی

اور یہیں سے اشکال رفع ہوگیا کہ مولانا رومیؒ نے فرمایا ہے

او خدو انداخت بروئے علی ☆ افتخار ہر نبی و ہر ولی

(اس نے تھوک ڈالا حضرت علیؓ کے چہرہ مبارک پر جو ہر نبی اور ولی کے افتخار ہیں) اس پر بعض لوگوں کو شبہ ہوا کہ حضرت علیؓ کو افتخار ہر نبی کیوں کر کہہ دیا جواب یہ ہے کہ اس کا مطلب وہی ہے جو اس حدیث کا مطلب ہے **ابا ھی بکم الامم** (میں تمہاری وجہ سے تمام امتوں پر فخر کروں گا) یعنی حضرات انبیاء علیہم السلام حضرت علیؓ پر فخر کریں گے۔ اور اس سے حضرت علی کی تفضیل انبیاء لازم نہیں آتی۔ کیونکہ افتخار کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو چھوٹوں کو بڑوں پر ہوتا ہے اس کا منشا یہ ہے کہ کامل کی طرف انتساب سے ناقصوں کو فضیلت حاصل ہوتی ہے اور ایک افتخار بڑوں کو چھوٹوں پر ہوتا ہے کہ ہمارے سلسلہ میں اور یا ہمارے فیض یافتہ ایسے ایسے ہیں۔ پس حضرت علیؓ افتخار ہر ولی بمعنی اول ہیں اور افتخار ہر نبی بمعنی ثانی ہیں۔

غرض حصول خشیت کے بعد اساتذہ ہم پر فخر کریں گے۔ ہم کو اس وقت بھی ناز کا حق نہ ہوگا۔ تو جب حصول خشیت کے بعد بھی ہم کو ناز کا حق نہ ہوگا تو حصول سے پہلے تو کچھ بھی نہیں۔ کیونکہ ایسا علم جو خشیت سے خالی ہو علم ہی نہیں۔ اس میں ناز کا احتمال ہی نہیں نہ تم کو اور نہ تم پر۔

صاحبو! علم کو میراث انبیاء کہا جاتا ہے تو اب دیکھو کہ انبیاء کہ میراث کون سا علم ہے۔

میراث پدر خواہی علم پدر آموز

(باپ کی میراث چاہتے ہو تو باپ کا علم سیکھو) کیا انبیاء کا علم بھی ایسا ہی تھا۔ نعوذ باللہ جس میں محض مسائل و اصطلاحات کا حفظ ہو اور خشیت کا نام نہ ہو۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ وہاں تو یہ حالت تھی کہ جتنا علم بڑھتا تھا اسی قدر خشیت بڑھتی تھی۔ حدیث میں ہے۔

اعلمکم باللہ واخشاکم للہ (الکاف الشاف فی تخریج أحادیث الکشاف: ١٣٩)

(تم سے زیادہ اللہ کو جاننے والا اور تم سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں) پس معلوم ہوا کہ علم خود مقصود نہیں بلکہ خشیت کے لیے مقصود ہے۔

خشیت مطلوبہ

مگر اب ہماری یہ حالت ہے کہ علم حاصل کرتے ہیں پھر پڑھانے میں مشغول ہو جاتے ہیں اور اسی کو مقصود سمجھتے ہیں۔ تحصیل خشیت کا اہتمام نہیں کرتے حالانکہ غیر مقصود کو

مقصود بنا لینا مکروہ ہے۔ فقہاء نے اس راز کو خوب سمجھا ہے فرماتے ہیں کہ وضو سے جب تک نماز نہ پڑھی نہ جاوے اس وقت تک دوسرا وضو مکروہ ہے۔ ظاہر میں تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ فقہاء نے ایک عبادت کو منع کیا ہے۔ مگر یہ لوگ حکماء امت ہیں واقعی خوب سمجھے کہ جب اس نے غیر مقصود کو ادائے مقصود سے پہلے مکرر کیا تو اس نے غیر مقصود کو مقصود کو بنا لیا اور یہ حد سے تجاوز ہے۔ اسی طرح تعلم و تعلیم کو مقصود بالذات سمجھ لینا بھی حد سے تجاوز ہے۔

اب بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ صاحب ہم کو تحصیل خشیت کی فرصت نہیں۔ یہ جواب ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص نے حجام کو خط دیا کہ جلدی سے فلاں شخص کو پہنچا دو۔ وہ دوڑا ہوا آیا اور لا کر خط اس کے حوالہ کیا۔ اس نے کھول کر دیکھا تو اندر کورا کاغذ رکھا ہوا تھا۔ پوچھا کہ اس میں تو کچھ بھی نہیں لکھا محض سادہ کاغذ ہے۔ کہا صاحب کو لکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ جلدی میں بھیج دیا۔ کہا پھر زبانی کچھ کہا تھا۔ کہنے لگا حضور میں تو عرض کر چکا ہوں کہ جلدی بہت تھی۔ اس لیے زبانی بھی کچھ نہیں کہا بہت ہی جلدی تھی اتنی بھی فرصت نہ تھی کہ زبانی کچھ کہتے۔ اس نے کہا کہ پھر بے وقوف کو قاصد بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔

تو ایسا ہی یہ آپ کا جواب ہے کہ ہم کو حصول خشیت کی فرصت نہیں تو غیر مقصود کے لیے فرصت نکالنے سے کیا حاصل ہوا۔ اور بعض یہ کہتے ہیں کہ کتابیں پڑھ لینے سے خشیت بھی خود بخود حاصل ہو جاتی ہے۔ مستقل طور پر اس کے حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔

میں کہتا ہوں کہ محض کتابیں پڑھنے سے جو خشیت حاصل ہوتی ہے اس کی ایسی حالت ہے جیسے ایک منہار چوڑیوں کی گٹھڑی باندھے ہوئے لیے جا رہا تھا۔ ایک گاؤں والا ملا اور اس میں لاٹھی کا کھودا مار کر پوچھا کہ اس میں کیا ہے۔ (دیہاتیوں کی عادت ہے کہ یہ لاٹھی ہی سے بات کیا کرتے ہیں ۱۲) منہار نے جواب دیا کہ اس میں ایسی چیز ہے کہ ایک کھودا اور اس میں مار دو تو کچھ بھی نہیں۔

ایسی ہی وہ خشیت ہے جو کتابیں پڑھنے سے حاصل ہوتی ہے کہ شیطان کی ذرا سی ٹھیس سے شکستہ ہو جاتی ہے اور دوسری ٹھیس میں کچھ بھی نہیں رہتی۔ اور خشیت مطلوبہ وہ ہے جو معاصی سے جواب ہو جائے۔ جو شیطان کی ہزار ٹھیس لگانے سے بھی شکستہ نہ ہو۔

اب تو معلوم ہو گیا کہ تحصیل علم کے بعد تحصیل خشیت کی مستقل طور پر ضرورت ہے

تاکہ اس کو استحکام ہو جائے (مگر آجکل اہل علم اسی کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔ خانقاہ والوں پر اعتراض کرتے ہیں۔ ان کو نکما اور بے کار بتلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ وقت خانقاہوں میں بیٹھنے کا نہیں ان کو بند کر دو۔

سبحان اللہ! جو درس گاہ اصل مقصود کی تعلیم کیلئے موضوع ہے وہ تو بیکار ہو جائے۔ اور جو درس گاہ غیر مقصود کی تعلیم کے لیے ہیں وہ بے کار ہوں ۱۲)

میرے بیان کا حاصل یہ تھا کہ جس کو تم مقصود بالذات سمجھ رہے ہو یعنی تعلیم و تعلم وہ مقصود بالذات نہیں ہے محض طریق ہے اور مقصود بالذات دوسری چیز ہے یعنی وہ علم ہے جس سے خشیت ہو۔

عوام کی تعلیم

اب میں تنزل کر کے کہتا ہوں کہ اچھا تم جس تعلیم کو مقصود بالذات سمجھ رہے ہو یہ تو بتلاؤ کہ اسی کا کیا حق ادا کر رہے ہو۔ چنانچہ میں پوچھتا ہوں کہ تعلیم کس کی مقصود ہے تم کہو گے طلباء کی۔ میں کہوں گا کہ تم نے اس مقصود کو بھی پورا نہیں کیا کیونکہ طلباء کی دو قسمیں ہیں۔ خواص اور عوام۔ اس کی کیا وجہ کہ تم صرف خواص کو تعلیم دیتے ہو عوام نے آخر کیا خطاء کی ہے۔ ان کو آپ کیوں نہیں پڑھاتے۔ شاید تم یہ کہو گے کہ صاحب یہ عوام میزان منشعب کیسے پڑھیں گے۔ ان کو تو الف با کی بھی خبر نہیں۔

میں کہتا ہوں کہ عوام کی میزان دوسری ہے تم عوام کو ان کی میزان پڑھاؤ۔ یعنی ان کو کلمہ سکھلاؤ۔ پاکی ناپاکی کا طریقہ بتلاؤ۔ نماز سکھلاؤ اور ضروری ضروری احکام سناؤ۔ اور جو ان میں اردو لکھنا پڑھنا جانتے ہوں ان کو دینیات کے اردو رسائل پڑھاؤ۔ مگر اردو ہی میں پڑھانا ولایتی زبان میں تقریر نہ کرنا کیونکہ بعضے مولویوں کو اردو میں بھی عربی لغات کے ٹھونسنے کا مرض ہوتا ہے۔

لکھنؤ میں ایک بزرگ زمیندار تھے۔ ان کے پاس گاؤں کے کاشت کار آئے تو مولوی صاحب ان سے پوچھتے ہیں کہ امسال تمہارے کشت زار گندم پر تقاطر امطار ہوا یا نہیں۔ یہ گاؤں والے بڑے ذہین ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب کی یہ بات سن کر ایک نے دوسرے سے کہا۔ بھائی مولوی جی ابھی قرآن پڑھ رہے ہیں۔ اب چلو جب آدمیوں کی سی بولی بولیں گے۔ اس وقت آجائیں گے۔

اسی طرح مولوی فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ بیان کرتے تھے کہ دہلی میں ایک مدرس معقولات سے لوگوں نے وعظ کی درخواست کی آپ وعظ کہنے بیٹھے کہ حق تعالیٰ کا ہم پر بہت بڑا انعام ہے کہ ہم کو لیس سے ایس میں لائے۔ اور پھر وہ ہم کو ایس سے لیس میں لے جائیں گے اور اس کے بعد قیامت میں پھر لیس سے لیس میں لے آئیں گے۔ بندۂ خدا نے سارا وقت ایس اور لیس ہی میں گزار دیا۔ تو خدا کے واسطے ایسی ولائتی زبان میں وعظ نہ کہنا بلکہ روزمرہ کی بول چال میں عوام کو احکام سمجھاؤ۔

افسوس ہے کہ مولویوں نے وعظ کہنا بالکل چھوڑ دیا اور غضب یہ ہے کہ بعضے تو یہ سمجھتے ہیں کہ وعظ کہنا جاہلوں کا کام ہے علماء کا کام فتویٰ دینا اور پڑھنا پڑھانا ہے۔

صاحبو! ذرا زبان سنبھالیئے یہ بات بہت دور تک پہنچتی ہے میں پوچھتا ہوں کہ اب تک جتنے انبیاء گزرے ہیں ان میں کتنے ایسے تھے جو کتابیں پڑھاتے تھے انشاء اللہ ایک نبی کو بھی آپ ایسا نہ پائیں گے۔ بلکہ انبیاء کا طریقہ وعظ و نصیحت ہی کے طریقہ سے تبلیغ کرنا تھا۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ پڑھنا پڑھانا بیکار ہے اس کی ضرورت میں ابھی بیان کروں گا مگر اس وقت میں ان صاحبو کا جواب دے رہا ہوں جو وعظ کو فضول اور بیکار سمجھتے ہیں۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کا اصلی کام یہی تھا۔ آپ کو یہی طریقہ ضرور اختیار کرنا چاہیئے عوام کی تعلیم اسی طرح ہو سکتی ہے سب کو میزان منشعب پڑھنے کی فرصت نہیں ہے۔

اور اگر کوئی یہ کہے کہ صاحب وعظ سے اثر نہیں ہوتا اس لیے بے کار ہے اور درس و تدریس پر نتیجہ مرتب ہوتا ہے اس لیے ہم بجائے وعظ کے درس میں مشغول ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ اثر پہنچانے کے مکلّف نہیں ہیں۔ آپ اپنا کام کیجئے اثر خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ہے جس کو وہ نفع دینا چاہیں گے اسے خود متاثر کر دیں گے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

نوحؑ نہ صد سال دعوت می نمود　　دمبدم انکار قومش می فزود

(نوح علیہ السلام نو سو برس تک تبلیغ کرتے رہے مگر دمبدم ان کی قوم کا انکار بڑھتا ہی رہا)

حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو برس تک اپنی قوم کو وعظ و نصیحت سے سمجھایا اور ان پر کچھ بھی اثر نہ ہوا مگر نوح علیہ السلام اتنی میں بھی نہ گھبرائے اور آپ چار ہی دن میں گھبرا گئے۔

اب تو ہمارے بھائی یہ کرنے لگے ہیں کہ جو کام ان کے قابو سے باہر ہو اس میں تو

کوشش کرتے ہیں۔ سلطنت حاصل کرنے کے لیے بڑی لمبی چوڑی تجویزیں کرتے ہیں۔ اس میں روپیہ بھی خرچ کرتے ہیں۔ حالانکہ اس میں کامیابی مظنون تو کیا موہوم بھی نہیں۔ اور دین کے بارے میں کچھ کوشش نہیں کرتے جس میں کوشش کرنے سے کامیابی کا بھی وعدہ ہے اور اگر دنیا میں نہ ہو تو آخرت میں یقینی۔ اور یہ کام ان کے قابو کا بھی ہے۔

مثلاً آج کل ہمارے بہت سے ناواقف بھائی مسلمان جن کو ہم نے اپنی برادری سے الگ کر رکھا تھا۔ اور اب تک ان سے غافل تھے۔ دشمن ان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ ان کو اسلام سے مرتد کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت بڑا کام دین کا یہ ہے کہ ان کو جا کر سمجھایا جائے اور وعظ ونصیحت کے طریقہ سے اسلام کی خوبیاں ان کے کانوں میں ڈالی جائیں تاکہ وہ دشمنوں کے فریب سے محفوظ رہیں۔ مگر چونکہ یہ کام خالص دین کا ہے اس میں سلطنت ملنے کی کچھ توقع نہیں اسلیے ہمارے بہت سے بھائی اس کام کو فضول سمجھتے ہیں۔ بلکہ بعض تو مضر کہتے ہیں کہ صاحب اس وقت تبلیغ کرنا مصالح کے خلاف ہے۔

ارے میں کہتا ہوں کہ تم اپنی مصالح کو پیس دو۔ مصالحہ کو جتنا پیسو گے۔ اتنا ہی عمدہ کھانا ہوگا۔ کیسا مسالہ لیے پھرتے ہو۔ غذا کا اہتمام کرو فضول کام میں نہ لگو۔ اس وقت وعظ و نصیحت کے ذریعہ سے ان ناواقف مسلمانوں میں تبلیغ کی سخت ضرورت ہے۔ سب مسلمانوں کو مل کر یہ کام کرنا چاہیئے۔

دولت علم

یہ کام اصل میں تو علماء کا ہے مگر علماء کی حالت یہ ہے کہ ان کے پاس مال نہیں اور نہ ان کو مال کی ضرورت ہے حضرت علیؓ فیصلہ کر چکے ہیں ۔

رضينا قسمة الجبار فينا　　لنا علم و للجهال مال.

کہ ہم حق تعالیٰ کی اس تقسیم پر راضی ہیں کہ ہم کو علم دیا جائے اور جہاں کو مال۔ شاید اس پر کوئی صاحب یہ کہیں کہ حضرت علیؓ نے یہ تقسیم کیسی کی کہ خالی علم پر راضی ہو گئے۔ کچھ علماء کے لیئے مال کا بھی تو حصہ رکھ لیتے یہ اعتراض ایسا ہی ہے جیسے ہمارے استاد علیہ الرحمۃ پر بعض لوگوں نے کیا تھا۔ جب مدرسہ دیوبند کی بنیاد قائم ہوئی تو بعض لوگوں نے کہنا شروع

کیا کہ کالج علیگڑھ کے تعلیم یافتہ تو سرکاری عہدے حاصل کریں گے۔ یہ دیوبند کے پڑھے ہوئے کیا کر کے کھائیں گے یہ اعتراض سن کر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے حق تعالیٰ سے دعا کی کہ مدرسہ دیوبند کے طلباء کے واسطے معاش کا کچھ انتظام کر دیا جائے وہاں سے بذریعہ الہام کے جواب میں ارشاد ہوا کہ اس مدرسہ کا کوئی تعلیم یافتہ کم ازکم دس روپے ماہوار سے محروم نہ رہے گا۔ اتنی آمدنی اس کو ضرور ملے گی۔

مولانا بہت خوش ہوئے اور اپنے مجمع میں اس الہام کو بیان فرمایا کہ حق تعالیٰ نے اس مدرسہ کے طلباء کے لیے کم ازکم دس روپے ماہوار کا ذمہ لے لیا ہے۔ بس اب یہاں کا پڑھا ہوا بھوکا نہ رہے گا۔ اس کو سن کر ایک مولوی صاحب نے کہا کہ واہ مولانا سستے ہی راضی ہو گئے۔

اسی طرح حضرت علیؓ کے ارشاد پر بھی شاید کسی کو شبہ ہو کہ آپ بھی سستے ہی راضی ہو گئے کہ بس ہمارے لیے علم ہے اور جاہلوں کے لیے مال ہے ہم اس پر راضی ہیں تو صاحب جس شخص کو علم کی قدر معلوم ہے وہ تو اس تقسیم پر ضرور راضی ہوگا کیونکہ یہ ایسی دولت ہے جس کے سامنے ہفت اقلیم بھی کوئی چیز نہیں

مبیں حقیر گدایان عشق راکیں قوم ☆ شہان بے کمر و خسروان بے کلہ اند

(گدایان عشق کو حقیر نہ سمجھو کیونکہ یہ لوگ شاہان بے تخت و تاج ہیں)

میں سچ کہتا ہوں کہ علم میں علاوہ رضاء حق کے لذت بھی ایسی ہے کہ جب کوئی علم جدید حاصل ہوتا ہے تو ایسی مسرت حاصل ہوتی ہے کہ سلاطین کو عمر بھر بھی نصیب نہیں ہوتی اسی لیے کہتے ہیں۔

درسفالیں کاسئہ رنداں بخواری منگرید ☆ کایں حریفاں خدمت جام جہاں بیں کردہ اند

(مٹی کے پیالہ میں رندوں کو ذلت سے مت دیکھو اسلیئے کہ انھوں نے جام جہاں بیں کی خدمت کی ہے) بہر حال اہل علم کے پاس اتنا مال نہیں ہے کہ دور دراز سفر کر کے جائیں اور اتنی مدت کے لئے اہل وعیال کو نفقہ دے جائیں۔

تبلیغ کی صورت

تو اب تبلیغ کی صورت یہ ہے کہ جن مسلمانوں کے پاس مال ہے وہ مال جمع کریں اور

علماء سے کہیں کہ سفر خرچ اور اہل وعیال کے نفقہ کا اس رقم سے انتظام کیجئے اور تبلیغ کے لیے جائیے مگر آجکل تو حالت یہ ہے کہ دین کا جو کام ضروری ہو وہ بھی سب مولویوں کے ذمہ اور جو الزام ہو وہ بھی سب ان پر جیسے انوری نے کہا ہے ۔

ہر بلائے کز آسمان آید ☆ گرچہ بر دیگر قضا باشد
برزمیں نار سیدہ پرسد ☆ خانہء انوری کجا باشد

(جو بلا آسماں سے نازل ہوئی ہے اگرچہ دوسرے ہی پر مقدر ہو بغیر زمین پر پہنچے ہوئے دریافت کرتی ہے کہ انوری کا گھر کہاں ہے)

اور میں کہتا ہوں کہ خانہء مولوی کجا باشد (مولوی کا گھر کہاں ہے)

چنانچہ اس تبلیغ ہی کے بارہ میں عام طور سے اخباروں میں لکھا جاتا ہے اور زبان سے بھی کہا جاتا ہے کہ ہمارے علماء کی غفلت کا یہ نتیجہ ہے کہ آج اتنے مسلمان مرتد ہوگئے اور اتنے مسلمان احکام سے بالکل ناواقف ہیں۔ علماء نے ان کی بالکل خبر نہیں لی۔ اور جب کہا جاتا ہے کہ واقعی ان مسلمانوں کی خبر لینا چاہیئے تو ہر شخص یہ کہہ کر الگ ہو جاتا ہے کہ یہ کام مولویوں کا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جیسے ان مسلمانوں سے بے خبری کا الزام آپ نے مولویوں پر رکھا ہے کچھ آپ کا بھی اس میں قصور ہے یا نہیں۔ صاحب مولوی اتنا ہی تو کر سکتے ہیں کہ ان لوگوں کو جا کر سمجھا دیں۔ مگر یہ تو بتلائیے کہ مولوی جائیں کیونکر ریل کا کرایہ کہاں سے لائیں اور جتنے دن تک تبلیغ میں رہیں اس زمانہ کے لیے اہل وعیال کو خرچ کہاں سے دیں۔

اس کی صورت صرف یہ ہو سکتی ہے کہ آپ روپیہ دیں اور یہ سفر کریں۔ باقی یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ چلیں بھی یہی اور لدیں بھی یہی اور گھر والوں کو بھوکا ماریں بھی یہی۔ افسوس یہ ہے کہ آج کل عوام اور رؤسا سوائے رائے دینے کے اور کچھ نہیں کرتے پس جہاں کوئی ضرورت پیش آئی یہ اتنا کہہ کر الگ ہو گئے کہ علماء کو یوں کرنا چاہیئے۔ اس طرح کرنا چاہیئے اور جب پوچھا جاتا ہے کہ علماء یہ کام کیوں کر کریں۔ اس کے لیے روپے کی ضرورت ہے تو اس وقت سب خاموش ہو جاتے ہیں۔

صاحبو! کام کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے چندہ جمع کر کے رقم کا انتظام کر کے پھر مولویوں سے کہو کہ مولانا تبلیغ کے لیے ہمارے پاس اتنا روپیہ جمع ہے آپ کوئی مبلغ ہم کو دیں۔ پھر اگر

وہ کام کرنے والا نہ دیں تو بیشک ان کا قصور ہے۔

چندہ اور علماء

باقی یہ نہیں ہوسکتا کہ مولوی ہی کام کریں اور وہی روپیہ کا انتظام کریں۔ علماء کو تو کسی کام کے لیے چندہ بھی نہ کرنا چاہیئے اے علماء خدا کے لیے تم چندہ کرنا چھوڑ دو۔ تمہارے منہ سے تو چندہ کا لفظ اچھا لگتا ہی نہیں۔ بس تمہاری زبان سے یہ اچھا لگتا ہے۔

وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

(میں تم سے اس تبلیغ پر مال نہیں مانگتا ہوں اور نہ اس پر تم سے اجرت طلب کرتا ہوں۔ میری اجرت تو اللہ رب العالمین ہی کے ذمہ ہے۔ اس چندہ کی بدولت لوگ علماء سے بھاگنے لگے ان کی صورت سے بھی ڈرنے لگے۔

چنانچہ ایک سب جج صاحب جن کا لباس مولویانہ ہوتا تھا کسی نئی جگہ بدل کر گئے اور محض خوش اخلاقی کے سبب کسی رئیس سے ملنے گئے تو وہ ان کو دیکھ کر گھر میں گھس گئے۔ بعد میں نوکر نے اطلاع دی کہ سب جج صاحب آپ سے ملنے کو آئے ہیں۔ تب وہ باہر آئے اور کہا معاف فرمایئے گا۔ میں آپ کے لباس سے یہ سمجھا تھا کہ کوئی مولوی صاحب چندہ مانگنے آئے ہیں۔

واقعی آج کل کوئی مولوی کسی رئیس سے ملنے جاتا ہے تو اس کو اول یہ خیال آتا ہے کہ شاید چندہ کا سوال ہوگا۔ اسلیے میں کہتا ہوں کہ علماء یہ کام ہرگز نہ کریں بلکہ روسا عوام خود چندہ کریں اور مولویوں سے دین کا کام لیں۔

مگر آج کل تو علماء کی مثال ڈوم کے ہاتھی جیسی ہو رہی ہے کہ اکبر نے ایک ڈوم کو انعام میں ہاتھی دیدیا تھا۔ وہ بڑا گھبرایا کہ اس کا خرچ میں کہاں سے لاؤں گا۔ آخر ایک دن اکبر کی سواری نکلنے والی تھی آپ نے ہاتھی کے گلے میں ڈھول ڈال کر راستہ میں چھوڑ دیا۔ اکبر نے دیکھا کہ شاہی ہاتھی گلے میں ڈھول ڈالے ہوئے پھر رہا ہے پوچھا یہ کیا قصہ ہے ڈوم کو بلایا گیا کہ تم نے اس ہاتھی کے گلے میں ڈھول کیوں ڈالا ہے کہا حضور! آپ نے مجھے ہاتھی تو دیدیا اب میں اسے کھلاتا پلاتا کہاں سے۔ میں نے اس سے کہا کہ بھائی میں تو گا بجا کر کھاتا ہوں تو بھی گلے میں ڈھول ڈال کر گا بجا کر اپنا پیٹ بھر لے۔ اکبر ہنس پڑا اور ڈوم کو اس کی امداد کے لیے بھی عطا فرمایا۔

یہی حال آج کل مولویوں کا ہے کہ لوگوں نے ان کے گلے میں ڈھول ڈال دیا ہے کہ جاؤ گاؤ بجاؤ اور روپیہ جمع کر کے خود ہی سب کام کرو۔ یاد رکھو ایک جماعت سے دو کام نہیں ہو سکتے کام کا طریقہ یہی ہے کہ روپیہ تم خود جمع کرو اور مولویوں سے صرف دین کا کام لو۔ بلکہ روپیہ جمع کر کے اپنے ہی پاس رکھو۔ علماء کو روپیہ دو بھی نہیں۔ کیونکہ آج کل بہت لوگ ایسے بھی ہیں جو واقع میں مولوی نہیں تھے مگر مولویوں میں جا گھسے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے چندوں میں بہت خیانتیں کی ہیں جس سے مولوی بدنام ہو گئے۔

اسلیئے میری رائے یہ ہے کہ رؤسا چندہ کر کے اپنے ہی پاس رکھیں مولویوں کو نہ دیں۔ کیونکہ اس سے علماء پر دھبہ آتا ہے۔ تو کیا آپ کو یہ گوارا ہے کہ آپ کے علماء بدنام ہوں۔ ہر گز نہیں۔ آپ کو تو چاہیئے کہ اگر علماء چندہ کرنا بھی چاہیں تو آپ ان کو خود روکیں کہ یہ کام آپ کے مناسب نہیں یہ کام ہم خود کریں گے۔

بلکہ ایک صورت سب سے اچھی یہ ہے کہ ایک ایک رئیس ایک مبلغ کی تنخواہ اپنے ذمہ کر لے۔ اس میں کسی جھگڑے ہی کی ضرورت نہیں۔ اور اگر ایک آدمی ایک مبلغ کی تنخواہ نہ دے سکے تو دو چار مل کر ایک مبلغ رکھ لیں اور اس کا حساب اپنے پاس رکھیں۔ یہ صورت تو روپیہ کے انتظام کی ہے۔

تبلیغ کا قاعدہ

رہا تبلیغ کا قاعدہ اور طریقہ، یہ علماء کی رائے سے ہونا چاہیئے تم روپیہ جمع کر کے علماء سے طریقہ پوچھو اور مبلغ بھی انہی کی رائے سے مقرر کرو۔ اس مشورہ کے لیے ایک کمیٹی بناؤ۔ علماء کو اس میں مشورہ اور رائے دینے سے انکار نہ ہوگا اور میں علماء سے بھی کہتا ہوں کہ وہ اس سے انکار نہ کریں۔ پھر اس طرح اللہ کا نام لے کر کام شروع کریں۔ انشاء اللہ بہت جلد کامیابی ہوگی۔ گو اول معمولی دقتیں بھی پیش آئیں گی مگر دقت سے نہ گھبرائیں۔ پیادہ سفر کرنے کی تو ضرورت نہیں۔ سواری میں سفر کریں۔ جہاں ریل ہو وہاں ریل سے پہنچیں ورنہ گاڑی بہلی سے جائیں باقی فٹن اور موٹر کی ضرورت نہیں نہ لیمن اور برف کی ضرورت ہے مبلغوں کو ان فضولیات میں قوم کا روپیہ برباد نہ کرنا چاہیئے۔ آپ کا تو یہ رنگ ہونا چاہیے۔

اے دل آں بہ کہ خراب از مۓ گلگوں باشی ☆ بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی

دررہ منزل لیلےٰ کہ خطرہاست بجاں ☆ شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

(اے دل یہی بہتر ہے کہ عشق الٰہی میں مٹ جاؤ۔ بے زر و مال سے حشمت و دبدبہ میں قاروں (دنیاداروں) سے بہت بڑھ جاؤ۔ لیلےٰ (محبوب حقیقی) کی راہ میں جان کو سینکڑوں خطرات ہیں۔ اس راہ میں قدم رکھنے کی اول شرط یہ ہے کہ مجنوں بنو)

آپ کو تو رضاء محبوب کے لیئے محبت و عشق کے ساتھ کام کرنا چاہیئے پھر عشاق بھی کہیں فٹن اور موٹر کے منتظر ہوا کرتے ہیں۔ ان کو تو رضاء محبوب کے لیے مشقتیں بھی آسان ہو جاتی ہیں یہ ہے کام کا طریقہ۔

مگر جو کام شروع کرو، دوام و استقلال کے ساتھ ہونا چاہیئے اس لیئے سب واعظ و مبلغ بھی نہ بنیں کیونکہ واعظ بننے کی جڑ تعلیم و تدریس اور مدارس عربیہ ہی ہیں اگر سارے واعظ ہی ہوگئے۔ اور مدارس بند کردیئے گئے تو پھر ان واعظوں کے مرجانے پر آئندہ کے لیے واعظ کہاں سے آئیں گے۔

آج کل مسلمانوں میں یہ بھی مرض ہے کہ جس کام کو شروع کرتے ہیں سب کے سب اسی کام میں لگ جاتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے اس کی ممانعت فرمائی ہے چنانچہ ایک دفعہ جہاد کے لیے سب لوگ چل پڑے تھے تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ

کہ سب مسلمانوں کو ایک دم سے جہاد کے واسطے نہ جانا چاہیئے تھا۔ بلکہ ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی سی جماعت تفقہ فی الدین کے لئے بھی رہنی چاہیئے تھی۔

صاحبو! یہ ہے شریعت معتدلہ کہ ہر کام کے لیے ایک خاص جماعت ہونا چاہیئے۔ سب کے سب ایک ہی کام میں نہ لگیں۔ غرض ایک جماعت تعلیم و تدریس میں مشغول ہو اور ایک جماعت وعظ و تبلیغ میں مشغول ہو۔ پھر اگر تم سے توکل ہو سکے تو پھر کسی کا انتظار نہ کرو۔ خدا پر بھروسہ کر کے چل کھڑے ہو۔ انشاء اللہ وہ تمہاری ضروریات کو پورا کر دیں گے۔ اور توکل نہ ہو سکے تو اپنے شغل و معاش میں لگ کر جتنا کام تبلیغ کا کر سکو اتنا ہی کرو۔ مثلاً اپنے محلّہ میں وعظ کہو۔ اور گاہے گاہے آس پاس وعظ کہا کرو۔ علماء نے یہ کام آجکل بالکل چھوڑ دیا جو انبیاء

کا کام تھا۔ اسی لیئے آج کل واعظ جہلاء زیادہ نظر آتے ہیں علماء واعظ بہت کم ہیں، تو اپنے اصل مقصود کے علاوہ جس چیز کو مقصود بنا دیا تھا اس کی بھی تکمیل نہیں کی اس کا بھی ایک شعبہ لے لیا۔ یعنی تعلیم درسیات اور دوسرا شعبہ تعلیم عوام کا چھوڑ دیا۔

صاحبو! اگر علماء عوام کی تعلیم نہ کریں گے تو کیا جہلاء کریں گے اگر جہلاء یہ کام کریں گے تو وہی ہوگا جو حدیث میں۔

اتخذوا رؤسا جھا لا فضلوا و اضلو.

(جہال کو انھوں نے پیشوا مقتدا بنا لیا ہے خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا)

کہ یہ جہلاء مقتدا و پیشوا شمار ہونگے۔ لوگ انھی سے فتوی پوچھیں گے اور یہ جاہل خود بھی گمراہ ہوں گے دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے اس لیے علماء کو تعلیم درسیات کی طرح وعظ و تبلیغ کا بھی اہتمام کرنا چاہیے اور اس کا انتظار نہ کرو کہ ہمارے وعظ کا اثر ہوتا ہے یا نہیں اور کوئی سنتا بھی ہے یا نہیں اور سننے والا ایک ہے یا مجمع ہے۔

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہیدؒ کا قصہ ہے کہ ایک دفعہ آپ نے مسجد میں وعظ فرمایا۔ ختم وعظ پر ایک شخص آیا۔ اس نے آہ بھر کر کہا کہ افسوس میں بہت دور سے وعظ سننے آیا تھا۔ یہاں ختم بھی ہو لیا۔ مولانا شہیدؒ نے فرمایا کہ بھائی تم افسوس نہ کرو۔ آؤ میں تم کو سارا وعظ دوبارہ سنا دوں گا۔ چنانچہ آپ نے اس کے سامنے سارا وعظ دہرایا۔

صاحب! اخلاص کے بعد اس پر نظر نہیں ہوا کرتی کہ سننے والے کتنے ہیں اگر ایک بھی سننے والا ہو تو غنیمت سمجھو۔

حضرت مولانا عبدالحی صاحبؒ جو سید صاحب بریلوی کے خلفاء ہیں ان کو سید صاحب نے حکم دیا تھا کہ وعظ کہا کرو۔ انھوں نے عرض کیا کہ سنے گا کون؟ سید صاحب نے فرمایا تم دیوار کی طرف منہ کر لیا کرو اور سامعین کو دیکھا ہی مت کرو تاکہ مجمع کا ہونا نہ ہونا معلوم ہی نہ ہو اول اول یونہی وعظ کہتے رہے پھر تو یہ حالت تھی کہ لوگ دور دور سے آپ کے وعظ کے اشتیاق میں اس کثرت سے آتے تھے کہ جگہ بھی نہ ملتی تھی۔ پس مجمع کے کم و بیش ہونے پر نظر نہ کرو کام شروع کر دو پھر اثر بھی ہونے لگے گا۔ یہ تو اسی علم کی تکمیل کا طریقہ تھا جو مقصود بالغیر ہے۔

باقی اور اصل مقصود وہ علم ہے جس کے ساتھ قلب میں خشیت بھی پیدا ہو۔ اس

کا حاصل کرنا بھی ہر شخص کے ذمہ ضروری ہے۔ مگر عادتاً یہ بدوں صحبت شیخ کے حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے لیئے قال و قیل کو کچھ دنوں کے لیے ترک کرنا اور کسی شیخ کی جوتیاں سیدھی کرنا شرط ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں ؎

از قال و قیل مدرسہ حالے ولم گرفت ☆ حالے امالہ ہے حالا کا
از قال و قیل مدرسہ حالے ولم گرفت ☆ یک چند نیز خدمت معشوق می کنم

(مدرسہ کے قیل و قال سے اب میرا دل رنجیدہ ہو گیا۔ اب کچھ دنوں شیخ کامل کی خدمت کرتا ہوں۔)

قال را بگذار و مرد حال شو ☆ پیش مرد کاملے پامال شو

(یعنی قال کو چھوڑ و حال پیدا کرو۔ یہ اس وقت پیدا ہو گا جب کسی اہل اللہ کے قدموں میں جا کر پڑ جاؤ)

مگر اس میں ایک ترتیب بھی ہے اور وہ ترتیب ہر شخص کے لیے جدا ہے اس کو میں اس مجلس میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس کو صحبت شیخ پر رکھو جب تم کسی سے رجوع کرو وہ خود ترتیب بتلا دے گا۔

ایک علمی اشکال

اب میں ایک طالبعلمانہ اشکال کا جواب دینا چاہتا ہوں جو اس آیت پر وارد ہوتا ہے۔ یہ جواب ابھی کوئی دس بارہ دن ہوئے قلب پر وارد ہوا ہے اس سے پہلے اس کی طرف ذہن نہیں گیا۔ اشکال کا حاصل یہ ہے کہ میں نے تو اب تک خشیت کو لوازم علم سے کہا تھا کہ علم جب ہو گا خشیت ضرور ہو گی اور انتفاء خشیت انتفاء علم کی دلیل ہے کیونکہ انتفاء لازم سے انتفاء ملزوم ضروری ہے مگر آیت کے الفاظ اس کو مفید نہیں کیونکہ

إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا

(اللہ تعالیٰ سے عالم ہی اس کے بندوں میں سے ڈرا کرتے ہیں۔)

میں انما لفظ حصر ہے جس سے یہ معنیٰ حاصل ہوئے کہ خشیت من اللہ علماء میں منحصر ہے یعنی جہلاء کو خشیت نہیں ہوتی۔ (کیونکہ بقاعدہ بلاغت یہاں قصر صفت علی الموصوف ہے جیسے انما یقوم زیداً اور انما یتذکر اولو الالباب میں۔ کہ مثال اول میں قیام زید کا اثبات اور اس کے ماسوا کی نفی ہے کہ عمرو بکر وغیرہ قائم نہیں ہیں اور مثال ثانی میں تذکر کا

عقلاء کے لیے اثبات ہے اور غیر عقلاء سے تذکر کی نفی ہے ۱۲)

حاصل جس کو یہ ہو کہ خشیت علم کے بغیر نہیں ہوتی یعنی خشیت کے لیے علم شرط ہے علت نہیں۔ اور وجود مشروط لازم نہیں۔ ہاں انتفاء شرط سے مشروط معدوم و منتفی ہو جاتا ہے اور علت میں اس کا عکس ہے کہ وجود علت سے وجود معلول ضروری ہے اور انتفاء علت میں اس کا عکس ہے کہ وجود علت سے وجود معلول ضروری ہے اور انتفاء علت سے انتفاء معلول لازم نہیں۔ ممکن ہے کہ کسی دوسری علت سے اس کا وجود ہو گیا ہو۔ معلول واحد کے لیے علل متعددہ ہو سکتی ہیں مطلب یہ ہوا کہ جہاں خشیت ہے وہاں علم ضرور ہے۔ باقی یہ لازم نہیں کہ جہاں علم ہو وہاں خشیت بھی ضرور ہو تو آیت سے یہ ثابت نہ ہوا کہ علم خشیت کو مستلزم ہے بلکہ یہ ثابت ہوا کہ خشیت علم کو مستلزم ہے کیونکہ وجود مشروط وجود شرط کو مستلزم ہے حالانکہ عام طور پر اس آیت سے علم کی فضیلت اس تقریر سے ثابت کی جاتی ہے کہ علم اس لیئے ضروری ہے کہ اس سے خشیت پیدا ہوتی ہے جو کہ ضروری ہے اور اب اس کے برعکس یہ تقریر ہوئی کہ علم اس لیے ضروری ہے کہ بدوں اس کے خشیت پیدا نہیں ہوتی۔ تو مشہور تقریر صحیح نہ ہوئی۔

یہ اشکال ذہن میں عرصۂ دراز سے تھا مگر جواب ابھی دس بارہ دن ہوئے ذہن میں آیا ہے۔ نہ معلوم اب تک ذہن میں یہ اشکال کیوں رہا۔ کیا جواب کی طرف التفات نہیں ہوا جواب شافی اب تک نہ ملا تھا۔ بہر حال اب جواب ذہن میں آ گیا ہے۔

حاصل جواب کا یہ ہے کہ قرآن کا نزول محاورات کے موافق ہوا ہے۔ اسالیب معقول پر نہیں ہوا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن سے قضایا عقلیہ کی نفی ہوتی ہے۔ ہر گز نہیں۔ کیونکہ قضایا عقلیہ سے قضایا نقلیہ کا تعارض جائز نہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ دلالات قرآنیہ میں محاورات کا لحاظ کیا گیا ہے۔ اصطلاحات معقول کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ پس یہ ہو سکتا ہے کہ اسلوب معقول سے ایک کلام کی دلالت کسی خاص معنی پر ہو اور اسلوب محاورہ سے دوسرے معنی پر دلالت ہو اور مقصود ثانی ہو نہ کہ اول۔ پس بطریق اسلوب معقول تو وہ اشکال وارد ہوتا ہے مگر بطریق اسالیب محاورات پر یہ اشکال نہیں پڑتا۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ گو ظاہر میں اس ترکیب سے خشیت کا مستلزم علم ہونا مستفاد ہوتا ہے نہ کہ علم کا مستلزم خشیت ہونا۔ مگر محاورات میں اس ترکیب سے علم کا مستلزم خشیت ہونا بھی

ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس کی نظیر دوسری آیت میں ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ۝
وَمَا یُلَقّٰهَاۤ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا

بدی کو اچھے برتاؤ سے دفع کرو۔ پھر دفعۃً وہ شخص جس کے اور تمہارے درمیان عداوت تھی گویا خالص دوست ہو جائے گا اور یہ بات انھی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو صابر ہیں۔

یعنی بدی کا بدلہ بھلائی سے صابرین ہی کر سکتے ہیں۔ یہاں بھی وہی ترکیب جو اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (اللہ تعالیٰ سے علم والے ہی ڈرا کرتے ہیں) میں ہے۔ کیونکہ نفی کے بعد استثناء موجب ہے حصر ہے۔ مگر اس آیت سے ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ صبر کو اس وصف میں خاص دخل ہے اور یہ کہ صبر ہی سے یہ بات حاصل ہوتی ہے۔ ورنہ بظاہر اسلوب عقلی کے مطابق تو معنیٰ یہ ہوتے ہیں کہ صبر کے بدوں یہ بات نصیب نہیں ہوتی۔ گویا صبر اس صفت کے لیے شرط ہے اور وجود شرط وجود مشروط کو مستلزم نہیں۔ تو یہ لازم نہیں کہ جس میں صبر ہو اس میں یہ وصف بھی ہو۔ تو صبر کا اس صفت کو مستلزم ہونا ثابت نہ ہوا۔ مگر محاورات میں اس سے یہی مفہوم ہوتا ہے کہ صبر کو اس وصف میں خاص دخل ہے۔ چنانچہ ہمارے محاورات میں بھی کہتے ہیں کہ میاں وضو وہی کریگا جو نماز پڑھے گا۔

اس سے ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ وضو کو نماز پڑھنے میں خاص دخل ہے یعنی اگر نماز پڑھنا نہ ہوتا تو وضو ہی کیوں کرتا۔ معلوم ہوتا ہے یہ نماز پڑھے گا۔ حالانکہ وضو شرط ہے علت نہیں ہے۔ پس اسالیب محاورات واسالیب معقول کا فرق سمجھ لینے کے بعد اب یہ معنیٰ صاف ہیں کہ اس آیت میں محاورات کے اعتبار سے خشیت کو بھی علم کے لیے لازم کہا گیا ہے تو انتفاء لازم سے ملزوم کا انتفاء ہو جاتا ہے تو حاصل یہ ہوا کہ جہاں خشیت نہیں وہاں علم ہی نہیں۔

اب ایک اور عرض ہے کہ اشکال تو رفع ہو گیا مگر جس کو یہ شبہ از خود پیدا ہوا ہو وہ اپنے ذہن کو اس کے سمجھنے کی تکلیف نہ دیں۔ میں نے یہ جواب ان لوگوں کے لئے بیان کیا ہے جن کو یہ اشکال پیش آیا ہو یہ تو علماء کی اصلاح تھی کہ وہ آیت میں علم کو شرط خشیت سمجھ کر بے فکر نہ ہوں کہ وجود علم وجود خشیت کو مستلزم نہیں۔ لہذا علم بدوں خشیت کے بھی ہو سکتا ہے۔ تو گو ہم میں خشیت نہیں مگر پھر بھی عالم ہیں اور علم کے فضائل ہم کو حاصل ہیں۔ بلکہ وہ سمجھ لیں کہ نزول قرآن

محاورات پر ہوا ہے اور محاورہ میں اس کی ترکیب سے خشیت کا لازم علم ہونا مفہوم ہوتا ہے۔

اب وہ لوگ رہ گئے جو جاہل ہیں وہ محاورات کے موافق اس آیت سے یہی مطلب سمجھتے ہیں کہ علم کو خشیت لازم ہے۔ پھر وہ دیکھتے ہیں کہ بعض مواد میں علم ہے اور خشیت نہیں تو ان کو علم قرآن پر شبہ ہوتا ہے کہ قرآن کا حکم صحیح نہ ہوا۔

اس کا ایک جواب تو اوپر آ چکا ہے کہ یہاں علم سے علم تام مراد ہے (جو دل کے اندر اتر جائے۔ محض لفظی علم مراد نہیں کیونکہ وہ مطلوب بالذات نہیں ۱۲)

علم کی قسمیں

دوسرا جواب ایک اور ہے وہ بڑے کام کی بات ہے۔ خصوص سالکین کے لیے ہو کہ علم کی دو قسمیں ہیں۔ اور یہی دو قسمیں خشیت میں بھی جاری ہیں۔ ایک عقلی ایک حالی۔ عقلی کو کبھی اعتقادی بھی کہہ دیتے ہیں اور حالی کو طبعی بھی کہا جاتا ہے پس جہاں علم اعتقادی ہے وہاں خشیت بھی اعتقادی ہے۔ اور جہاں علم حالی ہے جس کو کہا تھا۔ ؎

علم گر بر دل زنی یارے شود

(علم اگر دل میں اثر کرے وہی معاون و مددگار ہوتا ہے) وہاں خشیت بھی حالی ہوگی۔ پس اب کوئی مادہ ایسا نہ رہا جس میں علم ہو اور خشیت نہ ہو جن کو آپ اہل علم سمجھ کر خشیت سے خالی دیکھتے ہیں وہ خشیت حالی سے خالی ہیں خشیت اعتقادی سے وہ بھی خالی نہیں۔ پس جیسا علم ان کا اعتقادی ہے ایسی ہی خشیت بھی اعتقادی ہے اور یہاں سے یہ اشکال بھی رفع ہو گیا کہ اس آیت میں خشیت کو علماء میں منحصر کیا گیا ہے۔ حالانکہ بہت سے جاہل بھی خدا سے ڈرتے ہیں۔ جواب ظاہر ہے کہ جن کو آپ جاہل سمجھتے ہیں علم اعتقادی سے وہ بھی خالی نہیں کیونکہ خدا تعالیٰ کے زبردست و قہار و منتقم ہونے کا اعتقاد ان کو بھی ہے اور یہی علم اعتقادی ہے پھر وہ علم سے خالی کہاں ہوئے۔

اب خشیت اعتقادی کے معنی بھی سمجھ لیجئے۔ خشیت اعتقادیہ کہتے ہیں احتمال مکروہ و احتمال عقاب کو۔ سو ایسا کون سا مسلمان ہے جس کو اپنے متعلق احتمال کے درجہ میں یہ خطرہ نہ ہوتا ہو کہ شاید مجھے عذاب ہو۔ سو نفس ایمان کے واسطے اتنا کافی ہے مگر کمال ایمان کے واسطے یہ خشیت کافی نہیں۔ بلکہ اس کے لیے خشیت عالی کی ضرورت ہے جس میں ہر وقت

عظمت وجلال خداوندی کا استحضار رہتا ہے جہنم کا عذاب ہر دم پیش نظر رہتا ہے۔ اور اسی درجہء کمال کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

لا یزنی الزانی حین یزنی و هو مؤمن

(الصحیح للبخاری ۳:۱۷۸، ۷:۱۳۶، ۸:۱۹۵، ۱۹۷)

(نہیں زنا کرتا زانی جب کہ وہ زنا کرتا ہے کہ مومن ہو یعنی زنا کی حالت میں ایمان نہیں رہتا یہاں محض ایمان اعتقادی مراد نہیں جس کے ساتھ اعتقادی خشیت ہوتی ہے۔ بلکہ ایمان کامل مراد ہے جس کے ساتھ خشیت حالی ہوتی ہے اب مخالفین اسلام کا یہ اعتراض بھی رفع ہو گیا کہ حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مومن زنا نہیں کر سکتا اور ہم بہت سے مسلمانوں کو زنا کار دیکھتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ اس میں مومن اعتقادی مراد نہیں بلکہ مومن حالی مراد ہے۔

غرض اس آیت میں علماء کی بھی اصلاح ہو گئی اور عوام کی بھی اصلاح ہو گئی اور میری تقریر سے سالکین کے شبہات بھی رفع ہو گئے اور مخالفین اسلام کے بھی۔ خلاصہ یہ ہے کہ دلالت حکمیہ کے اعتبار سے تو اس آیت کے معنیٰ یہ ہیں کہ علم خشیت کو مستلزم ہے اور دوسری ترکیب سے جس کو دلالت لفظیہ کہنا چاہیئے یہ معنیٰ ہوئے کہ خشیت علم کو مستلزم ہے گویا طرفین سے تلازم ہے اگر کسی میں علم ہے تو انشاء اللہ علم سے خشیت پیدا ہو جائے گی۔ اور کسی میں خشیت ہے تو وہ خشیت علم کی طرف متوجہ کر دے گی تو یہ تلازم ایسا ہو گیا جیسا ایک شاعر نے کہا ہے ؎

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف ☆ گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف

(خوش قسمتی ہے کہ اس کا دامن ہاتھ آ جائے اور پھر وہ کھینچ لے تب بھی مقصود حاصل ہے ہم کھینچ لیں تب بھی) مقصود دونوں حالتوں میں حاصل ہے۔ خدا تعالیٰ کو اختیار ہے چاہے علم کو مقدم کر دیں۔ اور خشیت کو مؤخر، چاہے برعکس۔ اور ایک حقیقت یہاں ایسی ہے کہ اس کے اعتبار سے اگر چاہیں دونوں کو ساتھ کر دیں کیونکہ دو چیزوں میں تقدم و تاخر بالذات اسی وقت ہوتا ہے جب کہ ایک علت ہو اور ایک معلول ہو۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دونوں کسی تیسری شے کے معلول ہوتے ہیں۔ اس وقت یہ دونوں چیزیں معاً موجود ہوتی ہیں۔ تقدم و تاخر باقی نہیں رہتا۔ تو یہاں بھی ایک تیسری شے ایسی ہے جو علم و خشیت دونوں کی علت بن سکتی ہے وہ کیا ہے

جذبہ حق، عنایت حق اگر جذبہ حق متوجہ ہو جائے تو اس صورت میں یہ دونوں ایک دم سے پائے جائیں گے۔ علم بھی اور خشیت بھی۔ تو اب میں ختم کرتا ہوں

خشیت کی ضرورت

صرف ایک جزو آیت کا رہ گیا ہے اس کے متعلق بھی ایک مختصر بات کہہ دوں کہ اس کے بعد حق تعالیٰ فرماتے ہیں: اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ بے شک اللہ تعالیٰ زبردست بہت بخشنے والے ہیں۔

اوپر تو علم کی فضیلت مذکور تھی کہ علماء ہی حق تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔ اب اس جملہ میں خشیت کی ضرورت بیان فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ سے ڈرنے کی بہت ضرورت کیونکہ اللہ تعالیٰ زبردست ہیں۔ یہ تو ترہیب تھی آگے ثمرہ خشیت مذکور ہے کہ وہ غفور ہیں۔ اپنے سے ڈرنے والوں کو بخش دیتے ہیں اس میں بتلا دیا کہ خشیت کی اسلیئے بھی ضرورت ہے کہ اس سے مغفرت حاصل ہوتی ہے یہ ترغیب ہے (یا یوں کہا جائے کہ عزیز میں اپنا مالک ضرر ہونا بتلایا ہے اور غفور میں مالک نفع ہونا اور ان دونوں سے خشیت کی ضرورت یوں ثابت کی ہے کہ حق تعالیٰ سے ڈرنا اسلیئے ضروری ہے کہ ضرر و نفع سب ان کے ہاتھ میں ہے کہیں وہ تم کو مضار میں مبتلا اور منافع سے محروم نہ کریں۔

اسلیئے بے فکر نہ رہو ۔ (وفیہ ترغیب وترہیب کمالا یخفیٰ ۱۲)

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم و عمل قویم فرماویں۔ آمین۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ سیدنا و مولٰنا محمد
و علی الہ و اصحابہ اجمعین
وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین.

تعلیم البیان

طریقہ تقریر کے متعلق یہ خطبہ ۱۱، رجب ۱۳۳۰ھ کو مدرسہ امداد العلوم تھانہ بھون میں کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا جو ایک گھنٹہ ۳۰ منٹ میں ختم ہوا۔ اسے مولوی سعید احمد صاحبؒ نے قلم بند فرمایا۔

آج ہم لوگوں میں جو علم موجود ہے اس کی بدولت ہم خدا تعالیٰ کے مقبول بندوں میں داخل ہو سکتے ہیں یہ نعمت بیانیہ ہی کی بدولت ہے کیونکہ اگر ہمارے حضرات سلف صالحین علوم کو مبین و مدون نہ کر جاتے تو ہم کو کچھ بھی خبر نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی طرح اگر ہم نفع متعدی کا ثواب حاصل کرنا چاہیں تو اس کی بھی یہی صورت ہے کہ ہم تحریر و تقریر میں مہارت پیدا کریں۔ اور علوم دینیہ دوسروں تک پہنچائیں۔

خطبۂ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره و نومن به و نتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادی له ونشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له ونشهد ان سيدنا ومولنا محمدا عبده ورسوله صلى الله تعالىٰ عليه وعلى اٰله واصحابه و بارك وسلم.

اما بعد فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم

اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝ (الرحمٰن ۱ تا ۴)

(ترجمہ: رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی، اس نے انسان کو پیدا کیا پھر اس کو گویائی سکھائی)

تمہید و ضرورت

یہ معلوم ہوا کہ اس وقت خاص مبارک مجلس کا افتتاح ہے جس کی غرض صرف یہ ہے کہ طلباء کو بیان کرنے کی عادت ڈالی جائے تا کہ وہ غایت علم میں قاصر نہ رہیں۔ اور ان کا پڑھا لکھا انہی تک محدود نہ رہے دوسروں کو بھی پہنچا سکیں اور اسی کے متعلق بیان کرنے کی غرض سے اس وقت یہ آیت تلاوت کی گئی ہے۔ میں نے اپنے بیان کے لیے پہلے سے یہی آیت تجویز کی تھی۔ مگر حسن اتفاق سے قاری صاحب نے بھی یہی رکوع (اول قاری محمد یامین صاحب نے تبرکاً ایک رکوع پڑھا تھا جو وہ یہی تھا۔) سنایا۔ قاری صاحب کے شروع کرتے ہی مجھے یہ خیال ہوا

کہ یہ توافق تجویزوں کا انشاء اللہ اس مجلس کے مقبول ہونے کی علامت ہے۔

حدیث شریف میں شب قدر کی بابت ارشاد ہے کہ چونکہ چند خواب متفق ہیں کہ اس عشرے میں قدر ہے اسی لیے گمان غالب اسی کے موافق ہے اس سے عرفاء نے بھی یہ استنباط کیا ہے کہ چند قلوب کے واردات مجتمع ہو جانا دلیل ظنی اس وارد کے صحیح ہونے کی ہوئی ہے۔ اور ہر چند کہ ہم کیا اور ہمارے واردات کیا لیکن چھوٹی باتوں میں چھوٹے واردات کا بھی ہم وہی اثر کہیں گے جو بڑی باتوں میں بڑے واردات کا اثر ہوتا ہے۔ تو اس وقت میرے اور قاری صاحب کے دل میں یہ آنا کہ اس آیت کی تلاوت کی جائے اور ظاہر ہے کہ ہم دونوں میں کم از کم بحمد اللہ اسلام تو ضرور ہے اور ہماری مجلس چھوٹی ہی سہی مجلس ہے، قرینہ اس کا ہے کہ یہ مجلس انشاء اللہ لا طائل نہیں ہے بلکہ امید ہے مقبول ہوگی۔ لیکن صرف اس قرینہ پر اکتفاء و اعتماد نہ کرنا چاہیے بلکہ اس کی مقبولیت کے لیے تدبیر بھی کی جائے جو کہ اتباع سنت ہے اور اس کے ساتھ دعا بھی کرنی چاہیے۔ جو کہ انشاء اللہ تعالیٰ ختم بیان پر ہوگی۔ دعا میں یہ بھی ہونا چاہیے کہ خدا تعالیٰ اس کو باثمر کریں اور اس میں سنت نبویہ کی موافقت ہو اور حدود شریعت سے تجاوز نہ ہو۔ بڑی چیز ہر امر میں دعا ہے باقی سب دل خوش کن قرائن درجہ فال میں ہیں جو کہ مبشر ہوتی ہیں۔ اور یہ سب سے ادنیٰ درجہ بشارت کا ہوتا ہے اور اس کے بعد تدبیر کا مرتبہ ہے اور سب سے اعلیٰ مرتبہ دعا کا ہے جو تدبیر کے ساتھ ہو۔ گویا ہر امر میں کامیابی کے لئے علت تامہ کا جزو اخیر دعا ہے سو دعا کو بھی جلب منفعت میں بہت بڑا دخل ہے یہ جملہ معترضہ تھا اب میں مقصود عرض کرتا ہوں۔

رحمت عظیمہ

حق سبحانہ، تعالیٰ نے ان چھوٹی سی آیتوں میں اپنے خاص افعال کا ذکر فرمایا ہے کہ جو سراسر رحمت ہے اور پھر اپنے اسم مبارک کو بھی عنوان رحمت ہی سے ذکر فرمایا ہے اور اس آیت میں تین رحمتوں کا ذکر ہے اور تینوں بڑی رحمتیں ہیں اور ہر ایک کو الرحمن ہی سے شروع کیا ہے کیونکہ الرحمن مبتدا ہے اور اس کے بعد خبر ہیں تو گویا عبارت یوں ہے۔

اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ؕ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تینوں نعمتوں کا منشاء خدا تعالیٰ کی رحمت ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی حاکم کسی سے کہے کہ مہربان حاکم نے تم کو عہدہ دیا۔ مہربان حاکم نے تمہاری ترقی کی۔ مہربان حاکم نے تم کو افسر بنایا۔ اس سے ہر اہل زبان سمجھ سکتا ہے کہ منشاء ان تمام عنایتوں کا مہربانی ہے۔ پس اسی طرح ان سب نعمتوں کا منشاء بھی خدا تعالیٰ کی رحمت ہے اور پھر رحمت بھی عظیمہ کیونکہ رحمٰن مبالغہ کا صیغہ ہے تو ترجمہ کا حاصل یہ ہوا کہ

۱: جس ذات کی بڑی رحمت ہے اس نے قرآن کی تعلیم دی۔ یہ تو پہلی نعمت کا بیان ہے۔

۲: دوسری نعمت یہ کہ اس نے انسان کو پیدا کیا۔ اور

۳: تیسری نعمت یہ کہ اس نے انسان کو بیان کرنا سکھلایا۔

ان تینوں نعمتوں میں اس وقت کی غرض کے مناسب تیسرا جملہ ہے۔ مگر چونکہ ان دو نعمتوں کی تقدیم جس طرح ذکر میں ہے اسی طرح وہ دونوں وجود میں بھی اس تیسری نعمت پر مقدم ہیں خواہ وجود حسی ہو یا وجود معنوی۔ اس لیے ان کے دو جملوں کی بھی تلاوت کی گئی۔ چنانچہ ایک مقام کا تقدم اور دخل تو ظاہر ہے یعنی خلق الانسان کہ اس کو تو تکونیاً دخل ہے اور یہ شرط تکوینی ہے کیونکہ جب تک انسان پیدا نہ ہو اس وقت تک تعلیم بیان ہو ہی نہیں سکتی۔ تو تعلیم و تعلم موقوف ہے وجود پر اور وجود موقوف ہے ایجاد پر۔

اسی طرح بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ذکر کی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ یہ سب جانتے ہیں کہ اگر پیدا نہ ہوتے تو بیان نہ کر سکتے لیکن اس کے مستقلاً ذکر کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ اس پر متنبہ فرمانا ہے کہ جو نعمت کسی دوسری نعمت کا وسیلہ ہو وہ ایک درجہ میں مستقل اور مقصود بھی ہے اس کو محض واسطہ ہی نہ سمجھا جائے یعنی بعض نعمتیں چونکہ وسیلہ ہوتی ہیں اس واسطے ان کی طرف اکثر توجہ نہیں ہوا کرتی۔ اسلیئے مستقلاً ذکر کرنے سے گویا یہ ارشاد فرما دیا کہ یہ بھی بہت بڑی نعمت ہے اور یہ بھی قابل مستقل ذکر اور توجہ ہے صرف علم البیان ہی نعمت نہیں۔ پس اگر یہ نعمت تکوین مذکور نہ ہوتی تو اس کی مقصودیت بھی نعمت ہے کیونکہ پیدا کرنا صرف واسطہ تعلیم بیان ہی نہیں بلکہ اس میں اور بھی تو مصالح ہیں۔ بہر حال اس پر توقف تکوینی ہے اور بہت ظاہر ہے۔

رہا دوسری شرط کا تقدم وہ بہت غامض ہے حتی کہ اہل علم بھی بعض اوقات اس کی طرف التفات نہیں کرے اور وہ شرط علم القرآن ہے کہ اس پر توقف اس طرف التفات نہیں

کرتے اور وہ شرط علم القرآن۔ ہے کہ اس پر توقف تشریعی ہے یعنی بیان کا وجود اگرچہ بدوں قرآن کے حساً ہو گیا لیکن وجود صحیح قابل اعتبار تعلیم قرآن کے بعد ہوگا کیونکہ اگر بیان میں تعلیمات قرآنیہ کا لحاظ نہیں تو وہ بیان اور تقریر شرعاً باطل اور کالعدم ہے۔ جیسا کہ آج کل اکثروں نے قرآن کی تعلیم کو بالکل ترک کر دیا ہے۔

عوام الناس کو تو بہت دیکھتے ہیں کہ وہ اکثر امور میں حدود شرعیہ سے متجاوز ہو گئے ہیں اور ان کی ذرا رعایت نہیں کرتے۔ مگر ہم اسی طرح طلباء کو بھی اپنے اقوال وافعال میں جادہ شریعت سے بہت زیادہ بڑھا ہوا پاتے ہیں اور قرآن کی تعلیم کو انھوں نے بھی بہت زیادہ چھوڑ دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اہل تحقیق طلباء کو ایسے جلسوں اور انجمنوں کی اجازت دیتے ہوئے کھٹکتے ہیں کیونکہ ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ جلسوں کی کارروائی میں متجاوز عن الشرح نہ ہو جائیں۔

حسن بیان

چنانچہ میں اس وقت بعض نوجوان عربی طلباء کو بھی دیکھتا ہوں کہ وہ ان مجالس میں بھی شریعت کی بہت سی باتیں چھوڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ کبھی خلاف تحقیق مضامین بیان کرتے ہیں۔ کہیں طرز بیان مقلدان یورپ کا اختیار کرتے ہیں۔

چنانچہ میں اس وقت بعض نوجوان عربی طلباء کو بھی دیکھتا ہوں کہ وہ ان مجالس میں بھی شریعت کی بہت سی باتیں چھوڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ کبھی خلاف تحقیق مضامین بیان کرتے ہیں۔ کہیں طرز بیان مقلدان یورپ کا اختیار کرتے ہیں۔

اور ستم یہ ہے کہ ان کے بزرگ واساتذہ بھی ان کو اس طرز سے نہیں روکتے۔ بلکہ ان کے سرمایۂ تقریر میں اس کو معین اور قوت پیدا کرنے والا سمجھا جاتا ہے۔

سبب اس کا یہ ہے کہ علم کی تو کمی ہو گئی ہے اس لیے تلمیع کی ضرورت پڑتی ہے۔ چونکہ کھری چیز پاس نہیں ہے اور جس کے پاس کھری چیز ہو گی اس کو تلمیع کی ضرورت کیوں ہوگی۔ پس اس کی غیر ملمع تقریر گو لفظی آب و تاب نہ رکھے مگر اس میں حسن باطنی ہوتا ہے اور ملمع تقریر میں گو آب و تاب ظاہری ہوتی ہے مگر تدبر و تفکر کے بعد وہ تمام رنگ اتر کر الفاظ ہی الفاظ رہ جاتے ہیں۔ پس تفکر و تامل سے دونوں کا امتحان ہو جاتا ہے اسی مضمون کو حافظ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

خوش بود گر محک تجربہ آید بمیاں ☆ تا سیہ رو بشود ہر کہ دروغش باشد

یعنی بہتر یہ ہے کہ مجھے اور حریف کو تجربہ کی کسوٹی پر کس لیا جائے جس میں غش ہو گا وہ سیہ رو ہو جائے گا کیونکہ اس میں اگرچہ آب وتاب ہے لیکن کسوٹی کے پاس جا کر سب مٹ جائے گی اور جو کھرا ہے وہ وہاں بھی اسی آب وتاب کے ساتھ رہے گا بلکہ اور دونی رونق بڑھ جائے گی۔ غرض جن کے پاس علمی سرمایہ ہے ان کو کسی قسم کی تلمیع کی ضرورت نہیں اور جن کے پاس یہ نہیں وہ ہر طرح تلمیع سے کام لیتے ہیں اور پھر بھی وہ حسن پیدا نہیں ہوتا اسی حسن کو حافظ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں

حسد چہ می بری اے سست نظم بر حافظ ☆ قبول خاطر و حسن سخن خداداد است

(حاسدو! حافظ کی نظم پر تم حسد کیوں کرتے ہو کلام کی اچھائی اور اس کا قبول خاطر ہونا خداداد ہے) اور

دل فریبان نباتی ہمہ زیور بستند ☆ دلربا ماست کہ با حسن خداداد آمد

(نباتات اور پودوں کی دلفریبیاں دل لبھا رہی ہیں، مگر میرا محبوب جب حسن خدا داد سے جلوہ آراء ہو تو اس کے سامنے دلفریبیاں اور جلوہ آرائیاں مات ہیں)

ہم نے حضرات اہل حق کو دیکھا ہے، کہ ان کے سادہ الفاظ میں وہ خوبی اور دلچسپی ہوتی ہے کہ بڑے بڑے استعاروں میں نہیں ہوتی۔ یہ جتنی شستہ اور چست تقریریں کہلاتی ہیں ان کی خوبی نظر اول ہی تک ہے اور جس قدر زیادہ زور کرتے جایئے ان کا پوچ اور لچرا ور محض مجموعہ الفاظ ہونا ظاہر ہوتا جاتا ہے کیونکہ وہاں سرمایہ علم نہیں ہوتا۔ برخلاف اہل علم کے ان کے سادہ الفاظ کی یہ حالت ہے کہ

یزیدک وجهه حسناً ☆ اذا مازدته نظراً

(میرے محبوب کو جس قدر زیادہ دیکھو گے اس کا حسین چہرہ خود تمہارے حسن میں اضافہ کریگا)

اثر بیان

مجھے ایک انسپکٹر ڈاک خانجات ملے۔ وہ طالب حق تھے اور طلب حق کا خاصہ ہے کہ اس میں حقیقت کا انکشاف ہو جاتا ہے۔ وہ ایک صاحب کی بابت کہ وہ اس دنیا میں جس کو آج کل اخباری دنیا کہا جاتا ہے، بہت مشہور ہیں۔ کہتے تھے کہ مجھے ان کی معیت میں رہنے کا اور تقریریں سننے کا اتفاق ہوا ہے اور میں ان کی تقریریں سن سن کر سمجھا کرتا تھا کہ ان کے برابر کوئی محقق

نہیں۔ لیکن جب سے میں نے اہل حق کی تقاریر سنیں کہ جن کو نہ لیکچر دینا آتا ہے نہ وہ بڑے بڑے الفاظ بولتے ہیں۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ اصل علم کیا چیز ہے اور کہتے تھے کہ غور کر کے اہل حق کی اور جدید طرز کے لوگوں کی تقریر میں جو فرق میں نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ جدید طرز کی تقریریں پہلی نظر میں تو نہایت وقیع اور مؤثر ہوتی ہیں اور حق انھی میں منحصر معلوم ہوتا ہے لیکن جب ان میں غور کیا جائے تو ان کی حقیقت کھلتی جاتی ہے اور کالچر اور کمزور اور خلاف واقع ہونا اور پر تلمیع ہونا معلوم ہوتا جاتا ہے اور اہل حق کی تقریر نظر اول میں بے رنگ اور پھیکی معلوم ہوتی ہے لیکن جتنا ان میں غور کیا جائے تو ان کی قوت اور مطابق واقع ہونا معلوم ہوتا جاتا ہے اور قلب پر نہایت گہرا اثر ان کا ہوتا ہے کہ اس کے سامنے تمام تلمیعات قلب سے دھل جاتی ہیں۔

طرز بیان

یہاں سے اس اعتراض کا جواب بھی نکل آیا جو آجکل کے علماء پر منجملہ دوسرے اعتراض کے وہ بھی کیا جاتا ہے کہ ان کو لیکچر دینا نہیں آتا۔ وہ جواب یہ ہے کہ جب ہمارے پاس قرآن وحدیث ہے اور اس کی تعلیمات کا سرمایہ موجود ہے تو ہم کو کسی ظاہری آب وتاب کی کیا ضرورت ہے خوب کہا ہے ؎

زعشق نا تمام ما جمال یار مستغنی ست
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

(دوست کا جمال ہمارے ناتمام عشق سے مستغنی ہے اس لئے کہ جو چہرہ فی نفسہ حسین ہو اسے خالی خواہ مخواہ زیبائش کی کیا ضرورت)

ہمیں لیکچروں کا طرز سیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں اور ہم تو صاف کہتے ہیں کہ جو شخص لیکچر کے طرز کو اختیار کرتا ہے وہ اول ہمارے دل میں ناپسندیدگی کا بیج بوتا ہے ہم کو تو وہی طرز پسند ہے جس کی طرف حدیث شریف میں اشارہ ہے کہ نحن امة امية (مسند الإمام أحمد بن حنبل ۲:۱۲۲) امیۃ کے معنی سادگی کے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل مرضی یہ ہے کہ آپ کی امت نہایت سادہ رہے۔ اسی لیے آپ نے لفظ نحن فرما کر ساری امت کو شامل فرمالیا۔ یہی روح ہے اتباع نبوی کی۔ کہ ہر بات میں بالکل سادگی ہو۔ امیۃ ام کی طرف منسوب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہماری زندگی ایسی ہے جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے بعد بچہ کی

زندگی ہوتی ہے کہ اس کی کوئی حرکت بھی تصنع اور بناوٹ کی نہیں ہوتی۔ بلکہ ہر حرکت میں بے ساختگی ہوتی ہے۔ اور بچوں کی یہی صفت ہے جس کی وجہ سے ہر شخص کو ان سے محبت ہوتی ہے۔ ورنہ طبعاً بچوں سے جو کہ نجاست کے پوٹ ہوتے ہیں بہت نفرت ہونی چاہئے تھی اور یہی باساختگی ہے ورنہ لکھنا پڑھنا جوامیت کا مشہور مفہوم ہے یہ بھی اس کا ایک شعبہ ہے تو بیان میں بھی بناوٹ اور تکلف بالکل نہ ہونا چاہیئے اور تلبیس اور تلمیع سے بالکل پاک ہونا چاہیے۔ البتہ بیان میں سادگی کے ساتھ صفائی ہونی ضروری ہے لیکن اب یہ طرز بالکل چھوٹتا جاتا ہے۔

خصوصیات زبان

ہم اہل علم کو دیکھتے ہیں کہ ان میں ایک تو رواج زبان کا طرز آتا جاتا ہے۔ حالانکہ قطع نظر شریعت کے یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ ہماری مادری زبان اردو ہے اور اس کی کچھ خصوصیات ہیں جیسا کہ ہر زبان کے لیے کچھ خصوصیات ہوا کرتی ہیں۔ اب اس طرز جدید کو اختیار کر کے انگریزی کی خصوصیات کو زبان اردو میں لیا گیا ہے اور وہ روز بروز زیادتی کے ساتھ آتی جاتی ہیں۔ حالانکہ انگریزی کی خصوصیات اس میں بالکل نہیں کھپتیں۔ ان کی بدولت زبان بالکل بھدی اور خراب ہوتی جاتی ہے۔ ایسے لوگوں میں اس وقت ایک بڑی جماعت اپنے کو اردو کا حامی کہتی ہے۔

حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ لوگ اردو کے ماحی ہیں کیونکہ ہر زبان میں ایک مادہ ہوتا ہے اور ایک ہیئت۔ اور زبان دونوں کے مجموعے کا نام ہوتا ہے نہ کہ صرف مادہ کا۔ تو جب زبان اردو کی ہیئت باقی نہ رہے گی تو وہ زبان اردو کیوں کر رہے گی۔

پس اگر ہم اردو کے حامی ہیں تو ہم کو چاہیئے کہ ہم اس کی خصوصیات کو باقی رکھیں اور ہماری گفتگو ایسی ہو کہ اگر کوئی اجنبی سنے تو یہ سمجھے کہ ہم ایک حرف بھی انگریزی کا نہیں جانتے اور نہ انگریزی طرز سے ہم کو مناسبت ہے اور اس سے بھی بڑا تعجب یہ ہے کہ اس وقت عربی خواں طلباء کی تقریروں میں کثرت سے انگریزی الفاظ آنے لگے ہیں۔ حالانکہ ان کی تقریر میں اگر دوسری زبان کے الفاظ آتے تو عربی کے الفاظ آتے کیونکہ اول تو یہ لوگ عربی زبان کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ دوسرے عربی ہماری مذہبی زبان ہے اور اس اعتبار سے ان کی اصلی زبان وہی ہے اور اردو زبان تو بہت تھوڑے دنوں سے ہماری زبان ہوئی ہے ورنہ

www.alhaqq.org

ہماری اصلی اور پدری زبان عربی ہی ہے کیونکہ ہمارے آباؤ اجداد عرب ہی سے آئے ہیں اور ہندوستان میں بود و باش اختیار کر لی ہے۔

مجھے اکثر اس کا افسوس ہوا کرتا ہے کہ ہمارے بزرگوں نے اپنے نسب نامہ تک کو محفوظ رکھا لیکن زبان کی حفاظت نہ کی۔ حالانکہ ان حضرات کیلیئے یہ کوئی مشکل بات نہ تھی۔ صحابہ کرامؓ نے جہاں فتوحات حاصل کی ہیں اکثر جگہ ملک بھر نے ان کی زبان اختیار کر لی ہے اور آج تک وہی زبان چلی جاتی ہے حالانکہ صحابہؓ نے اس کا کوئی اہتمام بھی نہ کیا ہوگا۔ مثلاً مصر ہی کو دیکھا جائے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی بدولت تمام مصر کی زبان عربی ہے۔ اگرچہ تمام مصر کا مذہب اسلام نہیں۔

خیر اگر صحابہؓ کی سی برکت غیر صحابہؓ میں نہیں تھی اور اسلیئے تمام مفتوح قوم نے ان کی زبان نہیں لی مگر کم از کم یہ اپنی تو زبان سنبھالتے لیکن تعجب ہے کہ ہندوستان میں آ کر ہمارے ان بزرگوں نے اپنی زبان کو رواج دینا تو کجا سنبھالا بھی نہیں۔

آمیزش وتشابہ

غور کرنے سے اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ہمارے بزرگ اکثر جریدہ تشریف لائے ہیں اور یہیں بود و باش اختیار کر کے یہیں کی نو مسلم عورتوں سے نکاح کیئے ہیں اس لیئے اولاد پر زیادہ اثر ماں ہی کی زبان کا پڑا اور اسی سے یہ نئی زبان پیدا ہو گئی۔

یہی مادری اثر ہے کہ جس کی وجہ سے مسلمانوں میں آج تک تیجے وغیرہ کی رسمیں باقی ہیں یعنی چونکہ ہندی عورتوں میں اپنے آباؤ کی رسوم باقی تھیں اس لیے جب وہ ایام آئے ہوں گے تو انہوں نے کہا ہوگا کہ ہم ایسے موقع پر یوں کیا کرتے تھے۔ ان حضرات نے بظاہر کوئی خرابی دیکھ کر محض دلجوئی کے لئے تھوڑا سا تغیر کر کے مثلاً بجائے اشلوک کے سورہ فاتحہ کا پڑھنا و مثل ذالک اجازت دیدی ہوگی لیکن اس وقت یہ محض عارضی طور پر تھا۔ اب لوگ اس کو فرض عین سمجھنے لگے اور اس کے لیے علماء نے منع کیا تو ان کو وہابی اور کیا کیا کہنے لگے۔

غرض اسی عارضی مادری اثر کی بدولت ہندوستان میں عربی بھی نہ چل سکی۔ کیونکہ ابا جان تو عربی بولتے ہوں گے اور اماں جان ہندی اور بچہ زیادہ تر ماں ہی کے پاس رہتا ہے اس لیے کچھ عربی اور کچھ ہندی مل کر ایک مجموعہ ہو گیا اور اگر گھر میں عربی اور باہر آ کر

لوگوں سے ہندی سنتے تو دونوں زبانیں باقی رہتیں چنانچہ ہم بنگالیوں اور انگریزوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی زبان بھی بولتے ہیں اور اردو بھی بولتے ہیں۔

وجہ یہی ہے کہ ان کے گھروں میں وہی بنگلہ اور انگریزی بولی جاتی ہے۔ ہمارے بزرگوں نے چونکہ اس کا اہتمام نہیں کیا یا ہو نہ سکا۔ اسلیئے ہماری زبان مرکب ہوگئی مرکب ہونے پر یاد آیا۔ مولانا محمد یعقوب صاحب فرماتے تھے کہ میں نے مکہ معظّمہ میں ایک ہندی عربی مرکب بچے کو دیکھا کہ رو رہا تھا کہ انا بازار جاؤں۔ غرض ماں کی ہندیت نے زبان کی عربیت کو ضائع کیا اور اصلی زبان برباد ہوئی۔

اگر کوئی کہے کہ ہم تو مادری زبان کو اصل سمجھتے ہیں تو میں کہوں گا کہ جب نسب باپ سے ہے تو کیوں باپ کی زبان کو اپنی اصلی زبان نہ کہا جائے۔

غرض جب ہماری اصلی زبان عربی ہے تو اگر ہم کو اردو میں آمیزش ہی کرنا تھا تو اس بناء پر زیادہ سے زیادہ ہم یہ کرتے کہ اردو زبان کو عربی کے تابع کر دیتے مگر تعجب یہ ہے کہ ہم نے انگریزی کے تابع کیا کہ جس کی بدولت اردو زبان قریب قریب اردو ہونے ہی سے نکل گئی۔ اصل اردو زبان وہ ہے جیسے چہار درویش یا اردوئ معلّیٰ غالب کی۔ اور اگر اس میں آمیزش ہو تو عربی کی آمیزش ہونا چاہیئے کہ عربی کی آمیزش لطف کو دوبالا کر دیتی ہے۔ دیکھو فارسی کی عبارت میں اگر کہیں ایک جملہ عربی کا آجاتا ہے تو یوں معلوم ہوتا جیسے گل فشانی ہوگئی ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہماری زبان میں جو انگریزی کے خلط سے ایک جدت پیدا ہوگئی ہے وہ ضرور قابل ترک ہے اور اس جدید طرز میں علاوہ نقص مذکور کے ایک بڑا عیب یہ بھی ہے کہ تلبیس زیادہ ہو سکتی ہے اور پرانے طرز میں یہ بات نہیں ہے اور ایک شرعی پہلو اس میں یہ بھی ہے کہ اس کو اختیار کرنا ایک فاسق قوم کے مشابہ ہونا ہے اور یہ مشابہت خود حرام ہے حدیث شریف میں ہے۔

من تشبہ بقوم فھو منھم (جس نے بھی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ انہی میں سے ہے)(سنن أبی داؤد: ۴۰۳۱)

کیونکہ تشبیہ عام ہے لباس اور طرز سب چیزوں کو۔ اور گو ممکن ہے کہ اس پر کوئی شخص مولویوں کو متعصب کہے لیکن، ہم کو اس کی اصلاً پرواہ نہیں کیونکہ ہم ایک موقع پر ان کے مسلم دلائل سے اس کا برا ہونا (اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر کوئی مرد زنانہ جوڑا پہن کر مردانے میں آبیٹھے اس کو معیوب کیوں

سمجھا جاتا ہے۔ اس نے بجز تشبہ کے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہے ۱۲ منہ) ثابت کر چکے ہیں۔

باقی حدیث تو اپنے ماننے والوں کے لیے پڑھی ہے اب میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ حدیث آپ پر بھی حجت ہے کیونکہ مسلمان تو آپ بھی ہیں۔ غرض اس وقت تقریرات میں یہ تمام خرابیاں پیدا کی گئی ہیں جن سے بسبب قواعد شرعیہ کے چھوڑ دینے کے ان تقریروں کا وجود کالعدم سمجھا جائے گا۔ پس ثابت ہو گیا کہ جس طرح بیان کا وجود حسی موقوف ہے خلق انسان پر اسی طرح اس کا وجود شرعی موقوف ہے تعلیم قرآن پر۔ اور یہی حاصل ہے ان آیات کا جن کی اس وقت تلاوت کی گئی۔ اور چونکہ تقاریر میں آج کل یہ نقص عام طور سے پیدا ہو گیا ہے اسلیئے یہ جی بھی چاہتا ہے کہ طریقہ بیان کے متعلق ایسی آیت اختیار کی جائے کہ قرآن ہی سے اس کی خرابیوں کا ناجائز ہونا بھی ثابت ہو جائے۔ سو بحمد اللہ یہ آیت ملی کہ اس میں تعلیم بیان کی شرط شرعی بھی مذکور ہے کہ قرآن سکھلایا کیونکہ غایت اس کی عمل ہے اور بیان میں اگر حدود شرعی کا لحاظ نہ رہا تو قرآن پر عمل نہ رہا۔ تو قرآن پر عمل نہ ہوا۔ کیونکہ عمل بالقرآن مثل متن کے ہے اور سب علوم شرعیہ اسی کی شرح ہیں اور اسی کی مدلول ہیں۔ کوئی عبارت النص سے کوئی اشارہ یا اقتضاء سے کوئی جزئیاً کوئی کلیاً۔

www.chiehaq.org

چنانچہ حضرت ابن مسعودؓ کے پاس ایک عورت آئی اور کہنے لگی کہ میں نے سنا ہے کہ آپ بال نوچنے (یعنی جو حسن کے لیے پیشانی وغیرہ کے بال نوچ دے تا کہ پیشانی فراخ معلوم ہو ۱۲ منہ) والی وغیرھا کو لعنت کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ جس کو قرآن لعنت کرے میں اسکو کیوں لعنت نہ کروں۔ کہنے لگی میں نے تو تمام قرآن پڑھا۔ اس میں تو یہ نہیں ہے آپ نے فرمایا **لو قراء تیه لو جد تیه** یعنی اگر خیال کر کے پڑھتی تو اس میں ملتا کیونکہ ان افعال کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اور قرآن میں ارشاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو جو حکم دیں اس کو قبول کرو۔ پس اس طرح یہ احکام بھی مدلول قرآن ہو گئے۔

تو دیکھئے حضرت ابن مسعودؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو بھی قرآن ہی میں داخل فرماتے ہیں اور خود قرآن میں بھی ہے۔

فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۝

(ترجمہ: جب ہم پڑھائیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پیچھے پیچھے پڑھتے رہیے اسکے بعد

اسکے بیان کرلینے کی ذمہ داری تو ہمارے اوپر ہے)

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قرآن کے اجمال کو بیان فرمایا اور اگر کہیں حدیث میں بھی خفا رہا تو اس کو حضرت مجتہدین نے ظاہر فرمادیا حتی کہ اکملت لکم دینکم پوری طرح ظاہر ہوگیا اور اس ظہور اکمال کے بعد پھر چونکہ کوئی حاجت باقی نہیں رہی بحکمت الٰہیہ چوتھی صدی کے بعد قوت اجتہادیہ کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ کیونکہ اب اس کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی تھی۔

عجائبات قدرت

خدا تعالیٰ کی عجیب قدرت ہے کہ جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے اس کو پیدا کر دیتے ہیں اور ضرورت پیدا ہوچکتی ہے وہ سلسلہ ختم ہوجاتا ہے چنانچہ حضرت آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا جب وہ پیدا ہوچکے تو ان کی پسلی سے حضرت حوا کو پیدا کیا جب ایک مرد و عورت ہو گئے تو وہ طریقہ بند کردیا گیا اور زن و شو کے تعلق سے سب لوگ پیدا ہونے لگے۔ رہا عیسیٰ علیہ السلام کا پیدا ہونا وہ خرق عادت کے طور پر ہے علیٰ ہذا۔ اور امور میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔

چنانچہ میں نے اخبار میں ایک ڈاکٹر کا قول دیکھا ہے وہ لکھتا ہے کہ بارش اس لیے کم ہوتی ہے کہ درخت کٹ کٹ کر کم رہ گئے ہیں تو بارش کثرت سے ہونے کی صورت یہ ہے کہ جہاں جہاں درخت کم ہیں بہت کثرت سے درخت لگائے جائیں۔ اس ڈاکٹر نے تو خدا جانے اس کی وجہ کیا سمجھی ہوگی لیکن راز اس میں یہی ہے کہ جب درخت نہ رہے تو بارش کی زیادہ ضرورت نہ رہی۔ اور جہاں درخت بکثرت ہیں وہاں بارش کی بھی ضرورت زیادہ ہوتی ہے۔

رہی زراعت کی ضرورت۔ اس کا کام نہروں سے نکالنے لگے ہیں تو بارش سے اس کا بھی کم تعلق ہوگیا۔ غرض فلسفہ بھی اس کو مانتا ہے اور ہم تو مانتے ہی ہیں۔ وَاٰتٰکُمۡ مِّنۡ کُلِّ مَا سَاَلۡتُمُوۡہُ (جو کچھ تم نے مانگا ہم نے دیا۔

بھی اسی طرف مشیر ہے تو اسی طرح جب تک حضرات مجتہدین کی ضرورت تھی اجتہادی قوت پیدا ہوتی رہی اور جب یہ ضرورت پوری ہوچکی یہ قوت بھی ختم ہوگئی۔

قوت حافظہ

علیٰ ہذا قوت حافظہ کی جس زمانے تک ضرورت تھی اس وقت تک علیٰ وجہ الکمال یہ قوت

عطا ہوتی تھی۔ حتی کہ حضرت ابن عباسؓ کو سو شعر کا قصیدہ ایک دفعہ سن کر یاد ہو جاتا تھا۔

حضرت امام ترمذی علیہ الرحمۃ جب نابینا ہو گئے ہوا ایک مرتبہ آپ کو سفر کا اتفاق ہوا۔ راستہ میں ایک مقام پر پہنچ کر آپ نے اونٹ پر بیٹھے بیٹھے سر جھکا لیا۔ جمال نے اس کا سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ یہاں ایک درخت ہے اس میں ٹکر لگتی ہے جمال نے کہا کہ یہاں تو کوئی درخت نہیں ہے آپ نے اونٹ کو وہیں رکوا دیا اور فرمایا کہ اگر میرا حافظہ اس قدر کمزور ہو گیا ہے تو میں آج سے حدیث بیان کرنا چھوڑ دوں گا۔ اور قریب کے گاؤں میں اول بھیج کر دریافت کیا اکثر لوگوں نے وہاں درخت ہونے سے انکار کیا لیکن گاؤں کے بعض بوڑھوں نے کہا کہ مدت گذری جب یہاں ایک درخت تھا اور تقریباً بارہ برس ہوئے کہ اس کو کاٹ دیا گیا ہے جب اس کی تصدیق ہو گئی تو آپ آگے بڑھے۔

اسی طرح ابوداؤد میں قصہ ہے۔ ایک راوی بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک اعرابی سے ایک حدیث سنی تھی۔ مدت کے بعد مجھے خیال ہوا کہ اس کے حافظے کا امتحان کرنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ اس نے غلط حدیث مجھ سے بیان کر دی ہو چنانچہ یہ راوی اس کے پاس پہنچے اور جا کر وہ حدیث پوچھی اس نے وہ حدیث بتلائی اور کہا کہ تم میرا امتحان کرتے ہو میرا حافظہ اس قدر قوی ہے کہ میں نے ستر حج کیئے ہیں اور ہر سال نئے اونٹ پر حج کیا اور مجھ کو یاد ہے کہ فلاں سال فلاں اونٹ پر حج کیا تھا۔

امام بخاریؒ کسی مقام پر تشریف لے گئے وہاں کے عالموں نے آپ کا امتحان کرنا چاہا اور سو حدیثیں الٹ پلٹ کر کے آپ کے سامنے پڑھیں۔ آپ ہر حدیث پر لا اعرف فرماتے رہے جب وہ لوگ ختم کر چکے تو آپ نے ان سب احادیث کو جو انہوں نے سنائی تھیں اسی طرح نقل فرمایا اور ساتھ ساتھ تصحیح کرتے گئے کہ **اما الحدیث الاول فھو کذا و اما الثاني فھو کذا**۔

مگر جب حدیثیں مدون ہو گئیں اور ضرورت اس قدر حافظہ کی نہ رہی تو قوت حافظہ کم ہونا شروع ہو گئی۔ غرض انقطاع اجتہاد بعد ظہور اکمال دین کے ہوا ہے۔

قوت بیانیہ

اجتہاد سے اکمال کے ظہور کا یہی حاصل ہے کہ ان کا قیاس بھی مثل حدیث مبین قرآن و نیز مبین حدیث ہے پس مجتہدین کے قیاسیات یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات یہ

سب علوم قرآنیہ ہیں لہذا علم القرآن سے علم الشریعہ مراد ہوگا اور قرآن کا ترک شریعت کا ترک ہوگا۔ اس پر استدلال کرنے کے لیے بھی زیادہ صاف ایک واقعہ یاد آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقدمہ کے متعلق فرمایا تھا کہ اقضی بینکما بکتٰب اللہ (فتح الباری لابن حجر ۸:۱۶۷) اور پھر وہ ہوگا جو کہ شریعت کے موافق ہو اور بیان میں تقریر اور تحریر دونوں داخل ہیں۔ چنانچہ اسی تعلق کے اعتبار سے قرآن شریف میں ایک مقام پر ارشاد ہے: عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (ترجمہ: اس (اللہ) نے قلم سے تعلیم دی اور انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ نہ جانتا تھا)

یعنی کبھی تو بالبنان ہوتا ہے اور کبھی باللسان یہ دونوں قسمیں بیان کی ہیں اس بیان کا نعمت ہونا منافع دنیوی کے اعتبار سے بھی ہے لیکن اس وقت ان کا ذکر نہیں اس وقت خاص منافع دین کا ذکر ہے جن کے اعتبار سے یہ بیان ایک بڑی نعمت دینیہ بھی ہے اور وہ یہ ہیں کہ آج ہم لوگوں میں جو علم موجود ہے اس کی بدولت ہم خدا تعالیٰ کے مقبول بندوں میں داخل ہو سکتے ہیں۔ یہ نعمت بیانیہ ہی کی بدولت ہے کیونکہ اگر ہمارے حضرات سلف صالحین علوم کو مبین نہ کر جاتے تو ہم کو کچھ خبر بھی نہیں ہو سکتی تھی۔

اسی طرح اگر ہم متعدی کا ثواب حاصل کرنا چاہیں تو اس کی بھی یہی صورت ہے کہ ہم تحریر و تقریر میں پوری مہارت پیدا کریں اور علوم دینیہ دوسروں کو پہنچائیں ہم نے بعضے ایسے اہل علم بھی دیکھے ہیں کہ جن کو تحریر و تقریر نہیں آتی۔ سو ان سے بہت کم لوگوں کو نفع پہنچ سکتا ہے اور پھر بہ نسبت تحریر کے تقریر میں مہارت پیدا کرنے کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ تحریر سے نفع خاص ہوتا ہے یعنی صرف طلباء اور خواندہ لوگوں کو اور تقریر میں نفع عام ہے جن میں خاص بھی داخل ہیں۔ تو نفع عام و خواص کے اعتبار سے زبان بیان کی دو صورتیں ہیں۔ ایک درس جس کا نفع خاص طلباء کو ہے اور ایک وعظ جس کا نفع عوام کو ہے۔

طریق بیان

ان دونوں کا افادہ اس پر موقوف ہے کہ قوت بیانیہ بقدر ضرورت حاصل ہو۔ پس ہمارے طلباء کو اس وقت ان دونوں کی تکمیل اور مشق کی ضرورت ہوئی یعنی جب وعظ کہا جائے تو اس طرح کہا جائے۔

که عوام الناس پوری طرح سمجھ جائیں اور جب درس دیا جائے تو اس طرح که طلباء مخاطبین اس کو خوب سمجھ لیں۔

پھر درسیات میں دو قسم کی کتابیں ہیں ایک تو محض آلیات اور دوسری مقاصد۔ آلیات کا خطاب تو بالکل ہی خاص ہوتا ہے کیونکہ اس کو محض طلباء ہی پڑھتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ اور مقاصد کا خطاب عام بھی ہوتا ہے اور خاص بھی۔ یعنی قرآن و حدیث طلباء کے سامنے بھی پیش کیا جاتا ہے۔ اور عوام الناس کے سامنے بھی۔ پس مشق میں بھی اس کی رعایت کی جائے۔ یعنی جو لوگ صرف آلیات میں مشغول ہیں۔ ان سے تو جلسہٴ مشق میں صرف اس قسم کی تقریر کرائی جائے که وہ اول کتاب کی عبارت پڑھیں اور پھر اس کے مضامین کو حل کر دیں اس سے زیادہ توسیع نہ کریں۔ (کیونکہ ایسے مبتدیوں کو کوئی خاص مضمون دینے میں جس کو وہ بطور وعظ کے بیان کریں۔ چند خرابیاں ہیں۔ اول تو وہ ان مضامین کو بوجہ قلت معلومات صحیح بیان نہیں کر سکتے۔

سو اگر اصلاح کی جائے کہاں تک کی جائے۔ اگر نہ کی جائے تو وہ بھی جہل میں مبتلا رہیں گے اور سامعین بھی غلطی میں پڑیں گے دوسرے وہ اپنے اسباق کا چھوڑ کر شب و روز ان ہی مضامین کے جمع کرنے کی فکر میں رہیں گے تیسرے اگر ان کی کتابیں رہ گئیں تو مشاق ہونے کے سبب وہ وعظ کا پیشہ اختیار کریں گے اور جاہل واعظ ہو کر خلق کو خراب کریں گے اور جس طرح ایسے مبتدیوں کو تقریر میں توسیع مضر ہے اسی طرح تحریر میں بھی۔ جیسے اس وقت اس کی بھی عادت ہوگئی ہے کہ ایسے لوگ بھی اخباروں میں مضمون بھیجتے ہیں۔ ۱۲ منہ) اس میں علاوہ صفائی تقریر کے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ان کو پڑھانے کا طریقہ معلوم ہوگا۔ ہمارے بزرگوں کا طریقہ پڑھانے کا یہی تھا کہ وہ حضرات محض کتابوں کو حل فرما دیتے تھے اور زائد کچھ نہ بتلاتے تھے ہاں اگر کوئی بہت ہی ضروری بات ہوتی تو اس کو فرما دیتے تھے۔

پڑھانے میں ایک اس امر کی بھی رعایت ضروری ہے کہ جو بات معلوم نہ ہو تو اس کو صاف کہہ دے۔ یہ طریقہ حضرت مولانا مملوک علی صاحبؒ سے موروث چلا آتا ہے اس طریق میں یہ نفع ہے کہ طالب علم کو مدرس پر ہمیشہ وثوق رہتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ مجھے جو کچھ بتلایا جا رہا ہے سب صحیح ہے اور جہاں اس طریقے پر عمل نہیں کیا جاتا۔ بلکہ بات کو بنایا جاتا ہے اور اکثر طالب علم ان کی ہٹ دھرمی کو سمجھ جاتا ہے تو وہاں مصیبت ہوتی ہے جھک جھک

میں سبق بھی خراب ہوتا ہے اور یہی بد خلقی طالب بھی سیکھتا ہے۔ بعضے لوگ کہتے ہیں کہ اس اقرار غلطی سے طالب علم بگڑ جاتا ہے حالانکہ محض لغویات ہے وہ اور زیادہ سنور جاتا ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ اس کو مدرس پر وثوق ہو جاتا ہے۔

غرض یہ ہے طرز درس، تو تقریر کے وقت بھی اس کا خیال رکھیں اور تحقیقات وزیادات کو بالکل حذف کریں کیونکہ یہ تقریریں صرف پڑھائی کا طریقہ بتلانے کے لیے کرائی جائیں گی۔ طبیعت کی جولانیاں دکھلانے کے لیے نہیں اور جو درس کے وقت ایسی فضولیات بیان کی جاتی ہیں وہ اس لیے بھی مفید نہیں کہ کسی کو بھی یاد نہیں رہتی اور اضاعت وقت کا ضرر جدا۔

جیسے مولوی محمد صدیق صاحب مرحوم گنگوہی کہتے تھے کہ میں دہلی میں مدرس ہو کر گیا تو ولایتی طالب علم میرے سپرد ہوئے اور سلم شروع ہوئی میں نے ان سے پوچھا کہ تم لوگ تحقیق سے پڑھو گے یا سیدھا سادہ۔ کہنے لگے کہ ہم تو تحقیق سے پڑھیں گے۔ میں نے رات کو بہت سے حواشی اور شروح دیکھ کر صبح کو نہایت تحقیق سے پڑھایا۔ جب دوسرا دن ہوا اور پھر میں نے یہی سوال کیا تو طلباء نے پھر یہی کہا کہ ہم تو تحقیق سے پڑھیں گے میں نے کہا کہ اگر تحقیق سے پڑھو گے تو کل جو کچھ میں نے تم کو بتلایا تھا۔ اس کا اعادہ کر دو تا کہ مجھے اندازہ ہو کہ تم میں قابلیت تحقیق سے پڑھنے کی ہے یا نہیں۔

یہ سن کر سب کے سب میرا منہ تکنے لگے اور ایک سے بھی اعادہ نہ ہو سکا اس وقت میں نے کہا کہ سنو! تم نے باوجودیکہ یہ تقریریں سنیں اور بیان نہ ہو سکا اور میں نے باوجودیکہ استاد نے اس مقام پر مجھ کو درس کے وقت یہ تقریریں نہیں بتلائیں اور میں نے بیان کر دیں آخر اس کا کیا سبب ہے معلوم ہوا کہ استعداد کی ضرورت ہے جو کتاب سے پیدا ہوتی ہے۔ ان تقریروں سے کچھ نہیں ہوتا۔ سو کتاب پڑھو۔ تب وہ سمجھے۔

اور حل کتاب پر کفایت کی غرض یہ ہے مدرس کے لیے لکچر کا طرز بہت مضر ہے۔ میں نے ایک مولوی صاحب کو دیکھا کہ وہ ایک مبتدی کو میزان پڑھا رہے تھے اور اس کے خطبے میں الف لام تعریف کی قسمیں بیان کر رہے تھے میں نے کہا کہ مولوی صاحب اس غریب کا کیوں راہ مار رہے ہو۔ یہ ان سب مضامین کو جز میزان سمجھے گا اور مشکل سمجھ کر میزان ہی کو چھوڑ دے گا۔ میں نے اپنے پڑھانے کا طرز ہمیشہ یہی رکھا کہ نفس کتاب کو حل کر دیا اور

زوائد کبھی بیان نہیں کیے اور حل بھی اس طرز سے کہ بڑے بڑے مشکل مقامات بھی کبھی طالب علموں کو مشکل نہیں معلوم ہوئے۔

صدرا مین مثناۃ بالتکریر کی بحث ایک مشہور بحث ہے۔ کانپور میں ایک مولوی فضل حق طالب علم مجھ سے صدرا پڑھتے تھے جس دن یہ مقام آیا ہے تو میں نے بلا اہتمام معمولی طور سے اس کی تقریر کر دی۔ جب انھوں نے اس کو اچھی طرح سمجھ لیا تو میں نے یہ کہا کہ یہ وہی مقام ہے جو مثناۃ بالتکریر کے لقب سے مشہور ہے۔ ان کو بڑا تعجب ہوا اور کہنے لگے کہ یہ تو کچھ بھی مشکل نہیں۔ آخر سالانہ امتحان میں ممتحن نے یہی مقام سوال میں دیا۔ مولوی فضل حق مرحوم نے اس مقام کی جو تقریر لکھی تھی (کہ وہ اب تک مدرسہ جامع العلوم میں محفوظ ہے) ممتحنین بھی اس پر عش عش کرتے تھے۔ بعض نے یہ کہا کہ ہم نے اس مقام کی تقریر ایسی کبھی نہیں دیکھی۔

تو بڑی کوشش اس کی ہونی چاہیے کہ کتاب کو پانی کر دے نہ یہ کہ اپنی فضیلت کا اظہار کر دے۔ یہ تو تقریر آلیات کا طرز ہے۔

اب رہے مقاصد یعنی علوم دینیہ۔ سو ان کو چونکہ کبھی عوام کے سامنے بیان کرنے کی نوبت آتی ہے اور کبھی خواص کو خطاب ہوتا ہے اسلیئے اس کے متعلق دونوں طرز کی مشق ہونی چاہیے اور اس کی دو صورتیں ہیں یا تو ہر جلسے میں نصف وقت طرز خاص اور نصف وقت طرز عام کے لیے رکھا جائے یا یہ کیا جائے کہ ایک باری میں طرز خاص کے موافق تقریر ہو اور دوسری باری میں طرز عام کے موافق تقریر ہو۔

اب الحمد اللہ سب ضروری باتیں اس کے متعلق ہو گئیں صرف یہ بات رہی کہ اس جلسے کا نام کیا رکھا جائے۔ سو میرے خیال میں تعلیم البیان اس کا نام بہتر ہے۔

نیا خبط

آج کل لوگوں کو ایک یہ خبط بھی بہت بڑھا ہوا ہے کہ جب کوئی کام شروع کریں تو اس کے لیئے نام بھی کوئی نیا اور نرالا تجویز کریں۔ اسی خبط کی بدولت ندوہ کو ایک بڑی لغزش ہوئی یعنی نیا نام تلاش کرنے کی وجہ سے علماء کی مجلس کا نام ندوہ تجویز کیا گیا جو کہ راس الجہال عدو اللہ ابو جہل کی اس مجلس کا نام تھا جس کی بنیاد محض اسلیئے قائم ہوئی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرر رسانی اور آپ کے دین کی اشاعت روکنے کی تدابیر پر غور کیا جائے اور عجب

نہیں کہ اسی نام کا اثر ہو کہ آج یہ پاکیزہ نورندوے (مگر ندوہ نے جو اکابر پیدا کیئے انہوں نے اس خدشہ کا ازالہ کر دیا ۱۲) میں برس رہا ہے۔

اب بہتر معلوم ہوتا ہے کہ غرض بیان کے متعلق ایک حدیث بھی بیان کر دی جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

من تعلم صرف الکلام لیبی بہ قلوب الناس لم یقبل اللہ منہ صرفاً ولاعدلاً. (سنن ابی داؤد ، الأدب ب: ۹۳)

دیکھیے اس وقت نہ کوئی اس قسم کی انجمن تھی نہ مجالس کا یہ طرز تھا۔ لیکن حضورؐ نے اس کا انتظام بھی اسی وقت فرمادیا کہ جو شخص کلام ہیر پھیر اسلیئے سیکھے کہ اس کے ذریعے سے لوگوں کے قلوب مسخر کرے گا تو خدا تعالیٰ اس سے کسی نفل اور فرض کو قبول نہ فرمائیں گے یہ حدیث فساد غرض پر تنبہ کے لیے بہت کافی ہے اور اس علم البیان پر علم القرآن کو مقدم کرنے کی غرض اور زیادہ وضاحت سے ہوگئی جس کا اوپر بھی بیان ہوا ہے۔

میں ان طالب علموں کو چونکانا چاہتا ہوں جو آج کل طرز جدید کو تقریر میں اختیار کرتے ہیں جس کی غرض زیادہ تر یہی ہے کہ جاہ اور وقعت اور قبول عام ہو۔ اسی لیئے یہ کوشش ہوتی ہے کہ الفاظ پر شوکت ہوں۔ بندشیں چست ہوں۔ حالانکہ اس سے خاک بھی نہیں ہوتا۔

اس قسم کی تقریروں کی ہستی صرف اتنی ہوتی ہے کہ جیسے مشہور ہے کہ ایک منہار چوڑی کی پوٹ لیے جاتا تھا۔ ایک گنوار نے اس میں لاٹھی مار کر کہا کہ اس میں کیا ہے کہنے لگا کہ ایک اور ماردو تو کچھ بھی نہیں۔

برخلاف پرانی تقریروں کے کہ اگر ان پر پچاس چوٹیں بھی ماریں تو وہ اپنی اسی حالت پر قائم ہیں۔ ان کی قوت میں ذرا بھی تزلزل نہیں آتا۔ بلکہ حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بہت بے باکی اور آزادی سے تقریر کرنا بھی مذموم ہے چنانچہ حدیث میں ہے۔

الحیآء والعی شعبتان من الایمان والبذاء والبیان شعبتان من النفاق. (سنن الترمذی: ۲۰۲۷)

اس حدیث میں حضورؐ نے حیاء کے مقابلے میں اور عی کو بیان کے مقابلے میں فرمایا ہے اور حیاء اور عی کو ایک ساتھ جمع کر کے ایمان کے شعبوں میں سے قرار دیا ہے اور بذاء اور بیان کو

نفاق کے شعبے قرار دیئے ہیں۔ اس قرینے سے معلوم ہوا کہ عی سے وہ عی مراد ہے جو کہ حیا کی وجہ سے ہو۔ اور حیاء فی نفسہ عام ہے خواہ حیا من الخلق خواہ من الخالق۔ مگر اس مقام پر مقصود حیا من اللہ ہے یعنی ہر لفظ پر یہ سوچ کہ کہیں شریعت کے خلاف کوئی بات نہ نکل جائے۔

اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو بیان حدود شرعیہ سے متجاوز ہو وہ علم البیان میں داخل نہیں۔ کیونکہ وہ بیان جس کا آیت میں ذکر ہے نعمت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے اور حدیث میں ایسے بیان کو جس کا منشاء بذاء ہوتا ہے نفاق میں داخل فرمایا ہے اور قرآن و حدیث میں تعارض ہو نہیں سکتا۔

پس معلوم ہوا کہ جو بیان مذموم ہے وہ نعمت نہیں۔ لہٰذا ایسے بیان سے بچنے کی کوشش نہایت ضروری ہے۔

اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ ہر امر میں اتباع کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یارب العالمین۔

فضل العلم والعمل

علم وعمل کے درجات کے متعلق یہ وعظ ۲۶، رجب ۱۳۳۰ھ کو دارالطلباء مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں قریباً ایک ہزار کے مجمع میں کھڑے ہو کر بیان فرمایا جو پونے تین گھنٹہ میں ختم ہوا اسے مولانا سعید احمد صاحب تھانویؒ نے قلم بند فرمایا۔

نافرمانی کے ساتھ راحت اور عزت نہیں۔ اور اطاعت کے ساتھ تکلیف اور ذلت نہیں۔ پس اگر ہم عزت کے خواہاں ہیں تو اطاعت خداوندی کو اختیار کریں۔ ہم نے جب سے اس کو چھوڑ دیا ہے ہماری عزت وراحت بھی جاتی رہی ہے۔

خطبۂ ماثورہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له ونشهد ان سيدنا ومولانا محمدا عبده ورسوله صلى الله عليه وعلى اله واصحابه وبارك وسلم. اما بعد فقد قال الله تبارك وتعالى

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا
فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا
يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ وَاللّٰهُ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (المجادلہ:١٠)

(ترجمہ: اے ایمان والو جب تم کو کہا جائے کہ مجلس میں جگہ کھول دو تو تم جگہ کھول دیا کرو اور جب تم سے کہا جائے کہ مجلس سے اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہو جایا کرو۔ اللہ تعالیٰ (اس حکم اطاعت سے) تم میں ایمان والوں کے اور (ایمان والوں میں) ان لوگوں کے جن کو علم (دین) عطا ہوا ہے۔ اخروی درجے بلند کرے گا اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی پوری خبر ہے)

ایک خاص حکم

جس کے آیت کی تلاوت اس وقت کی گئی ہے ہر چند کہ اس میں خاص مضمون ایک خاص مقام کے متعلق بیان کیا گیا ہے۔ یعنی اس میں ایک خاص عمل کا حکم ہے ایک خاص

حالت میں۔ لیکن اس پر جس ثمرے کو مرتب کیا گیا ہے اس کے مبنیٰ پر نظر کرنے سے ایک عام قاعدہ پیدا ہوتا ہے جس کے مستحضر رکھنے کی ہر وقت ہر مسلمان کو ضرورت ہے۔

بالخصوص اس زمانے میں کہ علی العموم لوگوں کے خیالات منتشر ہیں اور اہل الرائے میں سے ہر شخص کی ایک جداگانہ رائے ہے۔ اسی لیے اس وقت اس آیت کو اختیار کیا گیا ہے۔ ترجمے سے وہ خاص مضمون اور ذرا تامل سے وہ مبنیٰ معلوم ہو جائے گا۔ اور پھر اس سے جو ایک عام قاعدہ پیدا ہوتا ہے اس کی تقریر کر دی جائے گی۔

ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ اے مسلمانو! جب تم کو یہ حکم ہو کہ مجلس میں فراخی کر دو تو فراخی کر دیا کرو۔ حق سبحانہ، تعالیٰ تمہارے لیے فراخی کر دیں گے اور جب تم سے کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہوا کرو۔ خدا تعالیٰ تم میں سے مومنین اور اہل علم کے بہت سے درجے بلند کر دیں گے۔ یعنی جب کسی مصلحت سے منجانب منتظم مجلس ایسا حکم ہو تو اس پر عمل کا کرو۔ یہ عام ہے نبی اور غیر نبی کو جو بھی منتظم مجلس ہو اسی لیے قیل کہا گیا۔ قائل کی تخصیص نہیں کی اور اللہ تعالیٰ تمہارے سب اعمال پر خبیر ہیں یعنی ان اعمال کے باطن پر بھی مطلع ہیں۔ مفسرین نے خبیر کی تفسیر میں اس کی تصریح کی ہے یہ آیت کا ترجمہ تھا۔

ترجمے کے ساتھ ہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ آیت کا شان نزول بھی معلوم کر لیا جائے کیونکہ اس سے فہم مراد میں بھی اعانت ہوتی ہے اور تفسیر میں بھی آسانی ہوتی ہے۔

علت و حکمت

شان نزول اس آیت کا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک مجلس میں تشریف رکھتے تھے۔ بہت سے صحابہؓ بھی حاضر تھے کہ اصحاب بدر آئے۔ اصحاب بدر وہ لوگ ہیں کہلاتے ہیں کہ جو جنگ بدر میں شریک ہوئے ہیں ان کی فضیلت بہت ہے۔ اس وقت مجلس میں کچھ تنگی تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حاضرین مجلس کو حکم فرمایا کہ مل بیٹھو اور ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے بعض کو فرمایا کہ تم اٹھ جاؤ اپنے کسی دوسرے کام لگو یا اٹھ کر دوسری جگہ بیٹھو۔ ان دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے بلکہ آیت کا مجموعہ ان دونوں کے مجموعے پر دال ہے۔ ممکن ہے کہ بعض کو مل کر بیٹھنے کا حکم دیا ہو اور بعض کو اٹھ جانے کا حکم دیا ہو۔ صحابہؓ

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لبوں کو تکتے تھے۔ وہ تو اس پر نہایت خوشی سے عامل ہو گئے لیکن منافقین نے کہ وہ ایسے مواقع کے لیے ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ اس پر اعتراض کیا۔ اور یہ گویا ان کو عیب جوئی کا ایک موقع مل گیا۔

حالانکہ اگر سرسری نظر سے بھی دیکھا جائے تب بھی اس انتظام میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال خوبی معلوم ہوتی ہے کہ تمام طالبان حق کی کس قدر رعایت کی کہ جگہ نہ ہونے کی مجبوری سے کوئی شخص محروم نہ رہ جائے لیکن چشم بدبین میں ہنر بھی عیب ہی ہو کر نظر آتا ہے

چشم بداندیش کہ برکندہ باد ☆ عیب نماید ہنرش در نظر

(بداندیش آدمی جب کسی کام کو دیکھتا ہے تو اسکی نظر میں اس کا ہنر اس کا عیب معلوم ہوتا ہے)

منافقین کو اعتراض کا بہانہ مل گیا۔ کہنے لگے کہ یہ کیا بات ہے کہ نئے آنے والوں کی خاطر پہلے بیٹھے ہوئے کو اٹھایا جائے۔

خدا تعالیٰ نے اس اعتراض کے جواب میں یہ آیت نازل فرمائی۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ اعتراض لغو اس لیے ہے کہ حضورؐ کے وہ دونوں حکم مناسب اور مستحسن تھے اور مستحسن کو غیر مستحسن کہنا حماقت ہے اور مستحسن ہونا اس طرح ظاہر فرمایا کہ ان حکموں کا خود بھی امر فرمایا اور خدا تعالیٰ اگر کوئی حکم فرمائیں تو وہ قبیح ہو نہیں سکتا۔ عقلاً بھی اور نقلاً بھی۔ جیسا کہ دوسری آیت میں ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ (ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ بے حیائی کا حکم نہیں فرماتے)

اور اس کا حکم خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ مستحسن ہے کیونکہ ایسی ذات کا حکم ہے جس کے برابر کوئی حکیم نہیں۔ پھر ہر حکم پر ایک ایک ثمرہ مطلوبہ کو بھی مرتب فرمایا کہ وہ استحسان کی مزید دلیل ہے۔ چنانچہ اور ثمرہ دونوں کے لیے ارشاد ہے۔

اِذَا قِیْلَ لَکُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا

(ترجمہ: جب تم سے کہا جائے کہ مجلس میں جگہ کھول دو تو کھول دیا کرو)

ایک حکم تو یہ صیغہ امر اس میں ارشاد ہے اس کے بعد فرماتے ہیں یَفْسَحِ اللّٰہُ لَکُمْ یہ اس کا ثمرہ ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر تم اس پر عمل کرو گے تو خدا تعالیٰ جنت میں تمہارے لیے فراخی فرمائیں گے یہاں تک تو پہلا حکم اور اس کا ثمرہ تھا۔

آگے بذریعہ عطف دوسرا حکم فرماتے ہیں وَإِذَا قِيلَ انْشُزُوا فَانْشُزُوا

یعنی جب اٹھ جانے کا حکم ہوا کرے تو اٹھ جایا کرو۔ نقلی استحسان تو اس ارشاد ہی سے ثابت ہو گیا۔ باقی عقلی استحسان کی تقریر یہ ہے کہ صدر مجلس جب اہل ہو اور یہ حکم کرے تو وہ کسی مصلحت کی بناء پر ہوگا۔ پس اس کا قبول کرنا ضروری ہوگا اور مطلق صدر مجلس بلا تخصیص اسلیئے کہا گیا کہ قرآن میں لفظ قیل ہے کہ جو کہ ہر صدر مجلس کے کہنے پر صادق آتا ہے۔ پس یہ شبہ جاتا رہا کہ یہ خاص ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ۔ اگرچہ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے ارشاد فرمایا تھا۔ لیکن جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی ضرورت پیش آئی اسی طرح جو حضورؐ کے نائب ہیں اور نیابت کی اہلیت ان میں ہے ان کو بھی صدر مجلس ہو جانے کی صورت میں ایسی ضرورت پیش آسکتی ہے اور اس کے قبول پر بھی عمل کرنا ایسا ہی واجب ہوگا جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر۔ تو اگر وہ اٹھنے کا حکم دیں تو فوراً اٹھ جانا چاہیئے۔ اور اس کے امتثال میں ننگ و عار کرنا چاہیئے کیونکہ مصلحت وقت سے ایسا کیا جاتا ہے۔

حصول نفع کی صورت

توضیح مقام کی یہ ہے کہ ان حکموں کا حاصل تناوب فی الانتفاع ہے اور تناوب شرعاً بھی محمود ہے یعنی اگر کوئی مطلوب مشترک ہو اور اس کے حاصل کرنے کے لیے سب طالبین کی گنجائش ایک مجلس میں نہ ہو تو شریعت نے اس کے لیے تناوب تجویز فرمایا ہے اور عقل بھی اس کے ساتھ اس میں متفق ہے کہ سب طالبین کے کمال حاصل کرنے کی یہی صورت ہے کہ آپس میں تناوب ہو۔ زیادہ وضاحت کیلئے اس کو ایک مثال میں سمجھیئے۔

مثلاً ایک کنواں ہے کہ شہر کے ہر شخص کو اس کے پانی کی ضرورت ہے اور ایک ساتھ سب کے سب اس سے پانی نہیں بھر سکتے تو سب کے پانی حاصل کرنے کی صورت یہی ہے کہ یکے بعد دیگرے سب کے سب پانی حاصل کریں اور چار آدمیوں کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کنوئیں پر جم کر بیٹھ جائیں اور دوسروں کو جگہ نہ دیں۔

یہ مثال ایسی ہے کہ اس کے تسلیم کرنے میں کسی کو بھی کلام نہیں تو جس طرح دنیاوی نفع میں تناوب مسلم ہے اسی طرح دینی نفع میں بھی سب کے انتفاع کی یہی صورت ہے کہ علی

سبیل التناوب سب نفع حاصل کریں۔

اسی مثال کے قریب ایک دوسری مثال پیش کرتا ہوں کہ وہ وضاحت میں تو اس سے کم ہے مگر اس موقع کے زیادہ مناسب ہے۔ وہ یہ کہ اگر ایک مدرسے میں ایک عالم ایسے ہوں کہ ہر طالب علم کو ان کی ضرورت ہو اور ہر شخص ان سے نفع حاصل کرنا چاہے۔ کوئی بخاری شریف پڑھنا چاہے اور کوئی نسائی اور کوئی منطق و فلسفہ۔ تو اگر بخاری شریف والے ان کو گھیر کر بیٹھ جائیں اور دوسروں کو وقت ہی نہ دیں تو دوسروں کے نفع حاصل کرنے کی کوئی صورت ہی نہیں ہے اور اس لیے بخاری والوں کو یہ حق نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ دوسری جماعتوں کے لئے بھی وقت چھوڑ دیں۔

ان مثالوں سے معلوم ہوا ہوگا کہ نفع دنیاوی اور دینی دونوں میں اگر طالبین کا اجتماع نہ ہو سکے۔ تو تناوب ہونا ضروری ہے۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نہایت ہی قرین مصلحت تھا اور چونکہ تفسحوا اور انشزوا عام ہے۔ بعض اور کل دونوں کو۔ اس لیے اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب کو اٹھنے کو فرمائیں سب کو اٹھ جانا واجب ہے اور اس میں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ بنیٰ اس کا تو انتفاع الجمیع تھا سب کے اٹھا دینے میں تو حرمان الجمیع ہے۔

جواب یہ ہے کہ اس میں بھی انتفاع الجمیع اس طرح ہو سکتا ہے کہ شاید آپ خلوت میں کچھ نفع عام کیلیے سوچیں یا آرام فرمائیں تا کہ پھر سب کی مصلحت کے لیے تازہ ہو جائیں۔ پس اس میں بھی جمیع کا انتفاع ہوا۔ اسی طرح اگر کسی دوسرے صدر مجلس کو بھی اس کی ضرورت پیش آئے کہ وہ کسی مصلحت سے بعض مجلس یا ساری مجلس کو اٹھنے کا حکم دے تو اس کو اجازت ہے کہ کہہ دے کہ اب تم لوگ اٹھو اور اس کا یہ کہہ دینا بدلیل اس کے اہل ہونے کے قرین مصلحت سمجھا جائے گا۔ اور اس پر عمل کرنا واجب ہوگا۔

تو منافقین کی یہ شکایت محض حسد کی بنا پر تھا اور اس کے قبول کرنے سے اباء کرنا محض عار و استنکاف تھا اور نہ واقع میں بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں کہ وہ ایسے امور میں اپنی توہین سمجھتے ہیں۔

اس وقت مجھے اپنی ایک حکایت یاد آئی۔ اپنی اوائل عمر میں یعنی جب کہ میں بالغ ہو چکا تھا۔ ایک مرتبہ اپنی مسجد میں نماز پڑھانے کے لیے کھڑا ہوا۔ صف میں داہنی طرف آدمی زیادہ ہو گئے تھے اور بائیں طرف کم تھے۔ میں نے داہنی طرف کے ایک شخص کو کہا کہ آپ

بائیں طرف آجائیں۔ یہ سن کر ان کو اس قدر غصہ آیا کہ چہرہ تمتما اٹھا۔ زبان سے تو کچھ نہیں کہا لیکن چہرے پر برہمی کے آثار نمایاں ہوئے۔ حالانکہ یہ کوئی غصہ کی بات نہ تھی۔ ترتیب صفوف تو شریعت میں بھی ضروری قرار دی گئی ہے۔ ان کی یہ حرکت مجھے بھی ناگوار ہوئی۔ آخر میں ان کے قریب کے آدمی سے کہا کہ بھائی تم ادھر آجاؤ کیونکہ ان کی تو شان گھٹ جائے گی۔ اس پر تو وہ ایسے خفا ہوئے کہ صف میں سے نکل کر مسجد ہی کو چھوڑ کر چلے گئے۔

تو بعض طبیعتیں اس قسم کی ہوتی ہیں کہ اس کو عار سمجھتے ہیں کہ کسی دوسرے کا کہنا کریں اور اس کا اندازہ ایسے لوگوں کے حالات دیکھنے اور ان سے ملنے سے ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے ذریعے سے یہ قانون دائمی مقرر کیا گیا۔ ورنہ بظاہر اس کا قانون بنانے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ یہ تو ایسی ظاہر بات ہے کہ معاشرت روزمرہ میں داخل اور فطرۃ سلیمہ کا مقتضا ہے۔ مگر اسی قسم کی طبائع کی بدولت یہ قانون مقرر فرمادیا۔ کہ واجب سمجھ کر ماننا پڑے اور اس کا امر بھی فرمایا اور امر کے ساتھ ترغیب بھی دی تاکہ کوئی ہیبت سے مانے اور کوئی رغبت سے۔ کیونکہ دو ہی قسم کی طبیعتیں ہوتی ہیں بعض پر ہیبت کا اثر زیادہ ہوتا ہے اور بعض پر رغبت کا زیادہ اثر ہوتا ہے۔

جیسا کہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے اور قرآن میں زیادہ لطف اسی شخص کو آتا ہے جس کی نظر واقعات پر ہو اور وہ واقعات پر غور کرے۔ مثلاً اگر ان بڑے میاں کا واقعہ پیش نظر نہ ہوتا تو اس حکم کی مشروعیت کی حکمت سمجھنے کا لطف نہ آتا۔ اور اب معلوم ہوتا ہے کہ کس قدر پاکیزہ انتظام فرمایا ہے کہ ذرا سی بات کو بھی نہیں چھوڑا۔

غرض اس قسم کے واقعات ہوئے بھی ہیں اور قیامت تک ہونے والے بھی ہیں۔ اسلیئے یہ قانون دائمی مقرر فرمادیا اور اس پر اس ثمرے کو مرتب فرمایا کہ ہم تمہارے لیے جنت میں جگہ کو فراخ فرمائیں گے۔ اور دوسرا حکم یہ فرمایا کہ اگر اٹھ جانے کا حکم ہوا کرے تو اٹھ جایا کرو۔ خدا تعالیٰ تم میں سے ایمان والوں کے اور اہل علم کے درجات بلند فرمائیں گے۔ یہ حاصل ہے ارشاد کا اس تقریر سے آپ کو سبب نزول آیت بھی معلوم ہوگیا اور حاصل آیت بھی جس میں حکم اور ثمرہ دونوں مذکور ہیں۔

اب میں وہ بات بیان کرتا ہوں جس کا بیان کرنا اس وقت مقصود ہے۔ میں نے کہا تھا کہ

اس ثمرے کا ایک مبنیٰ ہے۔ اس میں غور کرنے سے وہ قاعدہ عامہ نکلے گا۔ جس کا استحضار ہر وقت ضروری ہے۔ سو یہاں ایک امر تو یہ ہے کہ **تفسحوا** اور ثمرہ یہ ہے کہ **یفسح الله لکم** یعنی جنت میں فراخی ہوگی۔ اور دوسرا حکم یہ ہے کہ **فانشذوا** اور اس کا ثمرہ یہ ہے کہ **یرفع الله الذین امنو منکم** تو ان دونوں میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ صدر مجلس کے کہنے سے فراخی کر دینے میں جنت میں فراخی کیوں ہوگی اور اٹھ جانے میں رفع درجات کیوں ہوں گے؟

جس کو ذرا بھی عقل ہوگی وہ اس میں بالکل بھی تامل نہ کرے گا۔ بلکہ یہی کہے گا کہ مبنیٰ یہ ہے کہ اس نے خدا اور رسولؐ کی اطاعت کی۔ کیونکہ حضورؐ کا خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے اور **اولی الامر** کا حکم بھی خدا اور رسول کا حکم ہے اسلیئے کہ خدا تعالیٰ ہی نے ہم کو اولی الامر کا کہنا ماننے کو فرمایا ہے۔ پس اگر ہم نے صدر مجلس کا حکم مان لیا تو خدا تعالیٰ کا حکم مان لیا۔ غرض پھر پھرا کر مبنیٰ یہی نکلے گا کہ چونکہ اس امر کا امتثال کرنے والا خدا اور رسولؐ کا حکم ماننے والا ہے اس لیے اس کو یہ ثمرہ حاصل ہوا۔

سو اصل مقصود اس وقت اسی امر کا بیان کرنا ہے کہ یہ آیت اس پر دلالت کر رہی ہے کہ خدا اور رسولؐ کی اطاعت پر یہ دو ثمرے مرتب ہوتے ہیں۔ اور دوسرے مضامین اگر آئیں گے تو استطراداً اسی کی توضیح کے لیے آئیں گے یا بعض اس پر مرتب ہوں گے۔

تعلیم جدید کی خرابیاں

اب رہی یہ بات کہ اس مضمون کو اس وقت کیوں اختیار کیا گیا اس کی بابت میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ آجکل اس کی سخت ضرورت ہے کہ خیالات اور آراء اس وقت نہایت منتشر ہیں اور طالب مال و طلب جاہ کا بہت چرچا اس وقت ہو رہا ہے۔ جس کو دیکھیئے اس میں منہمک ہے۔ نیز ان کے لیے کچھ تدابیر بھی تراش رکھی ہیں۔ اور ان میں یہ بھی نہیں دیکھا جاتا کہ کون سی تدبیر حلال ہے اور کون سی تدبیر حرام ہے۔ بکثرت خیال ادھر متوجہ ہیں کہ اصل چیز مال اور جاہ ہے اور اسی کو ترقی کہا جاتا ہے اور اسی کے لیے سعی کی جاتی ہے خواہ وہ سعی شریعت کے موافق ہو یا مخالف۔ چنانچہ ذرائع تحصیل مال وہ ہیں جن کی بدولت شریعت سے بعد چلا جاتا ہے۔

مثلاً یہ کہ تعلیم جدید کمال کے ساتھ حاصل کرنا چاہیئے۔ اور اس میں بڑے بڑے درجے حاصل کرنے چاہئیں گو اس پر کیسے ہی آثار و مفاسد مرتب ہوں آج کل تعلیم جدید کے متعلق علماء پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ تعلیم جدید سے روکتے ہیں اور اس کو ناجائز بتلاتے

ہیں۔ حالانکہ میں بہ قسم کہتا ہوں کہ اگر تعلیم جدید کے یہ آثار نہ ہوتے جو علی العموم اس وقت اس پر مرتب ہو رہے ہیں تو علماء ہرگز اس سے منع نہ کرتے لیکن اب دیکھ لیجئے کہ کیا حالت ہو رہی ہے جس قدر جدید تعلیم یافتہ ہیں باستثناء شاذ و نادر ان کو نہ نماز سے غرض ہے نہ روزے سے نہ شریعت کے کسی دوسرے حکم سے بلکہ ہر ہر بات میں شریعت کے خلاف ہی چلتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ اس سے اسلام کی ترقی ہو رہی ہے۔

صاحبو! موٹی بات ہے کہ جب ان میں اسلام کی کوئی بات نہ رہی تو وہ اسلام کی ترقی کہاں ہوئی البتہ مال و جاہ کی ترقی ہوئی۔ سو اسلام روپیہ اور جاہ کو تو نہیں کہتے۔ خدا کا شکر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو محتاج تفسیر نہیں چھوڑا۔ اور خدا تعالیٰ نے بھی اس کی تفسیر کا خاص اہتمام فرمایا اور عجب نہیں کہ اسی زمانہ کے لیے اہتمام کیا ہو۔

بیان اس کا یہ ہے کہ اکثر صحابہ کرام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیبت سے بہت سی باتیں نہیں پوچھ سکتے تھے تو خدا تعالیٰ نے ایک بار جبرئیل علیہ السلام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بشکل انسان بھیجا۔ وہ ایک مجلس عام کے وقت تشریف لائے اور حضورؐ سے دوسروں کے سنانے کو چند سوال کیئے۔ چنانچہ ان سوالوں میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ ماالاسلام یعنی اسلام کیا چیز ہے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ **ان تشهد ان لا اله الا الله و ان محمد رسول الله و اقام الصلوة و ایتاء الزكوة و صوم رمضان و ان تحج البيت** (سنن النسائی الایمان ب ۵) (الحدیث)

شہادتوں کا اقرار کرو۔ دل سے بھی اور زبان سے بھی ظاہر ہو اور نماز و زکوٰۃ و صوم و حج کا ادا کرنا۔ پس جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر سے اسلام کی حقیقت معلوم ہوگئی تو اسلام کی ترقی تو یہ ہوگی کہ ان احکام کے امتثال میں ترقی ہو۔ نماز میں ترقی ہو۔ روزے میں ہو۔ نہ یہ کہ ٹم ٹم ہو اور عالی شان محل ہو۔ یعنی اس کو اسلام کی ترقی نہ کہا جائے گا۔ غرض جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی تفسیر فرما چکے ہیں تو آج کون ہے کہ وہ بڑے بڑے عہدوں کو اور مال و جاہ کی ترقی کو اسلام کی ترقی بتلائے۔

ترقی مال و جاہ

مسلمان اگر اپنی حالت دینیہ پر بھی قائم رہتے تب بھی ان چیزوں کو اسلام کی ترقی نہ کہتے بلکہ ترقی اہل الاسلام کہتے۔ مگر جب کہ وہ دین پر بھی باقی نہیں ہیں تو اس حالت میں

ترقی مال لاہل الاسلام نہ ہوئی بلکہ ترقی مال لاہل الکفر ہوئی یعنی جب نماز و روزہ عقائد اسلام سب رخصت ہو گئے تو اب اگر مال اور جاہ کی ترقی بھی ہوئی تو یہ اہل اسلام کی ترقی بھی نہ کہلائے گی۔ بلکہ اہل کفر کی ترقی کہلائے گی۔

غرض اس ترقی کو قبلہ توجہ بنا رکھا ہے کہ حلال و حرام کی بھی مطلق تمیز نہیں رہی چاہے سود سے حاصل ہو چاہے رشوت سے حاصل ہو۔ چاہے شریعت کو بھی بالکل چھوڑنا پڑے مگر یہ فوت نہ ہو۔ چنانچہ بعض نے تو صریحاً یہ کہہ دیا کہ اس وقت حلال اور حرام کے دیکھنے کا وقت نہیں ہے۔ یہ وہ وقت ہے کہ جس طرح ہو سکے روپیہ سمیٹ لو۔ غور کیجئے جب مسلمان ایسی رائے دینے لگے تو علماء کا کیا قصور ہے اگر وہ تعلیم جدید سے روکیں۔

علیٰ ہذا ترقی جاہ کہ اس میں بھی یہ تمیز نہیں رہی کہ ذریعہ اس کی تحصیل کا حلال ہے یا حرام۔ اکثر ایسے ذرائع سے جاہ حاصل کی جاتی ہے جو کہ شریعت کے بالکل ہی خلاف ہے اور پھر اس پر طرہ یہ کہ جاہ سے کام بھی ناپاک ہی لیا جاتا ہے۔ کبھی اس کو آلۂ ظلم و ستم بناتے ہیں اور اسی ظلم کو اپنی شان ریاست سمجھتے ہیں۔ چنانچہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ لا ریاست الا بالسیاست۔ اور یہ جملہ فی نفسہ بالکل صحیح ہے لیکن سیاست کے معنی وہ نہیں ہیں جو کہ ان لوگوں نے سمجھ رکھے ہیں یعنی ظلم کرنا۔ بلکہ سیاست کے معنیٰ ہیں اصلاح اور اصلاح کہتے ہیں احکام کے جاری کرنے کو جیسا کہ دوسری آیت میں ارشاد ہے۔

وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا

(ترجمہ: زمین کی اصلاح کے بعد اس میں فساد مت کرو)

جس کی کافی تقریر ایک مستقل وعظ میں ایک مقام پر بیان کر دی گئی ہے۔ غرض مال اور جاہ کو لوگوں نے مقصود بالذات کے درجے میں قبلۂ توجہ بنا لیا ہے اور یہ مرض بالکل عالمگیر ہو گیا ہے۔ اسی لیے اس وقت اس کے بیان کرنے کی ضرورت معلوم ہوئی اور حق تعالیٰ نے اس آیت میں دونوں حکموں پر دو ثمرے عجیب مرتب فرمائے ہیں جو اس وقت کے مقاصد کے نہایت مناسب ہیں۔

عزت و ذلت کی علت

یفسح جس کے معنی ہیں فراخی جو مناسب ہے ترقی مال و تنعم کے دوسرا یرفع جو مناسب ہے ترقی جاہ کے گویا خدا تعالیٰ نے اس میں یہ فرما دیا ہے کہ اگر فراخی و رفعت ہو سکتی

ہے تو اطاعت ہی سے ہو سکتی ہے۔

اور ہم سمجھ رہے ہیں۔ کہ خلاف شریعت کرنے میں فراخی ہوگی۔ اور شریعت پر عمل کرنے میں تو ناجائز عہدے متروک ہوں گے۔ حرام مال سے بچنا پڑے گا تو بس تو پانچ روپے کے ملا رہیں گے۔ پھر نہ پلیٹ فارم پر جا سکیں گے۔ نہ بے ٹکٹ گاڑی میں بیٹھ سکیں گے تو کچھ عزت بھی نہ ملے گی۔ گویا ساری عزت پلیٹ فارم پر جانے میں ہے تو خدا تعالیٰ اس کو فرماتے ہیں کہ ترتب فراخی کا محض اطاعت پر ہے اور چونکہ حاصل مال کا تنعم ہے اور وسعت مکانی بھی ایک تنعم ہے۔ لہٰذا اگر ہم اس مضمون کو ذرا وسیع کر دیں تو مضائقہ نہیں ہے تو اب ہم یوں کہیں گے کہ تنعم یعنی ترقی مال اور رفعت یعنی ترقی جاہ دونوں اطاعت پر موقوف ہیں۔ اگر یہ نہیں ہے تو نہ ترقی مال ہے اور نہ ترقی جاہ۔ بلکہ ذلت ہے اور تنگی ہے چنانچہ ایک مقام پر فرماتے ہیں۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى

جس نے منہ پھیرا میری یاد سے تو اس کو ملتی ہے گزران تنگی کی۔ اور لائیں گے ہم اس کو قیامت کے دن اندھا۔

اس میں حشر قیامت کے مقابلے میں معیشت ضنک فرمانا دلیل اس کی ہے کہ یہ تنگی عیش قبل قیامت ہے اور قبل قیامت یا عالم برزخ ہے یا دنیا۔ سو آیت میں چونکہ کسی عالم کی تخصیص نہیں ہے اس لیے دونوں کے لئے عام کہا جائے گا۔ برزخ کے ساتھ نہیں ہوگا۔ خاص کر جب کہ واقعات اس کی تصدیق بھی کرتے ہوں کہ معصیت سے دنیا میں بھی تنگی ہوگی ہوتی ہے۔ چنانچہ عنقریب مذکور ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اطاعت نہ کرنے کی صورت میں دو سزائیں ملیں گی۔ ایک تو قیامت میں کہ اندھا اٹھایا جائے گا اور ایک دنیا اور برزخ میں کہ تنگی عیش میں وقت بسر ہوگا۔ تو فراخی اور راحت کا ہونا اسی میں منحصر ہے کہ اطاعت ہو ورنہ برزخ کے علاوہ دنیا میں بھی تنگی ہوگی۔

راحت و اطاعت کا تعلق

اس مقام پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ جو لوگ نافرمان ہیں وہ بڑے فراخی میں ہیں۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ جس کو آپ فراخی سمجھتے ہیں یہ سب ظاہری اور دیکھنے ہی کی حالت ہے ورنہ اگر حقیقت حال کو دیکھئے تو فی الواقع وہ نہایت تنگی ہے۔ اس لئے فرماتے ہیں۔

وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَ اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا

اور تعجب نہ کر ان کے مال اور اولاد سے یہی چاہتا ہے اللہ کہ عذاب کرے ان کو ان چیزوں سے دنیا میں۔

تو اطاعت نہ ہونے کی صورت میں یہ سب لفافہ ہے اور حقیقت میں ایسے شخص کے قلب کے اندر بے حد پریشانی اور تنگی ہوتی ہے اور کسی وقت اس کو چین نہیں ہوتا اس واسطے کہ واقعات کثرت سے غیر اختیاری ہوتے ہیں۔ اولاد سے وہ بیمار بھی ہوتی ہے۔ مرتی بھی ہے خود ان صاحب مال پر بھی مقدمات ہو جاتے ہیں مال کی بھی چوری ہو جاتی ہے۔ اس میں نقصان بھی ہو جاتا ہے۔ تکالیف بھی پیش آتی ہیں اور چونکہ تنعم کی زیادہ عادت ہو جاتی ہے اور امور پیش آتے ہیں۔ طبیعت کے خلاف اور کوئی چیز ان کو ہلکا کرنے والی نہیں ہوتی۔ اس لئے ان کو بے حد تکلیف ہوتی ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ واضح کرنے کے لئے میں ایک مثال عرض کرتا ہوں۔

فرض کیجئے کہ دو آدمیوں کے دو جوان لائق بیٹے مر گئے اور یہ دونوں شخص سب حالتوں میں مساوی ہیں لیکن صرف فرق اتنا ہے کہ ایک ان میں مطیع خدا ہے اور دوسرا مطیع نہیں۔ بلکہ اسباب دنیا و غفلت میں منہمک ہے۔ اب دیکھئے کہ بیٹے کے مرنے کا زیادہ غم کس کو ہوگا اور زیادہ دنوں تک کس کو رہے گا۔ ظاہر ہے کہ مطیع کو ہرگز زیادہ غم نہ ہوگا کیونکہ وہ سمجھے گا کہ

ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود (یعنی جو مالک حقیقی کرتا ہے اس میں خیر و مصلحت ہے)

نیز وہ جانتا ہے کہ یہ تو آج ہی مرنے والا تھا ٹل نہ سکتا تھا اور سمجھتا ہے کہ قیامت میں بھی مجھے ثواب ملے گا اور اب بھی ثواب ملا۔ تو ان خیالات کی بدولت بہت جلد اس کی تسلی ہو جائے گی۔ بخلاف اس غیر مطیع کے کہ اس کو عمر بھر کڑھتے ہیں اور غم کرتے ہی گذرے گی۔ کبھی خیال ہوگا کہ اگر فلاں نسخہ پلایا جاتا تو ضرور شفا ہو جاتی۔

غرض اس قسم کے توہمات کا سلسلہ عمر بھر کے لئے بندھ گیا اور گویا ایک گھن لگ گیا تو اس کے پاس ظاہری سامان اگرچہ سب کچھ ہو لیکن وہ سامان اس کے لئے سرمایہ فراخی نہیں ہے کیونکہ اس کے قلب میں تنگی ہے جو کہ قلب پر ایک عذاب ہے اور اسی راز کے سبب آپ کسی منہمک فی الدنیا کو آرام میں نہ دیکھیں گے۔

یوں کہ نافرمانی کر کے سکون قلب نصیب نہیں ہو سکتا البتہ اگر فرماں بردار ہے تو وہ

چین میں ہوگا گو امیر بھی نہ ہو اور اگر امیر بھی ہو تب بھی اس کی راحت کا سبب اس کی ریاست نہ ہوگی بلکہ اطاعت ہوگی تو علت تامہ راحت کی اطاعت ہے اب وہ شبہ جاتا رہا۔

عزت اور اطاعت کا تعلق

اسی طرح عزت بھی اطاعت ہی سے ہوتی ہے لیکن اس بارے میں بھی لوگ بڑی غلطی میں ہیں کہ مخالفت کر کے رفعت چاہتے ہیں۔ غرض مشاہدہ ہے کہ موافقت میں چاہے مال زیادہ نہ ہو لیکن مال کا جو ست ہے یعنی منفعت و کاروائی اور جاہ کا جو ست ہے یعنی حفظ عزت کیونکہ مال تو جلب منفعت کے لئے ہوتا ہے اس کے ذریعے سے انسان کے کام بہت چلتے ہیں مثلاً مال سے کھانے پینے کی چیزیں خریدی جاتی ہیں تو اس کی منفعتیں حاصل ہوتی ہیں۔ اور جاہ دفع مضرات کے لئے ہوتی ہے یعنی اس کا اثر اور اس کی غایت یہ دفع مضرت ہے کیونکہ عقلاء کے نزدیک عزت محض اس لئے حاصل کی جاتی ہے کہ اس کی بدولت بہت سی آفتوں سے محفوظ رہیں گے۔ مثلاً اگر آبرودار نہ ہو تو جس کا جو جی چاہے سو کہہ لے جس کا جی چاہے بیگار میں پکڑ لے اور عزت دار آدمی کو کوئی ستاتا نہیں۔ تو عزت کی روح حفاظت ہوئی مضرتوں سے پھر ان دونوں کی روح ہے راحت۔ سو یہ اطاعت ہی سے میسر ہوتی ہے گو ظاہر سامان کچھ ہی ہو۔

چنانچہ دیکھ لیجئے کہ یہ راحت خدا اور رسول کی اطاعت کرنے والے کو حاصل ہے یا مخالف کو۔ شرق سے غرب تک تلاش کر لیجئے خدا اور رسول کا مخالف ایک بھی راحت میں نہ ملے گا۔ اس کا پتہ واقعات میں غور کرنے سے چلتا ہے کہ مخالف ہر وقت کسی نہ کسی پریشانی میں مبتلا رہتا ہے۔ غرض مال و جاہ کی جو روح ہے وہ اطاعت ہی پر مرتب ہے سو دنیوی راحت کا ذریعہ بھی اطاعت ہی ہوا۔ تو اس تقریر کے بعد ان طالبان جاہ و مال سے کہا جائے گا کہ

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی ☆ کیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان ست

(مجھے ڈر ہے کہ اے اعرابی تو کعبہ شریف تک نہ پہنچے گا اس وجہ سے کہ جو راستہ تو نے اختیار کیا وہ ترکستان کو جاتا ہے)

موازنہ دنیا و آخرت

جس راستے سے تم راحت دنیوی حاصل کرنا چاہتے ہو اس کا وہ رستہ ہی نہیں اسی کو اس

آیت میں بتلایا ہے کہ فراخی اور رفعت خدا ورسول کی اطاعت پر موقوف ہے یہی مسئلہ اس وقت مقصود بالبیان تھا اور بقدر ضرورت بحمد اللہ اس کا بیان بھی ہو چکا اور اس کی بابت مسلمانوں کی غلطی رفع کر دی گئی۔

البتہ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس آیت میں تو جنت کی فراخی مراد ہے اور ہمیں ضرورت ہے دنیا کی فراخی کی اور اس کا ترتب اطاعت پر آیت سے ثابت نہیں ہوا تو جنت کے ادھار پر کہاں تک بیٹھے رہیں۔

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ آیت میں کہیں جنت کا نام نہیں تو اگر ہم عموم پر دعویٰ کریں تو کونسی چیز مانع ہے بالخصوص جب کہ ہم مشاہدہ بھی کر رہے ہیں جیسا کہ تقریر بالا سے معلوم ہوا۔ اور اگر فرض بھی کر لیں کہ یہ وعدہ جنت ہی کے لئے ہے تو جنت کے مقابلے میں دنیا کیا چیز ہے۔ جب جنت کی فراخی کا وعدہ ہو گیا تو دنیا کی کیا رغبت رہنا چاہئے مثلاً اگر کوئی شخص کسی سے کہے کہ میں تم کو ایک روپیہ دوں گا تو اس کو پھر پیسے کی کیا تمنا رہے گی۔

اب اس مثال کے بعد یہ دیکھئے کہ ان دونوں میں کیا نسبت ہے سو حدیث میں ہے دنیا بمقابلہ آخرت ایسی ہے، جیسے سمندر کے مقابلے میں ایک سوئی کے ناکے پر لگا ہوا قطرہ کہ اگر جزء لایتجزی ثابت ہو جائے تو وہی ہو۔ تو اس پانی کو سمندر کے ساتھ جو نسبت ہے وہی نسبت ہے دنیا کو آخرت کے ساتھ۔ تو اگر دنیا میں مال وجاہ نہ بھی حاصل ہوا اور اس آیت میں وہ نہ بھی مراد ہو تو کیا حرج ہے۔ اور یہ بالکل اخیر درجے کی بات ہے ورنہ ہمارا دعوے یہ ہے کہ یہاں بھی فراخی ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ تمہاری تخصیص فی التفسیر مان لینے کے بعد وہ اس آیت سے ثابت نہ ہوگا مگر ہم دوسری آیات سے ثابت کر دیں گے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ

(ترجمہ: اور اگر وہ لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتوں کو کھول دیتے)

دوسری آیت میں ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ

لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ

(ترجمہ: اور اگر وہ توریت اور انجیل اور اس چیز کو جو ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے اتاری گئی تھی قائم رکھتے تو اپنے اوپر سے بھی کھاتے اور پیروں کے نیچے سے بھی)

ان کے سوا اور بہت سی آیتیں ہیں۔ تو اگر بعض آیات میں ایک عالم کی وسعت مراد ہو اور دوسری بعض آیات میں دوسرے عالم کی وسعت تو جرم کیا ہے اور یہ تمام تر گفتگو دنیا پرستوں کے مذاق کے موافق لی گئی ہے ورنہ اصل تو یہ ہے کہ مسلمانوں کو دنیا کی طرف جس قدر رغبت اور طلب ہے نہ ہونا چاہیئے۔ ان کا مطمح نظر آخرت ہی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ آخرت کی فراخی کے مقابلہ میں دنیا کی فراخی اور آخرت کے عذاب کے مقابلے میں دنیا کا عذاب کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ حدیث شریف میں ہے کہ ایک شخص جو کہ عمر بھر نعمت میں رہا ہوگا دوزخ میں ایک غوطہ دے کر کہیں گے **هل رائیت نعیما قط**۔ یعنی کیا تم نے کبھی کوئی نعمت و آرام دیکھا ہے وہ کہیگا میں نے کبھی نہیں دیکھا اور ایک شخص کو جو کہ عمر بھر تکلیف میں رہا ہوگا جنت میں داخل کر کے پوچھا جائے گا کہ تم کو کبھی کوئی تکلیف آئی تو وہ کہے گا کہ کبھی نہیں۔

توضیح کے لئے اس کو ایک مثال میں پیش کرتا ہوں۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص نے حالت خواب میں یہ دیکھا کہ مجھے خوب پیٹا جا رہا ہے مجھے چاروں طرف سے سانپ بچھو ڈس رہے ہیں لیکن بیدار ہوا تو دیکھتا ہے کہ تخت شاہی پر آرام کرتا ہے کوئی مورچھل جا رہا ہے۔ کوئی عطر لگا رہا ہے کوئی پان لا رہا ہے چاروں طرف لوگ دست بستہ کھڑے ہیں تو کیا اس کے دل پر اس خواب کا کوئی اثر باقی رہے گا۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ اگر وہ خواب از خود یاد بھی آوے گا تو طبیعت اس کو بہلاوے گی۔

اس کے برعکس ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ میں تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوں اور تمام لوگ اپنی حاجتیں میرے سامنے پیش کرتے ہیں اور میں انکو پورا کرتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن آنکھ جو کھلی تو دیکھتا ہے کہ ایک شخص سر پر جوتیاں مار رہا ہے اور بہت سے سانپ بدن کو لپٹے ہوئے ہیں اور ایک کتا منہ میں موت رہا ہے۔ کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ بیداری کی اس مصیبت کے بعد بھی خواب کی کسی قسم کی مسرت اس کے دل پر رہ سکتی ہے؟

کبھی نہیں۔ پس دنیا کی مثال آخرت کے مقابلے میں بالکل ایسی ہے جیسے کہ خواب کی مثال بیداری کے مقابلہ میں۔

کسی نے خوب کہا ہے

حال دنیا را پرسیدم من از فرزانہ ☆ گفت یا خوابے ست یا بادیست یا افسانہ
باز گفتم حال آں کس گو کہ دل دروے بہ بست ☆ گفت یا غولیست یا دیویست یا دیوانہ

(میں نے ایک عقلمند سے دنیا کی حالت دریافت کی تو اس نے بتلایا کہ وہ تو ایک خواب ہے یا غول ہے یا افسانہ ہے، پھر میں نے اس شخص کے متعلق پوچھا جو دنیا میں پھنس گیا تو اس نے کہا وہ کوئی جن ہے یا دیو ہے یا کوئی پاگل ہے)

تو واقعی دنیا کی مثال خواب کی سی ہے اگر دنیا میں عمر بھر عیش کیا اور مرنے کے ساتھ ہی پکڑا گیا تو وہ عیش کیا کام آئے گا۔

حالت دنیا کی مثال

دنیا کی حالت پر مجھے ایک حکایت یاد آئی ہے تو مہمل سی لیکن منطبق خوب ہے ایک شخص کی عادت تھی کہ روزانہ سوتے میں پیشاب کرلیا کرتا تھا اور اس کی بیوی اس کو دھوتی تھی۔ ایک روز بیوی نے کہا کم بخت میں تو پیشاب دھوتے دھوتے بھی پریشان ہوگئی۔ آخر تجھ پر کیا شامت سوار ہوتی ہے۔ کہنے لگا میں روزانہ خواب میں دیکھتا ہوں کہ شیطان آتا ہے اور کہتا ہے چل تجھے سیر کرالاؤں۔ جب میں چلنے پر آمادہ ہوتا ہوں تو کہتا ہے کہ پہلے پیشاب تو کرلو میں سمجھتا ہوں کہ پیشاب خانہ میں پیشاب کررہا ہوں حالانکہ وہ بستر پر ہوتا ہے۔ بیوی نے یہ خواب سن کر کہا کہ ہم لوگ غریب ہیں۔ شیطان تو جنوں کا بادشاہ ہے اس کو کہنا کہ ہم کو کہیں سے روپیہ لادے۔ چنانچہ شوہر نے کہنے کا وعدہ کیا۔ رات کو جب سویا تو شیطان پھر خواب میں آیا اس نے شیطان سے کہا یار ہم خالی خولی نہیں چلتے، ہمیں کچھ روپیہ دلواؤ۔ شیطان نے کہا کہ یہ کیا مشکل ہے تم میرے ساتھ چلو پھر جس قدر روپیہ کہوگے ملے گا۔ اس نے ایک بادشاہ کے خزانے کے سامنے لے جا کر کھڑا کردیا اور ایک گٹھڑی میں بہت سا روپیہ بھر کر اس کے کندھے پر رکھ دیا اس میں اس قدر بوجھ تھا کہ مارے بوجھ اس کا پاخانہ نکل گیا جب صبح

ہوئی تو بستر پر پائخانہ دھرا تھا۔ پوچھا یہ کہ کیا ہوا۔ کہنے لگا کہ شیطان نے روپوں کے اس قدر توڑے میرے کندھے پر رکھ دیئے کہ بوجھ کے مارے پاخانہ خطا ہو گیا وہ کہنے لگی میاں تم پیشاب ہی کر لیا کرو ہمیں روپوں کی ضرورت نہیں۔ خدا کے لئے پاخانہ تو نہ کرو۔

تو یہ حکایت ہے تو مہمل سی لیکن اگر غور کیجئے تو یہ ہماری حالت پر بالکل منطبق ہے کہ ہم بھی مثل اس شخص کے اس وقت خواب میں ہیں لیکن بہت سے درہم و دینار کے توڑے اپنے سروں پر لادے ہوئے ہیں لیکن جس وقت آنکھ کھلے گی جس کو موت کہتے ہیں اس وقت معلوم ہوگا کہ وہ سب خیال تھا اور بس۔ اس وقت ہم اپنے گناہوں کی نجاست میں لت پت ہونگے۔ نہ روپیہ پیسہ ہمارے پاس ہوگا نہ کوئی یار و مددگار ہوگا بالکل جریدہ و تنہا ہونگے چنانچہ فرماتے ہیں۔

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ

اور تم ہمارے پاس آئے ایک ایک جیسے ہم نے بنائے تھے پہلی بار اور چھوڑ دیا جو ہم نے اسباب دیا تھا پیٹھ کے پیچھے۔

اور اگر بالفرض روپیہ ہوتا بھی تب بھی کچھ کام نہ آتا۔ چنانچہ دوسری آیت میں فرماتے ہیں۔

لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِیَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ

یعنی قیامت کے دن اگر دنیا ساری ایک شخص کو مل جائے اور وہ فدیہ میں دینا چاہے تو اس سے قبول نہ کی جائے گی۔ تو یہاں چند روز عیش کر کے اگر یہ انجام ہوا تو وہ عیش بھی کلفت ہے۔ اور اگر یہاں چند روز تکلیف اٹھا کر ابدالآباد کی نعمت حاصل ہوگئی تو یہ کلفت بھی راحت ہے۔

حضرت سیدنا شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ پر جب مسلسل تین دن تک فاقہ ہوتا تو بیوی کہتیں کہ حضرت اب تو صبر نہیں ہو سکتا آپ فرماتے ہمارے لئے جنت میں کھانے تیار ہو رہے ہیں ذرا صبر کرو، تو انشاء اللہ اب بہت جلد اس نعمت سے مالا مال ہوئے۔ اللہ اکبر۔ بیوی بھی ایسی شاکر صابر کہ جنت کے ادھار پر رضامند ہو کر خاموش ہو جاتیں۔

ایک اور بزرگ کا قصہ ہے کہ ان کو ایک بادشاہ نے لکھا کہ آپ پر بہت تنگی ہے۔ کھانے کی بھی کپڑے کی بھی۔ بہتر ہو کہ آپ میرے پاس چلے آئیں اور یہاں رہیں۔ آپ نے جواب میں ایک قطعہ لکھ کر بھیجا جس کے بعض اشعار یہ تھے۔

www.alhaq.org

خوردن تو مرغ مسمن و مے ☆ بہتر ازونانک جوین ما
پوشش تو اطلس ودیبا حریر ☆ بخیہ زدہ خرقہء پشمین ما
نیک ہمیں است کہ بس بگذرد ☆ راحت تو محنت دوشین ما
باش تا طبل قیامت زنند ☆ آن تو نیک آید و یا ایں ما

(تیرے موٹے موٹے مرغ کھانے اور شراب پینے سے ہماری جو کی روٹی بہتر ہے، تمہارا لباس اطلسی اور ریشمی کپڑے ہیں اور ہماری پوشاک بخیہ کی ہوئی اونی گدڑی ہے، بہتر یہی ہے کہ تو بس دل میں یہ بات نہ رکھ کہ تیرا آرام ہمارے کندھے کا بوجھ ہے۔ طبل قیامت جب بجے گا تو اس وقت تمہارا بھلا ہوگا یا ہمارا)

واقعی وہاں جا کر نہ یہاں کا عیش رہے گا نہ مصیبت۔ اور آخر تو یہ گذشتہ چیزیں کیا یاد رہتیں۔ دنیا ہی میں دیکھ لیجئے کہ عمر گزشتہ بیش از خواب نہیں ہے۔ زمانہ گزرتا چلا جاتا ہے کہ جیسے برف کا ٹکڑا کہ پگھلنا شروع ہوا تو ختم ہی ہو کر رہے گا۔

اسی واسطے حدیث شریف میں ہے کہ جب قیامت کے روز اہل مصیبت کو بڑے درجے عنایت ہونگے تو اہل نعمت کہیں گے کہ کاش ہماری کھالیں مقراض سے کاٹی گئی ہوتیں۔ تو آج ہم کو بھی یہ درجے ملتے۔ تو اس حالت پر نظر کر کے دیکھا جائے تو بے تامل یہ کہنا پڑتا ہے کہ دنیا میں کچھ بھی نہ ملتا تو کچھ بھی حرج نہ تھا تو یہ اعتراض محض لغو ہے کہ یہ جنت کا وعدہ ہے۔

صورت اور حقیقت کا فرق

صاحبو! کیا جنت تھوڑی چیز ہے۔ ابھی چونکہ دیکھا نہیں اس لئے جنت کی کچھ قدر نہیں ہے۔ جب دیکھو گے تو حقیقت کھلے گی اور جنہوں نے ان چیزوں کو دل کی آنکھوں سے آج دیکھا لیا ہے ان کی وہی حالت ہے جو دیکھنے والے کی ہوتی ہے۔

رہا یہ شبہ کہ جب ہوگا تب ہوگا اس وقت تو مصیبت میں ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آپ کی غلطی ہے اللہ سے تعلق رکھنے والا کبھی مصیبت میں نہیں ہے بات یہ ہے کہ جس چیز کا نام آپ نے مصیبت رکھا ہے وہ مصیبت ہی نہیں ہے۔ تحقیق اس کی یہ ہے کہ جس طرح آرام کی ایک صورت اور ایک حقیقت ہوتی ہے اسی طرح مصیبت کی ایک صورت اور حقیقت ہوتی ہے۔

دیکھو۔ اگر ایک شخص کا محبوب مدت کا بچھڑا ہوا اچانک مل جائے اور اس عاشق کو بہت

زور سے اپنی بغل میں دبائے حتیٰ کہ اس کی پسلیاں بھی ٹوٹنے لگیں تو بظاہر یہ نہایت تکلیف میں ہے لیکن قلب کی یہ حالت ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اور اس عاشق کو بہت زور سے اپنی بغل میں دبائے تو اچھا ہے اور اگر محبوب کہے کہ تکلیف ہوتی ہے تو چھوڑ دوں تو جواب میں کہے گا کہ

اسیرت نہ خواہد رہائی ز بند ☆ شکارت نہ جوید خلاص از کمند

(تیرا قیدی قید سے رہائی نہیں چاہتا، تیرا شکار کمند سے چھٹکارا حاصل کرنا نہیں چاہتا)

اور اگر وہ کہے کہ اگر تم کو دبانے سے تکلیف ہو تو تم کو چھوڑ کر تمہارے اس رقیب کو اسی طرح دباؤں تو کہے گا

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ☆ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(خدا کرے یہ دشمن کا نصیب نہ ہو کہ وہ تمہاری تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر سلامت رہے کہ تو خنجر آزمائی کرتا رہے)

اور کہے گا

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے ☆ یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

حتیٰ کہ اگر اس کا دم بھی نکل جائے تو اس کے لئے عین راحت ہے۔ حالانکہ بظاہر یہ نہایت ہی تکلیف میں ہے کہ اگر کسی اجنبی کو جس کو علاقہ محبت معلوم نہ ہو اس کی خبر ہو تو وہ بہت رحم کھائے اور محبوب سے سفارش کرے لیکن عاشق کو یہ رحم اور سفارش بے رحمی اور عداوت نظر آئے گی کیونکہ جانتا ہے کہ اس سفارش کا اثر یہ ہے کہ محبوب چھوڑ کر ابھی علیحدہ ہوا جاتا ہے۔ اسی طرح جب لوگوں خدا تعالیٰ سے تعلق ہو گیا ہے وہ آپ کی اس خیر خواہی کو کہ ہائے یہ اللہ والے بڑی مصیبت میں ہیں ان کو اس سے نکلنے کی تدبیر بتلائیں، نہایت ناگوار سمجھتے ہیں۔

میں نے اپنے استاد علیہ الرحمۃ سے ایک حکایت سنی ہے کہ ایک بزرگ چلے جاتے تھے راستے میں ایک شخص کو دیکھا کہ زمین پر پڑا ہوا ہے اور تمام بدن زخمی ہو رہا ہے۔ غور کر کے دیکھا تو مکھیاں اس شخص کو گھیرے ہوئے ہیں اور اہل اللہ میں سے ہیں ان کو بہت رحم آیا اور قریب جا کر ادب سے مکھیاں جھلنے لگے کچھ دیر کے بعد ان کو افاقہ ہوا تو آپ نے فرمایا کہ یہ شخص کون ہے جو میرے اور محبوب درمیان حائل ہو رہا ہے اور فرمایا کہ میری وہ حالت ہے کہ

خوشا وقتے کہ خرم روزگارے ☆ کہ یارے برخورد از وصل یارے

(بہترین وقت وہ بہترین زمانہ ہے کہ ایک دوست اپنے دوست سے ملنے جارہا ہے)

محبت کا علاقہ ایسی چیز ہے کہ ناگوار بھی گوار ہوتا ہے۔

محبت کی خاصیت اور تقاضا

ایک شخص کا واقعہ لکھا ہے کہ کسی شخص کی محبت کے جرم میں اس کو چابک کی سزا دی جارہی تھی۔ ننانوے چابکوں میں تو آہ نہیں کی اس کے بعد جو ایک چابک لگا ہے تو اس میں بہت زور سے آہ کی۔ لوگوں نے سبب پوچھا۔ کہنے لگا کہ ننانوے چابک تک تو محبوب بھی میرے سامنے کھڑا تھا۔ مجھے یہ خط تھا کہ محبوب میری حالت کو دیکھ رہا ہے اس میں تکلیف محسوس نہیں ہوئی اور اخیر کے چابک میں وہ جاچکا تھا اس لئے اس کی تکلیف محسوس ہوئی۔ حق سبحانہ وتعالیٰ اسی کو فرماتے ہیں۔ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا ''اور تو ٹھہرا رہ منتظر اپنے رب کے حکم کا تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے''۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خیال میں بھی یہ خاصیت ہے کہ کلفت مبدل بہ راحت ہوجاتی ہے اور عشاق نے بھی اس کی تمنا کی ہے۔

بجرم عشق تو ام میکشند غو غائیست ☆ تو نیز بر سر بام آن کہ خوش تماشائیست

(تیرے عشق میں لوگ مجھے مار رہے ہیں اور ایک ہنگامہ ہے تو بھی برسرِ بام آ، اس لئے کہ تو بہترین تماشائی ہے)

یہ جو برسر بام بلا رہا ہے محض اسی خط وراحت کے لئے ہے تو جب محبت میں یہ خاصہ ہے تو جن کو آپ تکلیف میں سمجھتے ہیں اور ان کی اس حالت کی برداشت پر تعجب کرتے ہیں اگر ان کو بھی اس تکلیف میں راحت ہوتی ہو تو کیا تعجب ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ ایک صحابی نماز میں قرآن شریف پڑھ رہے تھے کہ ان کے ایک تیر آکر لگا لیکن قرآن پڑھنا ترک نہیں کیا۔ آخر ایک دوسرے صحابی سوتے تھے جاگنے کے بعد انھوں نے اس حالت کو دیکھا اور بعد سلام ان سے پوچھا تو فرمانے لگے جی نہ چاہتا کہ تلاوت قرآن کو قطع کردوں۔ (باقی خون سے وضو اور نماز کا جاتا رہنا یہ ایک فقہی بحث ہے جو مختلف فیہ ہے اور قصہ کی توجیہ دونوں پر ہوسکتی ہے۔۱۲) غرض محبت ایسی چیز ہے لیکن چونکہ ہم نے محبت کا مزہ چکھا نہیں اسلیے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ مصیبت میں ہیں اور وہ

مصیبت میں نہیں۔ کیونکہ مصیبت نام ہے حقیقت مصیبت کا نہ کہ صورت مصیبت کا

پس وہ شبہ بھی جاتا رہا کہ اللہ والے مصیبت میں ہیں اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ نافرمانی کے ساتھ راحت اور عزت نہیں۔ اور اطاعت کے ساتھ تکلیف اور ذلت نہیں۔ پس اگر ہم عزت کے خواہاں ہیں تو اطاعت خداوندی کو اختیار کریں۔ ہم نے جیسے اس کو چھوڑ دیا ہے اسی وقت سے ہماری راحت اور عزت بھی جاتی رہی مجھ کو اس وقت یہی بیان کرنا تھا جو کافی مقدار میں بحمد اللہ بیان ہو چکا ہے۔

اصلاح اخلاق و معاشرت

اب میں اس آیت کے متعلق کچھ فوائد متفرقہ بیان کرتا ہوں جو کہ زیادہ تر اہل علم کو مفید ہیں۔ یعنی علاوہ مضمون مذکور کے اس آیت کے کچھ مدلولات اور بھی ہیں اور ان مدلولات میں بھی لوگ غلطی کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک مدلول یہ ہے کہ شریعت میں جیسے کہ عقائد اور معاملات وغیرہ مقصود ہیں۔ اسی طرح حسن معاشرت میں سے ہے آیۃ میں صاف مذکور اور مامور بہ ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اس وقت لوگوں نے اجزائے دین کو مختصر کیا ہے کسی نے تو صرف عقائد کو لیا کہ من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ (المعجم الکبیر للطبرانی: ۷:۵۵) کو لے کر نماز وغیرہ سب کو اڑا دیا۔ ایسے لوگوں کا مقولہ ہے کہ سزا پا کر پٹا کر کسی وقت تو جنت میں ضرور چلے ہی جائیں گے۔ تو ان لوگوں نے اعمال کو عملاً چھوڑ دیا۔ بعض ایسے ہیں کہ انہوں نے عقائد کے ساتھ اعمال کو بھی لیا لیکن اس میں سے معاملات کو عملاً خارج کر دیا یعنی نماز روزہ وغیرہ کا اہتمام تو ہے لیکن لین دین میں اس کی ذرا پرواہ نہیں کہ یہ جائز ہوا یا ناجائز ہوا۔ نیز آمدنی کے ذرائع میں اس کا بالکل خیال نہیں۔

بعض وہ ہیں کہ انہوں نے معاملات کو جزو شریعت قرار دیا لیکن اخلاق باطن کی درستی کو شریعت کا جزو نہ سمجھ کر کچھ ضروری نہ سمجھا۔ بہت ہی کم افراد ہیں کہ وہ اس کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔ چنانچہ ایسے بھی لوگ ہیں کہ ان کو دوسرے کی اصلاح کرتے ہوئے مدتیں گزر جاتی ہیں لیکن خود ان کے اخلاق سے لوگوں کو عام طور سے تکلیف ہوتی ہے اور ان کو اپنی حالت کی ذرا پرواہ نہیں ہوتی بلکہ خبر بھی نہیں ہوتی کہ ہم نے کیا حرکت کی اور ایسے تو بہت ہی ہیں کہ اگر رستے میں کوئی غریب مسلمان ان کو مل جائے تو ابتدا بالسلام کبھی نہ

کریں گے بلکہ خود اس کے سلام کے منتظر رہیں گے۔

بعض لوگ عقائد و اعمال و معاملات کے ساتھ اخلاق باطنہ کو بھی داخل شریعت سمجھتے ہیں اور اس کا علاج بھی کرتے ہیں لیکن انھوں نے معاشرت کو شریعت سے خارج کر رکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ تو ہمارے آپس کے برتاؤ ہیں۔ ان سے شریعت کو کیا غرض۔ اگرچہ یہ ضروری ہے کہ یہ سب اجزاء مساوی نہیں ہیں تاہم واجب الرعایت سب ہیں تو اس قسم کے بہت سے لوگ دیکھنے میں آتے ہیں کہ وہ دین دار بھی ہیں اس کے اخلاق بھی مثل تواضع وغیرہ درست ہیں لیکن معاشرت میں اکثر چھوٹی باتوں میں اس طرف التفات نہیں۔ کہ ان سے دوسروں کو اذیت تو نہ پہنچے گی۔ بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں سے بہت زیادہ تکلیف پہنچ جاتی ہے لیکن اس طرف التفات نہیں ہوتا۔ حالانکہ حدیث شریف میں بکثرت وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف اسی قدر التفات اور ان کا بھی اتنا ہی اہتمام تھا۔ جتنا کہ بڑی باتوں کا تھا۔

میں نے اس باب میں ایک رسالہ کی تالیف شروع کی ہے۔ اس کا نام آداب المعاشرت رکھا ہے۔ اسی قسم کی بہت سی حدیثیں اس کے خطبے میں بھی جمع کر دی ہیں۔ آپ لوگ خدا تعالیٰ سے اس کے پورا ہونے کی دعا کریں۔ ان احادیث کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ شریعت اسلام ایسے امور کو ہرگز جائز نہیں رکھتی۔ جن سے کسی کو ذرا بھی تکلیف یا کسی قسم کا بھی بار پہنچے۔ اس وقت یہ مرض ایسا عام ہوا ہے کہ جو لوگ اللہ اللہ کرنیوالے اور ذاکر و شاغل بھی کہلاتے ہیں ان کو بھی اس کی پرواہ نہیں ہے اور انہوں نے بھی عملاً اس کو شریعت سے خارج کر رکھا ہے۔

میں نے یہی حالات دیکھ کر اپنے ذمی اس کو ضروری سمجھ لیا ہے کہ جو لوگ میرے پاس آئیں ان کو ذکر شغل میں لگانے سے زیادہ ان کے اخلاق اور معاشرت کی زیادہ توجہ کے ساتھ اصلاح کی جائے۔ آداب معاشرت میں سے کسی جزو میں حتی الوسع کمی نہ ہو۔ کیونکہ اس کی بڑی ضرورت ہے۔ ہم لوگوں سے اس کی اصلاح بالکل ہی مفقود ہوگئی ہے۔

طریق اصلاح

جب تک اس کی تفصیل معلوم نہ ہو میں اس کا ایک سہل معیار بتلائے دیتا ہوں کہ اس میں ذرا توجہ کرنے سے قریب قریب تمام آداب معاشرت خود بخود سمجھ میں آنے لگیں گے۔ وہ معیار یہ ہے کہ جب کسی شخص کے ساتھ کوئی برتاؤ کرنا ہو۔ گو وہ برتاؤ ادب و تعظیم ہی کا ہو

اول یہ دیکھ لے کہ میرے ساتھ ہو جو مجھ کو اس شخص سے ہے تو مجھ کو ناگوار اور گراں تو نہ ہوگا جو جواب اپنے ذہن سے ملے اسی کے موافق دوسرے سے برتاؤ کرے۔

ایک مرتبہ میں پڑھ رہا تھا کہ ایک صاحب میری پشت کی طرف سے آ کر بیٹھ گئے۔ تو میں نے ان کو منع کیا۔ جب نہ مانے تو میں ان کی پشت کی طرف جا کر بیٹھ گیا۔ گھبرا کر فوراً کھڑے ہوگئے۔ میں نے کہا کہ جناب پشت کی طرف بیٹھنا اگر بری بات ہے تو آپ باوجود منع کرنے کے اس سے کیوں نہیں باز آئے۔ اور اگر اچھی بات ہے تو مجھے کیوں نہیں کرنے دیتے۔ اور میں نے کہا کہ آپ اندازہ کیجئے کہ میرے پشت کی جانب بیٹھنے سے آپ کو کس قدر گرانی ہوئی۔ اسی سے میری تکلیف کا بھی اندازہ کر لیجئے۔ اور اگر بجائے میرے کوئی دوسرا بھی اسی طرح بیٹھ جائے تب بھی گرانی یقینی ہے گو میرے بیٹھنے اور اس کے بیٹھنے میں کچھ تفاوت ہو مگر ایذاء رسانی کا تو کوئی جزو بھی بلاضرورت جائز نہیں۔

خدا جانے لوگ پشت کی طرف بیٹھنے میں کیا مصلحت سمجھتے ہیں۔ آیا یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ شخص بزرگ ہے۔ ہماری عبادت اس کے اندر سے نکل کر جائے گی تو ضرور قبول ہوگی۔ گویا کہ وہ خس کی ٹٹی ہیں کہ ہوا کی طرح سے ان میں سے عبادت چھن کر جائیگی بعض لوگ تو یہ غفلت کرتے ہیں کہ جن کو بزرگ سمجھتے ہیں ان کے پشت کھڑے ہو کر نماز شروع کر دیتے ہیں کہ اگر وہ کسی ضرورت سے اٹھنا چاہیں تو اٹھ ہی نہ سکیں۔

صاحبو! یہ کیا ادب ہے کہ ایک شخص کو مقفل کر کے بٹھلایا۔ فرض کیجئے کہ نماز کی نیت باندھنے کے ساتھ ہو تو وہ کیا کریں۔ یا تو نمازی کے سامنے سے اٹھ کر جائیں یا ان کی چار رکعتیں پوری ہونے تک جبراً وقہراً بیٹھے رہیں۔

علیٰ ہذا لوگوں کی عادت ہے ہوتی ہے کہ وہ بزرگوں کے پاؤں باوجود ممانعت کے پکڑتے ہیں اور ان کی تکلیف کی ذرا پرواہ نہیں کرتے۔ اور اگر روکا جاتا ہے تو اس کے روکنے کو تصنع اور تکلف پر محمول کرتے ہیں اور باز نہیں آتے۔ حالانکہ غور کرنا چاہئیے کہ جب ان کے روکنے کو تصنع پر محمول کی تو ان کو متصنع سمجھا تو پھر وہ بزرگ ہی نہ ہوئے پھر پاؤں کیوں پکڑتے ہو۔

مجھے ایک مرتبہ بنگالے کے سفر کا اتفاق ہوا۔ وہاں جا کر اس رسم کا کچھ ایسا رواج پایا کہ شاید ہی کہیں ہو۔ جو شخص مجھ سے ملنے آتا مصافحہ کے بعد پیر کو بھی ضرور ہی پکڑتا دو چار

آدمیوں کو تو میں نے منع کیا لیکن جب دیکھا کہ کوئی نہیں مانتا تو میں نے یہ علاج کیا کہ جو شخص میرے پیر پکڑتا میں اس کے پیر پکڑ لیتا۔ وہ لوگ گھبراتے۔ تب میں کہتا کہ جناب پیر پکڑنا اگر اچھی بات ہے تو مجھے کیوں اجازت نہیں دی جاتی۔ کہنے لگے کہ آپ تو بزرگ ہیں۔ میں نے کہا کہ میں بقسم کہتا ہوں کہ میں آپ کو بزرگ سمجھتا ہوں تب لوگوں نے پیر پکڑنا چھوڑا۔

آداب تعظیم و تکریم

میں کہتا ہوں کہ ایذاء کے جو اسباب ظاہری ہیں ان کے واجب الترک ہونے میں تو کسی کو کلام ہی نہیں مگر جن کا نام آجکل کی اصطلاح میں تکریم ہے وہ بھی اگر موجب ایذاء ہو جائیں تو ان کا ترک بھی لازم ہے۔ میں نے اپنے بزرگوں کی خدمت اکثر اسلیئے نہیں کی کہ شاید میری ناواقفی کے سبب اس خدمت سے ان کو تکلیف ہو یا ان کے قلب میں میرا لحاظ ہو اور اس کے سبب اس خدمت سے ان کو تکلیف اور گرانی ہو۔ کیونکہ بعض کے قلب میں بعض کا کچھ ایسا لحاظ ہوتا ہے کہ وہ کسی طرح نکلتا ہی نہیں اگرچہ طبیعت کو کتنا ہی مجبور کیا جائے۔ تو اگر ایسا شخص آکر بدن دبانے لگے یا پنکھا جھلنے لگے تو اس سے بجائے آرام کے تکلیف ہوتی ہے۔ اب لوگ اس کی مطلق پرواہ نہیں کرتے۔ زبردستی بھی آکر چمٹ جاتے ہیں تو ان مواقع میں سمجھ سے کام لینا چاہیئے اور اگر اپنے کو اتنی سمجھ نہ ہو تو دوسرے کے کہنے کے بعد تو اصرار نہ کرے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جان فدا کرتے تھے۔ فرماتے ہیں کہ چونکہ ہم کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارا تعظیم کے لیئے اٹھنا پسند نہیں اس لیے ہم آپ کی تعظیم کو نہ اٹھتے تھے۔

مجھے اپنے ایام طالب علمی کا قصہ یاد ہے کہ جب حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ مدرسہ میں تشریف لاتے تو ہم لوگ سب ادب سے کھڑے ہوتے۔ ایک روز مولانا نے فرمایا کہ مجھ کو اس سے تکلیف ہوتی ہے تم لوگ میرے آنے کے وقت مت اٹھا کرو۔ اس وقت سے ہم نے اٹھنا چھوڑ دیا۔ دل میں ولولہ پیدا ہوتا تھا۔ لیکن یہ خیال ہوتا تھا کہ مقصود تو ان کو راحت پہنچانا ہے۔ سو جس میں ان کو راحت ہو وہی کرنا مناسب ہے۔

بعض لوگوں کو بزرگوں کے جوتے اٹھا کر چلنے پر اصرار ہوتا ہے تو نفس اس فعل کا تو مضائقہ نہیں لیکن اگر کسی وقت منع کیا جائے تو فوراً رک جانا چاہیئے کیونکہ اصرار میں تکلیف ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ تھانہ بھون کی جامع مسجد سے استاذی مولانا فتح محمد صاحب مرحوم جمعہ کی نماز پڑھ کر چلے۔ وسط فرش تک پہنچے تھے کہ ایک شخص نے آ کر ہاتھ سے جوتے لینا چاہے۔ مولانا نے براہ تواضع انکار فرمایا لیکن اس نے نہ مانا۔ آخر قیل و قال میں بہت دیر ہوگئی اور اس احمق کی بدولت مولانا کو تپش آفتاب میں کھڑا رہنا پڑا۔ جب اس نے دیکھا کہ مولونا کسی طرح نہیں مانتے تو ایک ہاتھ سے مولانا کی کلائی پکڑ لی اور دوسرے ہاتھ سے جھٹکا مارا اور جوتے لے لیے اور دوڑ کر کنارہ فرش پر رکھ آیا اور اپنی اس کامیابی پر بہت خوش ہوا۔

میں نے جو یہ حرکت دیکھی تو مجھے سخت ناگوار ہوئی اور اس شخص کو میں نے بہت ہی برا بھلا کہا اور میں نے کہا کہ ظالم تو نے جوتے لے کر چلنے کو تو ادب سمجھا۔ لیکن اس بے تمیزی اور بے ادبی کا خیال تجھ کو نہ ہوا کہ تو نے تپتے ہوئے فرش پر مولانا کو کھڑا کیے رکھا۔ اور ہاتھ کو جھٹکا دیکر جوتا چھین لیا۔

آج کل لوگوں نے خدمت تعظیم کا نام رکھا ہے حالانکہ خدمت تعظیم کو نہیں کہتے بلکہ خدمت راحت رسانی کو کہتے ہیں۔ تو جو بزرگ تعظیم سے خوش نہ ہوں اور اس سے روکیں ان کی اتنی تعظیم مت کرو۔

آداب راحت رسانی

خلاصہ یہ ہے کہ جس بات سے کسی کو تکلیف ہو اس کو بالکل ترک کر دینا چاہیئے اگرچہ وہ بصورت تعظیم ہی ہو۔ اور اگر بصورت تعظیم نہ بھی ہو تب تو ظاہر ہے کہ وہ بری اور واجب الترک ہوگی۔ مثلاً رات کو ایک شخص کی آنکھ کھلی اور استنجے کی ضرورت ہوئی۔ اور اس نے بیٹھ کر زور زور سے ڈھیلے توڑنے شروع کر دیئے جس سے قریب کے سونے والوں کی نیند خراب ہوئی اور نیند خراب ہونے سے کسی کے سر میں درد ہوگیا۔ کسی کی آنکھ میں درد ہوگیا۔ کسی کی نماز صبح قضا ہوگئی تو یہ وہ باتیں ہیں کہ بظاہر نہایت چھوٹی اور معمولی ہوتی ہیں لیکن ان کے آثار بہت مضر ہیں۔ فقہاء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر ذکر جہر سے سونے والے کی نیند میں خلل پڑتا ہو تو پکار کر ذکر کرنا حرام ہے تو جب اللہ کا نام لینا بھی تکلیف پہنچا کر جائز نہیں تو دوسرے کام تو تکلیف پہنچا کر کیونکر جائز ہوں گے۔

نسائی شریف میں حدیث ہے کہ ایک مرتبہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت عائشہؓ کے پاس آرام فرماتے تھے کہ رات کو اٹھنے کی ضرورت ہوئی تو حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ قام رویداً یعنی نہایت آہستہ اٹھے وانتحل رویداً اور جوتے نہایت آہستہ سے پہنے وفتح الباب رویداً اور نہایت آہستہ سے دروازہ کھولا وخرج رویداً اور آہستہ سے باہر تشریف لے گئے۔ غرض کئی جگہ لفظ رویداً آیا ہے۔

حدیث بہت بڑی ہے کہ حضرت عائشہؓ بھی چپکے سے اٹھ کر پیچھے پیچھے ہو لیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم جنۃ البقیع میں تشریف لے گئے۔ پیچھے پیچھے حضرت عائشہؓ بھی رہیں۔ جب آپ واپس ہونے لگے تو حضرت عائشہ جلدی سے آ کر اپنے بستر پر لیٹ گئیں۔ حضورؐ نے تشریف لا کر دیکھا کہ ان کا سانس پھول رہا ہے پوچھا۔ **مالک یا عائشۃ حشیا رابیۃ** (سنن النسائی) یعنی سانس کیوں پھول رہا ہے۔ انہوں نے چھپانا چاہا لیکن چھپ نہ سکا۔ تب انھوں نے اپنے پیچھے جانے کا قصہ بیان کیا آپؐ نے فرمایا شاید تم کو خیال ہوا کہ میں تمہاری باری میں کسی دوسری بیوی کے پاس چلا جاؤں گا تو ایسا کب ہو سکتا ہے۔ بڑی حدیث ہے۔

مجھ کو اس حدیث میں سے صرف بیان کرنا اس کا مقصود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کہ آپ کی شان وہ محبوبیت مطلقہ ہے کہ اگر آپ کسی کو تکلیف بھی پہنچائیں تب بھی راحت ہی ہو۔ پھر خاص کر حضرت عائشہؓ کے ساتھ کہ عاشق زار تھیں تو اگر ان کی آنکھ کھل بھی جاتی۔ تب بھی ناگواری کا احتمال نہ تھا لیکن چونکہ صورت تکلیف کی تھی۔ اسلیئے آپؐ نے اس کو بھی گوارا نہیں فرمایا۔ تو اتنے موانع کلفت کے ساتھ جب آپؐ نے اتنی رعایت فرمائی تو ہم کو کب اجازت ہے کہ کوئی ایسی حرکت کریں جس سے دوسروں کو تکلیف کا احتمال ہو۔

بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ سفر میں جانے والے کو کچھ نہ کچھ فرمائش کر دیتے ہیں۔ اس سے بعض اوقات اس قدر تکلیف ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ! جب میں کانپور میں تھا تو دیکھتا تھا کہ جب کوئی شخص لکھنؤ جاتا تو لوگ فرمائش کر دیتے کہ فلاں سے فلاں ترکاری لیتے آنا۔ اور بعض اوقات اس مسافر کا جائے قیام سبزی منڈی سے اتنی دور ہوتا تھا کہ وہاں تک پہنچنے کے لیے کم از کم دو آنے میں یکہ کرایہ ہوتا۔ تو دو آنے کرایہ کے اپنے پاس سے صرف کر کے تب اس فرمائش کرنے والے کی چار پیسے کی فرمائش پوری کرو اور شرم کے مارے یکے کے پیسے مت مانگو اور ایسا نہ کرو تو عمر بھر کی شکایت خریدو۔ پھر بعض تو غضب کرتے ہیں کہ

فرمائش کر کے قیمت بھی نہیں دیتے۔ گویا وہ گھر سے خزانے لے کر چلا ہے کہ اپنی اور دوسروں کی سب کی ضرورتیں پوری کر کے لائے گا۔

بعض لوگ ایسا کرتے ہیں کہ جب کسی کو جاتے ہوئے دیکھا ایک دستی خط کسی کے نام دیدیا۔ اس میں بھی اکثر اوقات بہت تکالیف ہوتی ہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مرسل مطمئن ہو جاتا ہے کہ خط مکتوب الیہ کو پہنچ گیا مگر اتفاق سے خود وہ مسافر کبھی درمیان ہی میں رہ جاتا ہے کبھی خط ضائع ہو جاتا ہے۔ یہ تو خود مرسل کی مضرت ہے کبھی مکتوب الیہ کو تنگی ہوتی ہے کہ آرندہ تقاضا جواب کا کرتا ہے کہ میں ابھی جاؤں گا۔ بعض اوقات تو فرصت نہیں ہوتی اور بعض اوقات جواب بے تحقیق لکھ دیا جاتا ہے۔

چنانچہ میرے پاس بعض دستی فتوے آتے ہیں اور لانے والا تقاضا کرتا ہے کہ میں ابھی واپس جاؤں گا۔ آخر دوسرے کام کا حرج کر کے لکھنا پڑتا اس میں بعض مرتبہ جلدی کی وجہ سے کسی پہلو سے نظر چوک جاتی ہے اور جواب میں غلطی ہو جاتی ہے۔ بعض مرتبہ جواب لکھنے کے لیے کتاب دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے اور عین وقت پر روایت نہیں ملتی۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ اسی طرح ایک شخص کو میں نے ایک مسئلہ فرائض کا جواب لکھ کر دیا۔ جب وہ لے کر چلا گیا۔ تب یاد آیا کہ جواب غلط لکھا گیا سخت تشویش ہوئی۔ اس شخص کو تلاش کرایا تو نہ ملا اور یہ پوچھا نہ تھا کہ کدھر جاؤ گے۔ آخر خدا تعالیٰ سے دعا کی کہ یا الٰہی میرے اختیار سے تو یہ خارج ہو چکا ہے اب آپ کے اختیار کی بات ہے۔ خدا تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی۔ پندرہ منٹ نہ گزرے تھے کہ وہ شخص واپس آیا کہنے لگا کہ مولوی صاحب آپ نے مہر تو کی ہی نہیں۔ مجھے بڑی مسرت ہوئی میں نے کہا کہ ہاں بھائی لے آؤ۔ اس سے لے کر جواب کو صحیح کیا اور اس سے کہا کہ بھائی مہر تو میرے پاس ہے نہیں اس وقت تو خدا تعالیٰ نے میری دعا قبول فرما کر تجھے واپس بھیجا ہے کیونکہ مسئلے میں ایک غلطی ہو گئی تھی۔ اس واقعہ کے بعد سے میں نے عہد کر لیا کہ کبھی دستی فتوے کا جواب نہ دوں گا۔

اکثر لوگ ایسے امور پر مجھے بے مروت کہتے ہیں لیکن بتلایئے کہ ان واقعات پر کیوں کر خاک ڈال دوں۔ اب میں نے یہ معمول کر رکھا ہے کہ جب کوئی شخص دستی فتویٰ لاتا ہے تو اس سے کہتا ہوں کہ اپنا پتہ لکھ کر اور دو پیسے کا ٹکٹ دے کر رکھ جاؤ۔ میں اطمینان سے

جواب لکھ کر تمہارے پاس ڈاک میں بھیج دوں گا۔

میرے چھوٹے بھائی منشی اکبر علی صاحب تو کبھی ایسا کرتے ہیں کہ جب ان کو کوئی دستی خط دیتا ہے تو کہتے ہیں کہ اس کو لفافے میں بند کر کے پورا پتہ اس پر لکھ دو تا کہ پہنچانے میں سہولت ہو۔ اس کے بعد دو پیسے کا ٹکٹ لگا کر اس کو ڈاک خانہ میں چھڑوا دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ دستی خط دینے کی زیادہ غرض یہی ہے کہ دو پیسے بچیں۔ سو ہم اپنے پاس سے یہ دو پیسے صرف کر دیں گے مگر ان خلجانوں سے تو بچیں گے۔ اور شاذ و نادر جہاں بے تکلفی ہو وہ موقع تو مستثنیٰ ہے لیکن عام طور پر ایسا کرنا بڑی تکلیف کا موجب ہوتا ہے۔

یہ چھوٹی چھوٹی مثالیں نمونہ کے طور پر عرض کر دی ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ معاشرت ایسی ہونی چاہئے کہ کسی کو کسی سے تکلیف نہ پہنچے۔

ایک علمی نکتہ

معاشرت کا مسئلہ قرآن شریف میں کئی مقام پر مذکور ہے۔ چنانچہ ایک آیت میں ارشاد ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ

(ترجمہ: اے ایمان والو اپنے گھر کے علاوہ کسی غیر کے گھر میں مت داخل ہو)

اور اس آیت کا بھی مدلول ہے جس کو شروع میں تلاوت کیا گیا ہے جیسا کہ مذکور ہوا کہ اس میں معاشرت کے دو مسئلے بیان فرمائے گئے ہیں اور یہاں ایک علمی نکتہ بھی ہے وہ یہ کہ دو حکم یہاں مذکور ہیں اس میں اول کو ثانی پر کیوں مقدم فرمایا۔

سو وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ چونکہ ان میں دوسرا حکم اول سے اشد و اشق ہے کیونکہ تفسح میں تو مجلس سے نہیں اٹھنا پڑتا اور انشروا میں مجلس سے ہی اٹھا دیا ہے۔ اسی لیئے تفسحوا کو مقدم کیا تا کہ تعلیم اور عمل میں بتدریجی ترقی ہو۔ یعنی اول سہل پر عمل کرنے سے اطاعت کی عادت پڑے پھر اشد کا کرنا بھی آسان ہو اور عجب نہیں کہ حکم ثانی پر رفع درجات کا ترتب بھی اسی لیئے ہوا ہو۔

یعنی چونکہ انشزوا کا حکم نفس پر اس وجہ سے زیادہ شاق تھا کہ اس میں عار آتی ہے تو اس پر عمل کرنا غایت تواضع ہے اور تواضع کی جزا رفعت ہے۔ اس لیئے اس پر یرفع کو مرتب فرمایا۔

پس آیت میں دونوں حکموں میں عنوان کے اعتبار سے ایک تفاوت تو یہ ہوا کہ پہلے عمل کو

فراخی پر مرتب فرمایا جو کہ عادتاً مال کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے اور مال کم درجے کا مطلوب ہے اور دوسرے عمل پر رفع درجات کو مرتب فرمایا جو کہ جاہ کے ذریعے سے ہوتا ہے اور جاہ بہ نسبت مال کے اعلیٰ درجہ کا مطلوب ہے سو یہ تفاوت تو اسی لیے ہوا کہ عمل اول نفس پر سہل تھا۔ اسلیئے جزا بھی اس کی دوسرے درجہ کی ہوئی۔ اور عمل ثانی نہایت شاق تھا اسلیئے جزاء بھی نہایت اعلیٰ درجہ کی ہوئی۔ تو عمل ثانی کے متعلق جو وعدہ ہے وہ گویا **من تواضع لله رفعه الله (الترغیب و الترهیب للمنذری)** (جس نے اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع کی، اللہ تعالیٰ اس کا مرتبہ بلند فرمادیں گے) کا ہم مضمون ہوا کہ غایت تواضع کی وجہ سے رفع درجات کا ثمرہ مرتب ہوا۔

دوسرا تفاوت عنوان میں یہ ہے کہ ثمرہ اول میں **لکم** ،بتعمیم خطاب فرمایا اور ثمرہ ثانی میں یَرۡفَعِ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ ۙ وَالَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ دَرَجٰتٍ (اللہ تعالیٰ تم میں سے مؤمنوں اور اہل علم کے درجات کو بلند فرمادیں گے) بہ تخصیص بعد تعمیم فرمایا۔ یعنی ثمرہ اول میں تمام مومنین کو درجہ مساوات میں خطاب عام ہے، اور ثمرہ ثانی میں اہل علم کو تخصیص بعد تعمیم کے طور پر اہل ایمان میں سے خاص کرکے بھی خطاب فرمایا۔

وجہ اسکی یہ ہے کہ **تفسح** کوئی امر شاق نہ تھا۔ اس میں بہت کم احتمال تھا نیت کے صاف اور خالص نہ ہونے کا۔ تو اس کے امتثال میں سب مومنین قریب قریب یکساں ہوں گے۔ بخلاف دوسرے عمل کے کہ نفس پر بہت شاق ہے اس میں احتمال ہے کہ بعضے لوگ محض وضع داری سے اٹھ کھڑے ہوں اور اس میں وہ مخلص نہ ہوں اور خلوص میں زیادہ دخل ہے علم کو کیونکہ اس سے اس کے دقائق معلوم ہوتے ہیں۔

اسلئے اس میں علم والوں کی تخصیص بعد تعمیم فرمائی۔ کیونکہ اہل علم میں منشاء امتثال بدرجہ اول پایا جائے گا۔ اس لیے وہ خلوص میں دوسرے مومنین سے زیادہ ہوں گے۔

اصلاح معاشرت کے ثمرات

ایک مدلول اس آیت کا یہ ہے کہ اصلاح معاشرت پر بھی آخرت کے ثمرے ملتے ہیں جس سے اشارہ اس طرف ہے کہ احکام شرعیہ میں سے جس امر کو تم بالکل دنیا سمجھتے ہو اس میں بھی تم کو اجر ملے گا۔ وجہ دلالت ظاہر ہے کہ فسحت اور قیام پر جو کہ معاشرت میں سے ہیں۔ اجر آخرت کا وعدہ فرمایا۔ اس کے متعلق بعض اہل زیغ نے لکھا ہے کہ مولویوں نے

www.alhaq.org

شریعت کو طومار بنا دیا ہے کہ روٹی توڑنا بھی شریعت میں داخل، پانی پینا بھی شریعت میں داخل۔ اس پر مجھے ایک دردناک قصہ یاد آیا۔

ایک شخص نے ایک کتاب شعب ایمانیہ میں لکھی ہے انھوں نے میرے پاس وہ کتاب اصلاح کے لیے بھیجی اور لکھا کہ میں نے یہ کتاب اپنے ایک عزیز کو بھی جو کہ وکالت کرتا ہے دکھلانے کے لئے بھیجی تھی۔ اس نے لکھا کہ اگر یہ سب باتیں ایمان میں داخل ہیں تو ایمان (نعوذ باللہ) شیطان کی آنت ہوا۔ اور اس کفریہ کلمہ کو نقل کر کے سخت افسوس اور رنج کا اظہار کیا تھا۔ اور اس کے جواب میں اس مؤلف نے اس وکیل کو جو خط بھیجنے کا ارادہ کیا تھا۔ وہ بھی میرے پاس اصلاح کیلئے بھیج دیا تھا۔

میں نے لکھا اختیار ہے جواب بھیج دو لیکن یہ شخص بالکل مسخ ہو چکا ہے اسلیئے نفع کی ہرگز امید نہیں۔ یہ مخاطبت سے روبراہ ہونے والا نہیں ہے اس کا اصلی جواب یہی ہے کہ اس کو خدا تعالیٰ کے حوالے کیا جائے۔ اگر کم بخت کو یہ خبر نہ تھی کہ یہ ایمان کے شعبے ہیں تو اس مضمون کو کسی مہذب پیرایہ میں لکھ سکتا تھا لیکن خبیث روح کی خباثت تہذیب کی کیسی اجازت دیتی۔

اصل یہ ہے کہ جب تک علم یا اہل اللہ کی صحبت نہ ہو ایمان کا بھی بھروسہ نہیں ہے۔ دیکھیے جہل سے کیا کلمہ کفر کا بک دیا۔

کیوں صاحب بتلایئے۔ اگر اس شخص کی بھی تکفیر جائز نہیں تو اسلام میں کفر بھی داخل ہے۔؟ لوگ کہتے ہیں کہ مولوی کافر بنا دیتے ہیں۔ صاحبو! انصاف شرط ہے۔ یہ کافر بنانے کی نسبت تو مولویوں کی طرف اس وقت ہو سکتی تھی جب کہ وہ کسی کلمۂ کفر یا عمل کفر کی تلقین کرتے اور جب کہ لوگ خود ہی اپنی جہالت اور خباثت سے کفر کرتے ہیں تو مولویوں نے کب بنایا۔ یہ تو خود بنے البتہ مولوی اس کو بتا دیتے ہیں تو علماء لوگوں کو کافر بناتے نہیں۔ بلکہ کافر بننے والوں کو کافر بتا دیتے ہیں۔ پس ایک نقطہ کا فرق ہے۔

غرض اسی قسم کے لوگوں نے دعویٰ کی ہے کہ معاشرت دین کا جزو نہیں اور ان کے رد کے لئے یہ آیت بالکل کافی ہے۔ دو طور پر ایک تو یہ کہ ان دونوں حکموں میں امر کا صیغہ آیا ہے جو کہ اصل میں وجوب کے لیئے ہوتا ہے اور یہاں کوئی صاف اصل سے نہیں۔ دوسرے اس طرح کہ اس پر ثواب کا وعدہ کیا اور ثواب ہوتا ہے دین کا کام پر۔ پس اس میں اشارہ

اس طرف ہوا کہ جس امر کو تم دنیا سمجھتے ہو اس میں بھی اگر امتثال امر کرو گے تو اس پر بھی ثواب کا ثمرہ مرتب ہوگا اور اس سے اطاعت کی فضیلت بھی معلوم ہوگئی کہ اگر ادنیٰ امر میں بھی اطاعت ہو۔ تب بھی ثمرے سے خالی نہیں۔

قبول اعمال کی شرط

ایک مدلول اس آیت کا یہ ہے کہ قبول اعمال کے لئے ایمان شرط ہے کیونکہ بیان جزا میں الذین امنوا منکم فرمایا ہے اور اگر کسی کو شبہ ہو کہ حکم اول میں تو لفظ لکم فرمایا ہے جو کہ عام ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہاں بھی ضمیر کم سے مراد اہل ایمان ہیں کیونکہ اوپر سے خطاب مومنین ہی کو ہے۔ لیکن چونکہ حکم ثانی میں تخصیص ہے بعد تعمیم کرنا تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔ اس لیئے الذین امنوا کا لفظوں میں آنا مناسب ہوا۔ نیز دوسری آیت سے بھی یہ اشتباہ معلوم ہوتا ہے۔ تو اس آیت سے اور دوسری آیت سے بھی ثابت ہے کہ بدوں ایمان کے کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا۔

اس مسئلے سے عوام الناس کے کام کی ایک بات ثابت ہوئی یعنی بعض عوام جو کہ بزرگوں سے ملنے کے لئے شائق رہتے ہیں ان میں کچھ ایسی بے تمیزی ہوگئی ہے کہ تارک تعلقات ہندوؤں کو بھی بزرگ سمجھتے ہیں اور ان مسلمانوں کو بھی جو کہ شراب پی کر سکر کی حالت میں یا جنون کی مرض میں بے تکی ہانکنے لگتے ہیں ان کو مجذوب سمجھتے ہیں اور ان لوگوں نے مجذوب کی ایک عجیب پہچان تراشی ہے کہ اگر اس کی پشت کی طرف کھڑے ہو کر درود پڑھا جائے تو فوراً ادھر منہ کر لے۔ سو اول تو یہ خود اطلاع کی بھی دلیل نہیں ممکن ہے کہ اتفاقاً منہ کر لیا۔ دوسرے زیادہ سے زیادہ اس کے صاحب کشف ہونے کی دلیل ہوگی۔ اور صاحب کشف ہونا کوئی بڑا کمال نہیں۔ اگر کافر بھی مجاہدہ و ریاضت کرے تو اس کو کشف ہونے لگتا ہے۔ نیز مجانین کو بھی کشف ہوتا ہے۔ چنانچہ صاحب شرح اسباب نے لکھا ہے کہ مجنون کو کشف ہوتا ہے۔ میں نے خود ایک مجنون کو دیکھا کہ اس کو اس قدر کشف ہوتا تھا کہ بزرگوں کو بھی نہیں ہوتا لیکن جب اس کا مسہل ہوا تو مادہ کے ساتھ ہی کشف بھی نکل گیا۔ تو کشف بھی دلیل مجذوب ہونے کی نہیں۔

غرض عوام کو یہ معلوم ہونا نہایت دشوار ہے کہ یہ شخص مجذوب ہے اور بالفرض اگر وہ

اس علامت سے مجذوب بھی ثابت ہوگئے تو تم نے مجذوب کو تو تلاش کرلیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مبارک کی بے ادبی کی کہ قصداً اس کی پشت کی طرف درود شریف پڑھا۔

سالک و مجذوب کا طریق

پھر یہ کہ اس کے مجذوب ہونے سے تم کو کیا فائدہ۔ مجذوب سے تو نہ دنیا کا فائدہ ہوتا ہے نہ دین کا۔ دین کا تو اس لیے نہیں کہ وہ تعلیم پر موقوف ہے اور تعلیم اس سے حاصل نہیں ہوتی۔ اور دنیا کا اس لیے کہ وہ دعاء سے ہوتا ہے اور مجذوب دعا کرتے نہیں۔ کیونکہ وہ لوگ اکثر صاحب کشف ہوتے ہیں۔ ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں معاملے میں اس طرح ہوگا۔ تو اس کے موافق دعا کرنا تو تحصیل حاصل ہے اور خلاف دعا کرنا تقدیر کا مقابلہ ہے۔ البتہ وہ کشف کی بناء پر بطور پیشین گوئی کچھ کہہ دیتے ہیں کہ فلاں معاملے میں یوں ہوگا۔ سو اگر وہ نہ بھی کہتے تب بھی اسی طرح ہوتا اس طرح ہو جانا کچھ ان کے کہنے کے سبب نہیں ہوا۔

ہاں سالک سے ہر طرح کا نفع ہوتا ہے کیونکہ وہاں تعلیم بھی ہوتی ہے اور دعا بھی بلکہ مجذوب کے فکر میں پڑنے سے ضرر یہ ہوتا ہے کہ لوگ شریعت کو بیکار سمجھنے لگتے ہیں حاصل کہ کہ غیر مومن کو مقبول سمجھنا بالکل قرآن کا معارضہ ہے لہٰذا جوگیوں اور جاہل فقیروں کے پیچھے پڑنا اپنی عاقبت خراب کرنا ہے۔

مراتب اہل علم و اہل ایمان

ایک مدلول اس آیت کا یہ ہے کہ اہل علم عام اہل ایمان سے افضل ہیں کیونکہ مقام مدح میں تخصیص بعد تعمیم بہ قائدہ بلاغت خود افضلیت خاص کی دلیل ہوتی ہے اور علماء کی افضلیت کی تفصیل کا یہ وقت نہیں اگر کوئی دوسرا موقع ملا تو انشاء اللہ تعالےٰ اس کو بیان کر دیا جائے گا۔

ایک مدلول اس آیت کا یہ ہے کہ عام اہل ایمان بھی اگرچہ وہ جاہل ہوں مقبول ہیں۔ کیونکہ اہل علم سے قبل اہل ایمان کو بھی مقام فضل میں فرمایا ہے۔ لہٰذا عام مومنین کو بھی حقیر اور ذلیل نہ سمجھنا چاہیئے۔ پس ہر صاحب ایمان اگر وہ مطیع ہو مقبول ہے۔ اور مطیع کی قید اس لیئے لگائی کہ فسحت اور رفع درجات کو جس سے کہ اہل ایمان کے فضل پر استدلال کیا گیا ہے اطاعت ہی پر مرتب کیا ہے۔ کیونکہ تقدیر کلام یہ ہے۔

تفسحوا فی المجالس ان تفسحوا یفسح الله واذا قیل انشزوا فانشزوا ان تنشزوا یرفع الله لکم۔ (ترجمہ: مجلسوں میں فراخی کرو اور اگر کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے لئے فراخی کریں گے اور جب تم سے کہا جائے کہ اٹھ جاؤ تو اٹھ جاؤ، اللہ تعالیٰ تمہارے مرتبے بلند کریں گے)

مطلب یہ ہے کہ جب ان دو امر میں امتثال ہوگا تو یہ مرتبہ ملے گا اور اس مدلول کے بیان کرنے سے۔ جیسے اہل علم کی اصلاح کرنا مقصود ہے کہ عوام مومنین کو حقیر نہ سمجھیں اسی طرح غیر اہل علم میں سے متکبرین کی بھی اصلاح کرنا مقصود ہے کہ ان کو بھی جلاہے تیلیوں کو ذلیل سمجھنے کا کوئی حق نہیں کیونکہ یہاں مدار فضل مطلق ایمان و اطاعت ہے خواہ کوئی قوم ہو۔

عاصی و مومن سے سلوک

ایک مدلول اس آیت کا اور ہے جو کہ ذرا غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے یعنی **فانشزوا** کے بعد جو ثمرہ مرتب کیا ہے تو ایک خاص عنوان سے کیا ہے یعنی اس طرح فرمایا۔

یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ

اور یوں نہیں فرمایا **یرفعکم والذین اوتوا العلم** پس اس وضع مظہر موضع مضمر میں اشارہ اس طرف ہوگیا کہ زیادہ دخل اس ترتب رفعت میں ایمان کو ہے۔ پس اس سے یہ بات نکل آئی کہ اگر کوئی مومن پورا مطیع نہ ہو مگر مومن ہو تو وہ بھی عنداللہ ایک گونہ رفعت سے خالی نہیں۔ تو جو لوگ عاصی مومن ہیں ان کو بھی ذلیل نہ سمجھو البتہ اگر خدا کے لیے ان پر ان کے سوء اعمال کے سبب غصہ کرو تو جائز ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہمدردی اور ترحم ہونا بھی ضروری ہے۔ نفسانی غیظ اور کبر نہ ہو اور ان میں فرق کے لیے میں ایک موٹی سی مثال بیان کرتا ہوں جس کو میرے ایک دوست نے بہت پسند کیا اور ان ہی کی پسند سے مجھے بھی اس کی بہت قدر ہوئی۔ یعنی معمولی قصوں میں غصہ دو موقعوں پر آتا ہے۔ ایک تو اجنبی پر اور ایک اپنے بیٹے پر۔ سو اجنبی سے تو اس کی شرارت پر نفرت اور عداوت ہو جاتی ہے اور اگر اپنا بیٹا وہی حرکت تو اس سے نفرت نہیں ہوتی۔ بلکہ شفقت کے ساتھ تاسف ہوتا ہے اس کے لیے دعا کرتا ہے دوسروں سے دعا کراتا ہے اس کی حالت پر دل کڑھتا ہے اور غصہ جو ہوتا ہے تو اس کے ساتھ یہ شفقت ملی ہوتی ہے۔

پس اخوۃ اسلامیہ کا مقتضا یہ ہے کہ اجنبی عاصی کے ساتھ بھی بیٹے کا سا برتاؤ رکھنا چاہیئے ۔ یعنی اگر کبھی اس پر غصہ آئے اور خیال ہو کہ یہ غصہ خدا کے لیئے ہے اس میں نفس کی آمیزش نہیں تو اس وقت دیکھنا چاہیئے کہ اگر میرا بیٹا اس حالت میں مبتلا ہوتا تو اس پر مجھے اسی قسم کا غصہ آتا یا نہیں ۔ اگر قلب سے نفی میں جواب آئے تو سمجھے کہ یہ غصہ خدا کے لیئے نہیں ہے بلکہ ترفع کا غصہ ہے اور یہ اس شخص کی معصیت سے بھی بڑھ کر معصیت ہے اور خوف کا مقام ہے ۔

خدا تعالیٰ کی ایسی شان ہے کہ اگر ایک گنہگار اپنے کو ذلیل سمجھتا ہے تو وہ مغفور ہو جاتا ہے اور اگر ایک مطیع اپنے کو بڑا سمجھتا ہے تو وہ مقہور ہو جاتا ہے ۔ سو نہ تو خدا پر ناز کرنا چاہیئے اور نہ ہی ناامید ہونا چاہیئے ۔ غرض تحقیر تو کسی مسلمان کی کرے نہیں لیکن غیظ و غضب جس کا منشا بغض فی اللہ اور رحم و ہمدردی ہو اس کا مضائقہ نہیں ۔

کبر و عجب

باقی کبر و عجب تو خدا تعالیٰ کو بہت ناپسند ہے ۔ ہمارے ہاں ایک لڑکی تھی نماز روزے کی پابند (اب اس کا انتقال ہو گیا ہے) اس کی شادی ایک ایسے شخص سے ہو گئی جو کہ اس قدر پابند نہ تھا ۔ ایک روز کہتی ہے کہ اللہ کی شان میں ایسی پرہیزگار پارسا اور میرا نکاح ایسے شخص سے ہو ۔

صاحبو! کتنی حماقت کی بات ہے کیونکہ اگر کوئی بزرگ بھی ہے تو ناز کس پر کرتا ہے بزرگی پر ناز مثال ایسی ہے جیسے کہ کوئی مریض طبیب کا نسخہ پی کر ناز کرنے لگے کہ ہم ایسے بزرگ ہیں کہ ہم نے دوا پی لی ۔ کوئی اس سے پوچھے کہ اگر دوا پی لی تو کس پر احسان کیا اور کیا کمال کیا نہ کرتا جہنم میں پڑتا ۔ البتہ بجائے ناز کے خدا تعالیٰ کا شکر کرنا چاہیے کہ اس نے اپنی اطاعت کی توفیق عطا فرمائی ۔ حاصل یہ کہ الذین امنوا سے بھی یہ معلوم ہو گیا کہ گنہگار بھی رفعت عند اللہ سے خالی نہیں ۔

قبول اعمال کا معیار

ایک مدلول اس آیت کا یہ ہے کہ الذین امنوا منکم والذین اوتوا العلم میں تخصیص بعد تعمیم سے معلوم ہوا کہ قبول اعمال کا تفاوت خلوص سے ہوتا ہے کیونکہ اہل علم کے درجات میں امتیاز اس خلوص ہی کے سبب سے تو ہوا جیسا کہ اوپر مذکور ہوا اور اس مسئلے کو بیان کرنا اس لیے

ضروری ہے کہ آج کل لوگ اعمال کے تو شائق ہیں لیکن خلوص کی پروا اکثر نہیں ہوتی۔ حالانکہ خلوص وہ چیز ہے کہ اسی کی بدولت صحابہ کرام کا مرتبہ اس قدر بلند ہوا کہ ان کا نصف مد جو خرچ کرنا اور ہمارا احد پہاڑ برابر سونا خرچ کرنا برابر نہیں۔

اور اگر کوئی کہے کہ یہ صحبت نبویہ کی برکت سے ہے تو میں کہوں گا کہ ان کا خلوص بھی صحبت ہی کی برکت سے ہے تو یہ دونوں متلازم ہیں۔ اب خواہ صحبت کو سبب کہہ دیجئے۔ خواہ خلوص کو۔ بالکل وہ حالت ہے کہ ؎

عبارا تنا شتی وحسنک واحد ☆ فکل الیٰ ذاک الجمال یشیر

(ہماری تعبیرات مختلف ہیں اور تیرا حسن ایک ہے ساری تعبیریں اسی ایک (اجمال) کی طرف اشارہ کرتی ہیں)

کہ سب ایک ہی جمال کی تعبیریں ہیں۔

میں نے اپنے پیرومرشد سے سنا ہے کہ عارف کی ایک رکعت غیر عارف کی ایک لاکھ رکعت سے افضل ہے تو وجہ یہی ہے کہ اس کی ایک رکعت میں بوجہ معرفت کے خلوص زیادہ ہوگا۔

اسی مدلول پر ایک اور بات بھی متفرع ہوتی ہے یعنی آج کل اکثر لوگ بعضے انگریزی خوانوں کی تعریف کیا کرتے ہیں کہ یہ اس قدر انگریزی پڑھے ہوئے ہیں لیکن قرآن کے بہت پابند ہیں یا نماز پنج وقتہ پڑھتے ہیں اور ان کی باطنی حالت خلوص وغیرہ پر بالکل نظر نہیں کی جاتی۔ میں بھی مدتوں اس دھوکے میں مبتلا رہا۔ مگر میرے ایک نوجوان دوست نے ایسے لوگوں کی نسبت کہا کہ بعض لوگوں میں دین کی صورت ہوتی ہے مگر دین کی حقیقت نہیں ہوتی۔ یعنی ان کے دلوں میں دین رچا ہوا نہیں ہوتا۔ اسی طرح اس قسم کے لوگوں کے دلوں میں دین کی کوئی عظمت اور محبت نہیں ہوتی گو ظاہری اعمال کے پابند ہوتے ہیں مگر امتحان کے وقت معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں کوئی خاص اہمیت و محبت دین کی نہیں اور جب یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ کیونکہ اصل دینداری یہی ہے کہ دل میں دین کی عظمت و محبت گھس گئی ہو۔ اگرچہ شاذ و نادر کسی عارض کی وجہ سے اعمال میں کسی قدر کمی بھی ہو جائے۔

آگے ارشاد فرماتے ہیں: وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ

یعنی اللہ تمہارے اعمال پر خبردار ہیں۔ اس کو ہر جملے سے تعلق ہے کہ تم ہر حکم کی پابندی

کرو اور اس میں کوتاہی نہ ہونے دو کیونکہ خدا تعالیٰ کو تمہارے باطن کی بھی خبر ہے تو خدا تعالیٰ کو اس کمی اور فروگذاشت تک کی بھی اطلاع ہو جائیگی جو تمہاری نیتوں میں بھی ہوگی۔

ایک سہل مراقبہ

گویا اس جملہ سے خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ایک مضمون کا مراقبہ سکھلایا ہے کہ اگر اس کو متحضر رکھیں تو عمل میں کبھی کوتاہی نہ ہو یعنی ہر وقت یہ خیال رکھیں کہ اللہ تعالیٰ میرے ظاہر و باطن کو دیکھ رہے ہیں۔ اس کی مزاولت سے بعد چندے ایک حال پیدا ہوگا اور ذوقاً یہ سمجھے گا کہ گویا میں خدا تعالیٰ کو دیکھ رہا ہوں۔ اور قرآن و حدیث میں اس قسم کے جتنے مضامین ہیں یہ مراقبات ہیں۔ ان میں بتلا دیا ہے کہ اطاعت کی اصل اور راسخ حالت اس وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ یہ مراقبات متحضر ہو جائیں کیونکہ جب یہ خیال پختہ ہو جاتا ہے کہ ہمارے اس کام کو بھی اطلاع ہے تو پھر اس میں کوتاہی نہیں ہوا کرتی۔

اور یہ نہایت سہل مراقبہ ہے اس میں فی نفسہ کسی شیخ کی کسی خلوت وغیرہ کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص اس سے منتفع ہو سکتا ہے لیکن اس وقت کچھ ایسے عوارض ہو گئے ہیں کہ ان کی وجہ سے عادت اللہ یوں جاری ہے کہ کسی قدر خلوت کی اور کسی کامل شیخ سے مشورے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ اس وقت علوم اور اعمال میں ایک گونہ ضعف آ گیا ہے۔

شرط اعمال

توضیح اسکی یہ ہے کہ ہر عمل میں دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک تو رائے کے درست ہونے کی۔ اور دوسرے ہمت کی۔

ہم لوگوں میں دونوں کی کمی ہے۔ رائے کی کمی یہ کہ بسا اوقات بعض اعمال کے منشاء یا ناشی کے متعلق ہم ایک امر کو شر سمجھتے ہیں اور وہ تا خیر ہوتا ہے اور بسا اوقات کسی امر کو ہم خیر سمجھتے ہیں اور وہ شر ہوتا ہے۔ علیٰ ہذا البعض اوقات باوجود درستی راءے کے کسی عمل میں ہمت اکثر ٹوٹ جاتی ہے پس شیخ چونکہ صاحب تجربہ و صاحب بصیرت ہوتا ہے اس سے رائے کی بھی مدد ملتی ہے اور اس کے کہنے میں کچھ برکت ہوتی ہے۔

کہ اس سے ہمت بھی زیادہ ہو جاتی ہے اور اس کی رسم اصلی جو کچھ بھی ہو۔ یہ ضرور

قدرتی بات ہے کہ جب کسی کو شیخ بنالیا جاتا ہے تو اس کی مخالفت کم ہوتی ہے۔ تو رائے کے صحیح کرنے کا اور ہمت کے قوی کرنے کا عادۃً بجز شیخ بنانے کے اور کوئی ذریعہ نہیں۔ پس بقاعدہ مقدمۃ الواجب عمل کے لیے کسی شیخ کا دامن پکڑنا ضرور ہوگا۔

شیخ کامل کی شناخت

اور شیخ کامل ہونا چاہیے اور اس کے پہچاننے میں اکثر غلطی ہو جاتی ہے لہٰذا اس کی پہچان معلوم کرنا ضروری ہے۔ سو پہچان یہ ہے کہ۔

۱: علم دین بقدر ضرورت رکھتا ہو خواہ پڑھ کر یا علماء کی صحبت سے۔

۲: عمل میں مستقیم ہو۔

۳: امر بالمعروف ونہی عن المنکر طالبین کو کرتا ہو۔

۴: کسی مسلم شیخ سے تعلق رکھتا ہو۔

۵: علماء سے نفور نہ ہو ان سے استفادے میں عار نہ کرے۔

۶: اس کی صحبت میں رغبت آخرت ونفرت عن الدنیا کی خاصیت ہو۔

پس جس شخص میں یہ علامتیں ہوں وہ کامل ہے اس سے ارتباط پیدا کرلو۔ یہ مضمون تھے جو اس وقت بیان کیے جانے ضروری سمجھے گئے۔

اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ توفیق عمل عطا فرمائیں اور حسن خاتمہ۔ (آمین)

اکبر الاعمال

ذکر اللہ کی حقیقت وضرورت کے متعلق یہ وعظ آپ کی اہلیہ صغریٰ کے مکان پر بروز جمعرات ۱۸، جمادی الثانی ۴۸ھ کو ہوا جہاں ۶۰ کے قریب زن و مرد جمع تھے یہ وعظ سوا دو گھنٹوں میں ختم ہوا۔ اور مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی ؒ نے قلم بند فرمایا۔

آج کل واعظین زیادہ اعمال کے فضائل ہی بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ فضائل اعمال سے تو اکثر لوگ واقف ہیں۔ البتہ ان کی ضرورت سے غافل ہیں گو وہ شعائر دین ہی سے کیوں نہ ہوں۔ حالانکہ بعض اعمال گو وہ شعائر دین سے نہ بھی ہوں شعائر دین کی اصل وجڑ ہیں۔ جیسے حسیات میں پھلوں اور پتوں پر نظر ہوتی ہے اور جڑوں کی طرف کوئی نہیں دیکھتا۔ اسی شرعیات کی جڑ سے ہم غافل ہیں۔ محض فروع پر نظر ہے جو ایک بہت بڑی کوتاہی ہے۔

خطبۂ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره و نومن به و نتوكل عليه ونعو ذ بالله من شر و ر انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادی له ونشهد ان لا ا له الا الله وحده لا شريک له ونشهد ان سيدنا و مو لنا محمدا عبده ورسوله صلى الله تعالیٰ عليه وعلى اله وا صحابه و بارک وسلم. اما بعد فاعو ذ بالله من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم وَلَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ ؕ وَاللّٰہُ یَعۡلَمُ مَا تَصۡنَعُوۡنَ (العنکبوت:۴۴)

ترجمہ: اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو جانتا ہے)

ضرورت بیان

میں نے جس حصہ آیت کی تلاوت کی ہے اس میں دو جملے ہیں مقصود بالبیان صرف پہلا جملہ ہے دوسرے کو برکت کے لیے پڑھ دیا ہے مقصود وَلَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ کا بیان کرنا ہے۔ سامعین غالباً اس کی تلاوت ہی سے سمجھ گئے ہوں گے کہ مقصود ذکر اللہ کے متعلق کچھ کہنا ہے اور شاید متبادر یہ ہوا ہو۔ میں ذکر اللہ کی فضیلت بیان کرونگا کیونکہ آجکل واعظین زیادہ تر اعمال کے فضائل ہی بیان کرتے ہیں مگر مجھے فضیلت کا بیان کرنا مقصود نہیں کیونکہ آج کل فضائل اعمال سے تو اکثر لوگ واقف ہیں البتہ ان کی ضرورت سے غافل ہیں گو وہ شعائر دین ہی سے کیوں نہ ہوں۔ اور جو اعمال شعائر دین سے نہ ہوں مگر شعائر دین کی اصل اور جڑ ہیں اسلیئے ضرورت میں وہ شعائر سے کم نہیں مگر عام طور پر ان کو ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ چنانچہ بہت لوگ پھلوں سے تو واقف ہیں اور باغ میں جا کر پھلوں اور پتوں کو دیکھتے بھی ہیں مگر جڑوں کو کوئی نہیں دیکھتا نہ کسی کا ان کی طرف خیال جاتا ہے کیونکہ جڑوں کے ساتھ پھلوں اور پتوں کا تعلق نظری ہو گیا ہے بوجہ اس تعلق کے مستور ہونے کے۔

تو جیسا حسیات میں جڑوں کی طرف توجہ کم ہے اسی طرح شرعیات میں ہماری بعینہ یہی حالت ہے کہ جڑ سے غافل ہیں محض فروع پر نظر ہے۔ اسی لیے فضائل اعمال پر سب کی نظر ہے ضرورت پر بہت کم نظر ہے اور اس میں زیادہ خطا عوام کی نہیں بلکہ خطا ہماری ہے کہ ہم تعلیم کرنے والے بھی زیادہ تر فضائل ہی کو بیان کرتے ہیں ضرورت کو بیان نہیں کرتے اور یہ بڑی کوتاہی ہے میں ضرورت کو بیان کروں گا۔

شعائر دین اور ان کی حقیقت

ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ ذکر اللہ بہت بڑی چیز ہے۔ ظاہر میں لوگ اس سے یہی سمجھے ہوں گے کہ صرف فضائل کی وجہ سے بڑی چیز ہے مگر اس کے علاوہ ذکر اللہ ضرورت کی وجہ سے بھی بڑی چیز ہے۔ اس طرح سے فی نفسہٖ ضروری ہے اور دیگر ضرورت کی بھی جڑ ہے گو یہ شعائر دین سے نہ ہو مگر حقیقت میں یہ شعائر کی بھی جڑ ہے۔

شعائر دین وہ اعمال ہیں جو اسلام کی کھلی علامات ہیں۔ جن سے دوسروں کو یہ معلوم ہو جائے کہ ان اعمال کے بجالانے والا مسلمان ہے۔ مگر یہ ضرور نہیں کہ جو چیز کھلی علامت نہ ہو وہ ضروری بھی نہ ہو بلکہ ممکن ہے کہ ایک عمل شعائر میں نہ ہو۔ لیکن شعائر کی بھی جڑ ہو۔

حسیات میں اس کی مثال بال کمانی ہے کہ ظاہر میں وہ گھڑی کا بڑا پرزہ نہیں بلکہ چھوٹا سا پرزہ ہے جس کو دیکھ کر ناواقف شاید یہ سمجھے کہ معمولی چیز ہے مگر درحقیقت سب پرزے اسی وقت کارآمد ہیں جب بال کمانی درست ہو ورنہ سب بے کار ہیں یعنی گھڑی سے جو مقصود ہے وہ بدوں اسکے حاصل نہیں ہو سکتا گو اس کی خوب صورتی میں کمی نہ آئے اور جیب میں رکھنے سے دیکھنے والے بھی سمجھیں گے کہ آپ کے پاس گھڑی ہے۔

اسی طرح ذکر اللہ کو سمجھئے کہ گو خود نماز روزہ کے درجہ میں شعائر سے نہیں مگر تمام شعائر کی جڑ اور بنیاد ہے اور شعائر کی حقیقت تو یہ ہے کہ شریعت کو بعض انتظامات بھی مقصود ہیں اسلیئے شریعت نے بعض اعمال کو مصلحت انتظام سے اسلام کی علامات قرار دیدیا ہے جن سے لوگوں کو ایک دوسرے کے اسلام کا علم ہو جائے اور احکام اسلام کا اس پر اجرا کیا جائے۔ یہ علامات شعائر ہیں اور یہ ضروریات دین سے ہیں یعنی جن کا جزو دین ہونا خاص و عام ہر کسی کو معلوم ہے اور ضروریات کا درجہ اتنا بڑا ہے کہ اگر کوئی شخص ضروریات کا منکر ہو۔ خواہ وہ

انکار تاویل سے ہو یا بدوں تاویل کے وہ کافر ہے اور اس کا یہ عذر بھی نہ سنایا جاوے گا کہ مجھ کو علم نہ تھا۔ بخلاف غیر شعائر کے۔ مثلاً کوئی مسائل رہن وغیرہ کا انکار کرے وہ علی الاطلاق کافر نہ ہوگا۔ بلکہ اس میں یہ تفصیل ہوگی کہ آیت قرآنیہ کے سننے کے بعد انکار کرے تو کافر ہوگا۔ ورنہ نہیں کیونکہ مسئلہ رہن کا جزو دین ہونا بالمعنیٰ مذکور ضروریات میں سے نہیں اور نماز روزہ زکوٰۃ و حج وغیرہ کا جزو دین ضروریات سے ہے ان کا انکار مطلقاً کفر ہے۔ یہاں یہ عذر بھی مسموع نہ ہوگا کہ مجھے اس کے جزو دین ہونے کا علم نہ تھا گو عند اللہ معذور ہو (اگر واقعی اس کو علم نہ تھا) مگر یہ عذر قضاءً مسموع نہ ہوگا۔ حاکم اسلام اس پر کفر کا حکم لگا کر بینونیت زوجہ وغیرہ کا حکم جاری کر دے گا۔ **(الا ان یکون قد اسلم فی دار الحرب ثم ھا جر فا نکار ہ قبل الھجرۃ لایکون کفرا. لظھور عذرہ فی عدم العلم ۱۲)**

غرض حکمت انتظام و اجراء احکام کی وجہ سے بعض اعمال کو شعائر میں سے قرار دیا گیا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو شعائر نہ ہوں وہ ضروری نہیں۔ دیکھئے ایک تصدیق بالقلب ہی ہے گو یہ شعائر اصطاحیہ میں سے نہیں دیا گیا۔ ہاں اقرار باللسان شعائر میں سے ہے۔ مگر کیا تصدیق ضروری بھی نہیں۔

یہ عجیب مثال اس وقت ذہن میں آئی۔ جس سے میرا دعویٰ بخوبی ثابت ہو گیا۔ کہ یہ ضروری نہیں کہ جو شعائر میں سے نہ ہو وہ ضروری نہ ہو۔ کیونکہ ایمان و اسلام کیلئے تصدیق بالقلب کی ضرورت پر سب کا اتفاق ہے مگر اس کو شعائر میں سے اس لیئے شمار نہیں کیا گیا کہ شعائر سے جو مقصود یعنی ظہور ایمان و اجراء احکام وہ اس سے حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ تصدیق قلبی کی کسی کو اطلاع نہیں ہو سکتی۔ مگر ضروری ایسا ہے کہ تمام اعمال کی جڑ ہے بلکہ ایمان و اسلام کا مدار حقیقی اسی پر ہے بدوں تصدیق بالقلب کے عند اللہ کوئی شخص مسلمان نہیں گو ظاہر میں اس کو مسلمان کہا جاتا ہے۔

پس یہ ہم لوگوں کی بڑی کوتاہی ہے کہ ہم نے ضرورت کو صرف شعائر تک محدود کر رکھا ہے اور جو اعمال شعائر سے نہ ہوں ان کو ضروری نہیں سمجھتے۔ تصدیق کی مثال نے اس غلطی کو اچھی طرح واضح کر دیا اور بتلا دیا کہ جو اعمال شعائر دین سے شمار کیے گئے ہیں ان کو شعائر اسلام صرف اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ لوگوں کو ان کے ذریعہ سے ایک دوسرے کا اسلام بسہولت معلوم ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ سمجھ لینا کہ جو شعائر نہیں وہ غیر ضروری ہیں سخت غلطی ہے۔

ذکراللہ کے معنیٰ

ولذکراللہ اکبر کے معنیٰ یہ ہیں کہ ذکراللہ اس وجہ سے بھی اکبر ہے کہ افضل ہے اور اس واسطے بھی اکبر ہے کہ وہ تمام فضائل کی جڑ ہے۔ نیز تمام اوامر ونواہی کے امتثال واجتناب کی بھی جڑ ہے اور اکبر میں دو احتمال ہیں یا تو مقطوع عن الاضافۃ ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ ذکراللہ فی نفسہ بہت بڑی چیز ہے یا مفضل علیہ کی طرف اضافت ملحوظ ہو۔ تو معنیٰ یہ ہوں گے کہ تمام اعمال سے اکبر ہے۔

یہ تو آیت کی توجیہ تھی اب اس کی ضرورت کو سنئے جس سے بہت لوگ غافل ہیں۔ اول تو لوگوں کو آج کل دین کا اہتمام بھی کم ہے اور جن کو ہے بھی تو نماز فرض اور نوافل و مستحبات کا تو اہتمام کرتے ہیں مگر ذکراللہ سے غافل ہیں۔

یہاں شاید کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ جب تم کو یہ تسلیم ہے کہ لوگوں کو مستحبات کا اہتمام ہے اور مستحبات میں تلاوت قرآن بھی داخل ہے اور تلاوت قرآن کا بہت لوگوں کو اہتمام بھی ہے پھر یہ کہنا کیوں کر صحیح ہوا کہ ذکراللہ کا اہتمام نہیں کیونکہ تلاوت قرآن تو ذکراللہ کی بڑی فرد ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ میری مراد ذکر حقیقی ہے اور وہی اکبر کا مصداق ہے۔ اس کا اہتمام بہت کم ہے۔ رہی تلاوت قرآن تو وہ ذکر کی ایک صورت ہے اس کے اہتمام سے یہ لازم نہیں آیا کہ ذکر حقیقی کا بھی اہتمام ہے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ بعض اعمال کی صورت پائی جاوے ورنہ اگر حقیقت پائی جاتی۔ تو اس کے سب آثار لازمہ ضرور پائے جاتے جیسے مداریا فقیروں کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ وظیفوں کے بڑے پابند ہیں۔ بزرگوں کا شجرہ روزانہ پڑھتے ہیں۔ مگر نماز روزہ سے کچھ واسطہ نہیں۔ معلوم ہوا اس کو ذکر کی حقیقت حاصل نہیں۔ یہی حاصل ہے میری شکایت کا۔

شجرہ پڑھنے پر مجھے علی حزیں کی حکایت یاد آئی (یہ ایرانی شاہزادہ ہے بڑا شاعر تھا حزیں اس کا تخلص ہے گو شاعر حزیں نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ مسرور رہتا ہے اور مسرت کے سامان جمع کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے تو وہ برائے نام حزیں تھا۔ حقیقت میں حزیں نہ تھا بلکہ بڑا مسخرہ تھا) وہ دہلی آیا تو ایک رئیس کا مکان کرایہ پر لیا۔ چونکہ نازک مزاج تھا۔ اسلیے رئیس نے اس کی راحت کا سامان مہیا کیا۔ اس کے ایک گوشہ میں ایک مداریا فقیر رہتا تھا جو رات کو بہت سویرے سے اٹھ کر بزرگوں کا شجرہ پکار پکار کر پڑھتا تھا۔ جس سے علی حزیں کی نیند اڑ گئی۔ پھر وہ فقیر تو شجرہ پڑھ کر سو بھی گیا ہو کیونکہ صبح کی نماز کی اس کو کچھ ضرورت نہ تھی مگر علی حزیں صبح

تک کروٹیں بدلتا رہتا۔ صبح کو وہ رئیس مزاج پرسی کو آئے کہ جناب کو کسی قسم کی تکلیف تو نہیں۔ علی حزیں نے کہا کہ اور تو سب راحت ہے البتہ ایک تکلیف ہے اس کو رفع کر دیجئے۔ وہ یہ کہ اس تذکرۃ الاولیاء کو یہاں سے الگ کر دیجئے۔

تذکرۃ الاولیاء خوب لقب دیا کہ کیونکہ شجرہ میں بزرگوں کا تذکرہ ہی ہوتا ہے۔ تو دیکھئے ان لوگوں کو وظیفہ کا تو اہتمام ہوتا ہے مگر دوسرے اعمال کا اہتمام نہیں ہوتا۔

تھانہ بھون میں ایک صاحب اب بھی زندہ ہیں انھوں نے خود ہی مجھ سے کہا کہ میری نماز تو چاہے قضا ہو جائے مگر پیر کا بتایا ہوا وظیفہ قضا نہیں ہوتا۔ تو کیا اس وظیفہ کو آپ ذکر حقیقی کہہ سکتے ہیں؟۔ ہرگز نہیں۔ یہ کیسا ذکر حقیقی ہے جو دوسرے اعمال اس سے متخلف ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ یہ ذکر حقیقی نہیں بلکہ محض صورت کا ذکر ہے۔

توسل کی حقیقت

شاید یہاں کسی کو یہ سوال پیدا ہو کہ بزرگوں کے شجرہ کو تم نے ذکر میں کیوں داخل کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ شجرہ کا حاصل دعا التوسل ہے اور دعا ذکر کی فرد ہے یہ تو وہ شجرہ ہے جس میں بزرگوں کے واسطہ سے دعا مانگی جائے۔ جیسے ہمارے حاجی صاحب کا شجرہ ہے اور ایک شجرہ دوسرا ہے کہ پیر کے نام کا وظیفہ پڑھا جائے۔ (جیسے یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ۱۲) یہ ناجائز ہے۔

اور ابن تیمیہؒ تو پہلے شجرہ کو بھی ناجائز کہتے ہیں کیونکہ وہ توسل بالاموات کو مطلقاً منع کرتے ہیں۔ گو مسئلہ اجتہادی ہے مگر ہم یہ ضرور کہیں گے کہ ان کی رائے صحیح نہیں کیونکہ توسل کا حاصل یہ ہے کہ اے اللہ فلاں بزرگ کے طفیل سے ہمارے حال پر رحمت فرما۔ اب اس میں صرف اشکال یہ ہے کہ اس بزرگ کی بزرگی کو رحمت حق میں کیا دخل اور اس سے کیا تعلق ہے؟

اس اشکال کو میں نے بہت سے علماء سے کرنا چاہا مگر کسی سے حل کی امید نہ تھی ایک جگہ امید تھی کہ یہ اشکال حل ہو جاتا مگر وہاں ادب کی وجہ سے زیادہ عرض کرنے کی ہمت نہ ہوئی یعنی حضرت مولانا گنگوہیؒ قدس اللہ سرہ، سے حل کی امید تھی۔ مگر میں نے حضرت سے جو عرض کیا کہ حضرت توسل کی کیا حقیقت ہے؟ تو فرمایا سائل کی کون ہے؟ حضرت نے میری آواز اس وقت نہ پہنچانی اور بینائی زائل ہو چکی تھی۔ میں نے عرض کیا اشرف علی سائل ہے۔ حضرت نے تعجب سے فرمایا کہ تم توسل کی حقیقت پوچھتے ہو۔ بس میں خاموش ہو

گیا۔ پھر عرض کرنے کہ ہمت نہ ہوئی۔ یا تو اس واسطے کہ مکرر سوال کرنے میں کرکری ہوگئی کہ ایسی آسان بات بھی معلوم نہ ہوئی۔ یا یوں کہو کہ ادب کی وجہ سے خاموش ہوگیا اور یہ سمجھا کہ حضرت اس وقت اس مسئلہ کو بیان کرنا نہیں چاہتے مگر حضرت کی شان یہ تھی ؎

اے لقائے تو جواب ہر سوال ☆ مشکل از تو حل شود بے قیل وقال

غور سے سنیئے کیونکہ یہ حقیقت اس عنوان سے کتابوں میں آپ کو نہ ملے گی اور اس کے یاد کر لینے سے بڑا اشکال حل ہو جائے گا وہ یہ کہ توسل بالصحاء کی جو صورت ہے کہ اے اللہ! فلاں شخص میرے نزدیک آپ کا مقبول ہے اور مقبولین سے محبت رکھنے پر **المرء مع من احب** میں آپ کا وعدہ رحمت ہے آپ سے اس رحمت کو مانگتا ہوں۔ پس توسل میں یہ شخص اپنی محبت کو اولیاء اللہ کے ساتھ ظاہر کر کے اس محبت پر رحمت و ثواب مانگتا ہے اور محبت اولیاء اللہ کا موجب رحمت و ثواب ہونا نصوص سے ثابت ہے۔ چنانچہ متحابین فی اللہ کی فضائل سے احادیث بھری ہوئی ہیں۔

اب یہ اشکال جاتا رہا کہ بزرگ کی بزرگی اور برکت کو رحمت حق میں کیا دخل؟ دخل یہ ہوا کہ اس بزرگ سے محبت رکھنا حب فی اللہ کی فرد ہے اور حب فی اللہ پر ثواب کا وعدہ ہے اس تقریر کے بعد میں **اما بنعمة ربک فحدث** پر عمل کر کے تحدث بالنعمة کے طور پر کہتا ہوں کہ ابن تیمیہ اگر یہ تقریر سنتے تو توسل کے جواز کا ہرگز انکار نہ کر سکتے کیونکہ اس کے سب مقدمات صحیح ہیں۔

اللہ کے ساتھ بے ادبی

میرا حسن ظن یہ ہے کہ علامہ ابن تیمیہؒ نے اپنے زمانہ کے جاہلوں کے توسل سے منع فرمایا ہے۔ جس کی حقیقت استعانت واستغاثہ ہے (یا یہ کہ وہ لوگ اولیاء اللہ کو کارخانہء قدرت میں دخیل دار سمجھتے تھے کہ خدا تعالیٰ نے بہت سے کام ان کے سپرد کر دیئے ہیں وہ ان کے واسطہ ہی سے ہو سکتے ہیں ۱۲)

آج کل بھی اس خیال کے لوگ بہت موجود ہیں جیسے ایک درویش کے مریدوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ ان کے نام کا وظیفہ پڑھتے ہیں۔ میں نے ان درویش کو تو نہیں دیکھا اس لیے ان کو میں کچھ نہیں کہتا مگر ان کے مریدوں کو دیکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وارث خدا تعالیٰ کا نام بھی تو ہے یا وارث کا وظیفہ ممنوع کیوں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کیا خدا تعالیٰ کا نام وارث

ہی ہے۔ سب ناموں کو چھوڑ کر اسی کا وظیفہ کرنا اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ نعوذ باللہ خدا بھی اس واسطے پسند آیا کہ پیر کا ہم نام ہے۔ استغفر اللہ! استغفر اللہ! اور یہ نیت نہ بھی ہو تو اس کا ایہام تو ہے اور شریعت نے ایہام سے بھی منع کیا ہے۔

ہماری جماعت میں بھی پچھلے دنوں میں یہ مرض آ گیا تھا کہ بعض خطوط میں اور تحریرات میں **بامداد اللہ** اور **ھو الرشید** لکھنے لگے تھے میں نے اس سے منع کیا اور میں کیا بتلاؤں کہ مجھے اس سے کس قدر تکلیف ہوتی تھی مجھے تو اس میں سے بوئے شرک آتی تھی۔ کیا اس کی جگہ بعون اللہ نہیں لکھ سکتے تھے۔

صاحبو! ادب اور محبت تو وہ چیز ہے کہ کانپور میں عبد الرحمٰن خان صاحب مالک مطبع نظامی کے حجام کا نام بھی عبد الرحمٰن تھا تو خاں صاحب کے خاندان نے اس کا نام بدل کر عبد اللہ رکھ دیا تھا۔ تاکہ ندا کے وقت خاں صاحب کو ایذاء نہ ہو اور اشتراک و مساوات کا ایہام نہ ہو۔

پھر کیا صوفیوں اور عالموں کو اشتراک و مساوات کے ایہام سے نہ بچنا چاہیئے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ آج کل لوگ خدا تعالیٰ کا ادب نہیں کرتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تو کچھ ادب کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کا بالکل ہی ادب نہیں کرتے اور اس کے بارہ میں ایک مصرع بھی مشہور ہے۔

با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

مگر اول تو اس کے متعلق یہ سوال ہے کہ یہ کون سی نص ہے جس کی تقلید جائز ہو۔ دوسرے اگر کسی عارف کا قول ہو تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کو ندا کر سکتے ہیں کہ اے اللہ! مجھے روزی دیدے اس طرح حضورؐ کا نام نہ لو۔ بلکہ آپ کے نام کے ساتھ جائز ہے کہ توحید پر دال ہے۔ دوسرے اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرنا لازم ہے اور کثرت ذکر میں قیود دشوار ہوتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ بے ادبی کی یہ حالت ہے کہ جب کوئی جوان کو موت ہوتی ہے تو اس وقت برادری کے لوگ جمع ہو کر کہتے ہیں کہ اے ہے کیسی بے وقت موت ہوئی۔ بے چارہ کے چھوٹے چھوٹے بچے بے سرے رہ گئے۔ گویا اس کا تو فیصلہ کر لیا کہ یہ موت بے موقع و نامناسب ہوئی۔ اس کے بعد بوجھ بجھکڑ صاحب (یعنی جو عقلمند شمار ہوتے ہیں) فرماتے ہیں کہ بھائی تقدیر میں کسی کو دم مارنے کی جگہ نہیں خدا کی ذات بڑی بے پرواہ ہے گویا انھوں نے

اس بے موقع محل کی وجہ خدا تعالیٰ کی بے پرواہی کو قرار دیا تو نعوذ باللہ ان کے نزدیک خدا تعالیٰ کے بے پرواہ ہونے کے معنی یہ ہوئے کہ ان کے یہاں کوئی نظم نہیں۔ کسی کے حال پر رحم نہیں۔ پس اودھ کی سلطنت ہے یا ان نیاؤنگر ہے کہ عدل وانصاف کی خیال ہی نہیں۔

ان نیاؤنگر کا ایک قصہ عوام میں مشہور ہے کہ ایک گرو اور ایک چیلہ جارہے تھے۔ ایک بستی پر گزر ہوا جس کا نام ان نیاؤنگر معلوم ہوا اور وہاں دیکھا کہ ہر چیز کا ایک ہی بھاؤ ہے۔ دودھ بھی سولہ سیر روپے کا۔ اور گھی بھی سولہ سیر روپے کا۔ کاغذ بھی سولہ سیر روپے کا۔ گرو نے چیلہ سے کہا کہ یہ جگہ رہنے کی نہیں یہ تو ان نیاؤنگر ہے۔ یہاں انصاف کا نام نہیں ہر چیز کا ایک ہی بھاؤ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہاں چھوٹے بڑے میں کچھ فرق نہیں۔ یہاں رہنے میں خطرہ کا اندیشہ ہے۔

چیلہ نے کہا نہیں یہاں گھی دودھ بہت سستا ہے یہاں ضرور قیام کرلو۔ گھی دودھ خوب ملے گا گرو نے کہا اچھا مگر مجھے خطرہ ہے۔

چیلہ کھا پی کر بہت موٹا ہو گیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد راجہ کے ایوان پر گزر ہوا جہاں ایک مقدمہ پیش تھا۔ قدمہ یہ تھا کہ دو چور چوری کرنے چلے۔ ایک مکان میں نقب لگائی۔ پھر ایک چور نقب کے اندر گھسا دوسرا باہر تھا کہ نقب میں اوپر سے اینٹیں گر گئیں جس سے وہ چور مر گیا تو دوسرا چور مدعی تھا کہ اس کی اینٹوں سے میرا رفیق مر گیا اس مکان والے کو سزا ہونا چاہیئے۔

راجہ نے پوچھا ایسا مکان کیوں بنایا تھا اس نے کہا یہ معمار کا فعل ہے معمار کو بلا کر باز پرس کی اس نے کہا گارا مزدور لاتا تھا وہ گارا پتلا لایا جس سے تعمیر مضبوط نہ ہوئی مزدور بلایا گیا اس نے کہا یہ سقہ کا فعل ہے اس نے پانی زیادہ چھوڑ دیا گارا پتلا ہو گیا سقہ کو بلا کر پوچھا گیا اس نے کہا اس وقت ایک مست ہاتھی بھاگا ہوا آتا تھا میں بدحواس ہو گیا پانی زیادہ گر گیا۔ فیل بان کو بلایا گیا اس نے کہا کہ میری خطا نہیں ایک عورت میرے ہاتھی کو سامنے آگئی اس کے زیور کی جھنکار سے ہاتھی بدک گیا اس عورت کو بلایا گیا عورت نے کہا میری خطا نہیں سنار کی ہے۔ سنار کو بلایا گیا۔ سنار کے پاس کچھ معقول عذر نہ تھا وہ خاموش ہو گیا۔ اس غریب کے لیے پھانسی کا حکم ہو گیا پھانسی کا پھندا اس کے گلے سے بڑا تھا۔ اطلاع کی گئی کہ اس کے گلے میں پھندا نہیں آیا پھندا بڑا ہے حکم ہوا کہ اچھا سنار کو چھوڑ دو کسی موٹے آدمی کو پھانسی دیدو۔ وہاں سارے مجمع میں یہ چیلہ سب سے موٹا تھا۔ اس کو پھانسی کے واسطے لے گئے۔

چیلہ بڑا گھبرایا اور گرو سے کہا کہ مجھے بچاؤ۔ کہا میں نے تجھ سے کہا نہ تھا کہ یہ جگہ رہنے کی نہیں ہے دودھ گھی کا مزہ اور دیکھ! کہا میری توبہ ہے اب تو مجھے بچالو پھر ایسی مخالفت نہ کروں گا۔ گرو نے پھانسی والوں سے کہا کہ اس کو چھوڑ دو مجھے پھانسی دیدو۔ چیلہ نے جو یہ دیکھا کہ میری خاطر گرو خود پھانسی پر چڑھنے کو تیار ہو گیا اس کے دل نے یہ گوارا نہ کیا کہ میں زندہ رہوں اور گرو کو میری خاطر پھانسی ہو۔ اس نے کہا ہرگز نہیں بلکہ مجھے پھانسی دو۔ اب دونوں میں جھگڑا ہونے لگا چیلہ کہتا ہے مجھے پھانسی دو اور گرو کا اصرار تھا کہ مجھے دیدو۔

اس کی اطلاع راجہ کو ہوئی اس نے گرو کو بلایا اور پوچھا تم کس واسطے جھگڑ رہے ہو۔ اس نے کہا حضور! مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ گھڑی ایسی ہے کہ جو اس وقت پھانسی پائے گا سیدھا بیکنٹھ میں جائے گا۔ اسلیئے میں چاہتا ہوں کہ مجھے پھانسی مل جائے راجہ نے کہا اچھا یہ بات ہے تو بس ہم کو پھانسی دے دو۔

چنانچہ راجہ کو پھانسی دے دی گئی۔ خس کم جہاں پاک۔ سارا جھگڑا ہی مٹ گیا۔ گرو نے چیلہ سے کہا بس اب یہاں سے چل دو۔ یہ جگہ رہنے کی قابل نہیں ہے۔

یہ قصہ یوں ہی ایک مثل سی معلوم ہوتی ہے مگر اس میں بدنظمی اور بے انصافی کا فوٹو خوب کھینچا گیا ہے۔ تو آجکل لوگوں نے خدا تعالیٰ کو نعوذ باللہ ان نیاؤ نگر کا راجہ سمجھ لیا ہے کہ نامناسب اور خلاف مصلحت اور بے موقع کام کرتے ہیں۔ اس مضمون کو آج کل اس جملہ سے ادا کیا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات بڑی بے پرواہ ہے جس موقع پر یہ جملہ استعمال کیا جاتا ہے۔ کفر کو مستلزم ہے مگر یہ دیوبندی علماء کا حوصلہ ہے کہ ان لوگوں پر کفر کا فتویٰ نہیں دیتے کیونکہ ان کو اس کے کفر ہونے کی خبر نہیں نہ کفر کی نیت ہے۔

صاحبو! خدا تعالیٰ کا بے پرواہ ہونا بھی صحیح ہے مگر پرواہ کے دو معنیٰ ہیں۔ ایک احتیاج دوسرے توجہ اور رعایت۔ پس خدا تعالیٰ اس معنی کے بے پرواہ ہیں کہ کسی کے محتاج نہیں اور اس معنی کے بے پرواہ نہیں ہیں کہ کسی کی مصلحت کی رعایت نہیں کرتے بلکہ وہاں مراعات مصالح کامل طور پر ہے مگر اس کی ضرورت نہیں کہ خدا تعالیٰ اپنے افعال کی تم کو مصلحت بھی بتلائیں اور نہ ہم کو اس کا منتظر رہنا چاہیئے کہ مصالح معلوم کریں ہمارا مذہب تو یہ ہے ؎

زبان تازہ کردن باقرار تو ☆ نینگیختن علت از کار تو

(آپ کی ربوبیت کا اقرار کرنا آپ کے کاموں میں علتیں نکالنے کو مانع ہے)

اور یہ مذہب ہے

ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود (جو امر محبوب حقیقی کی طرف سے ہو اسی میں خیر ہے)

صاحبو! ایک ادنیٰ کسبی سے بھی اس کا کوئی عاشق اس کے افعال و احکام کی علت و حکمت نہیں پوچھتا۔ محض اس وجہ سے کہ اس کے ساتھ محبت ہے۔

نیز حکام اور آقاؤں سے بھی ان کے احکام کی علت و حکمت نہیں پوچھی جاتی کیونکہ دل میں ان کی عظمت ہے اصل یہ ہے کہ محبت و عظمت سوال عن الحکمت سے اور انتظار علم حکمت سے مانع ہے۔ اب جو لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام و افعال کی علت و حکمت معلوم کرنے کے درپے ہیں۔ درحقیقت ان کے دل میں خدا اور رسول کی محبت و عظمت جیسی ہونا چاہیے ویسی نہیں ہے پس خدا تعالیٰ کا بے پرواہ ہونا بمعنی غیر محتاج ہونا صحیح ہے چنانچہ خود حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ۚ إِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ

اور جو کوئی محنت کرے تو اپنے ہی واسطے کرتا ہے یقیناً اللہ تعالیٰ اہل عالم سے بے نیاز ہیں۔

اس میں طاعات خلق سے استغناء ظاہر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے مجاہدات و طاعات کی حاجت نہیں۔ ایک جگہ ارشاد ہے۔

اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۖ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ

اس میں معاصی و کفر سے استغناء ظاہر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے کفر و معاصی سے کچھ ضرر نہیں پہنچ سکتا بلکہ ان کی تو یہ شان ہے

من نکردم خلق تا سودے کنم ☆ بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم

(میں نے مخلوق کو اس لئے پیدا نہیں کیا کہ ان سے کچھ فائدہ حاصل کروں بلکہ اس لئے پیدا کیا کہ ان پر جود و کرم کروں)

یہ معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے غنی ہونے کے جو قرآن میں ہے اور وہ معنی جو مشہور ہیں کفر ہیں کیونکہ سارا قرآن رؤف الرحیم سے بھرا ہوا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ

کہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر بڑے مہربان ہیں۔ غرض آج کل اللہ کے ساتھ لوگ بہت بے

ادبی کرتے ہیں کوئی یا وارث کا وظیفہ پڑھتا ہے کوئی بامداد اللہ لکھتا ہے۔

ادب کی تعلیم

مقربین کو تو ذرا ذرا سی بات پر گوشمالی کی جاتی ہے ہمارا جہل ہمارے کام آ گیا کہ ہم سے ان باتوں پر گرفت نہیں ہوتی یا کم ہوتی ہے۔

ایک بزرگ کا واقعہ میں نے ایک کتاب میں دیکھا ہے کہ کسی چیز کی نسبت ان کی زبان سے یہ نکل گیا تھا کہ بہت لطیف ہے اس پر ان سے مواخذہ ہوا کہ او بے ادب لطیف ہمارا نام ہے دوسرے پر اس کو کیوں جاری کیا؟ مجھے خوب یاد ہے کہ جب سے یہ حکایت دیکھی تھی۔ برسوں کسی چیز کو میں نے لطیف نہیں کہا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو روزمرہ کے الفاظ میں بھی ادب کی تعلیم دی ہے چنانچہ ارشاد ہے کہ خبثت نفسی نہ کہو کیونکہ مسلمان کبھی خبیث نہیں ہوتا اور اپنے باندی غلام کو عبدی امتی نہ کہو بلکہ فتائی فتاتی کہو۔ غرض ادب بہت بڑی چیز ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

بے ادب را اندریں رہ بار نیست ☆ جائے او بر دار شد دار نیست

(بے ادب کے لئے اس راہ میں کچھ حصہ نہیں اس کا مقام دار پر ہے نہ کہ دربار میں ہے)

اور فرماتے ہیں ؎

ہر کہ گستاخی کند اندر طریق ☆ باشد او در لجۂ حیرت غریق

(جو شخص راہ طریق میں گستاخی کرتا ہے حیرت کے گڑھے میں غریق رہتا ہے)

طریق باطن میں سب سے زیادہ ادب کا اہتمام ہے کیونکہ اہل باطن خاص قرب کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس طریق ادب سے بہت نعمتیں ملتی ہیں۔ اور بے ادبی سے نعمتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرماتے تھے کہ مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ کے بے نظیر علوم کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ مولانا میں ادب بہت تھا۔ جب طریق باطن میں شیوخ و معلمین کا اس قدر ادب لازم ہے تو اللہ تعالیٰ کا ادب کیوں لازم نہ ہوگا۔

دوسرے یاد رکھو کہ بزرگوں کے نام کا وظیفہ پڑھنا خدا تعالیٰ کو تو ناراض کرنا ہی ہے خود وہ بزرگ بھی اس سے ناراض ہوتے ہیں جیسے کوئی شخص چیف ریڈر کو کلکٹر کے سامنے کلکٹر کہنے لگے تو خود چیف ریڈر بھی اس ناراض ہوگا۔

تو ممکن ہے کہ علامہ ابن تیمیہ کے زمانے میں توسل کی کوئی ایسی ہی صورت ہو جیسے لوگ پیروں اور بزرگوں کے نام کا وظیفہ پڑھتے ہیں اسلیئے قصداً تو انھوں نے اس توسل خاص کو منع کرنا چاہا مگر انتظام عام کی وجہ سے مطلقاً توسل کو منع کر دیا۔ جیسے ہم لوگ آج کل رہن کو مطلقاً منع کرتے ہیں کیونکہ عادت عام یہ ہے کہ رہن بدوں شرط انتفاع کے نہیں ہوتا اور یہ صورت حرام ہے۔

یہ تاویل ہے ان کے قول کی اور تاویل کی ضرورت اس لئے ہے کہ وہ بڑے آدمی ہیں۔ بعض علماء نے ان کو مجتہد کہا ہے ورنہ درحقیقت توسل کی وہ صورت جو میں نے بیان کی ہے حرام نہیں ہے۔ اگر یہ کہو کہ توسل کی جو حقیقت تم نے بیان کی ہے وہ تو کسی کو بھی معلوم نہیں پھر اس حقیقت کا قصد کر کے کون توسل کرتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جو بات جائز ہے وہ اس وقت تک جائز رہے گی جب تک ناجائز کا قصد نہ کیا جائے اور یہ ظاہر ہے کہ اہل حق جو توسل کرتے ہیں وہ ناجائز معنی کا قصد نہیں کرتے گو جائز معنی کا بھی قصد نہ ہو۔

صورت اور حقیقت کا فرق

یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ علی حزیں نے اس فقیر کو جو شجرہ پڑھتا تھا تذکرہ الاولیاء کہا تھا۔ اور میں نے اس حکایت کو بیان کر کے یہ کہا تھا کہ دیکھئے یہ فقیر شجرہ پڑھتا تھا جس کی حقیقت دعا بالتوسل ہے اور دعا بھی ذکر کا ایک فرد ہے تو ظاہر میں وہ ذاکر تھا مگر حقیقی ذکر اس کو حاصل نہ تھا کیونکہ نماز روزہ سے معرا تھا۔ اگر وہ حقیقی ذاکر ہوتا تو دوسرے اعمال سے معرا نہ ہوتا۔ تو اس کا ذکر پوست بادام تھا بادام نہ تھا۔

پس ذکر کی دو قسمیں ہیں ایک صورت ذکر ایک حقیقت ذکر۔ اور ذکر ہی کیا بلکہ ہر چیز کی دو قسمیں ہیں ایک صورت شے ایک حقیقت شے۔ آدمی بھی دو قسم کے ہیں۔ ایک صورت کے آدمی۔ دوسرے واقعی آدمی۔ مولانا اسی کو فرماتے ہیں۔

ایں کہ می بینی خلاف آدم اند ☆ نیستند آدم غلاف آدم اند
گر بصورت آدمی انسان بدے ☆ احمدؐ و بوجہل ہم یکساں بدے
اے بسا ابلیس آدم روئے ہست ☆ پس بہر دستے نباید داد دست

(یہ جو کچھ کہ تو دیکھ رہا ہے آدمی ہونے کے خلاف ہے یہ آدمی نہیں ہیں یہ آدمی کے اوپر کا غلاف ہے اگر آدمی کی صورت کی وجہ سے انسان ہوتا تو احمد اور ابو جہل یکساں ہوتے، اے طالب آدمی کی صورت میں بہت سے شیطان بھی ہیں پس ہر ایک سے رجوع اور بیعت نہ کرنی چاہیے)

نماز کی بھی دو قسمیں ہیں ایک صورت نماز ایک حقیقت نماز بے وضو کے نماز پڑھی جائے تو وہ صورت نماز ہو گی حقیقی نماز نہ ہو گی۔ جیسے کسی گنوار نے وعظ میں سنا تھا۔ بے وضو کے نماز نہیں ہوتی۔ وہ جواب دیتا ہے بارہا کردیم وشد۔

اسی طرح مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ سے لوگوں نے ایک مرد و عورت کا رشتہ بیان کر کے ان کے نکاح کے متعلق سوال کیا تھا۔ فرمایا ان کا نکاح نہیں ہو سکتا وہ سائل کہتا ہے ہم نے تو کیا تھا ہو گیا تھا۔

اسی قسم کا واقعہ مولانا شاہ سلامت اللہ صاحب کانپوری کے زمانہ میں ہوا کہ مولانا نے ایک مرد و عورت کے نکاح سے انکار کیا ان کا نکاح باہم نہیں ہو سکتا۔ لوگ مصر ہوئے کہ اب تو بارات آگئی ہے جس طرح بھی ہو کر دیجئے۔ مولانا نے دھمکایا کہ پاگل ہوئے ہو۔ میں حرام کو حلال کیسے کر دوں۔ اس سوا روپیہ کا ناس ہو۔ لوگوں نے ایک ملا کو سوا روپیہ دے کر بلا لیا اور ایجاب و قبول کرا لیا۔ پھر مولانا سے کہنے آئے کہ واہ ہم نے تو سنا تھا کہ تم بڑے عالم ہو مگر تم سے ذرا کام نہ ہوا جو ہمارے ملا نے کر دیا۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں حقیقی نکاح تو نہ ہوا ہاں نکاح کی صورت پائی گئی کہ ایجاب و قبول ہو گیا۔ چھوہارے بٹ گئے اور ملا کو سوا روپیہ مل گیا اس سے زائد کچھ نہیں ہوا۔

استطراداً ایک بات اس وقت اور ذہن میں آگئی کہ اس طرح مصیبت کی بھی دو قسمیں ہیں ایک صورت مصیبت ایک حقیقت مصیبت اس سے ایک سوال کا جواب حاصل ہو جائے گا۔ وہ سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ

کہ جو تم پر جو مصیبت بھی آتی ہے تمہارے اعمال کی وجہ سے آتی ہے اور ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر بھی حوادث کا نزول ہوا۔ اور بعض انبیاء کو قتل تک کیا گیا اور موت کو قرآن میں بھی مصیبت کہا گیا ہے فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ

نیز غزوہ احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دنداں مبارک پر صدمہ آیا۔ سر میں زخم آیا۔ تو کیا نعوذ باللہ حضرات انبیاء سے بھی کوئی گناہ سرزد ہوا تھا جس کی وجہ سے ان پر یہ مصائب نازل ہوئے اہل حق کا تو مذہب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں۔ گناہوں سے پاک ہیں۔ حشویہ نے انبیاء کی قدر نہیں کی۔ وہ ان کو معصوم نہیں مانتے ہیں۔

میں کہتا ہوں حشویہ کا یہ قول نقل کے تو خلاف ہے ہی عقل کے بھی خلاف ہے کیونکہ دنیا کے حکام بھی جس کے سپرد کوئی عہدہ کرتے ہیں تو انتخاب کر کے اس کو حاکم بناتے ہیں تو کیا خدا تعالیٰ کے یہاں عہدہ نبوت کے لیے انتخاب نہیں یا ان کا انتخاب ایسا غلط ہے کہ ایسے اشخاص کو نبوت کو عہدہ دے دیا جاتا ہے کہ اوروں کو قانون کا پابند بنا دیں اور خود قانون کے خلاف کریں عقل کبھی اس کو باور نہیں کر سکتی۔

پس جواب اشکال کا یہ ہے کہ انبیاء کو جو کچھ پیش آیا وہ مصیبت نہ تھی بلکہ صورت مصیبت تھی اور یہ محض تاویل ہی نہیں بلکہ اس کی ایک دلیل ہے میں آپ کو ایک معیار بتلاتا ہوں جس سے حقیقت مصیبت اور صورت مصیبت میں فرق معلوم ہو جائے گا۔ وہ یہ کہ جس مصیبت سے انقباض اور پریشانی بڑھے وہ تو گناہوں کی وجہ سے ہے اور جس سے تعلق مع اللہ میں ترقی ہو۔ تسلیم و رضا زیادہ ہو وہ حقیقت میں مصیبت نہیں۔ گو صورت اس کی ہو۔ اب ہر شخص اپنے گریبان میں منہ ڈال کر خود دیکھ لے کہ مصیبت کے وقت اس کی کیا حالت ہوتی ہے اور اسی معیار کو لے کر حضرات انبیاء و اولیاء کے مصائب اور اہل دنیا کے مصائب میں موازنہ کرے تو اس کو معلوم ہوگا کہ حضرات انبیاء و اولیاء پر ان واقعات سے یہ اثر ہوتا تھا کہ پہلے سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق بڑھتا اور رضا و تسلیم میں ترقی ہوتی تھی اور وہ غایت انقیاد و تفویض سے یوں کہتے تھے ؎

اے حریفاں راہ ہارا بستہ یار ☆ آہوئے لنگیم واو شیر شکار
غیر تسلیم و رضاء کو چارہ ☆ ور کف شیر نر خونخوارہ

(اے حریفوں یار کے تمام راستے بند کر دیئے ہیں ہم لنگڑے ہرن اور شکار کے ہرن کی طرح ہیں سوائے تسلیم و رضا کے اور کچھ چارہ نہیں کیونکہ شیر نر خونخوارہ کے پنجہ میں ہیں۔

اور یوں کہتے ہیں ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من ☆ دل فدائے یار دل رنجان من

(ناخوش کرنے والا ہی کیوں نہ ہو مگر وہ میرے لئے خوش کن ہے جو یار دل کو رنج دینے والا ہے میں اپنی جان اس پر قربان کرتا ہوں)

یہ حشویہ کی حماقت ہے کہ انھوں نے انبیاء کو اپنے اوپر قیاس کرلیا اور کہہ دیا کہ وہ بھی ہم جیسے بشر ہیں ان سے بھی گناہ ہو جاتے ہیں ان پر بھی مصائب آتے ہیں اور یہ نہ دیکھا کہ ہمارے مصائب میں کتنا زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس قیاس فاسد ہی نے مخلوق کو تباہ کیا ہے اور یہی تو وہ بات ہے جس کی وجہ سے بہت سے کفار کو ایمان نصیب نہ ہوا کیوں کہ انہوں نے انبیاء کا ظاہر دیکھ کر ان کو اپنے جیسا سمجھا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں۔

جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد ☆ کم کسے زابدال حق آگاہ شد
گفتہ اینک ما بشر ایشاں بشر ☆ ما و ایشاں بستۂ خوابیم و خور
ایں ندانستند ایشاں از عمیٰ ☆ درمیاں فرقے بود بے منتہا
کار پاکاں را قیاس از خود مگیر ☆ گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

(تمام دنیا اسی خام خیالی کی وجہ سے گمراہ ہوگئی کہ انہوں نے اولیاء اللہ کو پہچانا نہیں۔ کہنے لگے کہ ہم بھی انسان ہیں وہ بھی انسان ہیں، وہ بھی کھاتے پیتے ہیں ہم بھی کھاتے پیتے ہیں، ان بیوقوفوں نے یہ خیال نہ کیا کہ ہم میں اور ان میں بڑا فرق ہے، بزرگوں کے افعال کو اپنے اوپر مت گمان کرو، اگرچہ ظاہر میں دونوں کے فعل یکساں ہیں جس طرح لکھنے میں شیر اور شیر یکساں ہیں)

ایک شخص نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے

شیر آں باشد کہ آدم می خورد ☆ شیر آں باشد کہ آدم می خورد

(شیر وہ درندہ ہے جو مردوں کو کھا جاتا ہے اور دودھ وہ نعمت ہے جسے انسان پیتے ہیں)

آغوش میں لینا دو طرح ہے ایک چور کو پکڑ کر بغل میں دبانا گو دبانے والا حسین و محبوب ہی ہو۔ مگر چور اس دبانے سے خوش نہ ہوگا کیوں کہ وہ عاشق نہیں ہے وہ اس دبانے سے پریشان ہوگا بھاگنا چاہے گا اور ایک آغوش میں لینا یہ ہے کہ محبوب اپنے عاشق کو بغل میں لے کر دبائے اور زور سے دبائے۔ اب تم اس کے دل سے پوچھو کہ وہ کیا کہتا ہے کیا وہ اس تکلیف کی وجہ سے آغوش محبوب سے نکلنا چاہے گا ہرگز نہیں بلکہ یوں کہے گا۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ☆ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ وہ تیری تلوار سے ہلاک ہو، دوستوں کا سر سلامت رہے کہ تو ان پر خنجر آزمائی کرے)

اسی طرح حق تعالیٰ دو طرح کے لوگوں دباتے ہیں۔ ایک تو ان کو جو چور ہیں اور ایک ان کو جو اللہ تعالیٰ کے عاشق ہیں۔ چور تو خدا کی بندش سے گھبراتا ہے اور عشاق کی یہ حالت ہے ؎

اسیرش نخواہد رہائی ز بند ☆ شکارش بخوید خلاص از کمند

(تیرا قیدی قید سے رہائی کا خواہش مند نہیں ہوتا، تیرا قیدی جال سے خلاصی کا طالب نہیں)

اور یہ حالت ہے کہ ؎

خوشا وقت شوریدگاں غمش ☆ اگر تلخ بینند و گر مرہمش
گدایانے از پادشائی نفور ☆ بامیدش اندر گدائی صبور
دما دم شراب الم درکشند ☆ وگر تلخ بینند دم درکشند

(اس کے غم میں پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے خواہ اپنے زخموں پر نظر پڑے یا اس کے زخموں پر مرہم، وہ لوگ تو ایسے فقیر ہیں جن کو بادشاہی سے نفرت ہے اور اس کی امید میں گدائی پر صبر کئے ہوئے ہیں، جو دمادم رنج کی شراب پیتے ہیں اگر تلخ دیکھتے ہیں تو خاموش ہو جاتے ہیں)

اب تو آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ ایک صورت مصیبت ہے ایک حقیقت مصیبت ہے۔ حقیقت مصیبت تو واقعی گناہوں سے ہی آتی ہے مگر صورت مصیبت رفع درجات اور امتحان محبت کے واسطے بھی آتی ہے۔

ذکر اللہ کے درجات

اسی طرح ذکر کے دو درجے ہیں ایک حقیقت ذکر ایک صورت ذکر۔ تو جو وظیفچی نماز نہیں پڑھتے ان کو صورت ذکر حاصل ہے حقیقی ذکر حاصل نہیں جیسے مٹی کا ہاتھی بھی نام کا ہاتھی تو ہے مگر کام کا ہاتھی نہیں ہے۔

مٹی کے ہاتھی پر اکبر و بیربل کی ایک حکایت یاد آئی کہ اکبر نے بیربل سے کہا کہ یہ مشہور ہے کہ تین ہٹیں بہت سخت ہیں راج ہٹ۔ تریا ہٹ۔ بالک ہٹ۔ یعنی بادشاہ کی ہٹ۔ عورت

کی ہٹ۔ اور بچوں کی ضد۔ تو ان میں بادشاہ وعورت کی ضد کا سخت ہونا تو مسلم ہے کیونکہ وہ عاقل ہیں ممکن ہے کوئی ایسی ضد کریں جو پوری نہ ہو سکے مگر بچوں کی ضد کا پورا کرنا کیا مشکل ہے۔

بیربل نے کہا کہ حضور سب سے زیادہ مشکل یہی ہے البتہ عاقل کے لیے آسان ہے۔ اکبر نے کہا کہ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ بیربل نے کہا کہ اچھا مجھے اجازت دی جائے کہ میں بچہ بنوں اور بچوں کی طرح ضد کروں۔ کہا اچھا۔ اب بیربل رونے لگا۔ اوں اوں اوں۔ اکبر نے کہا کیا ہے کیوں روتا ہے کہا ہم تو ہاتھی لیں گے اکبر نے فیل خانہ سے ایک ہاتھی منگا دیا کہ لو۔ وہ پھر رونے لگا۔ کہا اب کیا چاہتے ہو۔ کہا ہم تو کلھیا لیں گے اکبر نے ایک کلھیا منگا دی۔ وہ پھر رونے لگا کہا اب کیا چاہتے ہو۔ کہا اس ہاتھی کو کلھیا میں رکھ دو۔ اب تو اکبر بڑا گھبرایا کہ یہ ضد کیوں کر پوری ہو۔ کہا واقعی بال ہٹ بڑی سخت ہے مگر تم نے جو کہا تھا کہ عاقل کو آسان ہے تو عاقل یہاں کیا عقل کیا چلائے گا۔ بیربل نے کہا حضور عاقل کو واقعی آسان ہے۔ اکبر نے کہا اچھا اب ہم بچہ بنتے ہیں تم ہماری ضد پوری کرو۔ چنانچہ اکبر نے بھی یہی سبق دہرایا کیونکہ ان کو تو ایک ہی سبق یاد تھا۔ پھر جب اکبر نے ہاتھی مانگا تو بیربل نے بازار سے مٹی کا ننھا سا ہاتھی منگا دیا۔ جب کلھیا مانگی تو بڑی سی کلھیا منگا دی۔

جب ہاتھی کو کلھیا میں رکھنے کو کہا اس نے آسانی سے رکھ دیا اور کہا حضور آپ نے جو بچہ کی ضد پر فیل خانہ سے ہاتھی منگایا یہ غلطی تھی۔ بچوں کے لیے انھی کے مذاق کا ہاتھی منگانا چاہیے۔ غرض مٹی کا ہاتھی بھی بچوں کے نزدیک ہاتھی ہے مگر حقیقت میں ہاتھی نہیں ہے۔

اسی طرح ذکر میں دو درجے ہیں جو ذکر حقیقی ہے وہ اور ہے اور صورت ذکر اور ہے۔ ذکر حقیقی سارے معاصی سے بچنے کو اور تمام اوامر کے بجالانے کو مستلزم ہے اور وہ بہت سہل ومختصر ہے۔

ہماری کوتاہی

مگر آج کل ہم لوگ واجد علی شاہ کے زمانہ کے احدی ہو گئے ہیں (نہ معلوم یہ کیا لفظ ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ لفظ احدی ہے چونکہ یہ لوگ جانثار ہوتے ہیں ان کا تعلق صرف ایک ذات سے تھا اس لیے ان کو احدی کہا گیا۔ پھر چونکہ ان کا کام اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ جب ضرورت ہو تو بادشاہ کی جان کی حفاظت کریں اور ایسا موقع شاذ و نادر پیش آتا تھا۔ ورنہ تنخواہ لے کر مزے کرتے تھے اس واسطے یہ لوگ سست اور کاہل رہا کرتے تھے)

ان احدیوں کی ایک حکایت مشہور ہے کہ دو احدی ایک جگہ رہتے تھے۔ دونوں میں باہم یہ عہد ہوا تھا کہ ایک دن ایک لیٹا رہے دوسرا اس کی حفاظت کرے دوسرے دن دوسرا لیٹا رہے پہلا اس کی خدمت کرے ایک دن ایک لیٹا ہوا تھا ایک سوار پاس سے گزرا اس نے آواز دی میاں سوار ذرا یہاں آنا اس نے پاس آکر کہا کیا ہے کہا کہ میرے سینے پر جو بیر رکھا ہے یہ ذرا میرے منہ میں ڈال دے سوار نے کہا کم بخت میں گھوڑے سے اتروں اور ڈالوں تو خود اپنے ہاتھوں سے کیوں نہ ڈال لے۔ کہا اجی اب ہاتھ کون ہلائے اور منہ تک اسے کون لے جائے۔ سوار نے اس کے ساتھی سے جو بیٹھا ہوا تھا کہا کہ تو ہی اس منہ میں ڈال دے وہ جھلا کر کہتا ہے کہ جناب مجھ سے ایسی بات نہ کہئے گا آپ کو واقعہ معلوم نہیں۔ کل میرے لیٹنے کی باری تھی یہ بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے جمائی لی۔ اس وقت ایک کتا میرے منہ میں پیشاب کر گیا۔ اس کم بخت نے اس کو ہٹایا تک نہیں۔ اب میں اس کو ضرور بیر کھلاؤں گا۔ سوار نے دونوں پر لعنت بھیجی اور چل دیا۔

تو جیسے ان بے وقوفوں نے اپنی کاہلی سے ایک آسان کام کو مشکل بنالیا تھا ایسے ہی ہم لوگوں نے بھی آسان کو مشکل بنا رکھا ہے، ہم لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ذاکر وہ ہے جو بیوی بچوں کو چھوڑ دے۔ اچھے سامان کو، اسباب راحت چھوڑ دے یہ بالکل غلط ہے البتہ غیر ضروری سامان کے لیے اہتمام و فکر کرنا یہ بے شک برا ہے کیونکہ خدا سے غافل کرنے والا ہے اور اگر بدوں اہتمام کے حاصل ہو تو مضائقہ نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک خواب میں فرمایا ہے۔

رایت طائفة من امتی راکبین هذا البحر ملوکا علی الا سرة یجاهدون فی سبیل الله او نحوه

کہ میں نے اپنی امت کی ایک جماعت کو دریا میں سفر کرتا ہوا جہاد کیلئے دیکھا۔ وہ ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے بادشاہ تخت پر بیٹھے ہوں یعنی شاہانہ ساز و سامان کے ساتھ جارہے ہیں تو حضورؐ نے ان لوگوں کی فضیلت بھی بیان فرمائی اور یہ بھی فرمایا کہ وہ شاہانہ سامان کے ساتھ ہوں گے۔ معلوم ہوا کہ شان و شوکت کا سامان مطلقاً مذموم نہیں اور جن بزرگوں نے سلطنت ترک کر دی ہے یہ ان کا غلبہء حال تھا ورنہ حضرات کی یہ حالت تھی کہ انھوں نے دنیا و دین کو جمع کر کے دکھلا دیا اور ان کی یہ شان تھی۔

رهبان اللیل لیوث النهار رات کو عابد و زاہد تھے دن کو بہادر شیر تھے۔

فرمائش میں احتیاط

حضرت سلطان نظام الدین اولیاء کے یہاں شاہانہ ساز و سامان تھا۔ مگر اہتمام سے جمع نہ ہوا تھا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ بھیجتے تھے اس لیے جمع ہو گیا تھا۔ چنانچہ آپ کے یہاں وزراء اور سلاطین بھی بعض دفعہ دستر خواں پر حاضر ہوتے تھے اور سب کو ان کے مذاق کے موافق کھانا ملتا تھا۔

ایک بار وزیر حاضر تھا۔ کھانے کا وقت آ گیا خادم نے اطلاع کی کہ کھانا تیار ہے وزیر صاحب کے دل میں مچھلی کے کباب کا خیال آیا کہ اس وقت مچھلی کے کباب بھی ہوں تو اچھا ہے۔ سلطان جی کو اس خطرہ کا کشف ہو گیا خادم سے فرمایا ذرا ٹھہرو تھوڑی دیر کے بعد پھر آیا کہ کھانا ٹھنڈا ہوا جاتا ہے فرمایا ذرا اور ٹھہرو۔ اتنے میں ایک شخص سر پر خوان لیے ہوئے حاضر ہوا کہ حضور کو فلاں امیر نے سلام عرض کیا ہے اور حضرت کے لیے مچھلی کے کباب بھیجے ہیں حضرت نے ہدیہ قبول فرمایا اور خادم کو حکم دیا کہ کھانا لے آؤ۔ وزیر صاحب کو یہ بھی احتمال ہوا کہ شاید میری فرمائش ہی کی وجہ سے کھانے میں دیر کی گئی اور کباب کا انتظار کیا گیا تھا اور یہ بھی احتمال ہوا کہ شاید اتفاق ہو۔ خادم نے دستر خواں بچھا کر سب کے سامنے کھانا رکھنا شروع کیا تو سلطان جی نے فرمایا کہ مچھلی کے کباب وزیر صاحب کے سامنے زیادہ رکھنا ان کو اس کا بہت شوق ہے۔ اب وزیر صاحب سمجھے۔ پھر سلطان جی نے فرمایا کہ وزیر صاحب فرمائش کا تو مضائقہ نہیں۔ مگر ذرا گنجائش رکھ کر فرمائش کرنا چاہیئے۔

دیکھئے اس وقت دیر ہونے سے سب کو تکلیف ہوئی۔ اب تو وزیر کو یقین ہو گیا ہو گا کہ حضرت کو میرے خطرہ کا کشف ہو گیا تھا۔

ترقی دین و دنیا

غرضکہ اہل اللہ میں ایسے بھی ہوئے ہیں جنھوں نے دنیا کے ساز و سامان کے ساتھ دین میں ترقی حاصل کی ہے۔ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار بھی ایسے ہی بزرگ ہیں جن کے یہاں بہت کچھ ساز و سامان تھا مگر اہل طریق ان کے کمال سے واقف تھے اور اپنے زمانہ میں وہ مشہور بزرگ تھے۔ چنانچہ مولانا جامی بھی شہرت سن کر آپ کے پاس کے پاس حاضر ہوئے تھے۔ مگر مولانا جامیؒ کے مذاق پر فقر کا غلبہ تھا وہ اہل باطن کے لئے باطنی فقر کے

ساتھ ظاہری ظاہری فقر کو بھی ضروری سمجھتے تھے خواجہ صاحب کا ساز و سامان اور شان شوکت دیکھ کر مکدر ہوئے اور جوش میں یہ کہہ ڈالا ؎

نہ مرد است آں کہ دنیا دوست دارد (وہ اللہ والا نہیں جو دنیا کو دوست رکھتا ہے)

اور خفا ہو کر مسجد میں چلے گئے۔ حق تعالیٰ کو ان کی دست گیری مطلوب تھی۔ اس لیے مسجد میں جو سوئے تو خواب دیکھا کہ میدان قیامت قائم ہے اور ایک شخص مولانا جامی کے سر ہو رہا ہے کہ تمہارے ذمہ میرے چند پیسے ہیں ادا کرو۔ ورنہ نیکیاں دو۔ یہ بڑے پریشان ہوئے۔ پھر دیکھا کہ خواجہ عبید اللہ احرار کی سواری آرہی ہے۔ وہ ان کے پاس پہنچ کر رکے اور اس شخص سے فرمایا کہ فقیر کے کیوں سر ہو رہا ہے یہ میرا مہمان ہے۔ اس نے اپنے حق کا ذکر کیا۔ فرمایا ہم نے جو خزانے یہاں جمع کر رکھے ہیں ان میں سے اپنا حق لے لو۔

مولانا جامی یہ خواب دیکھ کر بیدار ہوئے تو نماز ظہر کا وقت تھا اور خواجہ صاحب مسجد میں داخل ہو رہے تھے اس وقت ان کو معلوم ہوا کہ یہ شخص دنیا دار نہیں بلکہ مقبول بارگاہ ہے۔ دوڑ کر خواجہ صاحب کے قدموں میں گر پڑے اور خطرہ کی معافی مانگی اور خدمت میں قبول کرنے کی درخواست کی۔

خواجہ صاحب نے تسلی دی کہ اچھا جو چاہو گے ہو جائے گا۔ مگر ذرا اپنا وہ مصرع تو پھر سنا دو۔ مولانا نے عرض کیا کہ وہ تو میری حماقت تھی۔ فرمایا ایک بار تم نے اپنی خوشی سے پڑھا تھا۔ اب ہمارے کہنے سے پڑھ دو۔ انھوں نے حسب ارشاد سنایا ؎

نہ مرد ست آں کہ دنیا دوست دارد (وہ اللہ والا کیسے ہو سکتا ہے جو دنیا کو دوست رکھتا ہے)

خواجہ صاحب نے فرمایا صحیح مضمون ہے مگر محتاج اتمام ہے۔ اس لیے اس میں یہ اور ملا دو کہ ؎

اگر دارد برائے دوست دارد (وہ اللہ والا کیسے ہو سکتا ہے جو دنیا کو دوست رکھتا ہے)

نفس کی پہچان کا معیار

صاحبو! محبت کا ایک رنگ یہ ہے کہ اپنی طرف سے تو محبوب کے سوا سب کو چھوڑ کر اسی کے مشاہدہ میں لگا رہے لیکن اگر خود محبوب ہم کو کسی جماعت کا حاکم بنا دے تو حکومت کے انتظام میں مشغول ہونا یہ بھی عین مشاہدہ ہے۔ یہ شخص اس حالت میں بھی ذاکر اور صاحب مشاہدہ ہے۔

اب یہ بات باقی رہی کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ ہم اپنے نفس کو خوش کرنے کے واسطے انتظام کر

رہے ہیں یا محض حکم محبوب کی وجہ سے۔ تو اس کا معیار یہ ہے کہ اگر یہ شخص ان محکومین کو اپنے سے کم نہ سمجھے گا۔ گو کام تو کرے بڑا ہو کر مگر اعتقاد میں سب کو اپنے سے بڑا سمجھے تو یہ اس کی علامت ہوگی کہ یہ محض محبوب کے حکم کی وجہ سے سیاست خلق میں مشغول ہے نفس کے لیے کام نہیں کر رہا۔ چنانچہ اہل اللہ کی شان یہی ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کو سزا بھی دیتے ہیں اور عین اس حالت میں اپنی سیاست کو ایسا سمجھتے ہیں جیسے بادشاہ نے بھنگی کو حکم دیا ہو کہ شاہزادہ کے سو بیت مارو۔ تو وہ حکم شاہی کی تعمیل ضرور کرے گا۔ مگر شاہزادے سے افضل ہونے کا اسے وسوسہ بھی نہ آئے گا۔

ذکر ترک تعلق کا نام نہیں

بہر حال لوگ ذاکر اسی کو سمجھتے ہیں جو تمام تعلقات ترک کر دے چنانچہ بعض جاہل پیر فخر کرتے ہیں کہ ہمارے مرید نے بیس برس سے بیوی سے بات نہیں کی۔

ایک بار میں اپنے گھر والی کو علاج کے لیے میرٹھ لے گیا وہاں ایک مسماۃ نے بیعت کی درخواست کی تو دوسری بعض مستورات نے اس کو منع کیا کہ ان سے مرید نہ ہو یہ تو بیوی کو ساتھ ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ ہمارے پیر سے بیعت ہونا انھوں نے پچاس برس سے بیوی سے بات تک نہیں کی۔ مگر اس اللہ کی بندی نے التفات بھی نہ کیا گویا بزبان حال یہ جواب دیا کہ تم مجھے ایسے شخص سے بیعت ہونے کی ترغیب دیتی ہو جس نے پچاس برس سے خدا تعالیٰ کو ناراض کر رکھا ہے۔ میں اس سے ہرگز بیعت نہ ہوں گی۔ صاحبو! یہ جو مشہور ہے کہ

آں کس کہ ترا شناخت جاں راچہ کند ☆ فرزند و عزیز و خانماں راچہ کند

(جس شخص نے آپ کو پہچان لیا (یعنی وہ عارف باللہ ہوگیا، وہ اپنی جان، مال و دولت اور بال بچوں کی کیا پرواہ کرے گا)

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اہل وعیال کے حقوق ضائع کر دو۔ بلکہ معنی یہ ہیں کہ اس کو اہل وعیال کی محبت خدا تعالیٰ سے غافل نہ کر سکے ورنہ جو شخص خدا کو پہچانے گا وہ خدا کے احکام کو ضرور پہچانے گا اور خدا تعالیٰ کا حکم ہے کہ اہل وعیال کے حقوق ادا کرو مگر نہ اس حیثیت سے کہ وہ چیزیں تمہاری ہیں بلکہ اس حیثیت سے کہ وہ اللہ کی چیزیں ہیں چنانچہ وارد ہے۔ الخلق عیال اللہ (مشکوۃ المصابیح: ۴۹۹۸، ۴۹۹۹) اور جس کے متعلق خدا تعالیٰ حکم یہ ہے

احبکم الی اللہ احسنکم الی عیالہ او کما قال

یعنی خدا تعالیٰ کے نزدیک محبوب وہ ہے جو اس کی عیال سے اچھا برتاؤ کرے یعنی مخلوق سے۔ خصوصاً اس مخلوق سے جس کی نگہداشت اس کے ذمہ ضروری ہے مگر لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ ذاکر شاغل وہ ہے جو سب تعلقات کو ترک کردے اور مکان گرادے مگر اس کے گرانے سے کیا نتیجہ ہوگا؟

پس وہ نتیجہ ہوگا جیسے ایک شخص نے روپیہ قرض لے کر مکان بنایا تھا۔ ایک تو یہ حماقت کی۔ پھر جب قرض خواہ نے تقاضا زائد کیا تو آپ نے غصہ میں آکر مکان ہی گرادیا کہ جاؤ ہم وہ مکان ہی نہیں رکھتے جو تمہاری رقم سے بنایا تھا اس حرکت سے قرض تو بجنسہ رہا۔ ہاں ایک نقصان اور ہوگیا کہ مکان بھی نہ رہا۔

اس کی وہی حالت ہوگئی جیسے ایک افیونی کی ناک پر مکھی بار بار بیٹھتی تھی وہ اڑاتا تھا اور وہ پھر آکر بیٹھ جاتی۔ بعضی مکھی لیچڑ ہوتی ہے کہ تنگ کردیتی ہے افیونی نے کیا تدبیر کی کہ استرہ لے کر ناک ہی کاٹ ڈالی کہ جاؤ ہم نے اڈا ہی نہیں رکھا اب کہاں بیٹھے گی۔ مگر مکھی کے لئے اب پہلے اچھا اڈا مل گیا کیونکہ خون چوسنے کو ملا اور شاید اب پہلے سے زیادہ مکھیوں کا لشکر جمع ہوگیا ہو۔ مگر میاں کی ناک نہ رہی۔

یہی حالت ان ذاکروں کی ہے کہ بیوی بچوں کو چھوڑ کر خدا تو ان سے نہ ملا ہاں یہ نقصان مزید ہوا کہ اپنی دنیا بھی بے حلاوت کرلی اور پریشانی بڑھالی۔

صورت ذکر

اسلیے میں چاہتا ہوں کہ ذکر کو آسان کردوں اور لوگوں کو ذکر اللہ کی حقیقت بتلادوں۔ لوگ سوا لاکھ مرتبہ اللہ اللہ کرنے کو ذکر اللہ سمجھتے ہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ذکر نہیں بلکہ صورت ذکر ہے اور ذکر کے آثار سے ہے۔ ورنہ اگر اس کو حقیقت ذکر حاصل ہوتی تو یہ شخص دوسرے اعمال کا تارک نہ ہوسکتا۔ حالانکہ بعضے سوا لاکھ دفعہ اللہ اللہ کرنے والے بھی دوسرے اعمال سے معرا ہیں اسلیئے میں ذکر کی حقیقت بتلاتا ہوں اس کو ایک مقدمہ سے سمجھیئے وہ یہ کہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض مرتبہ شریف آدمی کے دل میں بھی جرائم کا تقاضا ہوتا ہے جیسے چوری وغیرہ۔ چنانچہ بعضے شریف آدمی بھی چوری کرنے لگتے ہیں۔ محض اس وجہ سے کہ طبیعت کا تقاضا ہے اور یہ تقاضا اس وجہ سے نہیں کہ ان کا پیشہ چوری کرنا ہے۔ بلکہ محض احتیاج کی وجہ

سے۔ کیونکہ احتیاج بری بلا ہے۔ یہ انسان کو بری سے بری جگہ لے جاتی ہے۔ ایک تو یہ منظر آپ کے سامنے ہے اس کو ذہن میں رکھیئے۔

اب اس کے مقابل دوسری جماعت کو دیکھئے کہ باوجود تقاضا وافلاس کے چوری نہیں کرتے۔ بلکہ چوری تو کیا کرتے سرکاری مالگذاری کو بھی نہیں ٹالتے بلکہ اپنی زمین اور جانور بیچ کر مالگذاری ادا کرتے ہیں گو گھر میں فاقہ ہو جائے۔

اس میں غور کیجئے کہ پہلی جماعت چور پر کیوں کر اقدام کرتی ہے اور دوسری جماعت مالگذاری تک کیوں ادا کرتی ہے حالانکہ افلاس واحتیاج میں دونوں برابر ہیں۔ وجہ اس کی صرف یہ ہے کہ ان کو ایک چیز یاد آتی ہے جو پہلی جماعت کو یاد نہیں آئی۔ یعنی سزا اور قید وغیرہ کی رسوائی اور بس!

اب سمجھو کہ ذکر کی حقیقت بھی یہی ہے اور یاد بھی اسی کو کہتے ہیں محض علم کا نام یاد نہیں ہے کیونکہ چوری پر سزا ہے۔ قید اور سزائے تازیانہ کا مرتب ہونا پہلی جماعت کو بھی معلوم تھا۔ مگر یہ سزا وقید ان کے پیش نظر اور متحضر نہ تھی اسلیئے وہ جرائم سے نہ رک سکے۔ اور دوسری جماعت کے پیش نظر تھی اور پہلی طرح متحضر تھی اسلیئے وہ اقدام نہ کر سکی۔

اس پر شاید یہ سوال ہوگا کہ اس تقریر کا حاصل تو یہ ہوا کہ جنت اور دوزخ کی یاد کا نام ذکر اللہ ہے۔ حالانکہ یہ تو ذکر جنت و نار ہوا۔ اللہ کی یاد تو نہ ہوئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ثواب کی یاد اور عذاب کی یاد اللہ ہی کی یاد ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ قانون کو یاد کرو۔ اس کا یہی مطلب ہے کہ قانون کا یاد کرنا ہی ہتھکڑی اور جیل کا یاد کرنا ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ ذکر اللہ کے مراتب ہیں بعض کو محض ذات حاکم کی یاد کافی ہوتی ہے ان کو جرائم سے بچنے کے لیے سزائے جیل وغیرہ کی یاد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ بعض کو حاکم یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ تم جو چاہو کرو تم کو سزا نہ ہوگی۔ پھر بھی اس کو حاکم سے ایسا خاص تعلق ہوتا ہے کہ مخالفت نہیں کر سکتا۔ پھر بعض تو ایسے وقت میں ناراض کے اندیشہ سے مخالفت نہیں کرتے اور بعض کو یہ اندیشہ بھی نہیں ہوتا بلکہ حیا وشرم مانع ہوتی ہے اور بعض کو یہ مانع بھی نہیں ہوتا یعنی حیا وشرم پر بھی التفات نہیں ہوتا۔ اس تعلق کا نام کچھ نہیں

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست ☆ بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

(حسن اسی ناز وخرام اور کسی کرشمہ کا نام نہیں ہے، حسینوں کی بہت ادائیں ایسی ہیں جن کا نام نہیں ہے)

www.ghlehqq.org

اس کا نام اگر کچھ ہے تو تعلق ذات ہے۔ بہر حال مراتب ذکر میں تدریج ضرور ہے۔

مراتب ذکر

اب ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ ہم کو اللہ تعالیٰ سے تعلق کس قسم کا ہے۔ جیسا تعلق ہو اسی کے مناسب ذکر میں مشغول ہونا چاہیئے۔ اور یہ فرق مراتب ہی تو ہے جس کی وجہ سے حق تعالیٰ نے ذکر کی تاکید فرماتے ہوئے کہیں تو ذکر کو اپنی ذات سے متعلق کیا ہے۔ جیسے وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ میں اور کہیں اسماء حسنیٰ سے متعلق فرمایا جیسے وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا میں۔ یہاں مفسرین نے لفظ اسم کو مقحم کہا ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ زائد کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ یہ تغیر عنوان مراتب ذاکرین کے اعتبار سے ہے اور یہ تفسیر بالرائے نہیں ہے کیوں کہ یہ نہ قواعد عربیہ کے خلاف نہ قواعد شرعیہ کے خلاف۔ پھر میں اس کو جزم کے ساتھ نہیں بیان کرتا۔ بلکہ احتمال کے طور پر کہہ رہا ہوں۔ مولانا ذکر کے اسی فرق مراتب پر تنبیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

مست ولا یعقل نہء از جام ہو ☆ اے زہو قانع شدہ برنام ہو

(اس کے جام سے مست اور مجنوں نہ ہو بلکہ اس کے نام پر قانع ہو جا)

اس میں تنبیہ ہے کہ ذکر کا ایک درجہ وہ ہے جو ذکر اسمی سے ارفع و اعلیٰ ہے مگر دوسری جگہ بتلاتے ہیں کہ ذکر اسمی بھی بیکار نہیں بلکہ نافع و مفید ہے جس کو پہلا درجہ حاصل نہ ہو وہ اسی کو غنیمت سمجھے کیونکہ ؎

از صفت و ز نام چہ زاید خیال ☆ واں خیالش ہست دلال وصال

(اس (محبوب حقیقی) کے نام و صفات سے کیا خیال پیدا ہوتا ہے کہ راستہ بتانے والا اور صاحب وصال محض اس کا ظن و گمان ہے)

نام یاد کرنے پر ایک حکایت مجنوں کی یاد آئی جو کسی نے مثنوی کے وزن پر لکھی ہے۔ مثنوی کے اشعار نہیں ہیں مگر اچھے اشعار ہیں ؎

دید مجنوں را یکے صحرا نورد ☆ در بیابان غمش بنشستہ فرد
ریگ کاغذ بود وانگشتاں قلم ☆ می نویسد بہر کسے نامہ رقم
گفت اے مجنون شیدا چیست ایں ☆ می نویس نامہ بہر کیست ایں
گفت مشق نام لیلےٰ می کنم ☆ خاطر خود را تسلی می دہم

(کسی نے مجنوں کو جنگل میں تنہا دیکھا کہ غمگین بیٹھا ہوا ہے کہ ریت پر انگلی سے کسی کو خط لکھ رہا ہے، پوچھا اے مجنوں کسے خط لکھ رہے ہو کہنے لگا لیلیٰ کے نام کی مشق کر کے اپنے دل کو تسلی دے رہا ہوں)

یہاں سے سمجھ میں آجائے گا کہ ذکر لسانی بھی بیکار نہیں گو دل متوجہ نہ ہو اور یہ جو کسی نے کہا ہے۔

بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر ☆ ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

(زبان پر تسبیح اور دل میں گاؤ خر یعنی دنیوی خیالات ایسی تسبیح کب اثر رکھتی ہے۔

یہ غلط ہے۔ میں نے اس کے رد میں کہا ہے

ایں چنیں تسبیح ہم دارد اثر (ایسی تسبیح بھی اثر رکھتی ہے)

صاحبو! غضب ہے کہ کھٹائی اور مٹھائی کے تو نام میں اثر ہو کہ نام لینے سے منہ میں پانی بھر آئے اور خدا کے نام میں اثر نہ ہو۔

کھٹائی کے نام کی اس تاثیر سے دیوبند کے ایک ہندو شاہی طبیب نے بڑا کام لیا وہ یہ کہ شاہ دہلی کے شاہزادے نے روزہ رکھا تھا۔ روزہ کشائی کی تقریب بڑی دھوم سے کی جا رہی تھی کہ عصر کے وقت لڑکا پیاس سے بیتاب ہو گیا اور کہنے لگا میں تو روزہ توڑتا ہوں سب کو فکر ہوئی کہ ایسی کیا تدبیر ہو کہ روزہ بھی رہے اور بچہ کو تکلیف بھی نہ رہے اطباء کو جمع کیا گیا۔

اور اس سے معلوم ہوا کہ بادشاہ دیندار تھا گو دنیا دار تھا۔ اگر آج کل کے نئی روشنی والوں کی طرح بے دین ہوتا تو کہہ دیتا کہ روزہ توڑ دو۔ بعد میں کیا رکھا ہے مگر اس نے روزہ کا احترام کیا۔

غرض اطباء نے تدبیریں سوچیں کسی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ یہ ہندو طبیب بھی حاضر تھا۔ اس نے کہا ایک تدبیر میری سمجھ میں آئی ہے۔ اگر اجازت ہو عرض کروں اس کو اجازت دی گئی تو اس نے کہا کہ جلدی کچھ لیموں منگائے جائیں اور بچوں سے کہا جائے کہ اس کے سامنے تراش کر چاٹیں اور چٹخارہ لیتے جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور شاہزادہ کے منہ میں لعاب کا دریا بہنے لگا۔ اب طبیب نے کہا کہ میں نے علماء سے سنا ہے کہ لعاب نگلنے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا۔ شاہزادہ اس لعاب کو نگلتا رہے پیاس بجھ جائے گی۔ علماء نے اتفاق کیا اور اس طرح شاہزادہ کا روزہ پورا ہو گیا۔

ہندوؤں کو بھی اس زمانہ میں علماء کے اختلاط سے بہت مسائل معلوم ہو جاتے تھے۔

میں نے ریاست بھوپال کا قصہ سنا ہے کہ ایک شخص کسی ہندو صراف کی دکان سے روپوں سے چاندی خرید رہا تھا اس نے اس کو بتلایا کہ اس طرح بیع و شراء تمہارے مذہب میں جائز نہیں روپوں کے ساتھ کچھ پیسے ملا کر خریدو۔

یہاں ہمارے قصبہ میں کھینشی سنار رہتا تھا۔ اس کو بہت مسائل اس قسم کے یاد ہو گئے تھے کیونکہ میں اس سے زیور بنوایا کرتا تھا۔ وہ میرے ساتھ ان مسائل کی رعایت کرتا تھا تو نام بھی بیکار نہیں بعض دفعہ نام ہی سے کام بن جاتا ہے بلکہ بعض دفعہ بھولے سے کسی نے اللہ کا نام لیا اور مقبول ہو گیا۔

ایک بت پرست کئی سال تک صنم صنم کرتا رہا۔ ایک دن بھولے سے صنم کی جگہ صمد زبان سے نکل گیا۔ فوراً آواز آئی۔ لبیک یا عبدی لبیک میرے بندے میں موجود ہوں اس آواز سے بت پرست پر وجد طاری ہو گیا اور فوراً بت کے ایک لات رسید کی کہ کم بخت اتنے سال تجھے پکارا مگر تو نے چھوٹے منہ سے کبھی جواب تک نہ دیا۔ قربان جاؤں میں اس خدا کے جس کا نام بھولے سے ایک دفعہ لے لیا تو میری طرف فوراً نظر فرمائی۔

سیبویہ عقائد میں معتزلی تھے۔ کسی نے موت کے بعد ان کو خواب میں دیکھا پوچھا کیا معاملہ ہوا کہا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تو مغفرت کا مستحق تو نہ تھا۔ مگر جاؤ ایک بات پر تم کو بخشتے ہیں کہ تم نے ہمارے نام کو اعرف المعارف کہا ہے تم نے ہمارے نام کی عزت کی ہم بھی تمہاری عزت کرتے ہیں۔ حالانکہ انھوں نے یہ مسئلہ تدین کی راہ سے نہیں بیان کیا ہوگا۔ بلکہ نحوی تحقیق کے طور پر یہ کہا ہوگا کہ اعرف المعارف لفظ اللہ ہے مگر اللہ تعالیٰ تو ایسے قدردان ہیں کہ ذرا سی بات پر مغفرت فرما دیتے ہیں۔ مغفرت کو کیا پوچھتے ہو اللہ تعالیٰ تو مغفرت کے لئے بہانے ڈھونڈتے ہیں۔ ؎ رحمت حق بہانہ می جوید (حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی رحمت بہانہ ڈھونڈتی ہے)

پھر نام لینا خالی کیوں کر جا سکتا ہے اس کو بھی غنیمت سمجھنا چاہیئے۔ یہاں سے ایک بات اور کہتا ہوں وہ یہ کہ متاخرین صوفیہ نے محض ذکر قلبی تجویز کیا ہے وہ بہت اچھی چیز ہے۔ مگر وہ زیادہ دیر تک باقی نہیں رہتا۔ بلکہ کچھ دیر کے بعد دل ادھر ادھر چلا جاتا ہے اور ذاکر یہ سمجھتا ہے کہ میں ذکر میں مشغول ہوں اسلیئے میں یہ تجویز کرتا ہوں کہ ذکر لسان سے بھی کرنا چاہیئے اور اسی میں توجہ قلبی رکھنا چاہیئے۔ اگر کچھ دیر میں ذکر قلبی نہ رہے گا تو ذکر لسانی تو باقی

رہے گا اور وقت ضائع نہ ہوگا۔ خصوصاً میری اس تحقیق کے بعد کہ جو عمل خاص نیت سے
شروع ہو اس کی برکت و انوار مستمر رہتے ہیں گو وہ نیت مستحضر نہ رہے اور گو توجہ باقی نہ رہے
اب جو ہم لوگوں کے ذکر میں انوار نہیں ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم کو توجہ کا اور حصول نور کا
قصد بھی نہیں ہے اگر قصد ہی ہو تو انوار ضرور حاصل ہوں۔ پس اب یہ بھی کہنا صحیح ہے کہ
این چنیں تسبیح کے دارد اثر (ایسی تسبیح کیا اثر رکھتی ہے)
یعنی جب کہ قصد حصول اثر کا نہ ہو اور یہ بھی صحیح ہے کہ
این چنیں تسبیح ہم دارد اثر (ایسی تسبیح بھی اثر رکھتی ہے)
یعنی جب کہ حصول اثر کا قصد ہو پس اب دونوں کلام جمع ہو گئے۔
بہر حال وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ میں لفظ اسم کو مقحم کہنے کے کیا ضرورت ہے یہ دوسرے
درجہ کے اعتبار سے ہے۔ اور وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ دوسرے درجہ کے اعتبار سے ہے اور ایک
درجہ ذکر کا یہ بھی ہے کہ عذاب و ثواب کو یاد کیا جائے کیونکہ نصوص میں جابجا عذاب و ثواب
کے یاد کرنے کا بھی امر وارد ہے۔ یہ بھی ذکر اللہ کی ایک فرد ہے۔
نیز اطاعت احکام بھی اللہ کی یاد میں داخل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت تو احکام کے
واسطے ہی سے ہوگی۔ پس ذکر اللہ کے مختلف مراتب ہیں۔ اسی واسطے مشائخ نے ذکر میں
بتدریجی رفتار رکھی ہے۔

ذکر لسانی کے درجات

چنانچہ ہمارے مشائخ چشتیہ تو ذکر لسانی میں بھی تدریج کرتے ہیں کہ بارہ تسبیح میں اول
لاالہ الا اللہ کی تعلیم ہے۔ یہ مبتدی کے لئے مناسب ہے کیونکہ اس کے دل میں ابھی اغیار
بھرے ہوئے ہیں۔ تو اس کو چاہیئے کہ ان کو ذہن میں پیش کر کے تیغ لاَ سے نفی کرے۔ جب
ان کی نفی ہوگئی اور دل اغیار سے خالی ہوگیا تو صرف ذکر اثبات الا اللہ مناسب ہے مگر اثبات
ین بھی اغیار کو گونہ استحضار ہے اس لیے اس کے بعد اللہ اللہ بتلاتے ہیں۔ جس میں محض ذات
ق پر توجہ ہے مگر اس میں بھی توجہ بواسطہ اسم کے ہے اسلیئے بعضے مشائخ اس کے بعد ذکر ھو ھو
ا تعلیم کرتے ہیں جس میں ذات پر توجہ ہوتی ہے اسم کا بھی واسطہ نہیں رہتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔
علامہ ابن تیمیہ لاالہ الا اللہ کے سوا ان سب اذکار کو بھی بدعت کہتے ہیں کیونکہ سنت

سے ان کا ثبوت نہیں۔ اگر میں اس وقت ہوتا۔ تو ادب کے ساتھ ان سے استفسار کرتا کہ علماء
دین اس مسئلہ پر کیا ارشاد فرماتے ہیں کہ ایک شخص قرآن حفظ کرتے ہوئے اذا السماء انفطرت
کے کلمات کو الگ الگ یوں یاد کرتا ہے کہ اول اذالسماء ن اذا السماء ن یاد کرتا ہے پھر
فطرت یاد کرتا ہے۔ اس کے بعد دونوں کو ملا کر اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ کے کلمات کہتا ہے تو اس کو
اس طرح یاد کرنا جائز ہے یا نہیں۔ اور شبہ کی وجہ یہ ہے کہ اذالسماء ن لفظ بے معنی ہے اسی
طرح فطرت فطرت بے معنی ہیں۔ تو میں حلفاً کہتا ہوں کہ ابن تیمیہ اس کو ضرور جائز کہتے اور
وجہ یہ بتلاتے کہ یہ تلاوت نہیں ہے نہ اس وقت اس شخص کو تلاوت مقصود ہے بلکہ مقصود ذہن میں
جمانا ہے تو اس پر میں کہتا کہ پھر الا اللہ اور الا اللہ کرنا کیوں بدعت ہے۔ اس میں بھی تو ذکر اللہ کا
ذہن میں جمانا ہے اور ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ بناء بر تجربہ رسوخ ذکر کے لیے یہ ترتیب بے
حد نافع ہے اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ جس کو شک ہو تجربہ کر کے دیکھ لے۔

اب اگر وہ یہ کہیں کہ جیسا وہ قرآن یاد کرنے والا اس حالت میں تالی نہیں منتہی
للتلاوت ہے۔ اس طرح یہ شخص اس حالت میں ذاکر تو نہ ہوا منتہی للذکر ہوا تو میں کہوں گا
کہ انتظار صلوٰۃ بحکم صلوٰۃ اسلیئے وہ حکماً ذاکر ہے۔

افسوس یہ ہے کہ کسی نے ان کے سامنے یہ مقدمات ذکر نہیں کیے اس لیے وہ اس کو
بدعت کہنے میں معذور ہیں۔ بلکہ طرہ یہ کہ ہوا کہ ان کے سامنے جہلا صوفیہ کے غلط مقدمات
پیش ہوئے۔ چنانچہ بعض نے قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ۔ سے استدلال کیا
ہے۔ اس دلیل پر علامہ ابن تیمیہ نے صوفیہ کے بہت لتے لئے ہیں اور واقعی اس سے استدلال
ہو بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ اس میں اللہ قل کا مقولہ نہیں کیونکہ قول کا مقولہ مفرد نہیں ہوتا بلکہ جملہ ہوتا
ہے۔ بلکہ یہ تو انزل مقدر کا فاعل ہے جس کا قرینہ سیاق کلام ہے کیونکہ اوپر ارشاد ہے
قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ
تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ قل الله ای قل انزله الله
آپ پوچھئے وہ کتاب کس نے اتاری جو موسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے۔ روشن تھی
اور ہدایت تھی لوگوں کے واسطے جس کو تم نے ورق ورق کر کے لوگوں کو دکھلایا اور ہدایت تھی
لوگوں کے واسطے جس کو تم نے ورق ورق کر کے لوگوں کو دکھلایا اور بہت سی باتوں کو چھپا

رکھا اور تم کو سکھا دیں جن کو نہ جانتے تھے تم اور نہ تمہارے باپ۔ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ نے اتاری ہے پھر ان کو چھوڑ دیجئے۔

تو یہ استدلال کسی جاہل نے کیا ہوگا۔ ابن تیمیہ کو خوب موقع مل گیا انھوں نے اچھی طرح خبر لی۔ مگر اناڑی طبیب غلطی کرے تو اس محمود خاں اور عبدالمجید خاں سے بدگمانی جائز نہ ہو جائے گی۔ ہاں موت خاں کو برا کہو تو ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ یہ کیا کہ اناڑیوں کے ساتھ محققین کو بھی ایک لکڑی ہانکا جائے۔

محققین کے دلائل سنے ہوتے تو ابن تیمیہ کو صوفیہ پر انکار کی ہرگز جرات نہ ہوتی خلاصہ یہ کہ ذکر کا ایک درجہ یہ ہے کہ اللہ کے نام کو یاد کرو۔ دوسرا درجہ یہ ہے ک بواسطہ نام کے ذات کو یاد کرو۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ نام کا واسطہ بھی نہ رہے محض ذات کے ذکر پر قادر ہو جائے۔

اسی طرح تعلق کا ایک یہ درجہ ہے کہ اگر اس سے یوں بھی کہہ دیا جائے کہ تم کو کسی گناہ پر سزا نہ ہوگی جو چاہو کرو جب بھی احکام کی مخالفت نہ کرے۔ بلکہ اگر یوں کہہ دیا جائے کہ اطاعت پر تم کو سزا ہوگی اور مخالفت پر جنت ملے گی جب بھی مخالفت نہ کریگا نیز اگر یوں کہہ دیا جائے کہ اطاعت پر تم کو سزا ہوگی اور مخالفت پر جںت ملے گی جب بھی مخالفت نہ کریگا نیز اگر یوں کہہ دیا جائے کہ تیرا خاتمہ کفر پر ہوگا جب بھی اعمال میں کوتاہی نہ کرے۔

چنانچہ ایک بزرگ کو ذکر میں آواز آئی کہ جو چاہے کر تو کافر ہو کر مرے گا وہ پریشان ہو گئے مگر ذکر اور نماز وغیرہ نہیں چھوڑی بلکہ شیخ سے جا کر عرض کیا۔ شیخ نے کہا کام لگے رہو اس آواز سے پریشان نہ ہو۔ یہ دشنام محبت ہے۔ محبوبوں کی عادت ہے کہ عشاق کو یوں ہی پریشان کیا کرتے ہیں

بدم گفتی وخرسندم عفاک اللہ نکو گفتی ☆ جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

(تو نے مجھے برا کہا ہے مگر میں خوش ہوں تیرے شیریں لب لعل کے لئے جواب تلخ ہی بہتر ہے)

پریشان کرنا بھی محبت کا ایک رنگ ہے

ما پروریم دشمن و ما می کشیم دوست ☆ کس را رسد نہ چوں چرا در قضائے ما

(ہم دشمن کو پالتے ہیں دوست کو مارتے ہیں، ہماری قضا و قدر میں کسی کو چون و چرا کا حق نہیں ہے)

میرے والد صاحب بچوں کو گود میں کم لیتے تھے۔ بس جب زیادہ محبت کا جوش اٹھتا

بچوں کے گلے پکڑ کر دبا دیتے جس سے بچے رو پڑتے تھے۔ مستورات کہتیں کہ یہ تمہاری عجیب عادت ہے کہ بچوں کو گود میں لینا کھلانا تو نہیں آتا۔ بس گلے دبانا آتا ہے۔ جس سے وہ رو پڑتے ہیں مگر ان کو ایسے میں لطف آتا تھا۔ مجھے بھی بچوں سے مزاح کا شوق ہے۔ جس میں بعض دفعہ ان کو غصہ بھی آجاتا ہے۔ ان کی یہ ادائیں پسند آتی ہیں۔

ایسے ہی بلاتشبیہ یوں سمجھیئے کہ بعض لوگوں کو اللہ تعالیٰ محبت کی وجہ سے طرح طرح سے پریشان کرتے ہیں۔ ان کا رونا چلانا ان کو پسند ہے۔ کسی کا ہنسنا پسند ہے اس کو ہنساتے ہیں کسی کا رونا پسند ہے اس کو رلاتے ہیں ؎

بگوش گل چہ سخن گفتۂ کہ خنداں است ☆ بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالاں است

(گل کے کان میں کیا کہہ دیا ہے خنداں ہے، بلبل سے کیا فرمادیا ہے کہ نالاں ہے)

اور ؎

ما پروریم دشمن و ما می کشیم دوست ☆ کس را رسد نہ چوں و چرا در قضائے ما

(ہم دشمن کو پالتے ہیں، دوست کو مارتے ہیں ہماری قضاوقدر میں کسی کو چون وچرا کا حق نہیں ہے)

اس تفصیل سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ جنت و دوزخ اور عذاب و ثواب کا یاد کرنا بھی اللہ ہی کی یاد ہے کیونکہ ذکر کے مراتب مختلف ہیں۔

حقیقت ذکر

پس ذکر کی حقیقت یہ ہے کہ جیسے بعض لوگ باوجود تقاضا کے چوری نہیں کرتے مال گزاری ادا کرنے میں سستی نہیں کرتے کیوں کہ ان کو ایک چیز یاد آئی ہے یعنی سزا و قید وغیرہ۔ اسی طرح ایسی چیز کو یاد رکھنا جو معاصی سے روک دے اور طاعات پر ہمت کو چست کر دے ذکر اللہ ہے۔ اب اگر کسی کو جنت و دوزخ کی یاد معاصی روکے اس کے واسطے یہی ذکر اللہ ہے اور جس کو مراقبہ ذات معاصی سے روکے اس کے واسطے یہی ذکر اللہ ہے۔ اور جس کو یہ چیزیں معاصی سے نہ روکیں اس کے واسطے یہ ذکر اللہ حقیقی نہ ہوگی بلکہ صورت ذکر میں داخل ہوگی۔ اس کو اپنے مناسب حال ذکر حقیقی کسی محقق سے تجویز کرانا چاہیئے۔ مثلاً بعضوں کے لئے نفس پر جرمانہ مالی کرنا معاصی سے مانع ہوتا ہے ان کے واسطے یہی ذکر ہے یہ حقیقت ہے ذکر کی اور یہی جڑ ہے تمام طریق کی بلکہ تمام شریعت کی۔

روح اعمال

اب میں چند آیات ذکر کر کے بیان ختم کرتا ہوں اور ان آیات کے ذکر سے مقصود یہ دکھلانا ہے کہ تمام اعمال سے مقصود ذکر ہے اور وہی تمام اعمال کی روح اور اساس ہے۔

چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں **اقم الصلوۃ لذکری**۔ (اور میری ہی یاد کی نماز پڑھا کرو) اس سے معلوم ہوا کہ صلوۃ سے مقصود ذکر ہے۔ روزہ کے بارے میں ارشاد ہے لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (تاکہ تم لوگ اللہ کی ثناء بیان کرو کہ تم کو ایسا طریقہ بتلایا سورہ البقرہ آیت نمبر ۱۵۸) اور حج کے بارے میں ارشاد ہے **فاذکرو ا اللہ عند المشعرا لحرام وا ذکرو ا اللہ فی ایام معدودت** اور فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ (تو مشعر الحرام کے پاس (مزدلفہ میں شب کو قیام کر کے خدا تعالیٰ کی یاد کرو۔ (البقرہ آیت نمبر ۱۹۸) اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کئی روز تک کرو۔ (البقرہ آیت نمبر ۲۰۳) (اور اگر غور کر کے دیکھا جائے تو تمام اعمال میں ذکر موجود ملے گا۔

یہ تو اعمال ظاہرہ کی چند مثالیں تھیں۔ اب اعمال باطنہ میں غور کیجئے تو وہاں بھی ذکر موجود ہے چنانچہ ارشاد ہے **اذا ذکر ا اللہ وجلت قلوبھم و اذا تلیت علیھم ایاتہ زادتھم ایماناً**۔

اس سے معلوم ہوا کہ خوف وخشیت وہی معتبر ہے، جس کا منشاء ذکر اللہ ہے۔ یہ مقامات کا بیان تھا۔ کیونکہ اعمال ہی کو مقامات کہا جاتا ہے۔ اب احوال میں غور کیا جائے تو ان میں بھی ذکر کو دخل ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر ہی سے قلوب کو اطمینان ہوتا ہے۔ اطمینان کے دو درجے ہیں ایک تو مقام ہے جو تصدیق و اذعان کا درجہ ہے اور ایک حال ہے جس کو سکون وانس سے تعبیر کیا جاتا ہے چونکہ اللہ تعالیٰ نے مطلق اطمینان کے لئے ذکر اللہ کو سبب بتلایا ہے اسلیے اس کے عموم میں مقام وحال دونوں داخل ہیں اور اگر عموم سے استدلال نہ کیا جائے تو مشاہدہ خود اس کی دلیل ہے۔

کیوں واقعی دل کو راحت اور چین ذکر اللہ ہی سے نصیب ہوتا ہے مولانا فرماتے ہیں

گر گریزی بر امید راحتے ☆ ہم ازانجا پیش آید آفتے
ہیچ کنجے بے دود بے دام نیست ☆ جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

(اگر تو کسی راحت کی امید پر بھاگتا ہے تو اسی جگہ تجھ کو کوئی آفت پیش آئے گی، کوئی

گوشہ بے دوڑ دھوپ اور بغیر دام کے نہیں ہے، سوائے خلوت گاہ حق کے آرام نہیں ہے)

خلوت گاہ حق سے مراد تعلق مع اللہ ہے جو ذکر اللہ کی اعلیٰ فرد ہے تو ذاکرین کو کیسی راحت ہے کہ وہ کسی حال میں پریشان نہیں ہوتے کیونکہ ان کو ایک ذات سے تعلق ہے جو کچھ ان کو پیش آتا ہے اس کو حق تعالیٰ کی طرف سے سمجھ کر ہر وقت مطمئن رہتے ہیں

موحد بر پائے ریزی زرش ☆ چہ فولاد ہندی نہا شد زکس
امید و ہراسش بنیاد توحید و بس ☆ ہمیں ست بنیاد توحید و بس

(مؤحد اور عارف کے قدموں میں خواہ سونا بکھیر دیں یا اس کے سر پر تلوار رکھیں، امید اور خوف اس کو سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی سے نہیں ہوتا۔ توحید کی بنیاد بس یہی ہے)

ذکر کی کوئی حد نہیں

چونکہ ذکر ایسی چیز ہے اسی لیے اس کی کوئی حد نہیں حالانکہ نماز کے واسطے ایک حد ہے کہ اوقات مکروہہ حرام ہے۔ روزہ کے واسطے حد ہے کہ ایام خمسہ میں حرام ہے۔ زکوٰۃ و صدقہ کے واسطے حد ہے کہ خیر الصدقۃ ما کان عن ظھر غنی۔ حج کے واسطے حد ہے مثلاً فرض ادا کرنے کے بعد ایسے شخص کے لیے حج نفل جائز نہیں۔ جس کی حقیقت یاد ہے کوئی حد نہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یذ کر اللہ فی کل احیا نہ (الصحیح للبخاری: ۱:۸۳، ۱۶۳، سنن ترمذی: ۳۳۸۴) کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے تھے اور اس کا غیر محدود ہونا یہاں تک ہے کہ بیت الخلاء میں زبان سے ذکر کرنا گو ممنوع ہے۔

کیونکہ زبان پاخانہ میں ہے مگر دل سے خدا تعالیٰ کو یاد کرنا کہ وہی ذکر حقیقی ہے ممنوع نہیں کیونکہ قلب پاخانہ میں نہیں ہے اور یہاں سے صوفیہ کے اس قول کی ایک لطیف تائید ہوتی ہے کہ تصفیہ قلب جسم سے باہر ہے وہ دوسرے عالم میں ہے۔ اسی واسطے پاخانہ میں ذکر قلبی ممنوع نہیں کیونکہ قلب یہاں نہیں ہے۔ اور اگر کوئی اس تحقیق کو نہ سمجھے یا نہ مانے تو وہ یوں سمجھ لے کہ قلب ذاکر مثل تعویذ ملفوف کے ہے اور تعویذ ملفوف کو پاخانہ میں لے جانا جائز ہے۔ اور گو زبان بھی ملفوف ہے مگر زبان سے ذکر جب ہی ہو سکتا ہے جب کہ لبوں اور دانتوں کی حرکت ہو۔ اور جب لب و دندان کو حرکت ہوگی تو زبان مستور نہ رہے گی۔ مکشوف ہو جائے

www.alhaq.org

گی۔ اور اگر کوئی شخص بدوں مکشوف نہ ہو تو یہ صورت جائز ہے۔ مگر وہ ذکر ہی نہیں کیونکہ ذکر و تلاوت کے لیے تصحیح حروف ضروری ہے اور بعض کے نزدیک سماع صوت بھی لازم ہے اور اس کے لیے کشف لسان لازم ہے اور بغیر اس کے جو ذکر ہوگا۔ وہ حکماً ذکر ہے نہ حقیقتاً۔

یہاں سے انسان کا عجز معلوم ہوتا ہے کہ بدوں حرکت لب و دنداں کے تکلم و ذکر سے عاجز ہے۔ امام صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ایک قدری کو یہی جواب دیا تھا کہ تو جو یہ کہتا ہے کہ افعال عبد بندہ کے مخلوق ہیں۔ ہم تو جب جانیں کہ تو صاد کو ضاد کے مخرج سے نکال دے یا ضاد کو صاد کے مخرج سے نکال دے۔ بس یہاں وہ عاجز ہو گیا۔

یہی وجہ ہے کہ شیر خوار بچہ پیار نہیں کر سکتا کیونکہ پیار کرنے کے لیے منہ کو جس حرکت کی ضرورت ہے۔ بچہ کو یہ طریقہ نہیں آتا۔ میں نے ایک بچہ کو پیار کیا پھر اس سے کہا کہ تو بھی پیار کر۔ تو وہ منہ کو گھمانے لگا۔ پیار نہ کر سکا۔ غرض انسان بدوں حرکت لب و دنداں کے تکلم نہیں کر سکتا۔ اور اس وقت زبان مکشوف ہو جاتی ہے مستور نہیں رہتی۔ اسلیئے بیت الخلاء میں ذکر لسانی تو ممنوع ہے مگر ذکر قلبی جائز ہے۔ کیونکہ وہ جسم سے باہر ہے یا مستور ہے۔

رفع اشکال

اب یہاں دو سوال ہیں۔ ایک یہ کہ تم نے بتلایا کہ تمام اعمال کی روح ذکر ہے۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ جس کو ذکر حاصل ہو جائے اس کو اعمال کی ضرورت نہ رہے کیونکہ روح تو حاصل ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اشکال جب وارد ہو سکتا ہے جب کہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ روح ہی مقصود ہے اور صورت مطلوب نہیں اور یہ مقدمہ غلط ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اولاد کی محض روح مقصود نہیں۔ ورنہ وہ تو بعد موت کے بھی باقی رہتی ہے۔ بلکہ صورت اور روح دونوں کا مجموعہ مقصود ہے۔ اسلیے موت کے وقت فقدان صورت سے غم ہوتا ہے ورنہ بقائے روح کا تو سب کو یقین ہے دوسرے اوپر بتلا دیا گیا ہے کہ ذکر حقیقی تمام اعمال کی جڑ ہے اور جڑ بدوں شاخوں کے کارآمد نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح محض ذکر بدوں دوسرے اعمال کے کارآمد نہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ تم نے ایک وعظ میں ہر عمل کے لیے حد بتلائی ہے جس کے عموم میں ذکر بھی آ گیا۔ اور یہاں ذکر کو غیر محدود بتلایا ہے کہ اس کی کوئی حد نہیں۔ یہ پہلے بیان کے خلاف ہے۔

اس کا جواب ایک تو یہ ہے کہ اس عموم سے ذکر مستثنیٰ ہے دوسرا جواب یہ ہے کہ اس کے

لیے بھی حد ہے مگر وسیع حد ہے۔ جس کا وقوع شاذ و نادر ہوتا ہے وہ یہ کہ اگر کسی کو ذکر سے تکلیف ہونے لگے کہ نہ زبان سے ذکر کر سکے نہ دھیان سے۔ اور یہ حالت ان لوگوں محسوس ہوتی ہے جو امراض جسمانیہ میں مبتلا رہتے ہیں کہ ان کو بعض دفعہ ضعف دماغ کی وجہ سے دھیان سے بھی تکلیف ہوتی ہے تو اس شخص کو اس حالت میں ذکر جائز نہیں تا کہ ذکر سے نفرت نہ ہو جائے۔

یہ مسئلہ آپ کسی دوسرے کی زبان سے نہ سنیں گے کیونکہ اول تو کسی کی سمجھ میں یہی بات نہیں آتی کہ دھیان سے تکلیف ہو سکتی ہے اور اگر کسی نے اس کو سمجھ لیا تو اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئے گی کہ تکلیف کے ساتھ ذکر کرنے سے نفرت کیسے ہو جائیگی۔

مگر میں تجربہ کی بنا پر کہتا ہوں کہ بعض دفعہ دھیان سے ایسی تکلیف ہوتی ہے کہ اس وقت جس چیز کی طرف دھیان جمایا جاتا ہے اس چیز سے دل میں کدورت پیدا ہونے لگتی ہے۔ اس لیے شیخ محقق اس حالت میں دھیان سے منع کر دیگا۔ تا کہ ذکر کی محبت باقی رہے مگر ظاہر ہے کہ یہ حالت شاذ و نادر ضرور ہے اس لیے میرا یہ قول صحیح ہے کہ ذکر کے لئے بھی حد ہے مگر وسیع حد ہے۔

اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو ذکر کی توفیق عطا فرمائیں اور حقیقت ذکر سے مشرف فرمائیں اور اس کو تمام فروع کے لئے اساس بنادیں۔ آمین

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقه سید نا محمد و علی اٰله وا صحابه اجمعین واٰ خر دعوانا ان الحمد لله رب العلمین.

توضیحات

اس وعظ میں ختم کے قریب یہ مضمون ہے کہ تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر حقیقی کو سب اعمال میں دخل عظیم یا خاص تعلق ہے اور قرآن مجید سے اس کے دو چار شواہد بھی مذکور ہوئے ہیں۔ مگر اتفاق سے اس وقت میری آنت اتر گئی۔ تھوڑی دیر تحمل بھی کیا مگر جب تکلیف بڑھنے لگی ذہن پریشان ہو گیا اور بیان ختم کر دیا گیا۔ اب بقیہ بعض شواہد قرآنیہ کو اس کے ساتھ ملحق کرتا ہوں۔

۱: اس جملہ کے قبل ارشاد ہوا ہے اَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (اور نماز کی پابندی رکھیئے، بے شک نماز (اپنی وضع کے اعتبار سے) بے حیائی اور ناشائستہ

کاموں سے روک ٹوک کرتی رہتی ہے) جس کا ربط قریب یہ ہے کہ یہ جملہ ان فیھا ذکر اللہ ولذکر اللہ اکبر فلا جل تاثیر الذکر تنھی الصلوۃ عن الفحشاء والمنکر۔

۲: ارشاد ہوا ہے کہ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى (اور اپنے رب کا نام لیتا اور نماز پڑھتا رہ) اس میں صلوۃ کو ذکر پر مرتب فرمایا گیا ہے۔ جس سے ذکر کا دخل نماز میں معلوم ہوا۔

۳: ارشاد ہے اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ (اور میری ہی یاد کی نماز پڑھا کرو) اس کی تقریر خود وعظ میں مذکور ہے۔

۴: ارشاد ہے وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (تم لوگ اللہ تعالیٰ کی ثناء بیان کرو کہ تم کو ایسا طریقہ بتلا دیا) اس کی تقریر خود وعظ میں مذکور ہے۔

۵: ارشاد ہے وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِىْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ (اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کئی روز تک کرو) یہ حج کے باب میں ہے اس کی تقریر بھی وعظ میں مذکور ہے۔

۶: ارشاد ہے لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ (اے ایمان والو تم کو تمہارے مال اور اولاد اللہ کی یاد سے غافل نہ کرنے پائیں اور جو لوگ ایسا کریں گے وہی خسارہ اٹھانے والے ہیں) الآیۃ انفاق سے پہلے ذکر کا امر ہے اور پھر انفاق کی یہ ترتیب ظاہراً بتلا رہی ہے کہ ذکر کو انفاق میں دخل ہے جیسا امنوا اور عملوا الصلحت کی جا بجا ترتیب اسی پر دال ہے۔

۷: ارشاد ہے فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۠ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ وقوله فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ (پھر جب تم لوگ عرفات سے واپس آنے لگو تو مشعر حرام کے پاس (مزدلفہ میں شب کو قیام کر کے) خدا تعالیٰ کی یاد کرو اور اس طرح یاد کرو جس طرح تم کو بتلا رکھا ہے (اپنی رائے کو دخل نہ دو) (پھر جب تم اپنے اعمال حج پورے کر چکو تو حق تعالیٰ کا ذکر کرو) الآیۃ۔ چونکہ حج مرکب ہے اعمال متعددہ سے جا بجا ذکر کا حکم ہوا ہے تاکہ ہر عمل میں اس سے اعانت ہو۔

۸: ارشاد ہے لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِىْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ (تاکہ اپنے (دینیہ و دنیویہ) فوائد کے لئے آ موجود ہوں اور تاکہ ایام مقررہ (یعنی ایام قربانی میں) ان مخصوص چوپایوں پر ذبح کے وقت اللہ کا نام لیں، جو اللہ

تعالیٰ نے ان کو عطا کئے ہیں) اس میں قربانی کو بھی ذکر اللہ سے خالی نہیں چھوڑا تا کہ اس کے سب احکام وحدود کا اہتمام ورعایت سہل ہو۔

۹: ارشاد ہے اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ الیٰ قولہ وَالذّٰکِرِیْنَ اللّٰہَ کَثِیْرًا وَّالذّٰکِرٰتِ (اور بکثرت خدا تعالیٰ کو یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں) اس آیت میں اسلام وایمان وقنوت وصدق وصبر وخشوع وتصدیق وصوم وحفظ فروج کا ذکر ہے اور ان سب کو ذکر پر ختم کیا ہے جس میں اشارہ ہوسکتا ہے کہ ان سب میں سہولت ذکر اللہ سے ہو جاتی ہے۔

۱۰: ارشاد ہے وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ ذَکَرُوا اللّٰہَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِھِمْ (اور ایسے لوگ ہیں جب کوئی ایسا کام کر گزرتے ہیں یا اپنی ذات پر نقصان اٹھاتے ہیں تو للہ تعالیٰ کی یاد کرتے ہیں پھر اپنے گناہوں کی معافی چاہنے لگتے ہیں)۔ اس میں استغفار کو ذکر پر مرتب فرمایا ہے جس سے معلوم ہوا کہ ذکر سبب ہو جاتا ہے استغفار کا وہذا مشاہدہ۔

۱۱: ارشاد ہے اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّھُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَا ھُمْ مُّبْصِرُوْنَ (یقیناً جو لوگ خدا ترس ہیں جب ان کو کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے پیش آتا ہے تو وہ یاد میں لگ جاتے ہیں یکا یک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں) اس سے معلوم ہوا کہ ذکر کو اضمحلال وساوس ونزغات شیطانیہ میں دخل ہے۔

۱۲: ارشاد ہے وَاِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ (اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی وسوسہ شیطان کی طرف سے آنے لگے تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے) اس کی تقریر وہی ہے جو اس کو قبل والی آیت کی ہے۔

۱۳: ارشاد ہے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ (وہ لوگ جو ایسے ہیں جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں) اس سے معلوم ہوا کہ ذکر کو خوف میں جو کہ اعمال باطنہ سے ہے دخل ہے۔

۱۴: اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُھُمْ بِذِکْرِ اللّٰہِ (اور وہ لوگ جو ایمان لائے اللہ کے ذکر سے ان کے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے) اس سے ذکر اللہ کا دخل اطمینان میں جو کہ منقسم ہے مقام وحال کی طرف معلوم ہوا۔ اس کی تقریر بھی وعظ میں ہے۔

۱۵: ارشاد ہے فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ وَاشْکُرُوْا لِیْ (پس مجھ کو یاد کرو میں عنایت سے تم کو

یاد کروں گا اور میری شکر گزاری کرو) ظاہر ترتیب سے ذکر کا دخل شکر میں معلوم ہوتا ہے جو کہ مقامات میں سے ہے۔

۱۶: ارشاد ہے يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (اے ایمان والو! جب تم کو کسی جماعت سے (جہاد میں) مقابلہ کا اتفاق ہوا کرے تو ثابت قدم رہو اور اللہ کا خوب کثرت سے ذکر کرو امید کہ تم کامیاب ہو جاؤ گے) ثبات عند اللقاء اعلی فرد ہے صبر کی۔ اس کی سہولت کیلئے ذکر کا امر اس پر دال ہے کہ ذکر کو صبر میں بھی دخل ہے جو کہ مقامات سے ہے۔

۱۷: ارشاد ہے يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الآیہ (وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی یاد کرتے ہیں کھڑے بھی بیٹھے بھی لیٹے بھی اور آسمانوں اور زمینوں کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں) اس میں دلالت ہے کہ ذکر کو فکر میں بھی دخل ہے جو کہ مقامات میں سے ہے۔

۱۸: ارشاد ہے اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا (کیا یہ انسان اس بات کو نہیں سمجھتا کہ ہم نے اس کو اس سے قبل (عدم سے) وجود میں لا چکے ہیں اور یہ اس وقت کچھ بھی نہ تھا) مع الآیۃ السابقہ واللاحقہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر کو اعتقادات میں دخل ہے۔

۱۹: ارشاد ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطَامًا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ (کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانات سے پانی برسایا پھر اس کو زمین کی سوتوں میں داخل کرتا ہے (تا) اس میں اہلِ عقل کے لئے بڑی عبرت ہے) اس سے معلوم ہوا کہ ذکر کو عدم انہماک فی الدنیا میں بھی دخل ہے۔

۲۰: ارشاد ہے اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ (اس میں اس شخص کے لئے بڑی عبرت ہے جن کے پاس (فہیم) دل ہو یا وہ (کم از کم دل سے) متوجہ ہو کر کان ہی لگا دیتا ہے) اس سے معلوم ہوا کہ امم سابقہ کی ہلاکت سے عبرت حاصل کرنے میں بھی دخل ہے۔

۲۱: ارشاد ہے يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا (منافقین) لوگوں کے سامنے

دکھلاوا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو یاد نہیں کرتے مگر بہت کم) اس میں دلالت ہے کہ ریاء کا علاج ذکر ہے۔

۲۲: وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنْسٰهُمْ أَنْفُسَهُمْ (اور تم ان لوگوں کی طرح مت ہو کہ انہوں نے اللہ کے احکام سے بے پروائی کی پس اللہ تعالیٰ نے خود ان کی جان سے ان کو بے پرواہ بنا دیا) اس میں ذلالت ہے کہ حقوق نفس ادا کرنے میں ذکر کو دخل ہے۔

۲۳: وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا معلوم ہوا ذکر کو عدم تسلط شیطان میں دخل ہے۔

ضمیمہ وعظ ھذا میں یہ بیان کی گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ثواب وعقاب کا یاد کرنا بھی حق تعالیٰ ہی کی یاد ہے اور اسی وجہ سے آیات میں ذکر کا تعلق کہیں خود اللہ کے ساتھ کہیں ثواب وعقاب کے ساتھ خواہ دنیوی ہو یا اخروی۔ اب تعلق ثانی کے بعض مواقع کو ضبط کر کے وعظ کا ضمیمہ بنایا جاتا ہے۔

۱: فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللّٰهِ (پس اللہ تعالیٰ کے انعامات یاد کرو)

۲: وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ (اور یاد کرو جب تمہیں نائب مقرر کیا گیا)

۳: وَذَكِّرْهُمْ بِأَيّٰمِ اللّٰهِ (اور ایام اللہ کو یاد کرو) الآیہ **العامة للنعم والنقم**

۴: وَاذْكُرُوا إِذْ أَنْتُمْ قَلِيلٌ مُسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ تَخَافُونَ أَنْ يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَآوٰكُمْ وَأَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (اور یاد کرو کہ جب تم بہت تھوڑے زمین میں کمزور تھے تم ڈرتے تھے کہ لوگ تمہیں کہیں اچک لیں پس تمہیں ٹھکانا دیا اور اپنی نصرت سے تمہیں قوت دی اور تمہیں پاکیزہ چیزیں عطا کیں کہ تم شکر ادا کرو) اس میں نعمت دنیویہ یاد دلائی۔

۵: فَالْيَوْمَ نَنْسٰهُمْ كَمَا نَسُوا لِقَاءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا (پس آج ہم نے انہیں بھلا دیا جس طرح انہوں نے اس دن کو بھلا دیا تھا) اس میں یوم قیامت کو کہ یوم ثواب وعقاب ہے یاد دلایا۔

۶: لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا نَسُوا يَوْمَ الْحِسَابِ (ان کے لئے سخت عذاب ہے جس طرح انہوں نے یوم حساب بھلا دیا تھا) اس میں بھی یوم حساب کے یاد نہ رکھنے پر وعید فرمائی۔

۷: فَالْيَوْمَ نَنْسٰهُمْ كَمَا نَسُوا لِقَاءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا (آج ہم نے ان کو بھلا دیا جس طرح وہ یوم قیامت کا آنا بھول گئے ہیں) اس میں یوم اللقاء کو یاد دلایا ہے۔

تمہ و ضمیمہ کی سب آیات ملا کر ۳۵ ہوئیں یہ شواہد نمونہ کے لیے کافی ہیں۔ اگر کوئی صاحب کم از کم پانچ کا اور اضافہ کر دیں تو اس باب میں چہل حدیث کے یہ ایک چہل آیات ہو جاویں۔

تشریحات از جامع و خطیب

۱- وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی

(جو شخص میری نصیحت سے اعراض کرے گا تو اس کے لیے تنگی کا جینا ہوگا اور قیامت کے روز ہم اس کو (اندھا کر کے) قبر سے اٹھائیں گے) اس سے اعراض عن الذکر کا موجب خسران دارین ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

۲: رِجَالٌ لَّا تُلْهِیْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِیْتَآءِ الزَّكٰوةِ یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۝ لِیَجْزِیَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَیَزِیْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ

(جن کو اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نماز پڑھنے سے اور زکوۃ دینے سے نہ خرید غفلت میں ڈالنے پاتی ہے اور نہ فروخت (اور) ایسے دن سے ڈرتے رہتے ہیں جن میں بہت سے دل اور بہت سی آنکھیں الٹ جائیں گی انجام یہ ہوگا کہ اللہ ان کو بہت ہی اچھا بدلہ دے گا اور اپنے فضل سے اور زیادہ بھی اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہے بے شمار رزق دے دیتا ہے)

اس میں ذکر اللہ سے عدم غفلت کو اقام الصلوۃ وایتاء الزکوۃ سے عدم غفلت پر مقدم فرمایا ہے جس سے معلوم ہوا کہ عدم غفلت عن الزکر مقدم ہے اس کے بعد عذاب و ثواب کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوا کہ خوف عذاب و رجاء ثواب بھی ذکر اللہ میں داخل ہے۔

۳: فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ

(پھر جب نماز جمعہ پوری ہو چکے تو تم زمین پر چلو پھرو اور خدا کی روزی تلاش کرو اور اللہ کو بکثرت سے یاد کرتے رہو تا کہ تم کو فلاح ہو)

ابتغاء مفسر بطلب الرزق کے ساتھ ذکر کا حکم مشیر ہے اس طرح کہ مشغولی معاش کے وقت بھی ذکر سے غفلت نہ چاہیے۔ نیز اس طرف بھی کہ ذکر سے معاش میں برکت بھی ہوتی

ہے لعلکم تفلحون۔ میں فلاح کی یہ تفسیر ہو سکتی ہے۔

۴: فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ (پھر جب تم اس نماز (خوف) کو ادا کر چکو تو اللہ تعالیٰ کی یاد میں لگ جاؤ کھڑے بھی بیٹھے بھی اور لیٹے بھی) اس میں اشارہ ہے کہ نماز ادا کر کے اپنے کو ذکر سے فارغ نہ سمجھیں۔ بلکہ ذکر میں برابر مشغول رہیں۔

۵: اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ الآیۃ۔ (بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات کے آنے جانے میں دلائل ہیں، اہل عقل کے لئے جن کی حالت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی یاد کرتے ہیں) اس میں دلالت ہے کہ صحبت استدلال میں بھی ذکر اللہ کو دخل ہے اس طرح سے کہ ذکر اللہ سے عقل میں نورانیت آجاتی ہے اس نورانیت کی بدولت خطائی الاستدلال سے حفاظت رہتی ہے ان آیات کے اضافہ سے جس کا ذکر ضمیمہ بالا کے اخیر میں ہے چہل آیات پوری ہو گئیں۔

ضمیمۃ الضمیمہ از جامع

وعظ میں وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ کا بیان نہیں ہوا نہ جملہء سابقہ سے اس کا ربط مذکور ہوا۔ اس لیے تمتہ کے طور پر اس کو مختصرا بیان کیا جاتا ہے کہ اس جملہ میں ذکر اللہ کی تحصیل کا طریقہ بتلا دیا گیا ہے کہ اس مضمون کو پیش نظر رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ کو میرے ہر عمل کا علم ہے۔ اس مراقبہ سے ذکر اللہ بسہولت حاصل ہو جائیگا۔ اور تمام اعمال کی تکمیل ہو جائے گی۔ کیونکہ ہمارے تمام اعمال کی کوتاہی کا سبب یہی ہے کہ ہم اعمال کو بدوں سوچے سمجھے ادا کرتے ہیں۔ اگر یہ سوچ کر عمل کریں کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارے عمل کا علم ہو رہا ہے کہ ہم کیسے ادا کر رہے ہیں تو عمل اچھی طرح ادا ہو۔ اور اگر یہ مراقبہ راسخ ہو جائے تو معاصی سے اجتناب آسان ہو جائے۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ذکر اللہ کی حقیقت محض زبانی ذکر نہیں۔ بلکہ وہ دوسری شے ہے جو مراقبہ علم سے حاصل ہوتی ہے پھر خواہ مراقبہ علم اس طرح ہو کہ اللہ تعالیٰ ہمارے عمل کو جانتے ہیں اگر کوتاہی ہو گی تو عذاب ہوگا۔ یا اس طرح ہو کہ محبوب کو میری عبادت کا علم ہے وہ مجھ سے اس حالت میں راضی ہے وغیرہ وغیرہ۔

آخر الاعمال

منتہائے اعمال کے متعلق یہ خطبہ بروز جمعہ ۲۰، ربیع الاول ۱۳۳۶ھ مطابق ۴، جنوری ۱۹۱۸ء جامع مسجد کانپور میں دیا جو ۲ گھنٹے ۲۳ منٹ میں ختم ہوا۔ اس وقت قریباً دو ہزار کا مجمع تھا۔ اسے محمد مصطفیٰ صاحب بجنوریؒ نے قلم بند کیا۔

دین اعمال کا نام ہے مجاہدات کا نہیں ہاں مجاہدات مقدمات ہیں اعمال کے لیے مگر مجاہدات کی انتہا نہیں ہو سکتی۔ اسلیئے دین کا اہتمام کسی وقت نہ چھوٹنا چاہیئے۔

خطبۂ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره و نومن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له ونشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريک له ونشهد ان سيدنا ومولنا محمدا عبده ورسوله صلى الله تعالىٰ عليه وعلى اله واصحابه وبارک وسلم. اما بعد فاعو ذ بالله من الشيطان الر جيم بسم الله الرحمن الرحيم

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّشۡرِیۡ نَفۡسَهُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوۡفٌۢ بِالۡعِبَادِ (البقرہ:٢٠٦)

(ترجمہ: اور بعضا آدمی ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں اپنی جان تک صرف کر ڈالتا ہے اور اللہ تعالیٰ بندوں کے حال پر نہایت مہربان ہیں)

تمہید: یہ آیت ان آیتوں میں سے ایک ہے جن کو میں نے پرسوں شب چہار شنبہ کے بیان میں پڑھا تھا اور ان سے ایک مضمون تو مدلولاً اور دوسرا مضمون استنباطاً ثابت کیا گیا تھا کہ اعمال میں بعضے ابتدائی ہیں اور بعض انتہائی اور اس بیان میں اول مرتبہ کی تعیین بھی کر دی گئی تھی کہ وہ توبہ ہے اور اس کو عقلاً ونقلاً ثابت کر دیا تھا اور یہ بھی کہا گیا تھا کہ یہ جلسہ اس سے زیادہ کے لئے کافی نہیں ہوسکتا۔ لہذا معذوری ہے اور صرف ابتدائی عمل کے بیان پر اکتفا کی جاتی ہے۔ نیز ایک اور جلسہ کی بھی امید تھی۔ اس واسطے بھی ایک ہی جزو کے بیان پر کفایت کی گئی ہے۔ چنانچہ بحمد اللہ اب اس کی نوبت آ گئی۔ اب دوسرے جزو کو یعنی اعمال کے انتہائی درجہ کو عرض کرتا ہوں۔ اور اس بیان میں یہ بھی عرض کیا گیا تھا کہ جزو کی تعیین سے غرض ایک غلطی کی اصلاح ہے وہ یہ کہ جب تک ابتدا کسی طریقہ کی معلوم نہ ہو تو وہ کام صحیح نہیں ہوسکتا کیونکہ

ابتدائی جزو بمنزلہ بنیاد اور اساس کے ہوتا ہے۔ جس مکان کی بنیاد متزلزل ہو اس مکان کا کیا اعتبار ہے۔ عمارت کی خوب صورتی اور نقش و نگار وغیرہ سب بے کار ہیں اس کے بقاء و ثبات کا امید نہیں۔ اسی طرح اس مرتبہ انتہائی کے بیان سے ایک غرض یہ ہے کہ اگر انتہا کسی چیز کی معلوم نہ ہو تو امتیاز ترقی کا کوئی رخ نہیں ہوتا۔ آج اس مرتبہ انتہائی کی تعیین پر بحث ہے۔

توبہ کی اہمیت

اس مرتبہ ابتدائی کی تعیین کے لیے جس طرح تلاوت کردہ آیات کی تائید کے لیے ایک آیت یہ بھی پڑھی تھی جس میں مومنین کی صفات مذکور ہیں۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ

بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ

اس میں بہت سی صفات مذکور ہیں مگر سب پر مقدم کیا ہے التائبون کو اس سے توبہ کے اول الاعمال ہونے کی بھی تائید ظاہر ہوتی ہے چنانچہ تائبون کو عابدون پر بھی مقدم کیا گیا۔ پھر آگے تو عبادت کی تفصیل ہی ہے اسی طرح ایک آیت اس کی تائید کے لیے اس وقت اور یاد آئی۔ اس کو بھی اس بیان میں ملحق کر دیا جاوے وہ یہ ہے۔

عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ

تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا

اس میں بھی تائبات مقدم ہے عابدات پر۔ ان آیات سے اور ان مؤیدات سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ توبہ جملہ عبادات پر مقدم ہے تو توبہ اول اعمال ہوئی۔

توبہ کی ضرورت

اس کے یہ معنی نہیں کے بلا توبہ کے کوئی عبادت صحیح نہیں ہو سکتی کبھی کوئی اس غلطی میں پڑ جاوے کہ ہم سے گناہ تو پورے طور سے چھوٹتے نہیں اور عبادت بلا گناہوں سے توبہ کیے صحیح نہیں ہو سکتی تو نماز روزہ سے بھی کیا فائدہ۔ بس ان کو بھی چھوڑ دینا چاہیے کیونکہ اگر ان کو کرتے رہے اور صحیح نہ ہوئے تو مفت تکلیف اٹھائی بلکہ معنی یہ ہیں کہ بلا توبہ کے عبادات کامل نہیں۔ جیسے وہ مثال میں نے دی تھی کہ توبہ کے ساتھ نسبت بنیاد اور تعمیر کی سی ہے۔ تعمیر

چل تو سکتی ہے بلا استحکام بنیاد کے بھی مگر اس کی حالت یہ ہے کہ ایک دفعہ بھی کوئی قصہ پیش آیا مثلاً بارش زیادہ ہوئی یا زلزلہ آیا تو سب ایک دم غارت۔ اور یہی وجہ تھی اس کے بیان کی تا کہ یہ عام غلطی رفع ہو جاوے کہ لوگ عبادات میں کوشش کرتے ہیں اور ان کو دیکھ کر خوش بھی ہوتے ہیں۔ مگر بنیا کا استحکام نہیں کرتے۔

اس واسطے کبھی ان پر ایک ایسی آفت آجاتی ہے کہ سب ندارد ہو جاتی ہے اور اس وقت حسرت ہوتی ہے کہ تمام عمر کوشش کی مگر یہ کیا ہو گیا بے قاعدہ کوشش کا انجام یہی ہوتا ہے۔ موٹی سی بات ہے کہ مکاں کی بنیاد اگر پوری طرح مستحکم نہیں ہے اور اس کی تعمیر میں لاکھوں روپیہ لگا دیا گیا اور عمدہ سے عمدہ مصالحہ لگایا گیا لیکن وہ زلزلہ کا متحمل نہیں ہوسکتا اور ضرور خوف ہے کہ انجام اس کا حسرت وافسوس ہے۔

غرض یہ خیال تو غلط ہے کہ جب تک پوری طرح توبہ نہ کی جائے کوئی عبادت ہی نہ کریں۔ یہ تو کید نفس ہے کہ اس حیلہ سے وہ عبادت سے بھی روکنا چاہتا ہے معاصی میں تو مبتلا تھے ہی عبادات سے بھی محروم رہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اور اعمال کے ساتھ توبہ بھی چاہیئے۔ اس سے غفلت کیوں ہے۔

غرض توبہ کا ضروری ہونا ثابت کیا گیا تھا اور تائید اس کی اس آیت سے کی تھی اور اس وقت یہ آیت بھی تائید کے لیے یاد آئی۔ ہاں اس آیت پر (عَسٰی رَبُّہٗٓ اِنْ طَلَّقَکُنَّ الآیۃ) ایک شبہ ہے۔

ایمان وعمل کا تعلق

وہ یہ کہ اس میں تائبات کا لفظ عابدات پر تو مقدم ضرور ہے جس سے توبہ کا مقدم ہونا عبادت پر نکلتا ہے مگر اول اعمال ہونا توبہ کا اس سے نہیں نکلتا کیونکہ اس سے بھی مقدم چند الفاظ ہیں اور وہ یہ ہیں۔ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ ترتیب کے لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ چوتھے مرتبہ میں درجہ تائبات کا ہے۔ توبہ کا اول اعمال ہونا جب مستنبط ہوتا جب کہ آیت التائبون کی طرح اس میں بھی سب سے مقدم التائبات ہوتا۔

اس کا جواب بہت ظاہر ہے کیونکہ میں نے اس بیان میں تصریح کردی تھی کہ توبہ کے اول اعمال ہونے کے معنی یہ ہیں کہ بجز ایمان واسلام کے اور سب اعمال پر مقدم ہے۔ اور ان دونوں کا مقدم ہونا تو مسلم ہے کیونکہ یہ تمام اعمال کی صحت کیلئے شرط ہیں۔ ان کے بغیر تو

اعمال خواہ کیسے ہی اچھے ہوں ایسے ہوتے ہیں جیسے ایک باغی ہو کہ رعایا کی بہت خدمت کرے اور بڑے بڑے کارنمایاں کرے چندہ رفاہ عام بھی بدرجہ وافر دے اور قحط وغیرہ میں بہت امداد دے مگر ہے باغی۔ تو یہ سب کام اس کے بیکار ہیں۔ کوئی بھی ان میں سے سلطنت کی نظر میں کچھ شمار نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک کہ بغاوت سے رجوع نہ کرے۔

اسی طرح ایمان و اسلام ہے کہ کوئی عمل بدوں ان کے صحیح بھی نہیں نورانیت تو الگ رہی تو اس آیت میں تین لفظ ہیں جو تائبات پر مقدم ہیں یعنی مسلمات اور مومنات اور قانتات۔ مسلمات اور مومنات کی وجہ مقدم تو ظاہر ہے صرف قانتات پر شبہ رہا۔

اسی کا جواب یہ ہے کہ قنوت ایک خاص وجہ سے توبہ سے مقدم ہے۔ اس واسطے کہ توبہ ندامت کو کہتے ہیں۔ اور ندامت جب ہوگی جب کہ تعب قنوت ہو کیونکہ جب تک نرمی اور جھک جانا اور عجز قلب میں نہ ہو تو کسی فعل پر ندامت کیوں ہونے لگی اور یہی ترجمہ ہے قنوت کا تو توبہ ہمیشہ قنوت کے بعد ہوگی۔ تو عقلاً ثابت ہو گیا کہ توبہ کی شرط قنوت ہے۔ اس واسطے قانتات کو بھی اس آیت میں تائبات پر مقدم کیا۔ تو حاصل یہ ہوا توبہ کے اول اعمال ہونے کا کہ ان اعمال سے جن پر توجہ مبنی ہے۔ ان سب سے مقدم توبہ ہے۔ باقی قنوت چونکہ توبہ کے لئے شرط عقلی ہے لہٰذا توبہ پر مقدم ہے اور ان کے سوا باقی اعمال پر توبہ مقدم ہے۔

فکر دین کا فقدان

پہلے جلسہ میں حاصل کلام یہ تھا کہ توبہ کمال اعمال کے لئے شرط ہے اور اس میں یہ شکایت کی گئی تھی کہ تمام اعمال کا تو اہتمام ہوتا ہے مگر توبہ کا اہتمام نہیں ہوتا۔ نماز پڑھیں، روزہ رکھیں مگر مبتلا ہیں معاصی میں۔ جیسے حسد، غیبت، مال حرام، جھوٹ، حب دنیا، ناشکری، بے صبری۔

غرض معاصی ظاہری و باطنی سب ہی تو موجود ہیں، طاعات کے ساتھ۔ یہ معاصی گویا منجیات کے ساتھ مہلکات بھی ہیں اور زر و جواہر کے ساتھ بڑے بڑے بچھو اور اژدھے بھی ڈسنے والے جمع ہیں اگر انھوں نے کسی دفعہ ڈس لیا تو زر و جواہر سب دھرے رہ جاویں گے۔ زر و جواہر سے تو تمتع جب ہی ہو سکتا ہے کہ ان کو الگ کیا جاوے ورنہ کچھ نہیں۔ مال و دولت سے کیا حظ پا سکتا ہے وہ شخص جس کے بدن پر سینکڑوں سانپ بچھو لپٹے ہوئے ہوں۔ اس

سے وہ غریب اچھا جو فاقہ کرتا ہے مگر سانپ بچھو اس کے بدن پر لپٹے ہوئے نہیں کیونکہ اس کی جان ہر وقت خطرہ میں تو نہیں ہے۔

پرسوں کے بیان کا حاصل اسی کی شکایت تھی کہ اعمال کے ساتھ ان کا ابتدائی واساسی درجہ کیوں نہیں ہے آج انتہائے اعمال کا بیان ہے اور اس بیان کی بھی ایک غایت اور غرض ہے اور وہ شکایت ہے اس بات کی کہ دنیا کے کام ہم کس طرح کرتے ہیں کہ مرتبہ انتہائی کے بغیر ہم بس نہیں کرتے۔ بلکہ مراتب مابعد کی تکمیل بھی کرتے ہیں مثلاً مکان بناتے ہیں تو بنیاد ڈال کر نہیں چھوڑ دیتے بلکہ دیواریں بناتے ہیں اور چھت پاٹتے ہیں۔ چونہ گچ سے بھی اس کو درست کرتے ہیں۔ اوپر بالا خانہ بھی بناتے ہیں ہر موسم کے لیے متعدد کمرے بناتے ہیں۔ گرمی کے لئے تہہ خانے اور برسات کے لیے بالا خانہ اور جاڑے کے لیے آتش دان وغیرہ سب ہی سامان پورا کرتے ہیں۔ اور تار بجلی لگاتے ہیں۔ اور ضرورت تک بھی تعمیر محدود نہیں رہتی۔ چھت پاٹ دی بالا خانہ بن گیا مگر اس چھت کے آس پاس بھی پردے کی دیوار کو اونچا کرتے ہیں تاکہ کبھی دل چاہے تو اوپر کھلی ہوا میں سو سکیں۔ اور اس میں بھی ایک فرضی ضرورت اور نکالی جاتی ہے کہ یہ دیواریں اس طرف دیکھنے سے مانع ہو گئیں۔ ممکن ہے کہ کبھی پڑوسیوں سے بات کرنی پڑے یا ہوا کی زیادہ ضرورت ہو اس واسطے اس میں کھڑکی بھی رکھتے ہیں۔

غرض مکان کی تعمیر میں بعید سے بعید ضرورتوں کا بھی خیال کرتے ہیں اور اس سبب سے اس کو مکمل کرتے ہیں۔ جہاں برقی سامان ہے وہاں روشنی بھی برقی لیے ہیں اور پنکھا بھی بجلی کا لگاتے ہیں۔ پانی کا نل بھی مکان میں لیتے ہیں۔ پھر یہ بھی نہیں کہ تعمیر کا کام ختم ہو جاوے۔ ہمیشہ اس میں کچھ نہ کچھ ترمیم اور اضافہ کرتے رہتے ہیں بلکہ تمام عمر اسی میں لگے رہتے ہیں اور کام کو ختم نہیں کرتے اور ذرا سی کوئی کوتاہی سمجھ میں آ جاوے تو اس کے دور کرنے اور مکان کو مکمل کرنے کے لئے تا ناختیار آمادہ ہو جاتے ہیں۔ مگر تعمیر کرنا مکمل نہیں دیکھ سکتے برابر یہی دھن رہتی ہے۔

اب میں پوچھتا ہوں کہ دین کی تکمیل میں ایسی دھن کیوں نہیں ہے بس یہی شکایت ہے اور اسی پر تو ہم کہتے ہیں کہ دین کی پرواہ نہیں۔

دیکھ لیجئے جس کی پرواہ ہے اس کے ساتھ کیا معاملہ ہے۔ یہ تو اجمالی شکایت ہے۔

فکر دین کی صورت

تفصیلی شکایت یہ ہے کہ دین کے بارہ میں دو طرح کی لاپروائی ہے ایک تو بنیاد کا اہتمام نہیں جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ بنیاد تو یہ ہے اس کی ضرورت ہی کم لوگوں کے ذہن میں ہے۔

دوسرے یہ کہ اعمال کا گو برا بھلا اہتمام ہو مگر ان میں ترقی کا اہتمام نہیں نہ کماً نہ کیفاً مثلاً نماز پڑھتے ہیں اور روزہ رکھتے ہیں تو جس طرح سے ایک دفعہ کر دیا ہے اسی طرح کئے جاتے ہیں۔ اگر دھن بھی ہوتی تو فرائض اور سنن پر بس کر کے نہ رہ جاتے۔ نماز نفل بھی پڑھتے، روزہ بھی نفل رکھتے۔ قرآن بھی پڑھتے۔ تجوید کی بھی کچھ مشق کرتے۔ دلائل الخیرات بھی پڑھتے اور مثلاً مناجات مقبول کی منزل بھی شروع کر دیتے۔ حزب البحر بھی پڑھتے تسبیح فاطمہ بھی ہوتی۔ کوئی وظیفہ بھی پڑھتے (وظیفہ دین کے لیے مراد ہے دنیا کے لیے نہیں۔ یہ تو آج کل بہت ہے۔) دعا بھی مانگا کرتے۔ غرض جس کو سنتے جاتے کہ یہ بھی دین کا کام ہے اسی کو لیتے جاتے اور وہ حالت جیسے کسی سخت مرض کے مریض کی ہوتی ہے کہ کوئی بھی طبیب مل گیا اس سے نسخہ پوچھ لیا۔ کوئی قرابادین مل گئی اور کسی نسخہ کی تعریف دیکھی تو داشتہ بکار آید اسی کو نقل کر لیا۔

حتیٰ کہ کسی عطائی ہی سے اگر نسخہ سن لیا تو اسی کو یاد کر لیا۔ مرض کے ازالہ کی فکر میں دھن لگی ہوتی ہے اور کہتا ہے جوئندہ یابندہ۔ کیا عجب ہے کہ کوئی نسخہ کامل مل ہی جاوے اور مرض کے جانے کا وقت آ گیا ہو۔ دھن اس کو کہتے ہیں۔

دین میں اس کا کہیں نام و نشان بھی نہیں۔ پھر کیسے کہا جاوے کہ دین کی پروا ہے یہ تو کمیۃً کی صورت ہے اور کیفاً ترقی یہ ہے کہ جیسے مکان کی تعمیر کرتے ہیں اور کمیۃً میں وہ پورا ہو جاتا ہے یعنے جتنے کمرے اس میں ہونے چاہئیں تھے وہ سب پورے بن گئے۔ غسل خانہ بھی، نشست بھی، کوٹھڑی بھی۔ کوٹھا بھی۔ باورچی خانہ بھی، تو اب اس پر بس نہیں کی جاتی۔ اب اس میں استرکاری کی جاتی ہے۔ پنڈول پوتا جاتا ہے یا قلعی کی جاتی ہے اور اس کو بھی کسی معمولی درجہ میں نہیں سمجھا جاتا ہے بلکہ اس اصلاح کیفیت کا بھی خاص طور سے اہتمام کیا جاتا ہے حتیٰ کہ بعض وقت اس کے واسطے اصل عمارت میں ترمیم کی جاتی ہے مثلاً مکان کے کسی کمرہ میں بعد تیار ہو جانے کے ثابت ہوا کہ روشنی کم ہے گو ضرورت کے لیے کافی ہو مگر دیوار کی توڑ کر کھڑکی بنائی جاتی ہے اور کہتے ہیں کہ اس کی بہت کمی تھی روشنی تو تھی

ہی نہیں۔ یہ ترقی فی الکیفیت ہے۔ تو ہم نے کسی کو نہیں دیکھا کہ اس کھڑکی کے کھولنے سے بھی ہمت ہاری ہو اور دل کو سمجھا لیا ہو کہ ضرورت کے موافق تو سارے کام ہو ہی گئے ہیں ایک کھڑکی نہیں ہے نہ سہی۔

اور دین میں یہ حالت ہے کہ نماز ہے مگر خشوع نہیں ہے کسی کو یہ خیال نہیں کہ اس کی بھی فکر کروں یا روزہ رکھتے چلے آئے ہیں مگر روزہ ناپاک ہے اور غیبت اور مال حرام وغیرہ سے احتراز نہیں ہے۔ تو خیال ہوا ہو کہ اس کو پاک کرلوں یا اتنا ہی کرتے ہوں کہ نماز میں قل ھو اللہ پڑھتے ہیں اسی کو کسی سے درست کرلوں یہ ہے ترقی کیفیت کی۔

دھن اور دھیان کی ضرورت

اللہ کے بندے بہت کم ہیں جن کو دھن ہو۔ دھن کے لفظ پر یاد آیا ایک میرے ابتدائی کتابوں کے استاد تھے ان کو دو چیزوں کی دھن تھی ایک تو کتابوں کی۔ آٹھ دس روپے کے نوکر تھے حالانکہ بڑے عالم تھے اور صاحب کمال بزرگ تھے مگر قناعت تھی۔ آٹھ دس روپے کی اوقات ہی کیا مگر کتابوں کے شوق کا یہ حال تھا کہ جو کتاب بھی ملتی پیٹ کاٹتے اور فاقے کرتے مگر اس کو ضرور بہم پہنچاتے جب ان کی وفات ہوئی تو تین ہزار کی کتابیں ان کے گھر میں سے نکلیں اور لکھنے کا شوق تھا حالانکہ کم سوجھ تھے۔ آنکھ سے کاغذ کو ملا کر لکھتے تھے مگر بہت کتابیں لکھ ڈالیں۔

حسب روایت ان کے ایک عزیز کے۔ ایک گلستان ان کے کتب خانہ میں ان کے ہاتھ کی ایک رات کی لکھی ہوئی نکلی (یہ کرامت ہے) سو اسی دھن کی بدولت ایک آٹھ روپے کی اوقات والے آدمی نے تین ہزار کی کتابیں جمع کرلیں۔

دوسری دھن ان کو تحصیل علم کی تھی جہاں کہیں کسی صاحب کمال کو سنتے ہیں وہیں پہنچتے۔ مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری کے پاس حدیث کی سند لینے گئے حالانکہ سند خود کو بھی حاصل تھی کیوں کہ عالم تھے مگر برکت کے لیے سند عالی کا شوق ہوا تو اب سند کیسے حاصل ہو۔ مدرسہ میں نوکر تھے۔ نوکری چھوڑیں تب سند لیں۔ مگر شوق عجیب چیز ہے۔ کام کے طریقے سکھا دیتا ہے۔ تھانہ بھون سے سہارنپور چوبیس کوس ہے۔ یہ ترکیب نکالی کہ مدرسہ کا کہ مہینہ چوبیس دن کا ہوتا ہے۔ کیونکہ یقینی تعداد دنوں کی انتیس ہے ان میں سے کم از کم چار جمعہ تعطیل کے نکل گئے اور ایک دن امتحان کا نکل گیا۔ پانچ دن نکل گئے تو چوبیس

رہے تو مولانا نے یہ ترکیب کی کہ جمعہ کی تعطیل نہ کرتے اور متصل چوبیس دن پڑھاتے اور وہ سب تعطیلیں ایک دم سے لے لیتے۔ دو روز آنے جانے میں لگتے اور چار دن متواتر سہارن پور میں پڑھتے اسی طرح مہینوں تک پڑھا۔ اور آخر سند حاصل کر ہی لی۔

اس کو کہتے ہیں دھن۔ جس کو دھن ہوتی ہے وہ کام کر ہی گزرتا ہے۔ اس حکایت سے مولانا کی بے نفسی اور تواضع بھی کس درجہ معلوم ہوئی کہ باوجود عالم ہونے کے پھر طالب علم بن گئے۔ آج ہم کو ترجمہ کرنا بھی آجاوے تو طالب علم بننا گوارا نہیں اور کسی کے سامنے کتاب رکھنا تو درکنار کوئی مسئلہ پوچھے تو اس سے لاعلمی ظاہر کرتے عار آتی ہے یہ قصہ تو میرے سامنے کا ہے۔

ایک قصہ مولانا کا مجھ سے پہلے کا ہے وہ یہ ہے کہ ایک بزرگ حافظ عبدالرزاق صاحب جھنجھانہ میں تھے وہ مثنوی کے حافظ تھے اور ان کو فیض مولانا رومیؒ کی روح سے ہوا تھا۔ تو حافظ عبدالرزاق مولٰینا کے شاگرد ہوئے۔ اور مثنوی سے اس قدر تعشق تھا حافظ صاحب کو کہ ہر شخص کو پڑھانے کو آمادہ ہو جاتے اور خود لوگوں کو لپٹتے کہ مثنوی پڑھ لو۔ یہاں تک کہ کریما پڑھنے والے لڑکوں سے میاں مثنوی پڑھ لو۔ جیسے کریما پڑھی ایسے ہی مثنوی پڑھ لو۔ اور کیا دقت ہے۔

غرض مثنوی کے مشہور استاد تھے ہمارے حضرت حاجی صاحب نے اور پیرانی صاحبہ دونوں نے مثنوی انہیں سے پڑھی تھی۔ یہ مولانا جھنجھانہ حافظ صاحب کے پاس مثنوی پڑھنے کو جاتے اور تمام مثنوی انہیں سے پڑھی اس طرح کہ جمعرات کے دن دوپہر کو مدرسہ کی چھٹی کر کے جاتے اور جھنجھانہ میں مسجد میں یا قبرستان میں پڑ رہتے (کیا زندگی ہے اہل الله کی۔ اتنے بڑے اہل کمال مگر کسی پر بھی ظاہر نہیں اپنے کام سے کام ہے) رات اس طرح گزارتے اور جمعہ کے دن صبح سے بیٹھتے اور عصر تک برابر پڑھتے۔ بس جمعہ کی نماز کے لئے تو اٹھتے ورنہ ہمہ تن استاد شاگرد دونوں سبق میں مشغول رہتے۔ اور عصر پڑھ کر واپس ہوتے اور عشاء کی نماز تھانہ بھون میں آ پڑھتے۔ سالہا سال تک یہی معمول رہا، حتی کہ مثنوی ختم کر لی۔ ختم کے قریب ایک مرتبہ حافظ صاحب نے فرمایا کہ ابی معتد بہ حصہ باقی ہے تھوڑی رخصت لیکر اس کو ختم کر لو۔ چنانچہ مہینہ ڈیڑھ مہینہ کی رخصت لی اور وہاں قیام کر کے مثنوی تمام کی ادھر مثنوی ختم ہوئی ادھر حافظ صاحب کا انتقال ہو گیا تھا۔

یہ مصلحت تھی حافظ صاحب کے جلدی کرنے میں کہ معلوم ہو گیا تھا کہ وفات قریب

ہے۔ کیا شفقت ہے اہل اللہ کی۔ کہ پورا کام کر کے تشریف لے گئے۔

نزع کی تکلیف کا راز

اہل اللہ کو اپنے متوسلین سے بے حد تعلق ہوتا ہے۔ یہاں سے اس کا راز بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نزع کی جو تکلیف زیادہ ہوئی۔ بعض لوگ شدت نزع کو ناپسند کرتے ہیں اور اس کو علامت بد سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس کی کچھ بھی اصل نہیں۔

اس وجہ سے اہل تحقیق نے یہ بیان کیا ہے کہ اس کی بنا شدت تعلقات پر ہے۔ تعلق جسمانی ہو یا روحانی۔ جسمانی یعنی رطوبات اصلیہ زیادہ ہوں جیسے بچوں میں یا پہلوانوں میں دیکھا ہوگا کہ بچوں میں نزع کی تکلیف بہت زیادہ ہوتی ہے حالانکہ ابھی انہوں نے گناہ کون سے کیا ہے اور مدقوق کو بالکل نہیں ہوتی کیونکہ رطوبات ان میں باقی نہیں رہتیں۔ تارکین کو نزع کی تکلیف کم ہوتی ہے خواہ وہ برے ہوں یا اچھے ہوں کیونکہ ان کو تعلق روحانی نہیں ہے۔ چونکہ انبیاء علیہم السلام کو امت سے بہت تعلق ہوتا تھا۔ (تعلق شفقت کا نہ جائیداد اور مال کا) اس وجہ سے نزع کی تکلیف ان کو زیادہ ہوئی۔

خدمت خلق کی اہمیت

اس واسطے انبیاء علیہم السلام نے اپنی حیات کو پسند کیا ہے کہ خلق کو نفع پہنچے۔ اسی طرح بعض اولیاء کو بھی متوسلین سے تعلق ہوتا ہے۔ اور ان کو بھی متعلقین کے نقصان سے تکلیف ہوتی ہے البتہ بعضے اولیاء آزاد بھی ہوتے ہیں۔ جیسے مولانا احمد جام فرماتے ہیں

احمد تو عاشقی بمشیخت تراچہ کار ☆ دیوانہ باش سلسلہ شد شد نہ شد نہ شد

(احمدؒ تو عاشق ہے مشیخت سے تجھ کو کیا کام، دیوانہ ہو جا سلسلہ ہوا ہوا نہ ہوا نہ ہوا)

اور بعضوں کو جن کا ذکر اولاً ہوا ہے خدمت خلق میں بڑا انہماک ہوتا ہے وہ یوں کہتے ہیں

طریقت بجز خدمت خلق نیست ☆ بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

(طریقت خدمتِ خلق کا نام ہے تسبیح مصلّی اور گدڑی کو نہیں کہتے)

اور ان دونوں میں سے اکمل وہی ہے۔ جس کی حالت انبیاء علیہم السلام کی سی ہو۔ کیوں کہ انبیاء علیہم السلام کی حالت تو کامل ہی تھی۔ دیکھئے احمد جام نے کہہ دیا "بہ مشیخت تراچہ کار" مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو ایسا نہیں فرما سکتے آپ کو تو نفع رسانی خلق میں اس قدر شغف تھا

کہ خود حق تعالیٰ آپ کو خطاب فرماتے ہیں

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ

یعنی آپ شاید جان دیں گے اس رنج میں کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے اس سے صاف ثابت ہے کہ حضورؐ کو نفع رسانی میں اتنا شغف تھا کہ اپنی جان کی بھی پرواہ نہ تھی۔

غرض! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ فرمایا کہ چولہے میں جاویں ایمان لاویں یا نہ لاویں۔ اسی طرح کاملین کو اپنے متوسلین سے عشق ہوتا ہے اور کوئی خیر خواہی ان سے اٹھا نہیں رکھتے تو مشورہ حافظ صاحب کا مولانا کو اس شفقت پر مبنی تھا۔ چنانچہ کتاب کو پورا کرا کر وطن تشریف لے گئے۔

شوق کا اثر

یہ قصہ اس واسطے بیان کیا گیا کہ اندازہ ہو کہ شوق اس کو کہتے ہیں اسی طرح کتابوں کا مولانا کو بے حد شوق تھا اور یہ نہیں کہ خاص ان کتابوں کی کچھ ضرورت تھی چنانچہ ایک کتاب بہت قیمتی منگائی اور خوشی خوشی مجھ سے کہا کہ لو تم دیکھنا۔ اس کتاب کو بس مجھے دے دیا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ جب آپ دیکھتے بھی نہیں ہیں تو پھر کیا شوق ہے کتاب کے منگانے کا۔ کہا کیا بتاؤں ایک لت ہے جیسے کسی کو پتنگ بازی کی لت ہوتی ہے کسی کو مرغ بازی کی لت ہوتی ہے مجھے کتابوں کی لت ہے۔ کسی نے کہا کہ اتنی کتابیں جمع ہو گئیں ان کی حفاظت مشکل ہے کیا ہوگا سوائے اس کے منتشر ہوں۔ فرمایا کہ کتاب ایسی چیز ہے جہاں جاوے گی کام ہی آوے گی۔

غرض دھن اس کو کہتے ہیں۔ سو بتلایئے کسی اللہ کے بندے کو اپنے دین کی تکمیل کی بھی دھن ہوتی ہے۔

اسی طرح مولانا کو قراءت سیکھنے کا شوق ہوا، پانی پت پہنچے اور مہینوں پڑے رہے حالانکہ معیشت کا کچھ سامان نہ تھا۔ عجیب قصہ ہے مولانا اتنے بڑے شخص مگر ظاہری شان و شوکت کچھ بھی نہیں کسی نے بات بھی نہ پوچھی حتی کہ تکلیف ہونے لگی۔ خدا کی قدرت ایک آدمی محلہ میں مر گیا۔ وہاں دستور تھا کہ چالیس دن تک ایک غریب آدمی کو کھانا دیتے تھے وہ کھانا مولانا کیلئے آنے لگا۔ ایک چلہ تک کا سامان ہو گیا۔ ابھی چلہ پورا نہ ہوا تھا کہ ایک اور مر گیا۔ چالیس دن کا رزق اور اتر آیا ابھی یہ چلہ بھی ختم نہ ہوا تھا کہ اور ڈھل گیا۔

غرض ان کی روٹیوں کا سامان ہوتا رہا۔ قاری صاحب نے کہا ان کا کھانا مقرر کر دو ورنہ سارے محلّہ کو اسی طرح کھا جائیں گے لوگوں نے کھانا مقرر کر دیا۔ بس سکون ہو گیا۔ چاہیئے کہ کبھی محتاج کے دینے میں کمی نہ کرے اور حق تعالیٰ کے ساتھ بدگمانی نہ کرے۔ وہاں جو کچھ لینا منظور ہے اس کا ٹوٹل پورا کر لیتے ہیں جب کوئی یوں نہیں دیتا ہے تو اس طرح سے وصول کرتے ہیں۔ تو پھر ویسے ہی کیوں نہ دے دیں۔

مولانا کا ایک اور قصہ ہے کتابوں کی دھن کا۔ ایک ڈپٹی نصر اللہ خاں تھے انھوں نے ایک کتاب فن رنگریزی میں لکھی تھی اس کا نام نمو الصباغین تھا وہ ہاتھ پڑ گئی اسی کو نقل کر لیا۔ وہ مولانا کے کتب خانہ میں موجود تھی۔

بہشتی زیور کے دسویں حصہ میں رنگ کے نسخے میں نے اسی سے لکھے ہیں اس کو دیکھ کر کوئی ناواقف کہے کہ مولانا کو بڑی حرص تھی۔ مگر نہیں ان کے افعال اور طرز معاشرت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کام بھی ان کے دنیا کے لیے نہ تھے اور نفع رسانی خلق مقصود تھی۔ کیونکہ اعمال میں یہ حالت تھی دین کے غلبہ کی کہ مولانا پیر پھیلا کر کبھی نہ سوتے تھے بس سکڑ سکڑائے پڑے رہتے تھے اور ذاکر و شاغل بہت تھے مگر حالت یہ تھی کہ اللہ اللہ کرتے اور ذرا کوئی اٹھا اور مولانا چپکے لیٹ گئے تاکہ ظاہر نہ ہو کہ ذکر کر رہے ہیں اور کبھی کھانا اچھا ہوتا تو طلبہ کو کھلا دیتے اور بچا کھچا خود کھا لیتے ایسے شخص کی نسبت کیسے خیال ہو سکتا ہے کہ دنیا کی حرص تھی۔

یہ قصے ہیں دھن کے۔ دین کی دھن ایسی ہونی چاہیئے جب ترقی ہوتی ہے۔ اور ترقی کرنے والے کو تو کسی حالت پر وقوف نہیں ہو سکتا جیسے تعمیر کے شوقینوں کی حالت آپ دیکھتے ہیں کہ ہمیشہ توڑ پھوڑ لگی رہتی ہے۔ مگر دین میں ایسے بہت کم ہیں جن کو دھن لگی ہوئی ہو۔ اور شوق نہ ہونے ہی کا یہ اثر ہے کہ لوگوں کو پورے دین سے واقفیت نہیں۔ ایک ایک جزو کو ہر شخص نے لے رکھا ہے اور خوش ہیں کہ ہم دیندار ہیں کسی کو نماز کا شوق ہے مگر روزہ نہیں کوئی روزہ رکھتا ہے مگر حج نہیں کرتا۔ کبھی یہ خیال بھی نہیں آتا کہ حج ہمارے اوپر فرض ہے کوئی حاجی بھی ہو گیا ہے مگر حقوق کی پروا نہیں حقوق کو بہت لوگ یہی سمجھے ہوئے ہیں کہ دین کو ان سے کیا تعلق یہ تو آپس کی باتیں ہیں۔

دیندار کی تعریف

دین کے تجربے میں ہماری بالکل وہ حالت ہے کہ اندھوں کے شہر میں ایک ہاتھی آ گیا تھا

۔ اس کے دیکھنے کے لیے بہت سے اندھے جمع ہوئے آنکھیں تو تھی ہی نہیں ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھا کسی کا ہاتھ پیٹ پر پڑا۔ اور کسی کا دم پر۔ کسی کا کان پر۔ کسی کا پیروں پر۔ کسی کا کمر پر۔ پھر سب جمع ہوئے اور آپس میں پوچھ گچھ ہوگئی کہ ہاتھی کیسا تھا۔ جس کا ہاتھ سونڈ پر پڑا تھا اس نے کہا ہاتھی ایسا تھا جیسے سانپ اور جس کا ہاتھ دم پر پڑا تھا۔ اس نے کہا ایسا تھا جیسے مورچھل ایک بولا ایسا تھا جیسے تخت۔ ایک بولا نہیں ایسا تھا جیسے کھمبے۔ غرض خوب سب میں لڑائی ہوئی۔

غور سے دیکھا جائے تو نزاع لفظی تھا اور سب کے سب جھوٹے تھے اور سب کے سب سچے۔ سچے تو اس طرح تھے کہ جو ان کو ٹٹولنے سے معلوم ہوا وہ کہا۔ اس میں جھوٹ کیا ہے اور جھوٹے اس طرح کہ ہاتھی کو اسی شکل میں محدود کیوں مان لیا جو اپنے ٹٹولنے میں آئی تھی یعنی جزو کو کل کیوں سمجھ لیا۔ ہاتھی ایک جزو کا نام نہیں ہے اگر سب یوں کہتے کہ ایک ایک جزو ہم نے دیکھی ہے اور ان سب کو ملا کر ہاتھی ہوتا ہے۔ تو نزاع نہ رہتا۔

یہی گت ہم نے دین کی بنائی ہے کہ ایک ایک جزو کو لے رکھا ہے اور اپنے کو دین دار سمجھتے ہیں اور پھر اس جزو میں دین کو ایسا منحصر سمجھتے ہیں کہ جس جزو کا نام دین رکھا ہے جس میں وہ جزو نہ ہو اس کے بے دین سمجھتے ہیں اور اس کی تحقیر کرتے ہیں۔

میں پوچھتا ہوں کہ چند آدمی کرتا پہننا چاہیں تو کیا ہوگا کہ ایک نے دامن لیا اور ایک نے آستین ہاتھ میں ڈال لی اور ایک نے گلا پہن لیا۔ ایسی تقسیم کرنے کے بعد ہر شخص کو یہ خیال کرنا درست ہوگا کہ میں نے کرتہ پہن لیا ہے۔ ان میں سے تو ایک نے بھی کرتہ نہیں پہنا۔ کرتہ تو دامن اور آستین اور گلے سب کا نام ہے۔ جس نے سب اجزاء پہنے ہوں اس کو کرتے والا کہا جاوے گا۔ اسی طرح دین والا وہ ہے۔ جس میں تمام اجزا دین کے موجود ہوں نہ کہ کوئی ایک جزو۔

دینداروں کی کوتاہیاں

اس غلطی میں کم و بیش ایک عالم کا عالم مبتلا ہے۔ اول تو ایک ایک جزو کو لے رکھا ہے اور وہ جزو بھی ناتمام ہے مثلاً جو لوگ نماز روزہ کے پابند ہیں اور کبھی ناغہ نہیں کرتے اور دیندار کہلاتے ہیں ان کے بھی ان اعمال کے بعض اجزا معدوم ہیں۔ خشوع نہیں خضوع نہیں۔

دیکھ لیجئے کتنے دیندار ایسے ہیں جن کی نماز میں خشوع و خضوع ہوتا ہے اس کی طرف سے تو ایسی بے حسی ہوئی ہے کہ وضو اور نماز کے ظاہری احکام تو پوچھے جاتے ہیں مگر یہ بھی

نہیں پوچھا جاتا کہ خشوع اور خضوع کیا چیز ہیں اور وہ کس طرح حاصل ہو سکتے ہیں یا نہیں اور چونکہ ان کے جزو ہونے کا خیال بھی نہیں ہے اس واسطے اسی جزو ناقص کو بڑا کمال سمجھتے ہیں اور دوسروں کو اپنے مقابلہ میں حقیر سمجھتے ہیں کیا علاج کی جاوے اس کا کسی کو فکر نہیں۔ ایک صاحب دل اسی کی شکایت کرتے ہیں ؎

زہے شریعت وملت زہے طریقت وکیش ☆ ریا حلال شمارند وجام بادہ حرام

(ریا کو حلال شمار کرتے ہیں اور شراب کو حرام، کیا شریعت وملت اور تصوّف وطریقت یہی ہے)

زاہدان خشک کو کہتے ہیں کہ ان کے نزدیک شراب تو حرام ہے اور مولوی عالم ہیں اور شیخ ہیں سب ہی کچھ ہیں اور باطن میں بھی عیب بھرے ہوئے ہیں بالکل یہ حالت ہے ؎

از بروں چوں گور کافر پر حلل ☆ واندروں قہر خدائے عز وجل
از بروں طعنہ زنی بر بایزید ☆ وز درونت ننگ می دارد یزید

(کافر کی قبر باہر سے خوب پھولوں کے ہار اور اندر خدائے عز وجل کا عذاب ہو رہا ہے، باہر سے تم حضرت بایزید بسطامیؒ پر طعنہ زنی کرتے ہو اور تمہاری اندرونی حالت سے شیطان بھی شرماتا ہے)

بات کیا ہے وہی کہ دین میں کتر بیونت کیا ہے۔ کوئی عمل ہے کوئی نہیں اور جو عمل ہے بھی اس کا بھی ایک جزو ہے ایک نہیں۔ اور اکثر یہ ہے کہ اجزاء میں سے بھی اگر کوئی جزو ہے تو جزو زائد۔ باقی اور جزو اعظم ندارد۔

غرض ہر عمل کی ایک صورت ہوتی ہے اور ایک قلب اور روح ہوتی ہے۔ صرف روح کو لے لیا اور اس کی پروا نہیں کہ روح بھی ہو یا نہیں۔ پھر جس قدر بھی دین کو لیا وہ بے پروائی کے ساتھ۔ نہ اس میں ترقی کیفیت کی کرتے ہیں نہ ترقی کمیت کی۔ بس جتنا آسانی سے ہو گیا وہ لے لیا اور زیادہ کو سمجھ لیا کہ بکھیڑا ہے یا یہ کہ جس کی عادت پڑ گئی لے لیا۔ باقی خود دین کے واسطے عادت بدلنے کی ضرورت نہ سمجھی آخر کیا وجہ ہے کہ بعض لوگ شراب تو پیتے ہیں مگر جوا نہیں کھیلتے اور جوئے کے نام پر کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں اور جواریوں کی صحبت سے دور بھاگتے ہیں اور کبھی نام بھی نہیں آتا ہے تو کہتے ہیں ارے میاں مسلمانوں کو تو خدا اس

فعل سے محفوظ ہی رکھے اور ایسے بھی بہت سے ہیں کہ شراب بھی نہیں پیتے اور جوا بھی نہیں کھیلتے اور دیندار سمجھے جاتے ہیں۔ اور خود بھی اپنی طرف گمان نیک رکھتے ہیں اور واقعی ان پر کسی کو حرف گیری کی گنجائش ہے بھی نہیں مگر بعض خفیہ گناہوں میں مبتلا ہیں جن کی خبر اپنے ہم جنسوں کو بھی نہیں اور اس وجہ سے ان کی نظر ان پر اچھائی کے ساتھ پڑتی ہے۔

وہ گناہ مثلاً بدنگاہی ہے کہ اس کے کرنے میں اس قدر سہولت ہے کہ چلتے چلتے کرلیا اور کسی کو شبہ بھی نہ ہوا۔ ان کو معلوم ہے یا خدا کو معلوم ہے۔ سب گناہوں سے بری ہیں مگر اس کو نہیں چھوڑتے۔ ان کے تقدس میں یہ چور موجود ہے کہ اگر شراب کو اور جوئے کو خوف خدا سے چھوڑا ہے تو تکنا کیوں نہیں چھوڑا۔ خدا کے نزدیک تو یہ بھی گناہ ہے اور جیسے شراب کو خدا نے منع کیا ہے۔ ایسے ہی اس کو بھی تو منع کیا ہے۔

وقار اور وضع کا خیال

بس وجہ اصلی یہ ہے کہ ان گناہوں کی عادت نہیں اور خاندان کی وجاہت کو ان سے بٹہ لگتا ہے اس واسطے نہیں کرتے باقی گھورنے سے خاندان کی بدنامی نہیں یہ کام تو باپ دادا نے بھی کیا تھا۔ دوسرے کسی کو اطلاع بھی نہیں۔ اسلئے اس سے شان میں فرق نہیں آتا۔ لہٰذا اس سے چنداں احتراز بھی نہیں۔

بس معلوم ہوا کہ اصلی معنی شان ہے جو گناہ شان کے خلاف ہوا وہ چھوڑ دیا اور نام نہاد کے لیے خدا کے خوف کا لفظ بھی لگالیا۔ اور جو شان کے خلاف نہ ہوا وہاں خوف خدا کوئی چیز نہیں ہے یا ایسے ہزاروں شرفاء ہیں کہ چال چلن ان کا درست ہے۔ آوارگی کے پاس تک نہیں جاتے، کبھی ساری عمر زنا نہیں کیا۔ مگر غیبت میں بے دھڑک مبتلا ہیں۔ حالانکہ یہ اس سے بدتر ہے۔ تصریحاً حدیث میں وارد ہے۔

الغيبة اشد من الزنا (مجمع الزوائد للهيثمي: ۸:۹۱)

سو پھر وجہ کیا ہے صرف یہی کہ غیبت سے آدمی بدنام نہیں ہوتا تمام عمر غیبت کرتے رہو مگر بزرگ کے بزرگ۔ اور زنا سے بدنامی ہوتی ہے ان کاموں میں پڑنا خاندانی وضع کے خلاف ہے۔

غرض اصل چیز لوگوں کے نزدیک خاندانی وضع ہے۔ وضع ٹھیک ہو اور بس۔ (اس کا یہ مطلب نہیں کہ وضع کا ٹھیک رکھنا کوئی چیز نہیں اور خواہ مخواہ وضع کو بگاڑو وضع کا ٹھیک رکھنا بھی

مطلوب ہے۔ آدمی اگر وضع ہی کے خیال سے زنا جیسے گناہ سے بچ جائے تو کیا برا ہے۔ بچ تو گیا۔ مطلب یہ ہے کہ صرف وضع کو مطمح نظر نہ بناؤ۔ وضع کے ساتھ شریعت کا بھی خیال رکھو۔ یعنی شریعت کا بھی ایسا ہی خیال رکھو جیسے وضع کا۔ جس طرح وضع کے خیال سے بعض گناہ سے بچتے ہو تو شریعت اور خوف خدا کے خیال سے سب گناہوں سے بچو)۔

غرض ہمارے برتاؤ سے معلوم ہوتا ہے کہ خوف خدا سے تو ترک معاصی ہے نہیں جن معاصی کو چھوڑا گیا ہے ان میں اور کوئی وجہ ہے ورنہ گناہ سب متساوی الاقدام تھے ایک کو چھوڑنا اور دوسرے کو باقی رکھنا کی معنی اور وہ وجہ وہی وضع اور عادت کا لحاظ اور دین سے لا پروائی ہے۔

دین میں قناعت کیوں

اگر دین میں پروا ہوتی تو اول گناہ ہوتا ہی نہیں اور بمقتضائے بشریت گناہ ہو بھی جاتا تو اس کی تلافی تو کرتے مگر پرواہی نہیں۔ بس قناعت ہے جیسی عادت ہوگئی ہوگئی۔

افسوس یہ ہے کہ دنیا میں کسی کام میں قناعت نہیں حتی کہ کپڑوں میں بھی نہیں۔ ضرورت کے موافق کپڑا موجود ہے مگر پچھلے سال کا بنایا ہوا ہے تو افسوس سے کہتے ہیں کہ اب کے سال ہاتھ ایسا تنگ ہے کہ بنڈی اور اچکن بھی نہ بن سکی۔ مکان میں قناعت نہیں اتنا بھی تو نہیں کرتے کہ ہمیشہ قلعی پوتی جاتی ہے اب کے سال نہ سہی قلعی میں کیا کھانا ہے۔

بس بے فکری ہے تو دین سے ہے اور قناعت کا کوئی موقع ہے تو دین ہی ہے نہ اس میں کسی قسم کی ترقی کی فکر۔ نہ اس کے نقصان کی پروا۔ ایک پیسہ جاتا رہے تو دل دکھتا ہے اور دین ڈھیروں غارت ہو جائے اور ہوتا ہے۔ تو خبرے نباشد۔ گویا دین بزبان حال کہتا ہے

قلق از سوزش پروانہ داری ☆ ولے از سوزما پروانہ داری

(پروانہ کے کاٹے سے تو دکھ اور تکلیف کا گلہ کرتا ہے، اور ہمارا دل دکھانے کی پرواہ اور خیال نہیں کرتا)

کیا دین ایسی چیز ہے جس کی پروانہ کی جائے۔ آپ جانتے بھی ہیں دین کیا چیز ہے دین تعلق مع اللہ کا نام ہے۔ کسی کی ہمت کہ دل کھول کر کہہ دے کہ تعلق مع اللہ باقی رکھنے کی چیز نہیں۔ غرض ہم لوگوں کو پرواہ نہیں کہ ہم دین میں کس حالت میں ہیں۔

یہ ہے وہ شکایت جس کے لئے یہ جلسہ تجویز ہوا ہے اور جس کا رفع کرنا ضروری ہے اور صورت اس کی یہ ہے کہ انتہائی مرتبہ دین کا معلوم ہو جائے کہ وہاں تک پہنچے بغیر دین کی

تکمیل ہی نہ ہوگی۔ جب یہ معلوم ہو جائے گا تو آدمی اس سے ادھر بس نہ کریگا۔

تکمیل دین کی صورت

چنانچہ ظاہر ہے کہ جو شخص دہلی جانے والا ہے اس کو برابر چلنا چاہیئے۔ جب تک دہلی میں نہ آجاوے اور اس کو دہلی کے علامات بتانا چاہئیں۔ تا کہ جب تک وہ علامات نہ نظر آجاویں چلنا بند نہ کرے۔ ورنہ وہ درمیان ہی میں رہ جاوے گا۔ جس جگہ کو بھی دہلی سمجھ لے گا۔ وہیں بس کر دے گا۔ لہذا انتہائی مرتبہ دین کا بتانا ضروری ہے۔

بعض لوگوں کو یہ دھوکا ہوتا ہے کہ مجاہدہ کرتے ہیں اور جب کسی خلق کی تکمیل یا کسی رذیلہ کے ازالہ میں کامیابی ہو جانے کے بعد مجاہدہ کم کرا دیا جاتا ہے تو وہ سمجھ لیتے ہیں کہ اب ہم کامل ہو گئے۔

بس دین کا اہتمام کم کر دیتے ہیں۔ ان کو سمجھ لینا چاہیئے دین نام اعمال کا ہے مجاہدات کا نہیں۔ ہاں مجاہدات مقدمات ہیں اعمال کے لئے تو مجاہدات کی تو انتہا ہو سکتی ہے مگر اعمال کی انتہا نہیں ہو سکتی۔ سو دین کا اہتمام کسی وقت نہ چھوٹنا چاہیئے۔ اس کی توضیح اس مثال سے ہوگی کہ مکان جس وقت تعمیر کیا جاتا ہے تو اس کی طرف کس قدر توجہ کی ضرورت ہوتی ہے تاوقتیکہ وہ مکمل نہ ہو جاوے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بعد مکمل ہو جانے کے اب اس کی طرف توجہ نہ چاہیئے ورنہ اس کے تو معنی یہ ہوں گے کہ مکان کو بنا کر معطل چھوڑ دیا جاوے حتی کہ اس میں رہا سہا بھی نہ جاوے اور سمجھ لیا جاوے کہ غرض تو حاصل ہوگئی یعنی تعمیر ختم ہوگئی اب اور کیا کام مکان سے باقی رہا۔ نہیں بلکہ ہمیشہ اس کی طرف توجہ رکھنی پڑے گی۔ ہاں فرق ہوگا دونوں وقت کی توجہ میں۔ اس وقت توجہ تھی اس کی تکمیل کی طرف اور اب توجہ ہوگی اس کی بقا اور استحصال غرض کی طرف۔ مکان بنانے کے بعد آدمی کا دل چاہتا ہے کہ اس میں رہوں اور اس کی ہواؤں اور جو غرض تھی تعمیر سے وہ حاصل کروں۔ غور سے دیکھیے تو حقیقی توجہ یہی ہے اور پہلی توجہ تو اس کا مقدمہ تھی۔

ایسے ہی دین کی طرف ایک وقت میں توجہ تھی بغرض تکمیل کے اور بعد تکمیل توجہ چاہیئے اس کا لطف حاصل کرنے کے لیے وہ توجہ مجاہدہ تھی اور یہ توجہ مشاہدہ ہے مجاہدہ کرنے سے تو محض تکمیل ہوئی ہے دین کی باقی دیندار ہونے کا وقت تو اب آیا ہے تو کیا اس کے معنی ہوں گے کہ یہاں پہنچ کر دین کو چھوڑ دیا جاوے؟

دیکھئے کوئی لباس بناتا ہے اور اس کا انتہائی مرتبہ اس کو معلوم ہے تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ اس مرتبہ پر پہنچ کر اس کو چاہیئے کہ لباس کو چھوڑ دے اور ننگا کھڑا ہو جاوے یا یہ معنی ہیں کہ اس سے متمتع ہو۔ ہم نے تو کسی کو نہیں دیکھا کہ لباس تیار ہو جانے کو انتہائی مرتبہ سمجھ کر اس کو تہ کر کے رکھ دیا ہو اور پہنا نہ ہو۔ بے وقوف سے بیوقوف بھی اس بات کو جانتا ہے کہ سلائی کا اخیر تو ہو گیا مگر اصل غرض کا اب شروع ہے اور اس کے لیے خاتمہ کہیں نہیں جب تک کہ کپڑے کا وجود ہے اور دین میں ایسے عقل مند بہت ہیں کہ انتہائی مرتبہ تک پہنچ کر بالکل چھوڑ دیا اور سمجھتے ہیں کہ ہم فنا ہو گئے۔ اب ہمیں اعمال کی ضرورت نہیں رہی۔

ایک اہم غلطی

چنانچہ اس خیال کے لوگ موجود ہیں کہ کسی مرتبہ میں پہنچ کر اپنے آپ کو آزاد سمجھنے لگتے ہیں اور شاہ صاحب بنے پھرتے ہیں۔ اور نماز کے نہ روزہ کے۔ اور معتقدین کہتے ہیں کہ فقیر کی فقیر ہی جانے۔ شاہ صاحب تو دراصل ہو چکے ہیں۔ اب ان کو محنت کی کیا ضرورت ہے۔ تعجب ہے شاہ صاحب نے لباس کو نہ چھوڑ دیا۔ انتہائی مرتبہ پر پہنچ کر۔

ہمارے یہاں کا ایک قصہ ہے کہ ایک شخص نے مکان بنانا چاہا مگر روپیہ نہ تھا اس واسطے ایک مہاجن سے قرض لیا اور مکان بنا لیا۔ چند روز کے بعد مہاجن نے تقاضا شروع کیا۔ کچھ دنوں تک تو لیت ولعل سے ٹالا۔ جب زیادہ تقاضا ہوا تو آپ نے کیا کیا کہ غصہ میں آ کر مکان کو کھود ڈالا کہ ہم قرض کا مکان ہی نہیں رکھتے جو تقاضا ہو اپنے نزدیک تو انھوں نے تقاضے کی جڑ ہی کاٹ دی کیونکہ مکان ہی کی بدولت تقاضا ہوا تھا اسی کو ندارد کر دیا لیکن درحقیقت تقاضا تو بدستور رہا اور مکان بھی ہاتھ سے گیا۔

ایسے ہی شاہ صاحب کو اپنے زعم میں مرتبہ انتہائی حاصل ہوا گویا دین کا مکان تیار ہوا۔ اب وقت تو آیا تھا اس میں رہنے کا اور متمتع ہونے کا۔ مگر اس مکان کو گرا دیا کہ روزہ نماز چھوڑ دیا۔ ہر چیز کا وجود اس کے اجزا ہی سے ہوتا ہے۔ جب دین کے اجزا نماز روزہ نہ رہے تو دین کا وجود کہاں رہا۔ یہ مکان کا گرانا ہی تو ہوا۔ دیکھ لیجئے کہ اس مثال سے اس کو کیا فرق ہے۔ مجاہدہ ختم ہونے کے بعد اعمال دین کو ترک کرنا تو بنائے ہوئے مکان کو گرانا ہے۔ چاہیے یہ کہ خدا کا شکر کرے کہ محنت ختم ہوئی اور لطف حاصل کرنے کا وقت آیا۔

مجاہدہ کا لطف

مجاہدہ کا زمانہ لطف کا نہیں ہے بلکہ محنت کا زمانہ ہے گو اس میں بھی لطف ہے اور وہ لطف ایسا ہے جیسے دہلی کے حلیم میں لطف ہے کہ مرچیں اس قدر ہوتی ہیں کہ کھاتے جاتے ہیں اور آنکھ سے اور ناک سے پانی بہتا جاتا ہے۔ یہ پانی بہنا ناگوار اور تکلیف دہ ضرور ہے۔ مگر حلیم ایسے مزہ کا ہے کہ اس کو اس تکلیف کی وجہ سے چھوڑا نہیں جاتا یا جیسے کھجلی کا مزہ کہ کھجلاتے کھجلاتے زخم ہو جاتے ہیں۔ مگر اس میں مزہ ایسا آتا ہے کہ چھوڑ نہیں سکتے۔

بعض مشقتوں میں بھی مزہ ہوتا ہے۔ اسی طرح دین کی مشقت میں بھی مزہ دنیا سے زیادہ ہے۔ اسی واسطے مجاہد دین تکلیفیں اٹھاتا ہے اور لذت سے محروم رہتا ہے مگر مجاہدہ کو نہیں چھوڑتا۔ مگر تاہم مجاہدہ ہے محنت ہی۔ جب مقدمہ میں یہ مزہ ہے تو اصل چیز میں کیا مزہ ہوگا۔ میں بتا دوں گا کہ اصل چیز کیا ہے اور وہ کوئی مشکل چیز بھی نہیں۔ بہت لوگ یہی سمجھے بیٹھے ہیں کہ اب اس زمانہ میں وہ چیز حاصل نہیں ہو سکتی یہ غلط ہے نبوت تو ایک مرتبہ ایسا ہے کہ ختم ہو گیا باقی ولایت ختم نہیں ہوئی۔

ہنوز آں ابر رحمت درافشاں است ☆ خم وخم خانہ با مہر ونشاں است

(یہی وہ ابر رحمت درفشاں ہے، خم اور خمخانہ مہر ونشان کے ساتھ موجود ہے)

اور یہ بات میں اپنی طرف سے نہیں کہتا ہوں بلکہ قرآن شریف میں بالتصریح موجود ہے۔

أَلَآ إِنَّ أَوْلِيَآءَ ٱللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ

یہ اولیاء اللہ کے لئے بشارت ہے اور آگے ہی اس کے یہ موجود ہے کہ اولیاء اللہ کون ہیں اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ اولیا کون ہیں جو ایمان لائے ہیں اور تقوی رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایمان اور تقوی فعل اختیاری ہے اور ولایت اس کے اوپر متفرع ہے تو ولایت بھی اختیاری ہوئی۔ پھر ختم ہو جانا کیا معنی۔ اب بھی سب کچھ حاصل ہو سکتا ہے اور آسانی سے ہو سکتا ہے یہ دور ہی سے مشکل معلوم ہوتا ہے ورنہ دین تو ایسا خوشگوار ہے کہ کوئی چیز بھی ایسی خوشگوار نہیں ہو سکتی۔ جس کے مجاہدہ میں یہ لطف ہے کہ اس کو آدمی چھوڑ نہیں سکتا تو خود مطلوب میں تو ظاہر ہے جو کچھ لطف ہوگا۔

غرض جب مجاہدہ ختم ہوگا تو لطف دین کا اب آتا ہے۔ نماز جس سے لوگ جان

چراتے ہیں اور بار سمجھتے ہیں وہ ایسی لذیذ ہوتی ہے کہ بیان میں نہیں آ سکتا۔ علیٰ ہذا روزہ بھی ایسا ہی لذیذ ہوتا ہے کہ وہی جانتا ہے جو اس لذت کو پاتا ہے۔

دین کی برکات

غرض دین ایسی چیز ہے کہ اس کی وجہ سے ہر چیز لذیذ ہو جاتی ہے حتی کہ بلا اور مرض اور حتی کہ قتل بھی بقسم کہا جاتا ہے کہ پریشانی نہیں ہوتی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ دینداروں کو مصائب پیش نہیں آتے۔ ان پر بھی سب طرح کی بلائیں آتی ہیں مگر وہ سب صورتاً بلائیں ہوتی ہیں اور حقیقتاً راحت ہوتی ہے کیونکہ اس کا عقیدہ یہ ہوتا ہے۔ بلکہ یہ بات اس کے حال میں داخل ہو جاتی ہے کہ ہر چیز کو وہ محبوب حقیقی کی طرف سے سمجھتا ہے اور محبوت کی کوئی بات بھی محبّ کو ناگوار نہیں ہوتی۔ مصیبت میں وہ کہتا ہے

ناخوش تو خوش بود بر جان ☆ دل فدائے یار دل رنجان من

(تیرا رنجیدہ ہونا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے، دل قربان ہے ایسے یار پر جو میرے دل کو رنجیدہ کرتا ہے)

اور محبوب سے خطاب کرتا ہے۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو ☆ دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں یہ آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں میں آپ پر فدا ہوں جو کچھ کریں میں آپ سے خوش ہوں)

تو کسی مصیبت اور تکلیف کی اس کو کچھ بھی پرواہ نہیں ہوتی۔ ہر بات میں خوش رہتا ہے کیونکہ راحت کو بھی عطیہ الٰہی سمجھتا ہے اور مصیبت کو بھی تو دونوں اس کے نزدیک برابر ہوئے۔ پھر جو حالت راحت میں ہوگی وہی تکلیف میں ہوگی۔

ایک شخص اللہ والے مریض ہوئے اور ان کو سخت تکلیف تھی۔ مگر میں نے ان کو دیکھا کہ اس حالت میں بھی خوش تھے۔ میں نے پوچھا کیا حال ہے تو بے حد ہنسے تکلیف میں ان کی وہ حالت تھی جیسے محبوب کسی کی چٹکیاں لے کہ چٹکی لینے کی تکلیف تو بدن کو محسوس ہوتی ہے مگر دل کھلا جاتا ہے اور کلیجہ اچھلا جاتا ہے۔ اس وقت اگر محبوب اس کو کہے کہ ہم الگ ہو جاویں اور تجھ کو تکلیف نہ دیں تو ہرگز قبول نہ کرے اور بے ساختہ کہہ اٹھے

سر بوقت ذبح اپنا اس کے زیر پائے ہے ☆ کیا نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

ایسے شخص کو ہر چیز میں لطف ہی لطف ہے پریشانی تو اس کے پاس بھی نہیں مصائب

اس کے لئے ایسے لطف دہ ہیں جیسے ناز محبوب۔

عاشق کی طلب

غرض حب دین ایسی چیز ہے کہ اس کی بدولت مصائب میں بھی لذت آتی ہے تو نماز روزہ میں تو اس کو لذت اور آنکھوں کی ٹھنڈک کیسے نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ تو خالص مجالست باللہ ہے۔ اس کا لطف وہی جان سکتا ہے جس نے کسی محبوب کے نخرے اٹھائے ہوں۔ پھر اس کو مجالست نصیب ہو جاوے تو اس کی کیا حالت ہوگی محو ہو جائے گا۔ یہاں سے ان لوگوں کی غلطی کا اندازہ کیجئے جو مجاہدہ سے فراغت کے بعد بیٹھ رہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو حس ہی نہیں ہے اور مقصود و غیر مقصود میں ان کو تمیز ہی پیدا نہیں ہوئی۔ جب ہی تو مجاہدہ کو منتہائے نظر سمجھا۔ لطف کا وقت تو ابھی آیا ہے اور یہ اس ذرا سے لطف کو جو مجاہدہ میں بھی ہے اصل لطف سمجھ بیٹھے۔

اے صاحبو! اس کی مثال بالکل وہی ہے کہ مکان بنایا اور اس کے واسطے محنت کی اور پریشانیاں اٹھائیں اور جب تیار ہو گیا اور اس میں رہنے کے دن آئے تو گرا بیٹھے۔

ایسے ہی یہ ہے کہ مجاہدے کئے جن سے استعداد پیدا ہوئی اللہ کے نام لینے کی اور دین سے مناسبت پیدا ہوئی اور جب یہ بات حاصل ہوئی تب کام چھوڑ بیٹھے نماز روزہ بالائے طاق رکھ دیا اور کامل بن بیٹھے۔ یہ تو عقل کے بھی خلاف ہے اور محبت کے بھی خلاف۔ یہ تو ایسا ہوا جیسے برسوں تک تلاش اور جستجو کے بعد محبوب نے آہستہ آہستہ اپنے پاس رسائی دی۔ بس یہ اس کی صورت دیکھ لاحول پڑھ۔ کر بھاگ گئے کیوں صاحب یہ عاشق ہے تو نماز روزہ شان عشق کے بھی خلاف ہوا۔ عاشق تو وہ ہے کہ ایسے وقت میں کہتا اور آگے آؤ حتی کہ کہتا میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ لو اور میری کمر پر ہاتھ رکھ لو اور مجھے دبا لو۔ قریب پہنچ کر کہیں سیری ہوا کرتی ہے

کنار و بوس سے دونا ہوا عشق ☆ مرض بڑھتا رہا جوں جوں دوا کی

عاشق کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ جوں جوں قریب ہوتا جاتا ہے اس کی تڑپ بڑھتی جاتی ہے ایسی ہی حالت کے متعلق کہا ہے۔

نگویم کہ بر آب قادر نیند ☆ کہ بر ساحل نیل مستسقی اند

(میں نہیں کہتا کہ پانی پر قادر نہیں لب دریا ہوتے ہوئے جلندھر کے بیمار کی طرح ہیں)

محبوب کے سامنے ہیں مگر تلاش میں باؤلے ہیں ؎

دل آرم در بر دل آرام جوئے ☆ لب از تشنگی خشک و برطرف جوئے

(محبوب گود میں ہے اور محبوب کی تلاش کر رہے ہیں، نہر کے کنارے پر ہیں اور ہونٹ پیاس سے خشک ہیں)

محبوب بغل میں ہے مگر دل نہیں بھرتا اور عجیب حالت ہے کہ پاس ہے اور دور ہے۔ حتی کہ شدت شوق میں عین وصل کی حالت میں کہتا ہے ارے فلانے! ارے فلانے! کیا کروں؟ کوئی پوچھے کس کو پکارتا ہے اس سے وصل نصیب ہے؟ وجہ یہ ہے کہ جو مرتبہ بھی وصل کا نصیب ہے وہ اس سے بھی اعلیٰ کو چاہتا ہے اور اس کے سامنے اس کو قریب نہیں سمجھتا بلکہ بعید سمجھتا ہے۔ اس واسطے فریاد کرتا ہے۔ یہ ہے شان عشق کی کہ وصل سے متمتع ہے۔ مگر حالت یہ ہے کہ نام لے کر پکارتا ہے نام لینے سے زبان لذت پاتی ہے اور اس کے سننے سے کان لذت پاتے ہیں غرض ہمہ تن اس کے ساتھ مصروف ہے۔ کسی حصہ بدن کو بھی غیر متمتع رکھنا نہیں گوارا کرتا۔ اگر بس چلے تو دل میں بٹھالے۔ غرض عاشق کو قناعت نہیں ہوتی۔

جب دنیا کے محبوبوں کے ساتھ عشق کی یہ شان ہے تو کیا خیال ہے آپ کا محبوب حقیقی کے ساتھ۔ اس کے طالب کی یہی حالت ہونا چاہیئے کہ جوں جوں بڑھتا جاوے طلب اور بڑھتی جاوے اور ذکر اللہ میں ترقی بھی ہوتی جاوے اور بالکل فنا ہو جاوے۔ ذکر میں نہ یہ کہ مقدمات ہی کو طے کر کے قناعت ہو جاوے اور سمجھ لیں کہ واصل ہو گئے۔ یہ عشق نہیں ہے یہ تو دل لگی اور تمسخر ہے۔ اس کی تو وہی مثال ہے۔ کہ محنت کر کے محبوب کے دروازہ تک پہنچے اور جب ہی حاضری کا موقع ملا تو لاحول پڑھ کر بھاگ گئے۔

صاحبو! کیا یہ عشق ہے اور کیا اس کو وصول کہتے ہیں ان پر تو محبوب کا وہ غضب ہوگا کہ ساری عمر بھی پاس نہ پھٹکنے دیا جاوے گا بلکہ اس گستاخی کی سزا میں جیل خانہ میں سڑ سڑا کر مار دیا جاوے گا۔

واصل الی اللہ!

حیرت کی بات ہے کہ ایسے لوگوں کو واصل سمجھا جاتا ہے۔ ہاں ایک طرح واصل کہیں تو صحیح بھی ہے یعنی واصل جہنم نہ واصل الی اللہ۔

حضرت جنیدؒ سے کہا گیا کہ کچھ لوگ واصل ہونے کے مدعی ہیں اور نماز روزہ کچھ نہیں

کرتے تو جواب دیا کہ صدقوا فی الوصول ولکن الی السقر۔ یعنی سچ کہتے ہیں کہ ہم واصل ہو گئے مگر جہنم واصل ہو گئے نہ واصل الی الجنۃ یا واصل الی اللہ۔ (مگر اس مذاق کے لوگ اب بہت ہیں اور ایسے بے ہودوں کے معتقد ہیں اور ان کو خدا رسیدہ سمجھتے ہیں۔ یہ خدا رسیدہ تو کیا ہوتے جہنم رسیدہ البتہ ہوں گے)

اور حضرت جنیدؒ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر ہزار برس کی عمر بھی مجھ کو مل جاوے تو بلا عذر شرعی ایک وقت کا وظیفہ بھی قضا نہ کروں۔ یہ ان لوگوں کے اقوال ہیں جو بالاتفاق واصل الی اللہ ہیں کہ ایک وظیفے کو بھی چھوڑنا گوارا نہیں ہے چہ جائیکہ ضروریات دین جیسے نماز روزہ۔

حضرت جنیدؒ کے ہاتھ میں کسی نے تسبیح دیکھی تو عرض کیا کہ اب آپ کو اس کی کیا ضرورت ہے آپ تو واصل ہو چکے جواب دیا کہ اسی کی بدولت تو واصل ہوئے پھر کی ایسے رفیق کو الگ کر دیا جاوے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک پتھر کو دیکھا کہ رو رہا ہے پوچھا کیوں روتا ہے؟ کہا میں نے سنا ہے کہ پتھر بھی دوزخ میں جھونکے جائیں گے اس خوف سے روتا ہوں حضرت کو اس پر بہت رحم آیا اور دعا کی کہ یا اللہ اس کو تو مستثنیٰ کر دے۔ حق تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی اور وعدہ کر لیا کہ اس کو جہنم سے بچاویں گے۔ آپ نے اس کو خوشخبری سنا دی اور آگے چلے گئے۔ ایک دفعہ پھر ادھر گزر ہوا دیکھا کہ وہ اب بھی رو رہا ہے۔ فرمایا اب کیوں روتے ہو۔ اب تو تمہیں نجات کا وعدہ مل چکا ہے کہا اس رونے ہی کی بدولت تو یہ نعمت نصیب ہوئی پھر میں ایسے عمل کو کیوں چھوڑ دوں۔ جس کی یہ برکات ہیں۔

مولانا نے لکھا ہے کہ اگر ایک دن بلی کو کسی سوراخ میں سے چوہا ہاتھ لگ جاوے تو روز اسی پر پہنچتی ہے۔ پھر کیا حال ہے ان طالبین کا کہ بلی کے برابر بھی ان کو حس نہیں۔

اور واقعی کیسے حیف کی بات ہے کہ جس کی بدولت کمال حاصل ہوا اسی کو ذبح کیا جاوے اعمال ہی سے توقیر پاویں اور انہیں کو چھوڑ بیٹھیں۔ عقل کے بھی خلاف قرآن کے بھی خلاف عشق کے بھی خلاف۔ فطرت سلیمہ کے بھی خلاف۔ قرب میں اور زیادہ قرب کی کوشش کرو۔ قرب خداوندی کی کوئی انتہا نہیں ان واصلین نے خدا جانے کس چیز کو دیکھ لیا۔ جس کو وصول سمجھ لیا۔ اگر مقصود کو پہچانتے تو ہر گز نہ ٹھہرتے وہ بہت دور ہے اس تک سعی کبھی ختم نہیں

ہوسکتی۔ اصلی چیز کا ان کو پتہ ہی نہیں چلا ہے اور اس لی لذت کا احساس ہی نہیں ہوا ورنہ اس کو چھوڑ نہ سکتے ان کو صرف مجاہدہ کے مکدر لطف کا احساس ہوا اور مجاہدہ ختم ہو چکا تو ان کی دوڑ بھی ختم ہوگئی۔ حالانکہ لطف خالص آگے تھا۔

قرب الٰہی کی حد

میرے اس بیان کو غرض بیان کے منافی نہ سمجھا جاوے کیونکہ غرض بیان یہ بتلائی گئی ہے کہ دین کا منتہا کیا ہے اور اس تقریر سے معلوم ہوا کہ کوئی منتہا ہی نہیں۔

سو بات یہ ہے کہ جس چیز کا منتہا ہونا بتلاؤں گا اس سے یہ مقصود نہ ہوگا کہ وہاں پہنچ کے چھوڑتے بلکہ اس سے مقصود تو یہ ہے کہ وہاں تک پہنچنے کی لوگ کوشش نہیں کرتے۔ حالانکہ اس کے قبل تکمیل نہیں ہوتی۔ باقی یہ بات کہ تکمیل کے بعد کیا کرنا چاہیئے تو یہ ایک مستقل مسئلہ ہے جس کی نسبت میں نے کہا ہے کہ پھر بھی کسی کو منقطع نہ کرنا چاہیئے۔

پس ایک سعی ہے قبل تکمیل۔ اس کا بیان مقصود تھا اور ایک سعی ہے بعد التکمیل، اس کا بیان آخر میں آگیا تھا۔

اول کی ایسی مثال ہے جیسے کہا جاوے کہ تکمیل کے قبل تعمیر کو نہ چھوڑنا چاہیئے دوسرے، کی ایسی مثال ہے جیسے کہا جاوے کہ تکمیل کے بعد انتفاع کو قطع نہ کرنا چاہیئے پس جس طرح مکان کی تعمیر کی انتہاء ہے اور سکونت کی انتہاء نہیں۔ چنانچہ کوئی یہ نہیں چاہتا کہ سکونت کے لیئے بھی کوئی مدت محدود ہو اور تعمیر کو ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کی مدت محدود ہو اور جلد اس بکھیڑے سے نجات ملے اور سکونت کا لطف حاصل کرنے کا موقع ملے۔ بلکہ تعمیر کے مجاہدہ میں جو حظ آتا ہے وہ اس حظ کی امید میں آتا ہے جو سکونت سے حاصل ہونے والا ہے اسی طرح دین کو سمجھ لیجئے کہ اس استعداد کے لیے مجاہدہ کرنا پڑتا ہے اور اس کی مدت محدود ہوسکتی ہے اور جب دین حاصل ہو جاوے اور اعمال میں لطف آنے لگے۔ تو اس کے لیے کوئی حد نہیں ہوسکتی۔ بلکہ اس میں دن رات ترقی ہوتی ہے۔ جس کو اس کا احساس ہی نہ ہوا تھا۔ ان کو صرف اسی خط کا پتہ چلا تھا جو مجاہدہ میں تھا۔ پہلے حظ تھا ترقی میں اور اب ترقی ہوتی ہے حظ میں۔ تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ ترقی چھوڑنے کی چیز ہے۔

ظاہر بات ہے کہ جب محبوب تک پہنچنے کے لیے محنت کی ہے تو بعد وصول زیادتی حظ

کی طرف توجہ کیوں نہ ہو۔ جو عاشق محبوب تک پہنچ جاوے اگر پچاس سال بھی اس کے پاس گزر جاویں پھر بھی وہ بس نہیں کرتا کہ اب تو بہت دن لطف اٹھالیا اب ختم کر دینا چاہیئے۔

بس جیسے عاشق کو معشوق سے تمام عمر سیری نہیں ہوسکتی۔ بلکہ اس کی طلب بڑھ جاتی ہے اور جوں جوں اس کا قرب بڑھتا جاتا ہے اس کی حالت یہی ہوتی جاتی ہے

دل آرام در بر دل آرام جوئے ☆ چو مستسقی تشنہ بر طرف جوئے

(محبوب پاس ہے اور پھر اس کو ڈھونڈ رہے ہیں جیسا پیاسا پانی تلاش کرتا پھر رہا ہے)

باقی دنیا کے محبوبوں کے قرب کی تو گاہے اس لیے حد ہو جاتی ہے کہ وہ خود محدود ہیں اور محبوب حقیقی خود غیر محدود اور لامتناہی ہیں لہذا وہ ان کے قرب کی حد نہیں ہوسکتی۔ اسی کو کہا ہے

اے برادر بے نہایت درگہیست ☆ ہرچہ بروے میرسی بروے مالیست

(اے بھائی اس کی درگاہ بہت ہی بڑی ہے جس منزل پر تیری رسائی ہو جائے اس پر قناعت کر)

بلکہ اس راہ میں علاوہ طویل ہونے کے یہ بھی خاصیت ہے کہ اس میں نمو ہوتا ہے اور بڑھتا جاتا ہے۔

نگردد قطع ہرگز جادہ عشق از دویدنہا ☆ کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

(او عشق دوڑنے سے ہرگز قطع نہیں ہوتا بلکہ ناگ کی طرح قطع کرنے سے اور بڑھتا ہے)

اس مضمون کی تقریر بہت ہی واضح طریق سے ہوگئی۔ اب سنیئے کہ ان دونوں مرتبوں کے لیے صوفیہ کی اصطلاح میں دو لفظ ہیں۔ ان کو اگر میں پہلے بول دیتا تو ایک عجوبہ سا معلوم ہوتا اور لوگ ان کو بہت ہی دقیق اور جانے کیا سمجھتے۔ لیکن اول ان کی حقیقت بالکل صاف کر دی گئی۔ اب ان لفظوں کی سن لیجئے۔ جس سے معلوم ہوگا کہ وہ کچھ اجنبی اصطلاحیں نہیں ہیں اور سیدھے سیدھے لفظ ہیں۔

سیر الی اللہ و سیر فی اللہ

صوفیہ کی اصطلاح میں مجاہدہ کی انتہا کا نام سیر الی اللہ ہے اور مجاہدہ کے لفظ کی سیر کا نام فی اللہ ہے یہ دونوں بہت ہی موٹی باتیں ہیں اور ان کی نظیریں ہمارے عادات و محاورات میں موجود ہیں۔ مثلاً جب تک کہ طالب علم نے درسیات ختم نہیں کی ہیں تو اس کے مطالعہ کو

سیر الی الکتب کہہ سکتے ہیں اور جب ختم کر چکے اور پھر مطالعہ کرے۔ (حظ اٹھانے کے لیے اور بصیرت بڑھانے کے لیے) کیونکہ علم ایک عجیب لذیذ چیز ہے تو اس مطالعہ کو سیر فی الکتب کہیں گے۔ یا مثلاً کسی نے دہلی کا ارادہ کیا اور چل دیا تو اس قطع مسافت کو سیر الی دہلی کہیں گے۔ اور جب دہلی پہنچ گیا اور وہاں کا سیر تماشا کرنے لگا تو اس کو سیر فی دہلی کہیں گے۔ یہ کس قدر موٹی باتیں ہیں انہیں لفظوں کو جاہل فقیر عوام کے سامنے بولتے ہیں اور معنوں میں ایچ پیچ دیکر تصوف کو ہاؤ بنا دیتے ہیں مگر دیکھ لیجئے کس قدر کھلے ہوئے اور بے غبار دقائق ہیں واقعی تصوف ایسی سہل اور مانوس چیز ہے کہ ہر مذاق میں فطرۃً موجود ہے۔

مگر خدا بھلا کرے جاہل مشائخ کا کہ اس کو ایسا مہیب لباس پہنایا ہے کہ دور سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ غرض سیر الی اللہ اور سیر فی اللہ کے معنی اچھی طرح سمجھ میں آ گئے ہوں گے۔ سیر الیٰ دہلی اور سیر فی دہلی اس کی بہت واضح اور منطبق مثال ہے بس اتنا فرق ہے کہ دہلی محدود ہے تو اس کی سیر بھی محدود ہوگی اور ذات خداوندی ہے غیر محدود ہے تو سیر فی اللہ بھی محدود نہیں ہو سکتی۔

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں ☆ بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہم چناں باقی
اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم ☆ واز آنچہ گفتہ ایم واز آنچہ شنیدہ ایم

(نہ اس کے حسن کی کوئی انتہا ہے نہ سعدی کے کلام کی، جیسے جلندھر کا مریض پیاسا مر جاتا ہے اور دریا باقی رہ جاتا ہے، اے خیال و قیاس اور گمان و وہم سے ارفع اور اعلیٰ جو کچھ کہ کہا ہے سنا ہے اور پڑھا ہے)

اور کہا ہے

مجلس تمام گشت وبپایاں رسید عمر ☆ اہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

(عمر تمام ہوگئی بڑھاپا آ گیا ہم جیسے پہلے دن تھے آج تک ویسے ہی ہیں)

ابتدا کی باتوں میں اور وہاں کی باتوں میں اتنا فرق ہے کہ یہاں ہر چیز کے لیے ختم ہے اور وہاں ختم نہیں۔ بس اس فرق کو ذہن میں ملحوظ رکھ کر مثال سے بخوبی معنیٰ سیر الی اللہ اور سیر فی اللہ کے سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ غرض ان نظائر سے سیر الی الشئی اور سیر فی الشی کی حقیقت معلوم ہوگئی اتنا اور یاد رکھیئے کہ متناہی میں سیر ختم ہو سکتی ہے اور غیر متناہی میں ختم نہیں

ہو سکتی۔ اسی کو کہا ہے ؎

قلم بشکن سیاہی ریز و کاغذ سوز و دم درکش ☆ کہ حسن ایں قصہ عشق است در دفتر نمے گنجد

(قلم ٹوٹ جائے، سیاہی خشک ہو جائے، کاغذ ناپید ہو جائے، یہ قصہ حسن و عشق دفتروں میں نہیں سما سکتا)

وجہ یہ کہ عشق حقیقی کو تعلق غیر متناہی کے ساتھ ہے اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ ایں قصہ عشق است در دفتر نمی گنجد۔ اس وقت میں سیر فی اللہ کو نہیں بیان کروں گا۔ کیونکہ اس کی تو کوئی انتہا نہیں بلکہ سیر الی اللہ کو بیان کرتا ہوں کیونکہ یہ سیر محدود ہے۔ اور اسی کے لیے اخیر ہو سکتا ہے اور مجھے آخر الاعمال کا بیان کرنا ہے۔ بلفظ دیگر اس طرح سمجھیے کہ سیر الی اللہ کہتے ہیں مجاہدہ کو۔ میں اس کی انتہا کو بیان کرتا ہوں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ میری شکایت کہاں تک صحیح ہے اور دنیا کے کسی کام میں انتہا سے قبل قناعت نہیں ہوتی اور دین میں قناعت ہو جاتی ہے۔ یہ شکایت جب ہی ہو سکتی ہے اور اس کا رفع کرنا بھی جب ہی ممکن ہے کہ اس انتہا کا علم ہو۔ اس واسطے ضرورت انتہا کے بیان کی ہے۔

دوستی کی شرط

جو آیت اس وقت پڑھی گئی ہے اس میں انتہائی مرتبہ کا بیان ہے۔ پس میں اول آیات کا ترجمہ بیان کروں گا۔ نفس مطلب اسی سے نکل آوے گا۔ پھر بقدر مناسب اس کی توضیح کروں گا فرماتے ہیں:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاةِ اللّٰهِ

یعنی لوگ مختلف ہیں جن میں سے اوپر کئی قسم کا بیان ہو چکا۔ انھی میں سے ایک قسم یہ ہے کہ بعضے بیچ ڈالتے ہیں اپنے آپ کو حق تعالیٰ کی مرضی کی تلاش میں۔

بیع ایک امر ہے جس کا تعلق بدلین سے ہوتا ہے۔ جب ایک طرف سے اپنے نفس کو دے ڈالنا ہوا تو دوسری طرف سے بھی عوض ہوگا۔ جس کا بیان اس جملہ میں موجود ہے۔ **واللہ رؤف بالعباد**۔ یعنی حق تعالیٰ بڑے مہربان ہیں۔ بجائے بیان اور تصریح کے یہ مضمون لایا گیا۔ جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وہ عوض ہوگا جو حق تعالیٰ کی شان رافت کے مناسب ہوگا۔ رافت کا ترجمہ ہے شدت رحمت۔ حق تعالیٰ کی رحمت اگر خفیف سی بھی ہو تو

بہت ہے چہ جائیکہ شدید ہو۔

اور الف لام العباد میں یا تو عہد کا ہے معنی یہ ہوں گے کہ حق تعالیٰ ایسے بندوں کے ساتھ شدت رحمت کا برتاؤ کرنے والے ہیں۔ اور اگر جنس کا بھی لیں تب بھی ظاہر ہے کہ معنی یہی ہیں کیونکہ ترجمہ یہ ہوگا کہ حق تعالیٰ عام طور سے بندوں کے ساتھ مہربان ہیں۔ اس سے التزاماً نکلتا ہے کہ ایسے خاص بندوں کے ساتھ تو بطریق اولیٰ رافت کا برتاؤ کریں گے۔ معلوم ہوا کہ ادھر سے عوض میں وہ چیز عطا ہوگی۔ جس سے اس بدل کو کچھ مناسبت ہی نہیں پھر تخصیص نہیں کسی عوض کی نہ معلوم کیا عطا ہوگا۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ عدم تصریح کی وجہ یہ ہے کہ وہ عوض سمجھ میں آنے کی چیز نہیں اس کا بیان کیا کیا جاوے۔ پس بدلین میں کچھ مشابہت اور مناسبت ہی نہیں ہوگی۔ اس کی نسبت کہا ہے

جمادے چند دادم جاں خریدم ☆ بنام ایزد عجب ارزاں خریدم

(میں نے چند پیسوں میں جان خریدی ہے خدا کی قسم بڑی سستی خریدی ہے)

اور کہا ہے

متاع جان جاناں جان دینے پر بھی سستی ہے

یہ جان اس کے سامنے واقعی ایک ٹھیکرا ہے اور وہ مضمون بالکل صحیح ہے۔

جمادے چند دادم جاں خریدم ☆ بنام ایزد عجب ارزاں خریدم
خود کہ یابد ایں چنیں بازار را ☆ کہ بیک گل می خری گلزار را

(میں نے چند پیسوں میں جان خریدی ہے، خدا کی قسم بڑی سستی خریدی ہے، ایسا بازار کہاں سے لاؤ گے کہ ایک پھول کے بدلہ میں چمن ہی خریدتے)

(یہ شعر مکرر) اور

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد ☆ آنکہ در وہمت نیاید آں دھد

(فانی اور حقیر جان لیتے ہیں اور اس کے بدلے باقی جان عطا کرتے ہیں جو وہم وگمان میں بھی نہیں آتا)

جب یہ عطا ہے تو کیا بندے کی طرف سے تسلیم نفس میں کچھ تامل چاہئے اللہ تعالیٰ کے سامنے تو کیا تامل ہوتا۔ اللہ والوں کے سامنے تسلیم کرانے کی نسبت فرماتے ہیں

ہمچو اسمٰعیل پیشش سر بنہ ☆ شاد و خنداں پیش تیغش جاں بدہ

(حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرح اس کے سامنے گردن جھکادے، ہنستے کھیلتے تلوار کے سامنے جان دینے کے لئے تیار ہو جا)

اور حق تعالیٰ کو تو ہر چیز پر مالکانہ اور خالقانہ حقوق حاصل ہیں پھر اگر کسی نے جان بھی نذر کر دی تو کیا احسان ہوا۔ جان انہی کی تو تھی

آں کہ جاں بخشد اگر بکشد رواست

(جس نے جان دی ہے وہ اگر واپس لے لے اس کو روا ہے)

دیکھا جاتا ہے کہ دنیا کے ایک محبوب یا حاکم کے سامنے جاں کی اور آبرو کی کچھ حقیقت نہیں سمجھی جاتی۔ مطیع وہی سمجھا جاتا ہے جو حکم کے سامنے کسی چیز کی بھی پروا نہ کرے سپاہی بادشاہ کے حکم پر گلے کٹواتے ہیں۔ ایک بازارن عورت کے عشق میں لوگ ننگ و ناموس کو بھول جاتے ہیں۔ جان اور مال اور آبرو سب فدا کر دیتے ہیں۔ پھر اگر کسی نے محبوب حقیقی کے سامنے ان چیزوں کو ذخیرہ کر کے رکھا ہے اور فدا نہ کر دیا تو وہ کس کام کا آدمی ہے۔ معمولی محبت میں بھی ان کی پروا کرنا خلاف مروت ہے۔

ایک بزرگ کا قول ہے کہ اگر دوست سے قرض مانگو اور وہ پوچھے کتنا تو وہ شخص دوستی کے قابل نہیں دوستی کے قابل وہ ہے کہ اشارہ پاتے ہی کل مال اپنا حاضر کر دے۔

پہلے زمانے کے لوگ بھی کس طرح کے تھے ایسے دوستوں کا وجود اب کہاں ہے ایک شخص کا قصہ ہے کہ اپنے دوست کے مکان پر رات کے وقت گئے اور آواز دی۔ وہ پانچ منٹ کے بعد گھر میں سے نکلے۔ یہ توقف ظاہراً دوستی کے خلاف تھا۔ مگر جس صورت سے گھر سے باہر نکلے اس میں دیر لازم تھی اور وہ صورت یہ تھی کہ ہتھیار لگائے ہوئے تیار اور خوبصورت لونڈی زیور سے آراستہ پیراستہ آگے آگے اور اس کے ہاتھ میں شمع اور ایک غلام بھی پیچھے پیچھے جس کے کندھے پر کچھ بوجھ۔ آنے والے نے اس بکھیڑے کی وجہ پوچھی اس نے کہا اس وقت تمہارے آنے سے مجھے چند احتمال ہوئے۔ ایک یہ کہ شاید کسی حسین کے نہ ہونے سے تنہائی میں دل گھبرایا ہو۔ اس کے واسطے تو یہ لونڈی موجود ہے اور شاید خادم کی ضرورت ہو تو یہ غلام حاضر ہے۔ اور اگر دشمن نے پریشان کیا ہو تو میں اپنی جان سے موجود ہوں۔ اور شاید خرچ

کی ضرورت ہو تو یہ توڑا اشرفیوں کا تیار ہے۔ کہا مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں یہ سب چیزیں آپ کو مبارک رہیں۔ مجھے اس وقت آپ کی صورت یاد آ گئی اور ایسا دل بے چین ہوا کہ بلا دیکھے رہ نہ سکا۔ بس جائیے آرام کیجئے۔ دونوں اچھے ہی تھے جیسے وہ تھے ایسے ہی وہ تھے۔

کیا اس کی کوئی نظیر دنیاداروں میں مل سکتی ہے۔ آج کل لوگ رسوم کو باعث ازدیاد محبت کہتے ہیں۔ کیا یہ بات کسی اہل رسم کو نصیب ہو سکتی ہے یا ان لوگوں میں ایسی محبت رسوم سے پیدا ہوئی تھی۔ غرض دوستی کی شرط یہ ہے کہ یوں نہ کہے کیا چاہیئے بلکہ بلا کہے جان و مال سے حاضر ہو جائے۔

جب مجازی دوست کے ساتھ محبت کا یہ مقتضا ہے تو خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلق کا مقتضا تو ظاہر ہے کہ کیا ہونا چاہیئے خدا تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب سمجھو اور اس سے آبرو کو یا جان کو یا مال کو بچانا روا نہ رکھو اور یہ نہ کرو

گر جاں طلبی مضائقہ نیست ☆ ور زر طلبی سخن دریں است

(اگر جان مانگو گے تو جان حاضر ہے لیکن اگر مال و زر طلب کرو تو یہ سوچنے کی بات ہے)

خدا سے بخل

خدا تعالیٰ کے ساتھ بخل نہ کرو کہ وہ اپنے ساتھ ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کی کسی چیز کی احتیاج نہیں جو کچھ خرچ کرتے ہیں وہ صرف تمہارے نفع کے لیے۔ خدا تعالیٰ کے ساتھ خلوص اور عشق کا برتاؤ چاہیئے۔ نہ ایسا جیسے کسی بخیل سے دوست نے کچھ مانگا۔ کہا محبت رکھیں پاک اور لینے دینے کے منہ میں خاک۔ ہماری محبت ہے اور لینے دینے کا جھگڑا ہے۔

ایک بخیل کا قصہ ہے کہ اس سے ایک دوست نے کہا کہ اپنی نشانی کے واسطے یہ انگوٹھی دے دو کہ جب اسے دیکھا کریں تو تم یاد آ جایا کرو گے۔ کہا اتنے بکھیڑے کیا ضرورت ہے یاد کیلئے یہی کافی ہے کہ جب تم اپنی انگلی خالی دیکھو تو میری یاد آ جایا کرے گی کہ انگوٹھی مانگی تھی نہیں دی تھی۔

نہ مال کے خرچ کرنے میں خدا تعالیٰ کے سامنے حیلہ بہانہ چاہیئے نہ جان کے خرچ کرنے میں خدا تعالیٰ کے سامنے چور بنے۔

جیسے ایک نوکر کا قصہ ہے کہ وہ کام چور بہت تھا۔ جب کام کو کہا جاتا تو کوئی ترکیب ایسی نکالتا کہ کام کرنا نہ پڑے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آقا نے کہا ذرا صحن میں نکل کر دیکھنا بارش تو نہیں ہو رہی ہے۔ کہا حضور بارش ہو رہی ہے کہا باہر تو نکلا نہیں کیسے معلوم ہوا کہ بارش ہو رہی ہے۔ کہا

حضور ابھی بلی باہر سے آئی تو وہ بھیگی ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ بارش ہو رہی ہے (بھیگی بلی کا قصہ یہی ہے) پھر آقا صاحب نے کہا چراغ گل کر دے کہا حضور منہ ڈھانک لیں۔ جب آنکھیں ڈھانک لیں اپنے سامنے اندھیرا ہو گیا دنیا میں کچھ ہوا کرے۔ کہا اچھا کواڑ تو بند کر لے کہا میں سارے کاموں کا نوکر تھوڑا ہی ہوں۔ دو کام میں نے کیئے ایک کام آپ کر لیجئے۔

ایسے ہی بعض دوست بھی ہوتے ہیں کہ ترکیبیں بناتے ہیں اور کام کچھ بھی نہیں آتے۔ کیا اللہ میاں کے ساتھ یہی برتاؤ کافی ہے کہ وہ کچھ کم خرچ کرنے کا حکم دیں تو اس بخیل کی طرح کہہ دیا جاوے کہ ہمیں اس طرح یاد کر لینا کہ فلاں شخص نے بخل کیا اور خرچ نہ کیا۔ حقوق مالیہ کے ادا نہ کرنے کی حقیقت یہی تو ہے۔ اس بخیل کے قصہ کو سن کر تو ہم لوگ ہنستے ہیں اور خود ویسا ہی کرتے ہیں بلکہ اتنا فرق بھی ہے کہ اس نے تو یہ جواب ایسے شخص کو دیا جس سے اس کو مساوات حاصل تھی۔ اور اس کا مال مانگتا تھا اور یہاں حقوق مالیہ کے ادا نہ کرنے میں یہ جواب ایسے شخص کو دیا جاتا ہے جو ہمارا مساوی نہیں ہے۔ ہم بندے ہیں اور وہ خدا ہے اس نسبت کو ملاحظہ کیجئے۔ قطع نظر بخل سے گستاخی بڑی ہے۔ اگر ایک بہت بڑا بادشاہ ادنیٰ بھنگی سے کوئی چیز مانگے اور وہ اس کو کورا جواب دیدے تو بادشاہ کی کس قدر توہین کی اور یہ کس قدر جسارت ہے پھر جو مال حق تعالیٰ مانگتے ہیں وہ کسی کے باوا کا نہیں ہے۔ خود ان ہی کا مال ہے۔ اس کو روکنے کا کیا حق ہے۔

یہ دو باتیں ہمارے برتاؤ میں اس بخیل کے قصہ سے زائد ہیں اور اس پر محبت کا دعوے کیا ہی برمحل ہے۔ خدا کی محبت میں مال کا خیال۔ علیٰ ہٰذا دوسرے حقوق میں خدا کی محبت کا دعوٰی ہے۔ اور آبرو یا جان کا خیال! یہ ہے خرابی۔ جس نے غارت کر رکھا ہے۔ معلوم ہے کہ فلاں رسم بری ہے مگر کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ ہے تو شرع کی بات مگر ہم چشموں میں ہیٹی ہوگی۔ جناب کیسے ہم چشم اور کیسی ہیٹی

نساز و عشق را کنج سلامت ☆ خوشا رسوائی کوئے ملامت

(یعنی عشق کو گوشہ سلامتی موافق نہیں اس کے مناسب تو کوچہ رسوائی ہے)

عاشق کا مذہب

کہیں عاشق کو ملامت کا اثر ہو سکتا ہے بلکہ اس کو تو ملامت میں مزا آتا ہے اور ملامت

سے خوف ہونا تو دلیل اس بات کی ہے کہ عشق کی ہوا بھی نہیں لگی اس واسطے کہا ہے

دررہ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں ☆ شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

(راہ لیلیٰ میں خطرات بہت ہیں اس کے قطع کرنے کے لئے مجنوں ہونا پہلی شرط ہے)

جب مجنوں (عاشق) ہو گئے تو کوئی بھی خطرہ باقی نہیں تھا۔ خود عاشق پر تو کیا اثر ہونا کہ وہ دوسروں جیسا ہو جاوے وہ تو دوسروں کو بھی اپنا ہی سا بنانا چاہتا ہے۔ چنانچہ دوسروں کو مشورہ دینے کے لیے کہتے ہیں

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار ☆ بگذار و خم طرہ یارے گیرند

(مصلحت یہ ہے کہ سارے جہان کی مصلحت کو چھوڑ کر دوست محبوب حقیقی کی طرف متوجہ ہو جائے)

سب مصلحت اور انجام بینی رکھی جاتی ہے جس وقت عشق کی ذرا سی بھی ہوا لگ جاتی ہے اور آدمی آبرو اور جان اور مال سب محبوب کے سامنے رکھ دیتا ہے اور اگر وہ ان سب کو قبول کرلے تو یہ احسان مند ہوتا ہے۔ عشق کی ہوا ہی نہیں لگی ہے جو مصلحت اور پالیسی لیئے پھرتے ہیں۔ مصلحت اور پالیسی کی ضرورت وہیں ہوتی ہے جہاں دو مختلف طرف کے تعلق کو نباہنا پڑتا ہے کہ اس کو بھی راضی رکھتا ہے اور اس کو بھی۔ لہذا کچھ ادھر کی بات ہو اور کچھ ادھر کی۔ بس ایک کو لو اور سب کو ترک کردو اور اس کے سامنے کسی کی پرواہ نہ کرو۔ عاشق کو کیا پرواہونی چاہیئے۔ عاشق کا مذہب تو یہ ہوتا ہے

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں ☆ مانمی خواہیم ننگ و نام را

(اگرچہ عقلاء کے نزدیک بدنامی کی بات ہے لیکن ہم ننگ و ناموس کے خواہاں نہیں ہیں)

معمولی عشقوں میں یہی ہوتا ہے اور خدا کا نام لینے والے کے نزدیک تو دنیا و مافیہا بھی کچھ نہیں۔ کیسا ننگ اور کیسا نام واللہ سب ہوا ہو جاتے ہیں مولانا فرماتے ہیں

اے دوائے نخوت و ناموس ما ☆ اے تو افلاطون و جالینوس ما

(اے ہمارے ننگ و ناموس کے طبیب اے ہمارے افلاطون اور جالینوس)

نخوت و ناموس کو تو یہ محبت پھونک دینے والی ہے۔ ان کا تو نام ہی نہیں رہتا۔ قیامت تک یہ مصلحت اندیشی عشق میں نہیں ہوسکتی کہ ہٹی ہوگی۔

عاشق کی نظر تو ایک ہی پر پڑتی ہے دوسرا کوئی نظر میں ہوتا ہی نہیں جس کے سامنے ہٹی ہوگی۔

www.alehaq.org

جنت کا سودا

غرض جب خدا کا نام لیا تو اسی کے ہو رہو اور اس سے کوئی چیز ذخیرہ نکرو جان و مال و آبرو سب اس پر فدا کر دو۔ کیا غضب ہے کہ حق تعالیٰ سے معاہدہ تو کیا گیا ہے اس طرح کہ

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ.

یعنی حق تعالیٰ سے ہم نے جنت کا سودا کیا ہے اور ہم نے داموں میں دیا ہے اپنی جانوں کو اور مالوں کو اور جنت کے خریدار بنے ہیں۔ مگر یہ اچھی خریداری ہے کہ چیز لے لی اور دام ندارد۔ جنت وغیرہ سب لینے کے لیے ہر وقت ایسے تیار بیٹھے ہیں کہ اگر آواز دی جاوے کہ چلو جنت کس کس نے خریدی ہے تو سب سے پہلے ہم ہی بول اٹھیں گے کہ ہم ہیں ہم۔ اور جو کوئی پوچھے کہ دام بھی دیئے ہیں تو جواب ندارد ہوگا۔

ذرا انصاف کیجئے اور پھر حق تعالیٰ نے خریدا بھی کیا ہے خود اپنی ہی چیز۔ کیونکہ وہ تمہاری چیز کون سی ہے جس کو تم عوض دیتے ہو وہ سب چیزیں تو ان ہی کی ہیں۔ صرف فرضی بیع ہے اور دل خوش کرنے کو بیع کا نام لگا دیا ہے۔

جو چیز ہماری کہی جاتی ہے اس کی حقیقت یہ ہے جیسے کسی نے چارپائیاں بنائیں اور اپنے ہی مِلک میں رکھ کر کہہ دیا کہ یہ ننھے کی اور دوسرے منے کی (یعنی دوسرے بچے کی) کیا یہ واقع میں ان ہی کی ہیں ان کے تو باوا کی ہیں۔ بس دنیا کا مال و متاع اسی طرح سے ہمارا کر دیا گیا ہے کہ نام لگا دیا گیا ہے ہمارا ان پر۔ جیسے بچوں سے کہہ دیا کہ یہ ننھے کی اور یہ دوسری منے کی۔ اللہ میاں نے اپنی چیزوں میں سے بعض پر ہمارا نام لگا دیا پھر کہا یہ چیز بیچتے ہو۔ دونوں اب بھی ہیں ان ہی کی۔

غور سے دیکھئے تو مطلب کیا ہے کہ وہ چیزیں تو دی ہی نہیں۔ دوسری چیز اس بہانہ سے اور دے دی کیونکہ ان کو یہ چیزیں لینا تھوڑا ہی ہے ان کو جان و مال کا اچار ڈالنا تھوڑا ہی ہے۔ اور ان کے جان و مال مانگنے کے یہ معنیٰ بھی نہیں کہ خودکشی چاہتے ہوں یا مال سے الگ کرتے ہوں کہ بالکل محتاج ہو کر بیٹھ جاؤ بلکہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ کچھ حدود ہیں ان کے اندر رہے اور مخلطی بالطبع ہو کر جو دل میں آوے مت کر گزرے آرام و لذات کو انہیں دے دو پھر یہ تم ہی کو دے دیں گے۔

www.ghiebaq.org

جیسے بعض کریم النفس نیوتہ میں ایک روپیہ لیتے ہیں تو خود دو روپیہ دیتے ہیں۔ ایسوں کے سامنے ایک روپیہ پیش کرنے میں بخل کرنا اپنا ہی نقصان کرنا ہے دیتے وقت تو ایک روپیہ گرہ سے جاتا ہی ہے۔ اور کوئی کوتاہ نظر لالچ میں آ کر ہاتھ روک لے تو تعجب ہے مگر جس کو اس کے کرم کی حالت معلوم ہے اور اس کے انجام کو جانتا ہے وہ ایک روپیہ دینے میں ہرگز تامل نہ کرے گا بلکہ غنیمت سمجھے گا اور خوش ہوگا کہ یہ روپیہ اپنے ساتھ ایک کو اور لاوے گا۔ یہی معاملہ حق تعالیٰ کا ہے کہ اس وقت جان و مال کے یعنی لذات کے مشتری بنتے ہیں مگر جتنا لیں گے اس سے دو چند نہیں بلکہ اضعافاً مضاعفہ اور ہزاروں گنا زیادہ دیں گے۔ محبت میں ظاہر اُمر جاتا ہے مگر

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ☆ ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما
نیم جاں بستاند و صد جاں دہد ☆ آنکہ در وہمت نیاید آں دہد

(جس کو عشق حقیقی سے روحانی لذت حاصل ہوگئی وہ اگر مر بھی جائے تو واقع میں اس کو زندہ کیا جائے گا، فانی اور حقیر جان لیتے ہیں اور اس کے بدلے باقی جان عطا کرتے ہیں جو وہم و گمان میں بھی نہیں وہ عنایت کرتے ہیں)

غرض یہ بیع بھی قرض ہے اور در حقیقت عطا ہی عطا ہے۔ بہر حال فرماتے ہیں آیت میں کہ بعض لوگ وہ ہیں جو بیچتے ہیں اپنی جان کو "ابتغاء مرضاۃ اللہ" کے لیے اور اس کے دام ادھر سے کیا ہیں۔ **واللہ رؤف بالعباد** یعنی حق تعالیٰ بندوں کے ساتھ بہت ہی مہربان ہیں۔

تصوف کی صورت

ترجمہ آپ نے سن لیا۔ اب میں بتاتا ہوں کہ وہ انتہائی مرتبہ کیا ہے جس کا اس آیت میں ذکر ہے۔ اس کو میں قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کروں گا۔

پس جان لیجئے کہ فن سلوک جس کا یہ مسئلہ ہے اس کے ماہرین اور محقق نے اکثر مقامات یعنی اعمال باطنہ میں ترتیب کا حکم کیا ہے اور ان مقامات کی مثال درسیات کے سبق کی سی ہے کوئی سبق تو ایسا ہے کہ اس میں اور دوسرے اسباق میں ترتیب ضروری ہے جیسے الف بے اور سیپارہ کہ یہ ممکن نہیں کہ الف بے کو سیپارہ پر مقدم نہ کیا جاوے اور بعضے سبق ایسے ہیں کہ کئی کئی ہو سکتے ہیں جیسے کافیہ اور قطبی لوگ اس فن سے چونکہ بالکل نا آشنا ہو

گئے ہیں اس واسطے قاعدہ اور طریقہ جانتے نہیں جو چال سمجھ میں آجاتی ہے اختیار کر لیتے ہیں اور مدتوں پریشان رہتے ہیں اور حاصل کچھ بھی نہیں۔

جیسے کوئی یہ نہ جانتا ہو کہ الف بے اور سیپارہ میں ترتیب ضروری ہے اور وہ بلا الف بے پڑھے سیپارہ شروع کر دے اور ایک حصہ عمر کا گزار دے مگر سیپارہ میں کما حقہ، کامیاب نہ ہوگا۔ بخلاف اس کے ایک شخص ترتیب سے پڑھے تو اس کو نہ اتنی محنت کرنی پڑے گی۔ اور اتنا وقت صرف ہوگا اور کامیاب بھی ہو جاوے گا اول شخص کے نزدیک سیپارہ اس قدر مشکل چیز ہے کہ اسے کے پڑھنے میں وقت بھی زیادہ صرف ہو گیا اور دماغ بھی خالی ہو گیا اور دوسرے کے نزدیک کچھ بھی نہیں آرام سے پڑھا اور وقت زیادہ نہیں لگا اور کامیابی بھی خاطر خواہ ہوئی۔ یہ طریقہ اچھا ہے یا وہ۔ تصوف کے مشکل ہونے کی یہی اصل ہے۔ ورنہ فی نفسہٖ بہت ہی سہل ہے اگر شوق ہے تو اس کا طریقہ سیکھئے۔ ہر کام طریقہ ہی سے ٹھیک ہوتا ہے اور بے طریقہ چلنے سے سوائے حیرانی کے کچھ نہیں ہوتا۔ اور وہ طریقہ شیوخ محققین جانتے ہیں پس اس کا اتباع گویا عین طریق ہے۔

گر ہوائے ایں سفر داری دلا ☆ دامن رہبر بگیر و پس بیا
واردات باش صادق اے فرید ☆ تا بیابی گنج عرفان را کلید

(اے دل اگر تو راہ طریقت میں چلنا چاہتا ہے تو کسی شیخ کامل کا دامن پکڑ اور خودی کو چھوڑ دے، اپنے راہ طریقت کی تلاش میں سچا اور ثابت قدم رہ تا کہ اس خزانہ کی چابیاں تجھ کو مل جائیں)

اور

بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق ☆ عمر بگذشت و نہ شد آگاہ عشق

(بغیر رہبر اور مرشد کے جس نے اس راہ میں قدم رکھا وہ ساری عمر میں اسی میں گم ہو کر رہ گیا اور کامیاب نہ ہوا)

بس کسی کے ساتھ ہو جاؤ اور اپنے کو اس کے سپرد کر دو

پیر خود را حاکم مطلق شناس ☆ تا براہ فقر گردی حق شناس
چوں گزیدی پیر ہن تسلیم شو ☆ ہمچو موسیٰ زیر حکم خضر رو
صبر کن در راہ خضر اے بے نفاق ☆ تا نگوید خضر رو ھذا فراق

(اپنے پیر کو پورا اپنا حاکم مانو تا کہ فقر کے راستہ سے اللہ تعالیٰ کو پہچان سکو، جب پیر چن لیا تو پھر اس کا کہنا مانو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ چلو۔ اے سچی آدمی خضر کی راہ میں صبر سے کام لے تا کہ حضرت خضر علیہ السلام یہ نہ کہہ دیں کہ بس اب مجھ سے جدا ہو جا)

تصوف کی کنجی

مگر پیر کو پہلے دیکھ لو۔ ہر شخص کے ساتھ نہ ہو جاؤ۔ اس فرقے میں راہزن بہت ہیں۔ پیر کامل ہو۔ متبع سنت ہو۔ متبع شیطان نہ ہو۔ کامل مکمل ہو اور جامع ہو ظاہر و باطن کا۔ نہ ظاہر اس کا خلاف شرع ہو نہ باطن خوب پرکھ لو اس میں جلدی نہ کرو۔ اس میں جتنی دیر لگے گی اتنا ہی نفع زیادہ ہوگا۔ جب ایسا پیر مل جاوے تو ہمہ تن اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دو۔ اور وہ جو کچھ بتلاوے اسی کو صحیح سمجھ لو۔ کچھ اس میں شک وشبہ نہ کرو۔ اس کے حکم کو خدا کا حکم سمجھو اور یہ پیر پرستی نہیں۔ وہ خدا نہیں ہے بلکہ یہ اس واسطے کہا جاتا ہے کہ وہ جو کچھ بتاتا ہے وہ خدا اور رسولؐ ہی کا حکم ہوتا ہے اور سب قرآن وحدیث کے موافق ہوتا ہے۔

قرآن وحدیث میں تصوف بھرا پڑا ہے اور ایک ایک مسئلہ تصوف کا قرآن وحدیث سے ثابت ہے یہ ہماری سمجھ کا قصور ہے کہ ہم نے نہیں سمجھا مثلاً دیکھئے کہ یہی مسئلہ انتہائی مرتبہ کا کیا ہے اس آیت میں موجود ہے جس کا اس وقت بیان شروع کیا گیا ہے۔ مگر ہمیشہ پڑھا اس آیت کو اور کبھی سمجھ میں نہ آیا جب تک کہ ان لوگوں نے نہ بتلایا۔ یہ سب علوم قرآن وحدیث میں موجود ہیں مگر مقفل ہیں اور کنجی ان کی حضرات اہل اللہ کے پاس ہے۔ ذرا سی معمولی بات تک بھی رسائی بلا ان کی عنایت کے نہیں ہو سکتی اور ان کی عنایت کے بعد بڑی بڑی باتیں بھی معمولی نظر آتی ہیں۔ اور ہر جز میں تصوف نظر آتا ہے اب تو یہ حالت ہے ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش ☆ من از رفتار پایت می شناسم
(کسی بھی بھیس میں آؤ میں رفتار قدم سے پہچان لیتا ہوں)

بلکہ اس سے اور ترقی کی جاتی ہے اور یوں کہا جاتا ہے ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش ☆ من انداز قدت را می شناسم

(کسی بھی بھیس میں آؤ میں تیرے قد کے انداز کو پہنچا تا ہوں)

اب تو ہر آیت وحدیث میں نظر آتا ہے کہ یہاں فلانی بات تصوف کی ہے اور یہاں فلانی ہے اور یہ سب احسان انھیں حضرات کا ہے۔ میرا اس میں کچھ کمال نہیں ہے۔ میں اس موقع پر بھی انھیں کے اقوال نقل کرتا ہوں۔

آج کل کا تصوف

پس اس میں اختلاف ہے کہ انتہائی مرتبہ مقامات سلوک کا کیا ہے جب سلوک میں مقامات ہیں اور مجھے بیان کرنا اسی کے انتہائی مقام کا ہے تو اول ضرورت ہے کہ لفظ مقام ہی کے معنیٰ بیان کئے جاویں کیونکہ یہیں سے غلطیاں شروع ہوتی ہیں۔ آج کل تصوف میں اول سے آخر تک ایسا خبط کیا گیا ہے کہ مجموعہ اعاجیب اور تکلیف مالا یطاق کا نام تصوف ہو گیا ہے۔ اسی واسطے اس کے نام سے لوگ ڈرتے ہیں اور اسی واسطے اس کو شریعت سے الگ کیا جاتا ہے کیونکہ شریعت کا تو عام اور پہلا اصول یہ ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (اللہ تعالیٰ احکام شرعیہ میں کسی شخص کو مکلّف نہیں بناتا مگر اس کا جو اس کی طاقت اور اختیار میں ہو)

اور ان کے مخترع تصوف کا پہلا قدم مالا یطاق ہے پھر دونوں موافق کیسے ہوں چنانچہ بہتوں کا گمان حقیقت تصوف کی نسبت یہ ہے کہ عورت کو ترک کردو اور مکان اور جائیداد بھی علیحدہ کرو تب سلوک میں قدم رکھو۔ (لوگوں نے تصوف کو ہاؤ بنا دیا ہے جس سے دور سے ڈر معلوم ہو) اس واسطے جس کو دیکھیں کہ یہ عورت بھی رکھتے ہیں۔ رہنے کا مکان بھی ان کے پاس ہے۔ اس کو صوفی نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ یہ تو دنیا دار ہے ایسے شخص کو پیر بنانا تو دور رہا۔ ادنیٰ درجہ میں بھی شمار نہیں کرتے۔

حالانکہ کوئی صوفی مطیع سنت کبھی ایسا نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ شریعت ان کے خلاف کے ساتھ وارد ہے۔ چنانچہ تبتّل کو شریعت نے منع کیا ہے اور مکان کی اجازت بھی دی ہے۔ چنانچہ سلف نے مکان رکھے ہیں۔ مکان تو مکان گاؤں خریدنے کو بھی اور ایک گاؤں نہیں دو دو گاؤں خریدنے اور عورت ایک نہیں چار تک رکھنے کو بھی محقق منع نہ کرے گا۔ نہ کسی صوفی نے آج تک منع کیا اور کسی حال کے غلبہ میں خود چھوڑ دینا اور بات ہے۔ جیسے بہت سے

طالبان خدا نے کیا ہے اور بڑے بڑے مجاہدے ان سے منقول ہیں سلطنتیں چھوڑ دی ہیں۔

عشق کی خاصیت

بعضے خشک مزاجوں کو غلبہ کے اس اثر میں بھی کلام ہے مگر غلبہ ایسی چیز ہے کہ جب تک کسی کو پیش نہیں آتا ہے تب تک جو چاہے باتیں بنا لے اور حجت اور دلیل کا مطالبہ کر لے اور جب پیش آ جاوے، تو کوئی چیز بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تم کو غلبہ ہوگا تو تم بھی چھوڑ دو گے۔ اور قیل وقال سب بھول جاؤ گے۔

غلبہ اور عدم غلبہ کی مثال ایسی ہے جیسے پلاؤ اور خشکہ۔ ایک شخص خشکہ کھا رہا ہے اور شوق سے کھا رہا ہے۔ اور بعضے اور لوگوں کو دیکھتا ہے کہ پلاؤ کھاتے ہیں خشکہ کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے تو تعجب کرتا ہے اور اعتراض کرتا ہے کہ یہ ایسی لذیذ چیز کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔ اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ اس کے سامنے بھی پلاؤ کی ایک رکابی رکھ دی جاوے اور اس کو ایک لقمہ پلاؤ کا چکھا دیا جاوے۔ وہ چکھتے ہی پھر نام خشکہ کا نہ لے گا۔ حالانکہ کسی نے اس کو خشکہ سے منع نہیں کیا اس وقت اس سے پوچھنا چاہئے کہ خشکے جیسی لذیذ چیز کو کیوں چھوڑا۔ جواب یہی ملے گا کہ میاں بیٹھو اس کے سامنے خشکہ کیا چیز ہے ایک لقمہ تم بھی کھا کر دیکھو تم بھی یہی کہنے لگو گے۔

یہی حال خدا کے راستے کا ہے کہ آدمی دور سے جو چاہے کہہ لے اور طالبان خدا پر اعتراض کر لے۔ مگر ذرا ادھر کو رخ کر کے پھر دیکھیں وہ اعتراض کدھر جاتے ہیں اور دنیا اس کو کیسے یاد رہتی ہے ؎

تا بدانی ھر کہ را یزداں بخواند ☆ از ہمہ کار جہاں بے کار ماند

(جس شخص کو اللہ تعالیٰ اپنا لیتے ہیں اس کو تمام دنیا کے کاموں سے بے کار کر دیتے ہیں)

اس وقت یہ حالت ہوگی کہ دنیا سے منع نہ کرنا تو درکنار اگر امر بھی کیا جاوے گا۔ دنیا کی طلب کا تو اس سے نہ ہو سکے گا۔ بہت موٹی سی مثال اس کی یہ ہے کہ ایک طوائف سے کسی کا دل لگ گیا ہو تو وہ اسی کا ہو رہتا ہے اور بی بی کو بھول جاتا ہے۔ حتی کہ اگر وہ طوائف اب اس کو اجازت بھی دے کہ بی بی کے پاس جاؤ۔ بلکہ اس کا امر بھی کرے تب بھی وہ نہ کر سکے۔ محبت میں تو خاصیت ہی یہ ہے کہ اور کچھ رہتا ہی نہیں۔ جب ایک بازاری عورت کے عشق میں یہ خاصیت ہے تو ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود ☆ گوئے گشتن بہر وے اولیٰ بود

(حق تعالیٰ شانہ کا عشق لیلیٰ کے عشق سے کہیں کم ہوسکتا ہے، عشق خداوندی میں گیند کی طرح لڑھکنا زیادہ اچھا ہے)

اور شیخ فرماتے ہیں ؎

ترا عشق ہمچو خودے زآب وگل ☆ رباید ہمہ صبر و آرام و دل

(میرا عشق اپنے جیسے مٹی پانی والے سے دل سے صبر اور آرام لے جاتا ہے)

اور مال و دولت کا یہ حال ہوتا ہے ؎

چو در چشم شاہد نیاید زرت ☆ زر و خاک یکساں نماید برت

(جب محبوب کی نظر میں تمہارا مال وزر نہیں آتا تو مال وزر اور خاک تمہارے نزدیک برابر ہیں)

آگے فرماتے ہیں ؎

عجب داری از سالکان طریق ☆ کہ باشند در بحر معنی غریق

(تو تعجب کرتا ہے سالکان طریق سے جو کہ معنی کے دریا میں غرق ہوں)

یعنی جب عشق میں مطلقاً یہ خاصیت ہے تو عشق حقیقی میں بدرجہ اتم ہوگی کہ آدمی ایک ہی کا ہو رہے گا۔ اس واسطے جرأت کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ گاؤں خریدنا۔ جائیدار خریدنا۔ مال و متاع بڑھانا گو فی نفسہٖ منافی طریق نہیں لیکن اگر محبت کا غلبہ ہو تو یہ خود ہی چھوٹ جائیں گے۔ میں نہیں چھڑاتا۔

تصوف اور شریعت

مگر کیا کیجئے کہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہتیں۔ دو تو جمع نہیں ہوسکتیں ہاں! یہ ممکن ہے کہ اصلی تلوار کو بدل دیا جاوے اور اس کی جگہ لکڑی کی تلوار رکھ دی جاوے اس سے نہ نیام کو انکار اور اصلی تلوار کا بھی ضرر نہیں لیکن جو شخص تلوار کو جانتا ہے اس سے کیا ممکن ہے کہ اصلی کی جگہ لکڑی رکھ لے۔ اسی طرح جس دل میں اللہ میاں آگئے ہیں اس میں دوسرے کی گنجائش کہاں۔ دونوں تو جمع نہیں ہوسکتے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اللہ میاں کو چھوڑ کر دوسرے کو جگہ دے لے۔ مگر کس دل سے۔ کوئی کہہ دو ایسا کرسکتا ہے۔ اللہ میاں کو کوئی چھوڑ سکتا ہے۔

غرض یہ تو غلبہ کے آثار ہیں۔ اس میں آدمی مغلوب ہوتا ہے۔ مگر حکم فن وہی ہے کہ جو چیز

جائز ہے۔ شرعاً اس کو کوئی منع نہیں کر سکتا جب کہ حق تعالیٰ نے گاؤں اور جائیدار خریدنے کو۔ اور چار عورتیں رکھنے کو جائز کہا تو کس کا منہ ہے کہ منع کرے اور جب خدا تعالیٰ نے ان چیزوں کو منع نہیں فرمایا تو یہ مانع فی السلوک کیسے ہوں گے اس کا اعتقاد رکھنا حکم الٰہی کا مقابلہ ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ ان میں ایسا مشغول نہ ہو کہ اصل کام سے یعنی یاد خدا سے رہ جاوے اور معاصی میں مبتلا ہو جاوے۔ اس وقت حکم الٰہی ان کے منع کے ساتھ متعلق ہوگا۔ جب کہ نصوص شرعیہ سے ظاہر ہے۔ غرض تصوف سوائے شریعت کے کوئی نئی چیز نہیں۔

مقام کی حقیقت

مگر دیکھ لیجئے سلوک کا نام لے کر لوگ کس مشکل میں ڈالتے ہیں اور دنیا کو جب تک بالکل ترک نہ کرے اس کو سالک ہی نہیں سمجھتے۔ گو آج کل اس ترک کی حقیقت اضاعت حقوق ہے جو کسی طرح بھی جائز نہیں اور کبھی وہ ذریعہ وصول الی اللہ کا نہیں ہو سکتا۔ جو حقیقت میں نے سلوک کی عرض کی کیسی صاف ہے۔ میں اس واسطے کہتا ہوں کہ تصوف کوئی مشکل چیز نہیں مگر کرنا شرط ہے۔ نری باتوں سے تو کوئی کام بھی نہیں ہو سکتا۔ غرض سلوک کا کوئی جزو کوئی انوکھی چیز نہیں۔ جیسا کہ لوگوں نے جہل سے سمجھ رکھا ہے۔

مثلاً لفظ مقام ہے۔ اس مقام ہی کے معنی لوگوں نے کیا کیا تراشے ہیں۔ چنانچہ آج کل اگر کوئی ذرا پڑھا لکھا فقیر ہوا تو وہ مقام کے معنی لیتا ہے، جبروت، لاہوت۔ یہ علماء تصوف سے چرائے ہوئے لفظ ہیں۔ عوام کے سامنے ان لفظوں کو بولا جاتا ہے کہ معلوم ہو کہ یہ بھی اہل فن ہیں۔ حالانکہ ان کو خبر بھی نہیں کہ یہ چیز کیا ہیں بس جبروت لاہوت یاد ہے میرا مطلب یہ نہیں کہ جبروت وملکوت مہمل ہیں لیکن یہ مراتب وجود ہیں۔

اصطلاح صوفیہ میں جس کو مقام کہتے ہیں اور جس کا مجھے انتہائی درجہ بیان کرنا ہے وہ یہ نہیں ہے۔ بلکہ نیک کام اختیار کرنے کو مقام کہتے ہیں اور اتنی ہی تخصیص اور ہے کہ نیک کام سے مراد بھی عمل باطنی ہے۔ عمل ظاہری کو مقام نہیں کہتے۔ مثلاً نماز پڑھنے کا کوئی عادی ہو گیا اور اچھی طرح اس کی تکمیل کر لی تو ان کی اصطلاح میں اس کو مقام نماز کے طے کرنے والا نہ کہیں گے۔ بلکہ اعمال باطنہ کا نام مقام ہے۔ جیسے تواضع یعنی اپنے آپ کو کم تر سمجھنا یا اخلاص یعنی عمل کو بلا کسی غرض کے کرنا یا جیسے صبر و شکر، رضا توحید وغیرہ جن کی تفصیل کتب فن

میں موجود ہے۔ ان کے حاصل کرنے کو سلوک مقامات کہتے ہیں۔ تو جب کہیں فلاں شخص نے مقام تواضع طے کر لیا تو معنیٰ یہ ہوں گے کہ اس ملکہ کی تکمیل کر لی۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس!

سلوک کے معنی

سلوک اڑنے کو نہیں کہتے نہ دریا پر چلنے کو کہتے ہیں۔ کیونکہ سالک آدمی ہوتا ہے نہ وہ مچھلی بن جاتا ہے نہ پرندہ بن جاتا ہے۔ لوگوں نے ان خوارق ہی کو کمال سمجھ لیا ہے اور اسی کو غایت سمجھتے ہیں۔ یہ حاصل ہو گیا تو بس کامل ہو گئے۔ اور یہ کمال نہ پیدا ہوئے تو بس سب محنت کو رائگاں سمجھتے ہیں۔ لیکن قرآن و حدیث میں تو کہیں ان باتوں کا پتہ نہیں ہے۔ مقامات یعنی اعمال کو قلب کے تصفیہ کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔ اور یہی تصفیہ قلب غایت ہے ان اعمال کی اور یہی بڑی چیز ہے رہا پانی پر چلنا اور ہوا پر اڑنا اس کے مقصود سمجھنے کے تو یہ معنیٰ ہیں کہ انسانیت سے حیوانیت کی طرف مسخ ہو جاؤ اور آدمی سے مچھلی یا پرندہ بن جاؤ۔

حاصل یہ کہ بعضے اعمال وہ ہیں جن کو اختیار کیا جاتا ہے اور بعض اعمال وہ ہیں جن کو ترک کیا جاتا ہے۔ مثلاً ریا، تکبر وغیرہ یہ سب مقامات ہیں اور ان کی تحصیل و تکمیل کا نام سلوک ہے اس تحصیل میں بعض مقدم اور مؤخر ہوتے ہیں جیسے میں نے مثال دی تھی کہ الف بے اور سیپارہ کا پڑھنا کہ دونوں میں ترتیب ضروری ہے بلا اس کے تحصیل نہیں ہو سکتی اور بعضے دو دو ایک ساتھ حاصل کئے جا سکتے ہیں اور اس کا فیصلہ کہ کن کن میں ترتیب ہے اور کون کون مجتمع ہو سکتے ہیں یہ شیوخ کی رائے پر ہے۔

جیسے طبیب کہ بعض معالجات کو ترتیب وار رکھتا ہے جیسے منضج کو اور مسہل کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ ان میں تقدیم و تاخیر ہو اور دونوں کو جمع کر دیا جاوے اور نہ یہ ہو سکتا ہے کہ ترتیب بدل دی جاوے کہ اول مسہل دیدے اور پھر منضج۔ اور بعضے کو جمع بھی کرتا ہے جیسے مسہل اور مدرر کہ ایک ہی دن میں دیئے جاتے ہیں۔

غرض اہل فن جانتے ہیں کہ کون کام ترتیب کے ساتھ ہونا چاہئے اور کون کون کام مجتمعاً بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کے کچھ قواعد بھی ہیں۔ مگر نہ ان کے بیان سے کچھ نفع ہو سکتا ہے اور نہ ان کے بیان کی یہاں گنجائش ہے کیونکہ کوئی چاہے کہ اس وقت ان قواعد کو سن کر اپنے معالجہ باطن میں ان سے کام لے لے اور طبیب معالج کی طرف رجوع سے مستغنی ہو جاوے تو یہ ممکن نہیں۔

اور اس کی مثال بالکل ایسی ہوگی کہ بروقت معالجہ طبیب کی طرف رجوع کرنا کارآمد ہے۔ یہ کارآمد نہیں کہ طبیب مریضوں کے سامنے ان قواعد کی تقریر کر دے کیونکہ اس سے وہ علاج نہیں کر سکتے۔ بلکہ ضرورت اسی بات کی ہے کہ جب علاج کی ضرورت پیش آ سے اس سے جزئیات کو دریافت کرلیں اسلم اور سہل طریق یہی ہے۔

رضا کے معنی

اس واسطے ان قواعد کا بیان تو فضول ہے جو ترتیب اور جمع کے ہیں ہاں اجمالاً اتنا بیان کرنا مقصود ہے کہ بعض میں ترتیب ہوتی ہے۔ اس ترتیب میں آخری درجہ کیا ہے۔ یعنی سب مقامات طے ہوکر جس کے بعد مجاہدہ ختم ہوجاوے وہ کون سی چیز ہے۔ سو اس میں اقوال مختلف ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ رضا اخیر مقام ہے۔ رضا مصدر ہے۔ فاعل اس کا خواہ اپنے آپ کو کہے تو معنیٰ یہ ہوں گے کہ آپ راضی ہوں۔ حق تعالیٰ سے اور کسی فعل سے حق تعالیٰ کی کشیدگی اور ناگواری نہ رہے۔ یا فاعل حق تعالیٰ کو کہئے تو یہ معنیٰ ہوں گے کہ حق تعالیٰ آپ سے راضی ہو گئے۔ اور ان دونوں میں تلازم ہے اور مقام ایک ہی ہے نام اس کا رضائے حق رکھو یا رضاء عبد۔ تلازم کے لفظ پر ایک شعر یاد آیا۔ اس سے اس مضمون کی توضیح ہوجاتی ہے

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف ☆ گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف

(خوش قسمتی سے محبوب کا دامن ہاتھ میں آنا چاہیے پھر وہ ہم کو کھینچ لے تب بھی وصل ہے اور ہم اس کو کھینچ لیں تب بھی وصل ہے)

محبوب کا دامن ہاتھ میں آنا چاہیئے پھر وہ ہم کو کھینچ لے تب وصل ہے اور ہم اس کو کھینچ لیں تب وصل ہے۔ غرض رضا کے دونوں معنیٰ متلازم ہیں اور ہر حال میں یہ امر اس میں مشترک ہے کہ خدا تعالیٰ کے کسی فعل سے ناگواری نہ ہو رضا کے معنی آپ نے سن لیئے کہ حق تعالیٰ کے کسی فعل سے ناگواری نہ ہو اور ایک صورت میں تو اس کے یہ معنی ہی ہیں یعنی جب اس کا فاعل بندہ کو قرار دیا جاوے اور جب فاعل حق تعالیٰ کو قرار دیا جاوے۔ جب یہ اس کے لفظی معنی نہ سہی کیونکہ لفظی معنی تو یہ ہیں کہ حق تعالیٰ بندہ سے راضی ہیں مگر باعتبار وقوع کے یہ بات اس کو لازم ہے کہ جب کسی بندے سے حق تعالیٰ راضی ہوتے تو اس کی حالت یہی ہوتی ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے ہر کام سے راضی ہوتا ہے۔ غرض مقام رضا میں یہ ضرور ہوتا

ہے کہ بندہ حق تعالیٰ کے ہر کام سے راضی ہوتا ہے اور اس کا امتحان یہ ہے کہ گو طبعاً ناگواری ہو۔ مگر عقلاً شکایت نہ ہو۔ اس میں بھی جاہلوں نے کیا کیا خبط کئے ہیں۔

رضا کی شرح یہ کرتے ہیں کہ ایسی حالت ہو کہ تیر بھی لگے تو اف منہ سے نہ نکلے اور خبر تک بھی نہ ہو۔ ایسی ہی شرحوں سے تصوف تکلیف مالا یطاق کا نام سمجھ لیا گیا ہے۔ اور اسی وجہ سے اس کے نام سے لوگ ڈرتے ہیں کہ ہمارے بس کا ہے ہی نہیں۔ کون بکھیڑے میں پڑے۔

خوب سمجھ لیجئے کہ طبعاً ناگوار ہونا رضا کے خلاف نہیں۔ ہاں عقلاً ناگواری نہ ہونا چاہیئے۔ مثلاً بیٹا مرے تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ قلب میں شکوہ شکایت تو نہیں اور یہ تو نہیں کہتا کہ نہ مرتا تو اچھا ہوتا۔ رنج طبعی تو جتنا بھی ہو برا نہیں۔ صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ ناگواری عقلی تو نہیں ہے اور ناخوشی و کراہت تو نہیں ہے۔ یعنی یہ سمجھے کہ بالکل ٹھیک ہوا جو کچھ ہوا۔ اور یہی مناسب تھا اور اسی میں حکمت ہے۔ پھر اس کے ساتھ گو طبعاً ناگواری ہو تو اس سے تعجب نہ کیجئے کہ ناگواری طبعی اور رضامندی عقلی جمع کیسے ہو سکتے ہیں ظاہراً تو دونوں ضدین معلوم ہوتے ہیں۔

اس کی ایک مثال ہے جس سے یہ اشکال رفع ہو جاتا ہے اور اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ مقام کوئی زیادہ مشکل نہیں۔ لوگ ایسی باتوں کو محققین سے حل نہیں کرتے۔ خود ہی بیٹھے بیٹھے جو سمجھ میں آتا ہے اس پر رائے قائم کر لیتے ہیں چنانچہ بہت سے لوگ اسی کے متعلق سمجھے بیٹھے ہیں کہ خوشی ناخوشی کیسے جمع ہو سکتے ہیں۔ اور اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ کسی سے پوچھ لیں۔

خوب سمجھ لیجئے کہ یہ ممکن ہے کہ طبعاً گرانی ہو اور عقلاً نہ ہو۔ اس پر کوئی اشکال نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان میں نہ تناقض ہے اس واسطے کہ تناقض میں وحدت حیثیت شرط ہے اور جب ایک میں قید عقلاً کی ہے اور دوسرے میں طبعاً کی تو تناقض کہاں ہوا اور نہ قضا ہے کیونکہ دونوں مفہوم وجودی نہیں تو ان کا اجتماع ممتنع عقلی تو نہیں اور اس کو دوسرے لفظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں اور ان کا اجتماع عقلاً ممکن ہے۔ پھر تعجب ہے کہ تعلیم یافتہ لوگ اس میں کیوں اشکال کرتے ہیں۔ ہاں عوام کی عقل میں یہ بات نہ آوے یا اس کو مستبعد کہا جاوے تو کسی قدر برمحل تھا۔ مگر میں جو مثال ابھی دیتا ہوں اس سے بہت آسانی سے یہ بات عقل میں آ جاتی ہے اور استبعاد مطلق بھی نہیں رہتا۔

وہ مثال یہ ہے کہ خدانخواستہ کسی کو پھوڑا نکل آوے اور سخت تکلیف ہو۔ جراح کو دکھلایا

اس نے کہا سوائے شگاف کے کچھ علاج نہیں ہے۔ دو چار ماہر جراحوں کو دکھلایا سب نے بالاتفاق یہی کہا۔ غرض یہ بات طے ہوگئی کہ شگاف ہی دینا پڑے گا۔ صحت سب کو عزیز ہے بمجبوری اس کو منظور کیا جاوے گا اور اس کو امر کریں گے کہ شگاف لگا۔ اس میں تکلیف ہوگی اس کو گوارا کریں گے۔ آپ چروانے بیٹھے اور پھوڑا تھا بری قسم کا اثر گوشت کے اندر ہڈی کے قریب تک تھا۔ جراح نے گہرا شگاف دیا۔ بس ایک آہ نکلی۔ اور آنسو بھی نکل آئے۔ گو کیسے ہی مرد اور شیر دل تھے مگر ضبط نہ ہو سکا اور منہ بھی بنایا اور سارا بدن کانپ گیا۔ خیر شگاف ختم ہوا اور بہت سا مواد نکل گیا اور بد گوشت کو کاٹ کر مرہم لگا کر پٹی باندھ دی گئی۔ اب مریض صاحب ہنسے اور اس مواد کو دیکھ کر خوش ہوئے کہ اچھا ہوا خدا تعالیٰ نے اس کو دفع کیا اور چاروں طرف سے لوگ مبارک باد دینے لگے انھوں نے حکم دیا کہ دے دو جراح کو دس روپے اجرت اور بیس روپے انعام اور جوڑا بھی دو۔ بہت ہوشیار اور تجربہ کار ہے اور وفادار ہے۔ بہت سوچ سمجھ کر اور دل سے ان نے یہ کام کیا۔

یہ مثال آپ نے سن لی۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ یہاں رضامندی اور ناگواری دونوں جمع ہیں یا نہیں۔ اگر ناگواری نہیں ہے تو آنسو کیوں نکلے اور آہ کیوں کی اور منہ کیوں بنایا اور بدن کیوں کانپا۔ اور اگر رضامندی نہیں ہے تو دس روپیہ اور بیس روپیہ کیوں دیا۔ اور اس کی تعریف کیوں ہو رہی ہے۔ بس یونہی کہا جاوے گا کہ ناراضی بھی اور رضامندی بھی۔ یعنی عقلاً تو اس مثال سے یہ مضمون بہت ہی واضح اور عام فہم ہوگیا اور اس پر کوئی اشکال و استبعاد باقی نہ رہا۔ کہ رضا اور سخط دونوں جمع ہو سکتے ہیں۔ باختلاف حیثیت۔ تو اب رضا کے معنیٰ پر یہ شبہ نہ رہے گا کہ بندہ مصیبت میں تکلیف اور رنج ناگواری بھی محسوس کرے اور حق تعالیٰ کے ساتھ رضا بھی قائم رہے کیونکہ تکلیف اور رنج کا احساس طبعی ہے اور راضی رہنا عقلی ہے۔

رضا کا مقام

غرض مقام رضا یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے ہر فعل سے عقلاً راضی ہو گو طبعاً ناگواری بھی محسوس ہو۔ جیسے بیٹے کے مرنے سے رنج ہوا اور آنسو بھی نکل آئے مگر عقلاً جانتا ہے اور اچھی طرح یہ بات ذہن نشین ہے کہ ٹھیک وہی ہے جو حق تعالیٰ نے کی ایسے شخص کو مقام رضا حاصل ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ رضا میں خوش طبعی ہونا شرط نہیں۔ ہاں بعض بندگان خدا کو طبعی خوشی بھی

ہوئی ہے اور یہ حالت ہوئی ہے کہ تکلیف میں ہنستے تھے اور قہقہے لگاتے تھے مگر یہ غلبہ حالت ہے اور یہ حالت ظاہراً بہت اکمل ہوتی ہے۔ مگر یاد رکھیئے کہ یہ حالت توسط میں ہوتی ہے اور انتہا اور کمال میں یہ حالت نہیں ہوتی۔ دیکھئے انبیاء کی حالت یہ نہیں ہوئی اور مسلم ہے کہ وہ سب سے اکمل ہیں تو یہ حالت کمال کی کیسے ہوسکتی ہے۔

بات یہ ہے کہ متوسلین استغراق میں ہوتے ہیں۔ ان کو احساس رنج والم کا نہیں ہوتا۔ جیسے کسی کو کلورا فارم سنگھا کر آپریشن کیا جائے کہ اس کو تکلیف کا احساس نہ ہوگا۔ اور منتہی کی حالت یہ ہے کہ کرسی پر بیٹھ کر آپریشن کروالیا جس سے تکلیف کا احساس پورا ہوا۔ پیشانی پر بل پڑ گیا۔ مگر ایسا قوی دل اور شیر مرد ہے کہ جھیل گیا۔

انبیاء علیہم السلام کی حالت یہی ہے کہ ان کو تکلیف کا احساس پورا ہوتا ہے مگر قوت قلب اس قدر ہوتی ہے کہ سب کو جھیل جاتے ہیں۔ آثار حزن کے بھی ظاہر ہوتے ہیں اور واقعی حزن ہوتا ہے۔ جیسے کہ کرسی پر بیٹھ کر آپریشن کرانے والے کو تکلیف کا پورا احساس ہوتا ہے لیکن رضاء عقلی غالب رہتی ہے اور حدود سے سر متجاوز نہیں ہوتا۔ ان کا رتبہ استغراق والے سے بڑھا ہوا ہے جیسے کرسی پر بیٹھ کر آپریشن کرانے والے کا رتبہ کلورا فارم سونگھنے والے سے بڑھا ہوا ہے۔

خوب سمجھ لو! اولیاء کا بیٹا مرے تو ہنسیں اور حضورؐ کے صاحب زادے کا انتقال ہو تو روویں اور فرماویں۔ **انا بفراقک یا ابراھیم لمحزونون (المصنف لابن أبی شیبة: ۳:۳۹۳)** اور یہاں پر کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ ممکن ہے کہ حضورؐ سے غلبہ غم میں ایسا ہوگیا ہوگا۔ باقی حضورؐ خود اس حالت کو یعنی مصیبت کے وقت مطلق غم نہ ہونے کو اس سے اچھا سمجھتے ہوں کیونکہ حدیث میں اس کے خلاف کی تصریح موجود ہے۔ حضورؐ کی آنکھ سے آنسو جاری دیکھ کر صحابہؓ نے عرض کیا کہ حضورؐ ہم کو تو منع فرماتے ہیں اور خود روتے ہیں فرمایا **تلک رحمة** یعنی یہ وہ رونا نہیں ہے جس سے منع کیا جاتا ہے۔ یہ تو رحمت ہے جس کو حق تعالیٰ نے مومن کے قلب میں رکھا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حالت کوئی گھٹی ہوئی حالت نہیں ہے کیونکہ اس کی حضورؐ نے مدح فرمائی اور ایسے الفاظ سے مدح فرمائی جن سے اچھی طرح مفہوم ہوتا ہے کہ اس کا

خلاف مذموم ہے کیونکہ اس کو رحمت فرمایا اور رحم کا خلاف ظاہر ہے کہ مذموم ہے۔

پس ثابت ہوا کہ اکمل حالت یہی ہے اور مصیبت میں ہنسنا اس سے کم درجہ کی حالت ہے جو کہ استغراق کے غلبہ میں ایسا ہوتا ہے۔

جوش اور ہوش

غلبہ متوسط ہی کو ہوتا ہے اور منتہی کو غلبہ نہیں ہوتا۔ ایک ہوش والا ہے اور ایک جوش والا۔ متوسط اور منتہی کی مثال ہانڈی کی سی ہے کہ اول اس میں کیسے جوش اٹھتے ہیں اور اخیر میں جوش نہیں رہتا۔

اول کے جوش کو دیکھ کر کوئی کہہ سکتا ہے کہ آنچ کا اثر قبول کرنے کی اس میں زیادہ قابلیت ہے اور اخیر میں یہ انفعال نہیں رہا۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ خیال صحیح نہیں آنچ کا اثر اخیر ہی میں زیادہ ہے۔ کیوں کہ فاعل دیر سے اثر کر رہا ہے۔ نیز منفعل میں جو مانع قبول اثر حرارت کا تھا وہ اب کم ہو گیا ہے۔ وہ مانع پانی تھا۔ پکتے پکتے پانی کم رہ گیا ادھر قوت انفعال بڑھی اور ادھر قوت فاعل بڑھی تو ضرور ہے کہ اب اثر زیادہ ہوگا اور اس کے لیے دلیل کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ تو مشاہدہ ہے اور سب کے نزدیک مسلم ہے گویا بدیہی بات ہے لیکن اب جوش نہیں ہوتا بلکہ اب حالت یہ ہے کہ آگ سے جگر تو جلتا ہے اور تھوڑی دیر میں ہانڈی میں جو کچھ ہے اگر چولہے سے ہانڈی کو اتارا نہ گیا تو سب چیز جل کر کوئلہ ہو جاوے گی مگر جوش نہیں آئے گا۔ یہی حالت منتہی کی ہے کہ جوش تو اس میں مطلق نہیں حتی کہ کوئی ناواقف کہتا ہے کہ یہ متاثر ہی نہیں ہوتا لیکن وہ جلا بھنا ایسا ہے کہ دوسرے بھی اس کے اثر سے جل جاتے ہیں۔ ان کے کلام سے آگ لگ جاوے مگر خود ظاہراً ٹھنڈے ہیں اور کسی کو ان کی حرارت کا پتہ بھی نہیں چلتا۔

جیسے بعض ادویات ہوتی ہیں کہ دیکھنے میں اور چھونے میں ان میں ذرا بھی گرمی نہیں۔ اور کھانے سے وہ حرارت پیدا ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ! بلکہ ایسی ہوتی ہے جیسے برف کے چھونے میں ٹھنڈی۔ حتی کہ دوسرے میں بھی برودت فعلی پیدا کر دے اور پینے سے گرمی ہوتی ہے۔

بعض اہل اللہ کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ہر شخص ان کو پہچان بھی نہیں سکتا۔ ان کو معمولی نظر سے دیکھا جاوے تو بجائے اس کے کہ ان میں کوئی سوز و گداز محسوس ہو سوز و گداز کی ضد محسوس ہوتی ہے جیسے برف کو ہاتھ سے چھونے سے بجائے گرمی کے سردی ہوتی ہے۔ اس کی واقعی

تاثیر معلوم کرنے کے لئے شرط ہے کہ اس کو پیا جاوے۔ اسی طرح اس شخص کی واقعی حالت معلوم کرنے کے لئے شرط ہے کہ اس کے پاس چندروز رہا جاوے اور خلا ملا پیدا کیا جاوے۔

آج کل یہ بھی خبط ہے کہ ایک ملاقات میں اثر معلوم کر لینا چاہتے ہیں۔ حضرت یہ لوگ وہ ہیں کہ اگر چھپنا چاہیں تو برسوں بھی کسی کو پتہ نہیں چل سکتا۔ یہ مطلب نہیں کہ ایک ملاقات میں کچھ اثر نہیں ہوتا بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر ایک ملاقات میں اثر نہ پاویں تو فیصلہ نہ کر لیں۔ ممکن ہے کہ کوئی مانع محسوس ہونے میں مثلاً ادراک منفعل کا ناقص ہونا یا خود فاعل کا اپنے آپ کو چھپا لینا۔

غرض جوش تو در کنار منتہی میں بعض وقت بظاہر جوش کی ضد محسوس ہوتی ہے جیسے برف میں واقع میں حرارت ہے مگر محسوس بروقت ہوتی ہے اگر ضد بھی نہ ہو تو یہ ضرور ہوتا ہے کہ جوش نہیں ہوتا اور تیار ہانڈی کی طرح ہوتا ہے کہ ابلتی نہیں مگر جو جو کمالات حاصل ہونے والے تھے سب ہو چکے۔ کوئی حالت منتظرہ باقی نہیں۔ اور متوسط ادھ کچری ہانڈی کی طرح ہے کہ ابل رہی ہے اور جوش اس کا دبتا نہیں مگر سب جانتے ہیں کہ قابل انتفاع نہیں۔ ابھی گوشت کی بساند بھی نہیں گئی۔ ابھی بہت سے تقلبات ہوں گے۔ بھونا جاوے گا۔ شوربا دے کر پکایا جاوے گا۔ تب کسی کے سامنے رکھنے کے قابل ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ غلبہ متوسط کو ہوتا ہے نہ کہ منتہی کو۔ تو یہ بات کہ مصیبت میں خوش طبعی بھی ہو اور ہنسی آوے یہ متوسط میں ہوگی اور منتہی کو الم کا احساس ہوگا ہاں عقلاً راضی ہوگا۔ تو رضا میں خوش طبعی ہونا شرط نہیں ہاں خوش عقلی ہونا چاہیے کہ آدمی دل سے سمجھتا ہو کہ حق تعالیٰ کا جو فعل بھی ہے وہ عین حکمت اور مناسب ہے اس سے تنگ دل نہ ہو گو طبعاً آزردہ ہو اور اس زوال کا طبعاً خواہش مند ہو۔

جنت سے بڑی نعمت

اس تقریر سے بخوبی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ رنج کے ساتھ رضا جمع ہو سکتی ہے پس بعض نے اس کو اخیر کہا ہے اور اس کے اخیر مقام ہونے ہی کی فرع ہے کہ تمام جنت کا بیان کر کے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ورضوان من اللہ اکبر یعنی جنت تو نیک بندوں کے لیے ہے ہی۔ رضاء الٰہی اس سے بھی بڑی نعمت حاصل ہوگی۔ اس کی تفسیر حدیث میں آئی ہے کہ جنتی

جب جنت میں چلے جاویں گے اور نعماء جنت سے متمتع ہوں گے۔ حتی کہ ان کو دیدار الٰہی بھی نصیب ہوگا۔ اس کے بعد جو خوشخبری سنائی جاوے گی کہ ایک دولت اور بھی دی جاتی ہے وہ یہ کہ آج سے کبھی ہم تم سے ناراض نہ ہوں گے یہ وہ نعمت ہوگی کہ تمام نعمتوں اور عیشوں کی تکمیل اس میں ہوگی۔ کیونکہ احتمال ناراضی کا باقی رہے۔ تو سب نعمتیں خاک ہیں۔ کیونکہ ہر وقت یہ خطرہ لگا ہوا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ ناراض ہو کر یہ چھن جاویں۔

یہ ایسا ہے کہ کسی کے سامنے پلاؤ، قورمہ اور تمام دنیا کی نعمتیں رکھیں مگر اس سے کہہ دیں کہ ہم کو اختیار ہے کہ جب چاہیں سامنے سے اٹھالیں تو وہ ان سے کیا خاک حظ پا سکتا ہے وہ ان کو چکھے گا بھی نہیں۔

دیکھا ہوگا کہ پھانسی والے کو جب پھانسی کے لئے کھڑا کرتے ہیں تو اس سے پوچھتے ہیں کچھ کھانا چاہتا ہے اور وہ جو مانگے دیا بھی جاتا ہے مگر حالت یہ ہوتی ہے کہ اس کے ہاتھ کانپتے ہیں اور اگر منہ میں رکھ بھی لے تو حلق سے نہیں اترتی۔ وجہ اس کی کیا ہے۔ یہی کہ اس کو معلوم ہے کہ یہ چیز مجھ کو دی جاتی ہے۔ مگر ابھی چھین لی جاوے گی۔ یہ حزن سب لذت کو مٹا دیتا ہے اور اس کے نزدیک مٹی اور مٹھائی برابر ہے۔ علیٰ ہذا اگر جنت میں یہ خطرہ رہتا کہ شاید کبھی یہ نعمتیں چھن جاویں تو کسی نعمت کا بھی لطف نہ رہتا بلکہ سخت اذیت ہوتی۔ کیونکہ جتنی نعمت بڑی ہو اتنی ہی اس کے چھننے سے بڑی تکلیف ہوتی ہے اور اسی طرح اس کے زوال کے خیال سے بھی معمول نعمت کے سبب زیادہ تکلیف ہوگی۔ تو اہل جنت کو ایسی تکلیف ہوتی کہ دنیا میں کوئی بھی تکلیف ایسی نہیں۔ پس یہ تکلیف رفع ہوگی اس خوشخبری سے کہ اب کبھی ہم ناراض نہ ہوں گے۔ تو یہ خوشخبری مکمل ہوئی ہر نعمت کی اور جملہ نعمتیں بلا اس کے ناقص تھیں۔ اس واسطے اس کو اکبر فرمایا گیا۔

تو مقام رضا کو اخیر مقام کہنا ٹھیک ہوا اور گو اس مقام کا حصول دنیا میں بھی میسر ہو جاوے۔ چنانچہ صحابہ و تابعین کو زندگی دنیوی ہی میں رضا کی بشارت رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ دے دینا اس کی دلیل ہے لیکن دنیا میں اس کا حصول مظنون اور درجہ خطر میں ہے اور آخرت میں اس کا حصول متیقن ہوگا۔ چنانچہ دنیا میں کوئی قطب بھی ہو جاوے تب بھی احتمال ہے کہ کون سی خطا ہو جاوے۔ جس سے رضا جاتی رہے۔

ادب مجالست کا جرم

خطا سے مراد چوری اور زنا ہی نہیں ہے۔ خاص بندوں کے لیے صرف یہی گناہ جرم نہیں ہیں۔ بلکہ ذرا سا کلمہ بھی جرم ہو جاتا ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی شریعت کوئی اور ہے جس میں جرائم بھی اور ہیں اور طاعات بھی اور ہیں جیسے بعض نماز نہیں پڑھتے اور مقتدین کہتے ہیں کہ فنا ہو گئے ہیں۔ قطرہ دریا میں مل گیا ہے۔ کچھ مغائرت باقی نہیں رہی۔ پھر نماز پڑھیں تو اپنی نماز ہوگی اور کچھ گناہ بھی کم ہو جاتے ہیں حتی کہ عورتوں کا پردہ تک ان سے نہیں رہتا۔ بہت سے پیر مرید کے گھروں میں بے تکلف رہتے ہیں (نتیجہ یہ ہے کہ حمل رہ جاتے ہیں) یہ سب خرافات ہیں۔ شریعت سب کے لئے ایک ہے جب تک حیات ہے اور ہوش و حواس ہیں کوئی طاعت کم نہیں ہو سکتی نہ کوئی گناہ جائز ہو سکتا ہے۔

پس ایک شریعت جدا نہیں ہے پھر ذرا سے کلمہ کے جرم ہونے کے کیا معنیٰ؟ سو معنی یہ ہیں کہ وہ جرم قانونی نہیں ہے۔ وہ ادب مجالست کا جرم ہوتا ہے کسی بڑے حاکم کے سامنے آپ جاویں تو کیا وہاں صرف قانونی جرائم کا خیال رکھتے ہیں اور اگر چوری اور ڈاکے کے آپ مجرم نہیں تو اس کے سامنے اکڑتے ہوئے اور اتراتے ہوئے اور بے تکلف چلے جاتے ہیں۔

اور اگر آپ ایسا کریں تو کیا اعتراض نہ ہوگا۔ اور اگر اعتراض ہو تو کیا یہ آپ کہہ دیں گے کہ میں نے کوئی قانونی جرم نہیں کیا۔ حضرت حاکم کے سامنے تو عجیب حالت ہوتی ہے جس کو سب جانتے ہیں کہ نگاہ اوپر کو نہیں اٹھتی۔ زبان بات کرنے میں یاری نہیں دیتی۔ پیر چلتے ہوئے کانپتے ہیں۔ حالانکہ دنیا کا حاکم چیز ہی کیا ہے خدا تعالیٰ کی عظمت کا اگر انکشاف ہو جاوے تو خدا ہی جانے کیا حالت ہو شاید سانس لینا بھی جرم معلوم ہونے لگے۔ جن بندگان خدا کو عظمت کا انکشاف ہو جاتا ہے ان کو ادب مجلس بھی کرنا پڑتا ہے اور ان پر ذرا سی بے اعتدالی پر گرفت ہوتی ہے اگرچہ وہ قانونی جرم نہیں ہے۔

ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ بارش ہوئی تو انھوں نے کہا آج کیا موقع پر بارش ہوئی ہے۔ الہام ہوا کہ او بے ادب اور بے موقع کب ہوئی تھی۔ بس ہوش ہی تو اڑ گئے کہ کیا تھا شکر اور ہو گئی گستاخی اور جواب طلب ہے۔

یہ ان کے مواخذے ہیں اور ہم لوگ یہ لفظ ہیں تو شکر ہو اور باعث ثواب ہو۔ دیکھیے

لفظ آج پر یہ عتاب ہو گیا۔

ایک بزرگ کے وقت میں بن میں بارش ہوئی تو انہوں نے کہا کہ یہ بارش بستی میں ہوتی تو کیا اچھا ہوتا۔ بس اس لفظ پر اپنے رتبے سے گرا دیئے گئے مگر ان کو خبر نہ ہوئی۔ یہاں سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ہر واقعہ کی خبر اولیاء کو ہو جانا ضروری نہیں۔ لوگ اولیاء کو جانے کیا سمجھتے ہیں گو اپنے متعلق اکثر تو ہو جاتی ہے کبھی نہیں بھی ہوتی۔ چنانچہ ان بزرگ کو نہ ہوئی۔ دوسرے ایک بزرگ کو معلوم ہو گیا وہ ان سے ملنے آئے تھے مگر اس سے اس کو ظاہر نہ کیا اور وہاں سے جانے کے بعد ایک اور شخص سے کہا کہ ان پر عتاب ہے اس کلمہ کی وجہ سے۔ اس نے کہا آپ نے ان سے اس کو ظاہر کیوں نہ کر دیا کہا مجھے شرم آئی اور خیال کیا کہ ان کا دل برا ہو گا انہوں نے اجازت چاہی کہ میں ظاہر کر دوں انھوں نے اجازت دے دی۔ انہوں نے ظاہر کر دیا ان کی بری حالت ہو گئی اور فرمائش کی کہ اس کی تدبیر میں میری مدد کرو اور وہ علاج یہ کیا کہ رسی باندھ کر مجھے گھسیٹو چنانچہ ایسا کیا گیا اللہ اکبر! یہ ایک شیخ وقت کے حالات ہیں

ایں چنیں شیخ گدائے کو بکو (اتنا بڑا اللہ کا ولی گلی گلی کوچہ کوچہ اس کی تلاش میں پھرتا ہے)

یہ حالتیں اہل اللہ پر گزرتی ہیں۔ لوگ تصوف کو نانا جی کا گھر سمجھتے ہیں یہ ہیں صوفی یہ گت بنتی ہے صوفیوں کی۔ رسیوں سے باندھ کر گھسیٹا جانے کے لئے تیار ہو جاؤ تب تصوف کا نام لو۔ یہ نہیں ہے تصوف کہ فقط کپڑے رنگ لیے۔ کوئی دنیادار ان کی اس حالت کو دیکھتا تو کیا کہتا سوائے اس کے کہ دماغ خراب ہو گیا ہے ابھی اچھے خاصے بیٹھے تھے۔ شیخ وقت ہیں بیٹھے نچ رہے تھے۔ یہ کیا خبط ہے کہ رسی سے گھسیٹے جا رہے ہیں۔ حضرت کیا کہا جاوے اس کے جواب میں سوائے اس کے کہ

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست ☆ حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

(تمہارے پاؤں میں تو کانٹا بھی نہیں لگا تم ان لوگوں کی حالت کیا سمجھ سکتے ہو جن کے سروں پر بلا اور مصیبت کی تلوار چل رہی ہے)

ان سے پوچھئے کہ ان کو یہ معلوم ہو کر کہ میرے اوپر حق تعالیٰ کا عتاب ہے کیا گزری اس کے مقابلہ میں جان کا جاتا رہنا بھی کچھ بات نہیں اور دنیا ان کو پاگل کہا کرے تو کیا ہوتا ہے وہ ان ہی کو پاگل سمجھتے ہیں۔ غیب سے آواز آئی کہ بس خبردار جو ایسی گستاخی کی۔ اس شخص

نے فوراً رسی کو کھول دیا۔

غرض دنیا میں رہتے رہتے جرائم کا احتمال اور ان کے جرائم بھی اوروں سے نازک تو اس لیئے کثرت جرائم کا احتمال رہا۔ اور جرائم منقص یا مفوت رضاء ہوتے ہیں تو پھر دنیا میں کس کو اطمینان ہو سکتا ہے اور جب تک یہ اطمینان نہ ہو جاوے سب کام ناتمام ہے۔ ہر وقت قسم قسم کے اندیشے لگے رہتے ہیں یہ کھٹکا بے شک جنت میں جاتا رہے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ پھر ان سے کوئی فعل خلاف رضا ہوگا ہی نہیں۔

غرض رضا بڑی دولت ہے اور تمام مقامات کے لیے متمم ہے اس واسطے اس کو اخیر مقام کہا ہے۔

فنا کے معنی

بعض نے اخیر مقام فنا کو کہا ہے اور فنا کے معنی موت نہیں ہے کبھی کوئی سمجھے کہ خودکشی کر لو بس سارے مقام طے ہو گئے۔ موت تو حیات کا آخر ہے۔ مقامات سلوک کا آخر نہیں۔ بلکہ فنا سے مراد معاصی و نامرضیات کے متعلق تقاضائے نفس کا فنا ہو جانا ہے نفس کا جب تک تقاضا فنا نہیں ہوا۔ اس وقت تک وہ فضولیات میں شہوات میں! اغراض میں مبتلا کرتا ہے۔ یہ باتیں جاتی رہیں اس کا نام فنا ہے اور تقاضے کا لفظ اس واسطے کہا کہ معاصی کی طرف نفس کا میلان بالکل جاتا رہنا ضروری نہیں البتہ نفس کا تقاضا کھونے کی ضرورت ہے اور یہ بات مجاہدہ سے حاصل ہو جاتی ہے۔ مجاہدہ سے نفس ایسا رام ہو جاتا ہے جیسے شائستہ گھوڑا کہ قابو میں آ جاتا ہے اور سوار کا مطیع ہو جاتا ہے اور اس کی قوت اور دوڑ دھوپ سب باقی رہتی ہیں۔ ہاں اتنا فرق ہو جاتا ہے کہ پہلے دوڑ دھوپ اپنی خواہش کے موافق تھی اور اب سوار کے موافق ہو گئی۔

خلاصہ یہ کہ نفس امارہ سے مطمئنہ رہ جاتا ہے۔ نفس مطمئنہ کوئی دوسرا نفس نہیں امارہ اس کی ایک صفت ہے۔ یہ صفت زائل اور دوسری صفت حاصل ہو جاتی ہے اور اب اسی کو مطمئنہ کہتے ہیں اور اس وقت میں بھی یہ نہیں ہوتا کہ تقاضا معصیت کا بالکل جاتا رہے۔ صفت تو باقی رہتی ہے مگر یہ حالت ہوتی ہے کہ گو کبھی تقاضا ہوتا ہے مگر رکنا معصیت سے مشکل نہیں ہوتا۔ جیسے شائستہ اور تعلیم یافتہ گھوڑا ابھی کبھی کبھی شرارت کرنے لگتا ہے۔ مگر تعلیم کا یہ اثر ہوتا ہے کہ سوار کو اس کے رام کرنے میں دقت نہیں ہوتی جیسے کہ غیر تعلیم یافتہ کے روکنے

میں ہوتی تھی۔ یہ اثر آدمی کو محسوس ہونے لگتا ہے۔

مثلاً پہلے عورت سے نگاہ کا روکنا بہت مشکل تھا گو محال اور خارج از وسع جب بھی نہ تھا ورنہ تکلیف مالا یطاق لازم آوے گی اور ظاہر بھی ہے کہ یہ ہر وقت اختیار میں ہے کہ سر نیچے کر لے مگر اس سے بے چینی بہت ہوتی ہے اور قریب اسی کے تھا کہ اختیار سے خارج ہو اور آج مجاہدہ سے یہ بات حاصل ہے کہ میلان بھی اس قدر نہیں یعنی ہر وقت نہیں مگر کبھی ہوتا ہے لیکن روکنے سے اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی پہلے تھی اور روکنے میں سہولت سے کامیابی ہوتی ہے۔

پہلے تو نظر کے روکنے میں بسا اوقات کامیابی نہیں ہوتی تھی اور کامیابی ہو بھی جاوے تو تکلیف تو بے حد ہوتی تھی۔ گو وہ تکلیف بھی اس تکلیف سے کم ہوتی ہے جو نظر سے پیش آتی ہے۔ نظر غضب کی چیز ہے جیسے نظر بازوں کا خود اقرار ہے کہ کس نے کہا ہے

بحیرتم کہ عجب تیر بے کماں زدہ (میں حیرت میں ہوں کہ بغیر کمان کے تیر کیسے مار دیا)

نظر واقعی ایسی چیز ہے کہ تیر سے زیادہ کام کرتی ہے اور گو نظر کے روکنے میں تکلیف ضرور ہوتی ہے مگر یہ تکلیف ذرا دیر کی ہے جب تک وہ چڑیل اور اس کا بناؤ سنگار زیور سامنے ہے اس وقت تک نظر کو روک لینا واقعی دل گردے والے کا کام ہے مگر ایک دفعہ دل پر جبر کر کے روک لیا بس تکلیف ختم ہو گئی اور اگر نفس کے کہنے میں آ گئے اور ہمت سے کام نہ لیا اور دیکھ لیا تو بس چنگاری رکھی گئی۔ حظ تو برا بھلا بہت ہی تھوڑی کا حاصل ہوا مگر ایسی آگ لگ گئی کہ تمام عمر نہیں بجھ سکتی۔ اور صرف گوشت پوست کو نہیں گلاتی بلکہ کپڑوں تک کو اور گھر بار کو پھونک دیتی ہے اور اس وقت تو کہنے کو صرف نظر کا گناہ تھا مگر وہ اصل گناہ سے ادھر دم نہیں لیتا۔ اور ایک گناہ نہیں۔ بلکہ بہت سے گناہوں کا تخم ہے۔ نظر میں بالخاصہ یہ اثر ہے کہ ایک بار پر بس نہیں ہوتی۔ بلکہ ہر مرتبہ اس کا داعی ہوتا ہے دوسرے کیلئے۔ یہ اثر اور گناہوں میں نہیں ہے۔ نظر کرنے والے کو چین بھی نہیں آتا۔

اب دیکھ لیجئے کہ نظر کرنے میں تکلیف زیادہ ہے یا ایک دفعہ ہمت کر کے روک لینے میں۔ مگر حیرت ہے کہ لوگ اس ذرا سی نظر کے روکنے کی تکلیف سے بچنے کے لیے یہ تکلیف خریدتے ہیں۔ اور ایک عجب بات ہے کہ نظر کے روکنے میں ذرا سی تکلیف ہوتی ہے مگر اس کے بعد وہ راحت ہوتی ہے کہ جس کو حاصل ہوئی ہو وہی جانتا ہے۔ اگر اسی کا تصور کر لیا

کرے تو نظر کے گناہ سے بچ سکتا ہے۔

غرض نظر سے روکنے میں جو تکلیف ہوتی ہے مجاہدہ سے نفس میں یہ بات پیدا ہو جاتی ہے کہ پھر روکنا اس کا مشکل نہیں ہوتا۔ اور وہ تکلیف نہیں ہوتی جو قبل مجاہدہ کے ہوتی تھی۔ بس اس کا نام فنا ہے۔ یعنی نفس کا تقاضا نہ رہنا اور یہ نہیں کہ نفس میں میلان ہی کی قوت نہ رہے گی اور گناہ میں لطف ہی نہ رہے۔

ہمہ اوست کے معنی

ہاں ابتدا میں بعض اوقات کیفیات کے جوش اور غلبہ سے یہ حالت ہوتی ہے کہ گناہ کی طرف اصلاً میلان ہی نہیں ہوتا مگر چونکہ کیفیات دیرپا نہیں ہیں یہ حالت بعد چندے زائل ہو جاتی ہے اور پھر یہ ایک کیفیت راسخہ اعتدال کے ساتھ مانع عن المعصیت نصیب ہوتی ہے۔ جس کو عدم تقاضائے معصیت سے تعبیر کیا جا رہا ہے مگر سالک ناواقفی سے اس پہلی حالت کو دوسری حالت سے اکمل سمجھ کر یہ سمجھتا ہے کہ مجھ کو تنزل ہوا اور میری حالت خراب ہوگئی اور اس طرح سے اس کو دھوکا ہو جاتا ہے اور شیخ سے شکایت کرتا ہے کہ مجھ میں وہ جوش نہیں رہا جو پہلے تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ سے تعلق کم ہوگیا۔ اور یہ سالک کے لیئے ایسی بات ہے کہ جان دے دینا بھی اس پر گوارا کر لیتا ہے۔

سو حقیقت اس کی یہ ہے کہ تعلق کم نہیں ہوا۔ ہاں رسوخ کیفیت سے اس سے افعال اعتدال سہولت کے ساتھ ہونے لگتے ہیں اس قلت جوش سے وہ سمجھتا ہے کہ محبت کم ہوگئی اور یہ نہیں جانتا کہ اگر جوش ہمیشہ رہے تو آدمی مر جاوے یہ حالت بری نہیں۔

اس کی شرح ایک بزرگ نے خوب کی تھی۔ یہ بزرگ مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی ہیں کسی نے مولانا سے یہی شکایت کی تھی کہ اب ذکر میں وہ جوش وخروش نہیں رہا۔ فرمایا۔ پرانی جورو اماں ہو جاتی ہے۔ دیکھئے لفظ تو بہت عامی ہے۔ مگر حقیقت اس سے پوری ادا ہوتی ہے۔

پس مطلب یہ ہے کہ جو جوش بی بی کی طرف پہلے تھا وہ پرانی ہونے کے بعد نہیں رہتا تو اس سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ محبت نہیں رہی۔ محبت تو ابھی بڑھی ہے مگر جوش نہیں رہا۔

چنانچہ محبت کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ ایک رئیس کی بی بی مر گئی تھی۔ وہ بڑے آدمی تھے

www.chiefhaq.org

ہے۔ حکام میں بھی ان کی بڑی عزت تھی۔ کلکٹر صاحب تعزیت کے واسطے آئے اور مناسب الفاظ میں کہا کہ آپ کی بی بی کے مرجانے کا افسوس ہے۔ تو رئیس صاحب کہتے ہیں صاحب وہ ہمارا بی بی نہیں تھا وہ ہمارا اماں تھا۔ ہم کو روٹی پکا کر کھلاتا تھا۔ صاحب کلکٹر ہنسنے لگے۔ تو دیکھئے گو اماں نہ تھی مگر کیسی محبوب تھی۔

اسی طرح سلوک میں ہے کہ اول جوش ہوتا ہے۔ اس میں یہ حالت ہوتی ہے کہ کوئی چیز بھی اچھی نہیں لگتی۔ نہ مال اچھا لگے نہ دولت اچھی لگے نہ عورت اچھی لگے۔ معصیت کی طرف میلان اصلاً بھی نہیں ہوتا۔ یہ حالت گویا سلب حواس کی ہے پھر اس جوش کو سکون ہوجاتا ہے۔ اور حواس درست ہوتے ہیں۔ اب انسانیت میں آئے کہ میلان ہوتا ہے۔ جو چیز اچھی ہے اچھی معلوم ہوتی ہے مگر حالت یہ ہے کہ گو استحسان تو ہے مگر قصد معصیت کا نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی سامنے آجاتا ہے تو سر نیچا ہوجاتا ہے اس وقت اس کو وہ حالت یاد کرنی چاہیئے کہ ایک وقت میں نگاہ کا روک لینا مشکل سمجھا جاتا ہے۔ مگر اب مشکل نہیں۔ یہ علامت ہے حصول دولت کی اور نجات ہے دھوکا سے۔ پس یہ دولت فنا ہے اور یہ فنا تو مقام ہے۔

ایک فنا درجہ حال میں بھی ہوتا ہے۔ بعض کو مقام میں حال سے دھوکا ہوتا ہے وہ حال ہی کے ساتھ فنا کو خاص سمجھتے ہیں اس وقت نہ غیر حق کے ساتھ ہوتا ہے نہ غیر کی طرف نظر کرتا ہے۔ ہر چیز میں اس کو خدا ہی خدا سوجھتا ہے اس وقت اس پر وحدت الوجود کا غلبہ ہوتا ہے اور ہمہ اوست کہتا ہے اور ہمہ اوست کے معنیٰ یہ ہوتے ہیں کہ کوئی چیز نہیں سوائے حق تعالیٰ کے نہ یہ کہ سب چیز خدا ہے۔ جیسے نقالوں نے یہی معنیٰ لے رکھے ہیں اس کی نظر تو کسی پر سوائے خدا تعالیٰ کے پڑتی ہی نہیں۔ پھر یہ معنیٰ کیسے لے سکتا ہے کہ سب چیز خدا ہے۔ ہمہ اوست کی لوگوں نے کیا کیا گت بنائی ہے حالانکہ یہ ایک بہت ہی واضح مفہوم ہے اور ہمارے محاورات میں ایسے الفاظ موجود ہیں۔

مثلاً کسی نے کلکٹر سے جا کر فریاد کی کہ مجھ پر ظلم ہوا ہے، تو اس نے کہا اس کی پولیس میں رپورٹ کرو اور کسی کو وکیل کرو۔ اور مقدمہ باقاعدہ چلاؤ۔ تو وہ کہتا ہے ہمارے تو آپ ہی وکیل ہیں اور آپ ہی پولیس ہیں۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ کلکٹر صاحب وکیل بھی ہیں یعنی وکالت کا پیشہ کرتے ہیں اور پولیس بھی ہیں یعنی کانسٹیبل یا کوتوال بھی ہیں۔ نہیں بلکہ

مطلب یہ ہے کہ پولیس کوئی چیز نہیں۔ اور وکیل کوئی چیز نہیں آپ ہی ہیں جو کچھ ہیں۔

اور اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ پولیس اور وکیل کا وجود دنیا میں نہیں ہے بلکہ یہ معنیٰ ہیں کہ آپ مقابلہ میں ان کا وجود کچھ ہستی نہیں رکھتا۔ گویا کالعدم ہے جب ان کا وجود نہیں ہے تو کلکٹر صاحب ہی کا وجود ہے اور بجائے پولیس اور وکیل سب کے وہی ہیں۔ اس معنیٰ کر ان کو ہمہ اوست کہا جاسکتا ہے یہ معنیٰ ہمہ اوست کے ہیں جو بالکل بے غبار ہیں لوگ فن کو جانتے نہیں نقل کرتے ہیں اور احوال نقل کرنے کی چیز نہیں اسی کو جامی غلبہ حال میں کہتے ہیں

بسکہ در جان فگار و چشم بیدارم توئی ☆ ہر کہ پیدا می شود از دور پندارم توئی

(میری جان، میرے دل و دماغ میں تو ہی بسا ہوا ہے، جو کچھ دور سے دکھائی دیتا ہے میں خیال کرتا ہوں کہ تو ہی ہے)

جب کسی سے آدمی کو تعشق ہوتا ہے تو ہر چیز سے اس کی طرف ذہن کو انتقال ہوتا ہے۔ بلکہ ہر چیز میں وہی نظر آتا ہے جیسے کسی نے کہا ہے

جب کوئی بولا صدا کانوں میں آئی آپ کی

جامی سے کسی احمق نے جو ان احوال سے ناآشنا اور منکر تھا کہا اگر خر پیدا شود۔ ملا جامی نے کہا پندارم توئی۔ بس چپ ہی تو رہ گیا۔ یہ ملا جامی کی ظرافت ہے۔

غرض فانی پر کبھی یہ فنا درجۂ حال میں بھی آجاتی ہے یہ حال ہے اور وہ مقام تھا۔ مقام اختیاری ہوتا ہے۔ اور حال غیر اختیاری تو فنا کے دو مرتبے ہوئے فنا مقامی اور فنا حالی۔

مقام عبدیت

اور (اس وقت ایک بوڑھے آدمی جانے لگے اور مصافحہ کرنا چاہا تو ان کو ڈانٹا اور فرمایا یہ کون سی تہذیب ہے کہ اثناء بیان میں مصافحہ کرو۔ عرض کیا مجھے جانا ہے فرمایا جانا ہے تو مصافحہ کرنا کون سا فرض ہے۔ افسوس ہے کہ رسوم نے ایسا مذاق خراب کیا ہے کہ نہ اس کا خیال کہ بیان قطع ہوتا ہے اور نہ اس کا کہ مجمع کو تکلیف ہوتی ہے کہاں آیا ہے کہ گردنیں پھلانگ کر جاؤ جب کہ صف اول میں بھی گردنیں پھلانگ کر جانا جائز نہیں تو مصافحہ کے لیئے کیسے جائز ہوگا۔ تہذیب تو نہ انگریزیت سے اور نہ تعلیم سے آوے۔ یہ تو فقط اہل اللہ کی صحبت سے آتی ہے کوئی ایسا ہی مدعی تہذیب ہو مگر ان حضرات کی صحبت میں پہنچے تو نور صحبت

سے نظر آ جاوے گا کہ جس کو تہذیب سمجھ رکھا تھا وہ صرف بناوٹ تھی۔

خیر! اللہ میاں بھلا کرے ان بڑے میاں کا کہ ان کی بدولت مسئلہ تہذیب بھی بیان ہو گیا۔ گو بیان کو انقطاع ہوا) بعض نے عبدیت کو اخیر مقام کہا ہے اس کو بقاء بھی کہتے ہیں فنا کے بعد ایک حالت اور پیدا ہوتی ہے وہ عبدیت ہے۔ فنا میں حال غالب ہوتا ہے اس حالت میں آکر وہ حال مغلوب ہو جاتا ہے اور سکون ہو جاتا ہے اور حالت بالکل مبتدی کی سی ہو جاتی ہے وہ حال عروج پر تھا اور یہ نزول ہے۔

اس کو ایک مثال سمجھ لو۔ اس میں زیادہ شرح کرتا مگر وقت تنگ ہے لہٰذا ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں جس سے مسئلہ تو بخوبی سمجھ میں آ جاوے گا۔ فرض کرو۔ ایک شخص شمس بازغہ تک پہنچا تو یہ منتہی ہے اب یہ میزان پڑھانے بیٹھا تو اس وقت میزان ہاتھ میں دیکھ کر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ یہ اور وہ طالب علم جو میزان پڑھتا ہے برابر ہے یا اس کی ان دو حالتوں کو یعنی وہ حالت جب کہ میزان شروع کی تھی اور یہ حالت جب کہ میزان لے کر پڑھانے بیٹھا ہے برابر سمجھ کر رائے قائم کرے کہ اسکی حالت پست ہو گئی ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ پہلے تعلماً اور تدریساً ہاتھ میں ہے اور نزول کہلاتا ہے۔ اور نزول کے معنیٰ کوئی یہ نہ سمجھے کہ ترقی سے اب تنزل ہو گا۔ کیونکہ یہ نزول وہ ہے جس کی نسبت کہا گیا ہے ما النہایہ۔ یہ جواب دیا گیا العود الی البدایہ یعنی پوچھا گیا انتہا کی حالت کیا ہے کہا ابتداء کی طرف لوٹ آنا۔ یہ نزول صورۃً جس میں ظاہری حالت بالکل ابتدا کی سی ہوتی ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ پہلے خالی تھا اور اب پر ہو گیا ہے پہلے خود فیض لیتا تھا اور اب دوسروں کو اس سے فیض پہنچے گا اس کو بقا کہتے ہیں۔

مقام محبوبیت

بعض نے کہا ہے (تصریح تو نہیں ہے مگر تلویحات سے معلوم ہوتا ہے) کہ محبوبیت اخیر مقام ہے اور اس کا ثبوت ان کے پاس یہ حدیث ہے:

ولا یزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتیٰ احببته فاذا احببته کنت سمعه الذی یسمع به و بصره الذی یبصر به ویده الذی یبطش به . (فتح الباری لابن حجر ۱۰:۴۶۲)

جس کا ترجمہ یہ ہے کہ بندہ مجھ سے قرب حاصل کرتا جاتا ہے حتی کہ میں اس کو محبوب بنا لیتا ہوں اور اس وقت میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس وہ پکڑتا ہے۔

اس حدیث کے الفاظ بہت صریح ہیں اس باب میں۔ کیونکہ حتی کا لفظ موجود ہے جو انتہا پر دال ہے۔ اور انتہا قرب ہی کی بیان فرمائی تو مطلب یہ ہوا کہ انتہائی درجہ قرب کا یہ ہے۔ حاصل یہ کہ ایک قول یہ بھی ہوا جو بعض کے کلام سے نکلتا ہے کہ محبوبیت اخیر مقام ہے۔

غرض اتنے اقوال ہوئے اس باب میں کہ بعض نے رضاء کو اخیر مقام کہا ہے اور بعض نے فنا کو اور بعض نے عبدیت کو اور بعض نے محبوبیت کو۔ ان سب میں تعارض نہیں بلکہ تلازم ہے کیونکہ رضا کامل بدوں فنا کے نہیں ہوتی۔ پھر جب رضا اور فنا کے بعد لازم ہے نزول، اس کا نام بقا رکھو یا عبدیت دونوں کا حاصل ایک ہی ہے اور ان میں غایت قرب لازم اور غایت قرب کے لئے محبوبیت لازم ہے تو نام ان مقامات کے کچھ رکھ لو مگر سب آپس میں ایک دوسرے کے لازم ہیں یا یوں فیصلہ کیا جا سکتا ہے ان اقوال میں کہ مقامات کا اخیر تو رضا ہے اور احوال کا اخیر فنا ہے۔ یہ سب عروج ہیں اور نزول کا اخیر ہے عبدیت۔ اور محبوبیت کو چاہے کسی میں داخل کر دو خواہ عروج میں خواہ نزول میں۔ اس طرح سب اقوال منطبق ہو گئے یہ فیصلہ ہے ان اقوال کے بارہ میں۔

اب میں اس غایت اور غرض کو عرض کرتا ہوں جس کی نسبت ابتدا وعظ میں کہا تھا کہ جیسے پرسوں کے بیان سے غرض ایک غلطی کا اظہار تھا۔ ایسے ہی آج کے بیان سے غرض ایک بات کی شکایت ہوگی۔

مقصود بیان

وہ یہ کہ دین میں تکمیل سے قبل قناعت کیوں ہو جاتی ہے اور اس مضمون تکمیل کی تحقیق کے لئے ضرورت ہوتی تھی انتہائی مرتبہ کے بتلانے کی۔ جب میں اس کو بیان کر چکا۔ تو اب اس شکایت کو زبان پر لاتا ہوں اور وہ شکایت اتنے بیان سے بخوبی سمجھ میں آ بھی گئی ہوگی۔ کیونکہ یہاں مقصود یہی ہوتا ہے کہ جو باتیں بیان کی جاتی ہیں وہ حاصل کرو مگر میں تصریحاً بھی اس کو دہراتا ہوں یعنی جب معلوم ہو گیا کہ انتہائی مقامات یہ ہیں تو ہم کو چاہیے۔ کہ دیکھ

لیں کہ ہم میں یہ پیدا ہوئے یا نہیں اور جب تک نہ ہوں برابر کوشش جاری رکھیں۔ ان سے پہلے قناعت کر کے کیوں بیٹھ رہتے ہیں۔

کبھی دہلی جانے والے کو بھی دیکھا ہے کہ ایک منزل ادھر پہنچ کر بس کر دی ہو بلکہ خاص شہر دہلی کے باہر بھی رہ جانا اس گوارا نہیں ہوتا۔ بلکہ شہر میں پہنچ کر بھی وہ جگہ اختیار کرتا ہے کہ بقدر اس کے امکان کے اعلیٰ سے اعلیٰ ہو۔ بلا مبالغہ ہے کہ اگر بس چلے تو کوئی بھی شاہی محل کے سوا کسی گھر اور سرائے میں بھی نہ اترے۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ دین میں منزل مقصود سے ادھر قناعت کر لی جاتی ہے کیوں اس وقت کوشش جاری نہیں رکھی جاتی۔ جب تک کہ یہ مقامات حاصل نہ ہو جاویں

اندریں رہ می تراش و می خراش ☆ تا دم آخر دمے فارغ مباش
تادم آخر دم آخر بود ☆ کہ عنایت با تو صاحب سر بود

(اس راستہ میں خوب کوشش کر، آخر دم تک بے کار مت رہ، یہاں تک کہ تری موت کا وقت قریب آ جائے، شاید اللہ تعالیٰ تجھ پر عنایت فرمائیں)

دھن میں لگے رہو۔ کوئی وقت خالی نہ رہو اور نا امید نہ ہو اور یہ مت سمجھو کہ ہم کو یہ مقامات حاصل نہیں ہو سکتے۔ طلب میں لگے رہو۔ انشاء اللہ تعالیٰ مقصود حاصل ہو گا۔ یہ تحقیق ہوئی انتہائی مقام کی اور جو کچھ اس کے مناسب تھا عرض کیا گیا۔ اب اس آیت پر منطبق کیجئے اور اس پر میں بیان کو ختم کر دوں گا فرماتے ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ

(ترجمہ: اور بعضا آدمی ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں اپنی جان تک صرف کر ڈالتا ہے اور اللہ تعالیٰ بندہ کے حال پر نہایت مہربان ہیں)

یہ دو جملے ہیں اور ایک ایک میں دو مقام مذکور ہیں وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ اس میں مقام فنا کا ذکر ہے کیونکہ شراء کہتے ہیں بیچ ڈالنے کو اور جو چیز بیچ ڈالی جاوے اس میں بائع کو کسی تصرف کا حق نہیں رہتا۔ وہ چیز مشتری کی ہو چکی۔ اور جب اپنی جان بیچ ڈالی تو وہ چیزیں جو جان سے ادنیٰ درجہ کی ہیں بطریق اولیٰ بک گئیں تو اپنی تو کوئی چیز بھی نہیں رکھی اور کسی تصرف کا اختیار نہ رہا۔ یہ فنا ہے اس کے آگے دوسرا بقا ہے۔ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ

www.alahaq.org

یعنی یہ معاملہ ہو رضاء الٰہی کے حاصل کرنے کے لئے۔ اس میں صاف الفاظ میں مقام رضاء مذکور ہے۔ ایک جملے میں فنا اور رضا کا ذکر ہو گیا۔

دوسرا جملہ وَاللّٰہُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ اس میں بھی دو لفظ ہیں ایک میں ایک مقام مذکور ہے اور دوسرے میں دوسرا۔ حق تعالیٰ کا معاملہ یہ ہے کہ رؤف ہیں۔ رافت کہتے ہیں غایت رحمت کو۔ اس سے زیادہ رحمت کیا ہو سکتی ہے کہ بندہ کو محبوب بنالیں۔ یہ مقام محبوبیت ہے اور یہ معاملہ ہے کس کے ساتھ بالعباد بندوں کے ساتھ یعنی جنہوں نے مقام عبدیت حاصل کر لیا ہے۔

لیجئے چاروں طرف اس آیت میں مذکور ہیں۔ یہ وہی آیت ہے جس کو لوگ روزمرہ پڑھتے ہیں اور اہل علم بھی برابر پڑھتے ہیں چلے جاتے ہیں مگر کبھی اس طرف خیال نہیں جاتا کہ اس میں تصوف کتنا بھرا ہوا ہے۔ اس کا علم صحبت سے ہوتا ہے اب قدر آتی ہے کہ اہل اللہ نے کیسا سمجھا ہے قرآن کو۔ ان کے واسطے سب کچھ قرآن میں موجود ہے اور دوسرے کو اس کی ہوا بھی نہیں لگ سکتی۔

دیکھئے آیت میں دو جملے ہیں جن میں چاروں مقام کس وضاحت سے ساتھ مذکور ہیں۔ اس تقریر سے میرا مقصود صرف بیان کو مزے دار کرنا نہ تھا بلکہ قرآن شریف کی بلاغت دکھانے کے ساتھ یہ بھی دکھلانا تھا کہ اہل تصوف کی باتیں من گھڑت نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ایک بات قرآن و حدیث کے مطابق ہے اور سیدھی سیدھی دل کو لگتی ہوئی۔ نہ تاویل و تحریف نہ اینچ پیچ بالکل عام فہم۔

خلاصہ مقصود یہ ہے کہ اپنی حالت کو ٹٹولو اور سمجھ لو کہ جب تک یہ انتہائی مقامات پیدا نہ ہوں۔ ہم ناقص ہیں۔ کوشش کرتے رہو۔ اور رفتار کو دھیمی نہ کرو اور مقصود سے ادھر قناعت نہ کرو۔ اور ان کے حاصل ہو جانے کے بارہ میں تمہاری خود کی رجسٹری معتبر نہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے اور بہت ہے یہ بات کہ کوئی حالت اچھی پائی اور سمجھ لیا کہ ہم کو فلاں مقام حاصل ہو گیا۔ بس خود ہی رجسٹری کر لی۔ اس کے رجسٹرار اللہ تعالیٰ ہیں۔ جب عند اللہ حالت درست ہو جاوے تب اطمینان ہو سکتا ہے۔ مگر اللہ میاں کسی کی تصدیق کرنے نہیں آتے اس واسطے سب رجسٹرار بھیج دیئے ہیں۔ ان ہی کی تصدیق پر مدار ہے۔ وہ سب رجسٹرار اہل اللہ ہیں۔ سب رجسٹرار کی تصدیق رجسٹرار ہی کی تصدیق مانی جاتی ہے۔ اگر اہل اللہ کی رجسٹری ہو گئی تو کہا جاتا ہے طوبیٰ لکم مبارک ہو حق تعالیٰ کی نعمت۔ اس کا شکر کرو۔ مگر ٹھہرو اب بھی مت۔

سیر الی اللہ سے فارغ ہوئے۔ دہلی کے دروازہ پر پہنچے ہو یہیں پڑاؤ مت ڈال دو بلکہ

دہلی کی سیر کو آئے ہو تو اندر جاؤ وہاں وہ چیز پاؤ گے کہ پھر دہلی سے کبھی نہ آؤ گے محنت اور مجاہدہ اور سفر کی صعوبات تو دروازہ پر ختم ہوئیں اب حظ ہے اور لطف ہے مگر ختم پر اور بھی مجاہدہ ہے۔ دہلی کے اندر بھی تو آخر پیروں ہی سے چلنا ہوگا۔ اور جو جو چیزیں تفریح اور حظ کی ہیں ان کے پاس تک پہنچنے میں بھی تو نقل و حرکت کرنا ہوگی۔ یہ بھی مجاہدہ ہے۔ غرض مجاہدہ کو ختم یہاں بھی نہ کرو اور اس مجاہدہ کی کہیں انتہا نہیں۔ ساری عمر اک قصہ ہے۔ غرض ابتدا کو بھی صحیح کرو یعنی توبہ کرو۔ اس کو میں گذشتہ بیان میں ثابت کر چکا ہوں کہ وہ اول اعمال ہے اور اخیر کو مطمح نظر رکھو اور بلا پہنچے دم نہ لو۔ کسی جگہ قناعت نہ کرو۔ جب تک اس فن کا ماہر نہ کہہ دے کہ پہنچ گئے۔ یہ آج ثابت کیا گیا ہے۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ فہم صحیح اور ہمت اور توفیق عطا فرماوے۔ آمین یا رب العلمین۔

صاحبو! الہ آباد میں دو بیان ہوئے تھے ایک کا نام الظاہر تھا اور ایک کا نام الباطن، ان میں ظاہر و باطن کی اصلاح کی ضرورت کا بیان تھا اور یہاں کانپور میں گذشتہ بیان میں اول اعمال کا ذکر ہوا اور آج آخر اعمال کا۔ اور یہ سب مجموعہ اس آیت کے مضمون کا مظہر ہے۔

هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ (وہی اوّل اور ظاہر اور پوشیدہ ہے)

(پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور جلسہ ختم ہوا)

واقعہ: اس وعظ سے لوگ عام طور سے بہت متاثر ہوئے ایک مولوی صاحب جو مدرسہ جامع العلوم میں مدرس تھے۔ ان کو تو یہ حالت ہوئی کہ عشاء کے وقت حضرت والا کی قیام گاہ پر ایک رقعہ لے کر آئے جس میں تحریر تھا کہ میں نوکری چھوڑ کر تھانہ بھون چلتا ہوں اگر حضرت اجازت دیں۔ فرمایا اس کا جواب میں تھانہ بھون میں پہنچ کر دونگا۔

بحمد اللہ تعالیٰ

www.ghlenaq.org